رجسٹرڈ نمبر ۱۸۱ اے جنوری سنہ ۱۹۴۹ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت: چھ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

سلسلۂ تاریخ اسلام

دارالمصنفین کے سلسلۂ تاریخ اسلام کو بڑا حسن قبول حاصل ہوا، علمی و تعلیمی ادارون نے خصوصیت کے ساتھ اس کی قدر دانی کی بعض یونیورسٹیون نے اس کو اسلامی تاریخ کے نصاب مین داخل کر لیا، اس لئے چند برسون کے اندر تقریباً اس کے سب حصے ختم ہو گئے جن کے دوسرے اڈیشن مزید اصلاح و ترمیم اور اضافون کے ساتھ چھپ کر تیار ہو گئے ہین اور بعض زیر طباعت ہین، اب یہ سلسلہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہو گیا ہے،

تاریخ اسلام حصۂ اوّل

(عہد رسالت و خلافت راشدہ)

یعنی آغاز اسلام سے لے کر خلافت راشدہ کے اختتام تک اسلام کی مذہبی، سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ، ضخامت ۵۹۰ صفحے، قیمت: سے ر

تاریخ اسلام حصۂ دوم

(بنو امیہ)

یعنی اموی سلطنت کی صد سالہ سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ کی تفصیل،

ضخامت ۳۶۳ صفحے،

(زیر طبع)

تاریخ اسلام حصۂ سوم

(بنی عباس اوّل)

یعنی ابو العباس سفاح ۱۳۲ھ / ۷۵۰ء سے ابو اسحاق متقی اللہ ۳۳۳ھ / ۹۴۴ء تک دو صدیوں کی سیاسی تاریخ،

(زیر طبع)

تاریخ اسلام جلد چہارم

(بنی عباس دوم)

یعنی مستکفی باللہ کے عہد سے آخری خلیفہ مستعصم باللہ تک خلافت عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی سیاسی تاریخ،

ضخامت :- ۴۳۲ صفحے

قیمت :- عہ

"منیجر"

جلد ۶۳ ماہ ربیع الاول ۱۳۶۸ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۴۹ء عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قومون کی تعمیر و تشکیل مین تعلیم کو سب سے زیادہ دخل ہو، اسی سانچہ مین ملک کے نوجوانون کے دل و دماغ ڈھلتے ہین، اور اسی گہوارہ مین اُن کے خیالات و نظریات نشو و نما پاتے اور بنتے اور بگڑتے ہین، وہان سے جو افکار و تصورات لے کر نکلتے ہین، اُن کا نقش کبھی نہین مٹتا، اور انہی کے مطابق اُن کی قومی سیرت و کردار کی تشکیل ہوتی ہے، اس لئے قومون کی زندگی مین تعلیم اور بالخصوص ابتدائی تعلیم کا مسئلہ نہایت اہم ہو،

انگریزون کے زمانہ مین ہندوستان کا نظام تعلیم قومی روح سے بالکل خالی اور اس کا مقصد صرف حکومت کی مشینری چلانے کے لئے کلرک پیدا کرنا تھا، اور تعلیم کسی بلند مقصد کے بجائے صرف حصول ملازمت کا ذریعہ تھی لیکن ہندوستان کی آزادی کے بعد جو نیا نظام تعلیم جاری ہونے والا ہو، وہ اس کی قومی ضروریات کے مطابق ہوگا، لیکن یہان بہت سے فرقے بستے ہین جن کی بہت سی تعلیمی ضروریات مین اشتراک کے باوجود اُن کی بعض جماعتی ضرورتین الگ بھی ہین جن کے بغیر اُن کی خصوصیات اور جماعتی حیثیت قائم نہین رہ سکتی،

مسلمان وطنی حیثیت سے خالص ہندوستانی ہین، اور ہندوستان پر اُن کے وہی حقوق و فرائض ہین جو دوسرے فرقون کے ہین، لیکن مذہبی و ملی حیثیت سے وہ اپنا الگ وجود رکھتے ہین، اُن کے مخصوص مذہبی عقائد و روایات اور مستقل نظریۂ حیات ہو جس پر انکی ہستی کا مدار ہے اس لئے انکی تعلیم مین انکا لحاظ ضروری ہو، جو تعلیم اس روح سے خالی ہوگی وہ اُنکی ملی خصوصیات کو قائم نہین رکھ سکتی، خصوصاً ابتدائی جبری تعلیم کے نفاذ کے بعد یہ مسئلہ اور زیادہ اہم ہو گیا

انگریزون کے زمانہ مین بھی جن کو ہندوستان کے کسی فرقہ و مذہب سے کوئی علاقہ نہ تھا، اور وہ مسلمانون کی اقلیت کی بنا پر تعلیمی امور مین اُن کے حقوق کا کچھ نہ کچھ لحاظ بھی رکھتے تھے، پرائمری اسکول مسلمان بچون کی تعلیمی ضروریات سے بالکل خالی تھے، اور ان مین جس طرح کی تعلیم ہوتی تھی، اور اس کے جو اثرات و نتائج تھے اس سے باخبر اشخاص ناواقف نہین، اور اب جب کہ نیا تعلیمی نظام متحدہ قومیت کے نقطۂ نظر سے جاری ہو رہا ہے، اس مین مسلمانون کی مخصوص ضروریات کا کیا سوال ہو سکتا ہے، یہ نیا نظام اگرچہ متحدہ اور مشترک نظام کے نام سے موسوم ہوگا لیکن اس مین جو روح کارفرما ہوگی، وہ اصحابِ نظر سے مخفی نہین ہے، اس مشترکہ ابتدائی تعلیم کسی طرح بھی مسلمان بچون کے لئے موزون نہین ہے، اس سے وہ نہ صرف اپنے مذہب اور کلچر سے بیگانہ رہین گے بلکہ اُن سے اُن کا تعلق قائم رہنا دشوار ہو جائے گا،

حکومت نے اپنے نظام مین کسی فرقہ کی مذہبی تعلیم کے لئے کوئی گنجائش نہین رکھی ہے، اور حکومت کے نظام کے ماتحت مسلمانون کی صحیح مذہبی تعلیم ہو بھی نہین سکتی، اسلئے اب مسلمانون کے لئے دو ہی صورتین ہین یا وہ ابتدائی مشترکہ تعلیم پر قناعت کر کے اپنی ملی خصوصیات ختم کرنے کے لئے تیار ہو جائین، یا ابتدائی تعلیم کے مکاتب علحدہ قائم کرین جن کا نصاب اُن کی مذہبی و ملی ضروریات کے مطابق ہو، اور اُن کے لئے وہ اپنے حق کے مطابق لوکل بورڈون سے مدد حاصل کرین، ان مین اپنے مذہب و روایات سے واقفیت کے بعد پھر مشترک ثانوی اور اعلیٰ تعلیم زیادہ نقصان نہین پہنچا سکتی لیکن اگر شروع ہی سے مسلمان بچون کو پرائمری اسکولون کے حوالہ کر دیا گیا، تو خدا ہی جانے ایک دو پشتون کے بعد مسلمانون کا حشر کیا ہوگا، جن لوگون کو دیہات کے پرائمری اسکولون کی تعلیم کا تجربہ ہے، وہ آنے والے خطرہ کا آسانی سے اندازہ کر سکتے ہین، اگر مسلمانون نے اس سے غفلت برتی، تو بحیثیت مسلمان کے اُن کا وجود قائم نہین رہ سکتا، اور اُن کی آنے والی نسلین ہندوستان کی دوسری قومون مین ضم ہو جائین گی،

لیکن یہ ظاہر ہے کہ سرکاری پرائمری تعلیم کے موازی اسلامی مکاتب کا پورا نظام قائم کرنا نہایت دشوار ہے، شہروں، قصبات اور بڑے بڑے مواضعات میں جہاں مسلمانوں کی قابلِ لحاظ آبادی ہے تو زیادہ مشکل نہیں ہے گو اس کے لئے بھی ایک مدت درکار ہے لیکن چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں جہاں مسلمانوں کی آبادی بہت کم ہو بالکل ناممکن ہے اس لئے مسلمان بچوں کی تعلیمی ضمانت کم سے کم یہ ہوسکتی ہے کہ ہر اسکول میں اردو کی تعلیم کا بھی انتظام ہو اُن کو خالص ہندی اور سنسکرت کی تعلیم پر مجبور کرنا نسل کُشی سے کم نہیں ہے، جو انگریزوں کے زمانہ میں بھی نہ ہوا تھا،

اس بارہ میں مسلمانوں کو حکومت پر زور ڈال کر اس سے اس مطالبہ کو منوانا چاہئے لیکن اس کے لئے محض زبانی وعدہ یا تحریری احکام کافی نہیں ہیں جب تک حکومت اسکی جانب پوری توجہ اور مسلمانوں کی شکایتوں کی پوری تحقیقات نہ کرے گی، اس کے احکام پر عمل نہیں ہوسکتا، چھوٹے چھوٹے دور افتادہ دیہاتوں کا کیا ذکر بڑے بڑے قصبات میں یہ حال ہے کہ مسلمان لڑکے اردو پڑھنا چاہتے ہیں لیکن صاف جواب ملتا ہے کہ اس کا انتظام نہیں ہوسکتا اور پھر اس کی کہیں شنوائی نہیں مسلمان کس سے فریاد کریں،

وہی قاتل وہی شاہد وہی منصف بھی ہے
اقربا میرے کریں خون کا دعویٰ کس پر

لیکن اس کا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ مسلمانوں کو وطنی قومیت اور مشترکہ ملکی اور قومی مقاصد سے الگ رکھا جائے بلکہ صرف ان کی مذہبی و ملی خصوصیات کا تحفظ مقصود ہے اور مذہب و وطنیت میں ربط قائم رکھنے کے لئے اسلامی مکاتب کا نصاب ایسا بنایا جائے جس میں مذہب کے ساتھ وطن کی محبت کی بھی پوری روح موجود ہو ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے، تضاد تو اُن کے غلط استعمال نے پیدا کر دیا ہے، صحیح مذہبی تعلیم تو وطن و اہلِ وطن کی محبت، اُن کی حقوق شناسی اور اُن سے اتحاد و یگانگت سکھاتی ہے،

جمیعۃ العلماء نے اپنا دائرۂ عمل مسلمانوں کی مذہبی و تمدنی ضروریات میں محدود کر دیا ہے اس وقت مسلمان بچوں کی ابتدائی تعلیم کا مسئلہ نہایت اہم ہے اگر وہ اس مہم کو اپنے ہاتھ میں لیکر انجام تک پہنچا دے تو یہ اس کا بڑا کارنامہ ہوگا،

مقالات

الروم

از

جناب مولانا ابوالجلال صاحب ندوی

ہمارے پرانے رفیق مولانا ابوالجلال صاحب ندوی کی نگاہ قدیم سامی اقوام اور ان کے مذاہب پر بہت گہری اور وسیع ہے، اور وہ کلام مجید کی مذکورہ اقوام اشخاص اور مقامات وغیرہ اسماء و اعلام قرآنی کی تاریخ وتحقیق پر اعلام القرآن کے نام سے ایک کتاب لکھ رہے ہیں، یہ موضوع اصحاب نظر علماء کے ذوق کا ہے، اس لئے وقتاً فوقتاً اس کے مختلف ٹکڑے ہدیۂ ناظرین کئے جائیں گے، اس مضمون میں اس کی پہلی قسط پیش کی جاتی ہے، "م"

قرآن کریم کی تیسویں سورۃ کا نام الروم ہے، روما اٹلی کے قدیم پایۂ تخت کا نام تھا، جو بعد میں اس پورے علاقہ کا نام ہوگیا جس پر یہاں کے قیصر حکومت کرتے تھے، ایک زمانہ میں یہ سلطنت دو حصوں میں منقسم ہوگئی، ایک کا پایۂ تخت روما ہی تھا، اور ایک کا شاہ نشین شہر قسطنطنیہ تھا، اس دوسری حکومت کو بازنطینی حکومت کہتے تھے، عربوں کا واسطہ اسی دوسرے حصہ سے تھا، بازنطینی علاقہ کو بھی عرب روم ہی کہتے تھے، مغربی سلطنت روما کو رومیہ کہتے تھے، قرآن کریم کی اس سورہ میں روم سے مراد بازنطینی فوج ہے جس کو ۶۱۴ء میں ایرانیوں نے زبردست شکست دی تھی، امام زہری فرماتے ہیں کہ مجھے یہ اطلاع ملی ہے، کہ جب ایرانیوں کے مقابل رومیوں کو شکست ہوئی، تو مشرکوں نے مومنوں سے کہا،

"تم لوگ خیال کرتے ہو کہ اس کتاب کی بدولت جو تمہارے نبی پر اُتری ہے، تم ہم پر غالب ہو جاؤ گے، روم کے لوگ بھی تمہاری طرح صاحب کتاب ہیں اہلِ فارس نے اُن پر فتح پالی، اسی طرح ہم بھی تم پر فتح پائیں گے، تب خدا نے وحی نازل فرمائی، (درمنثور بحوالہ بیہقی وغیرہ)

الم ۰	الف لام میم ۰
غُلِبَت الروم فی ادنی الارض وھم بعد غلبھم سیغلبون فی بضع سنین،	روم والے پاس والی زمین میں مغلوب ہو تو گئے، مگر وہ اپنی مغلوبی کے بعد غالب ہو جائیں گے چند ہی برسوں کے اندر
للّٰہ الامر من قبل و من بعد و یومئذٍ یفرح المومنون بنصر اللّٰہ ینصر من یشاء وھو العزیز الرحیم	خدا ہی کا حکم ہے، آگے بھی اور پیچھے بھی اور اس دن اہلِ ایمان خدا کی نصرت پر شادمان ہوں گے، اللہ جس کی چاہتا ہے مدد کرتا ہے، وہ قابو رکھتا ہے رحیم ہے،
وعد اللّٰہ۔	(یاد رہے کہ یہ) اللہ کا وعدہ (ہے)
لا یخلف اللّٰہ وعدہ، ولکن اکثر الناس لا یعلمون یعلمون ظاھراً من الحیوۃ الدنیا وھم عن الاخرۃ ھم غافلون	اللہ اپنے وعدہ کو ٹلنے نہیں دیتا لیکن بہتیرے لوگوں کو علم نہیں ہے، موجودہ زندگی کے ظاہر کو تو جانتے ہیں، مگر یہی (ظاہر حیات کے عمار) آیندہ سے (بالکل) ناواقف ہیں

ان آیتوں میں اہلِ روم کی جس فتح اور جیت کی پیشین گوئی کی گئی ہے، خدا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے بہت صدیوں قبل حضرت دانیال کو اس کا وقت بتا دیا تھا،

سنہ ۶۱۴ء میں جب ایرانیوں کو رومیوں پر فتح حاصل ہوئی تو وہ پیشین گوئی بظاہر غلط سی نظر آنے لگی،

اس لئے خدا نے یہ آیتیں اُتار کر بتایا کہ اللہ کا وعدہ کبھی ٹلنے والا نہیں ہے، وہ پیشینگوئی ضرور پوری ہوگی،

اس پیشینگوئی کے پورے ہونے کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ نبوت کی تصدیق کے لئے بہتون کو انتظار تھا، روم کی شکست سے مسلمانون کو رنج اور مشرکون کو خوشی تھی، مفسرین کے نزدیک اس رنج و خوشی کا سبب یہ تھا کہ اہلِ روم چونکہ اہلِ کتاب تھے، اس لئے مسلمان اُن کے ہمدرد تھے، اور مشرکین اپنے جیسے باطل پرست مشرکون کے ہم نوا تھے، ممکن ہو کہ رنج و خوشی کے متعدد اسباب ہین، اس واقعہ کو بھی دخل ہو لیکن ان آیات کو دانیالی بشارت کی روشنی مین پڑھنے پر اس سورہ کا روئے سخن قریش سے زیادہ اہلِ کتاب کی طرف نظر آتا ہے، جن کو حضرت رسولِ خدا صلعم کی تصدیق کے لئے ایرانیون پر رومیون کی فتح کا انتظار تھا، یہی انتظار غلط ثابت ہو رہا تھا، اور اس پر مشرکین خوشیان منارہے تھے، اور اہلِ کتاب جیسا کہ سورۂ بقرہ مین ہے،

كانوا يستفتحون على الذين كفروا کافرون پر فتح کی دعا مانگ رہے تھے،

لیکن اُن کی دعائین بظاہر ناکام ثابت ہو رہی تھین، اس لئے خدا نے یہ آیتین نازل فرمائین اور ان کو تسکین دی کہ خدا اپنے وعدہ کو ٹلنے نہین دے گا،

الف لام میم | یہ آیتین تین حروف کے اسماء سے شروع ہوتی ہین، اکثر مفسرین ایسی آیتون پر اتنا کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہین، کہ اس کا مطلب خدا ہی جانتا ہے، حضرت ابن عباسؓ سے الف لام میم کی تفسیر مین کئی اقوال مروی ہین، جن مین سے ایک یہ ہے کہ

"مین ہون، اللہ سب سے بڑا عالم"

اس مطلب کو اس جگہ خاص مناسبت حاصل ہے، اس لئے اس کی تشریح کر دینا مناسب ہے کہ یہ مطلب ان حروف سے نکالا کیسے،

عرب مین اسمائے حروف کے ذریعہ ایک دوسرے کے ساتھ رازدارانہ کلام کرنے کا رواج تھا،

یہ ملاحظت کے مختلف طریقوں میں سے ایک طریقہ تھا، حروف کے اسمائہ صرف حروف تہجی کی آوازوں کے نام ہین بلکہ اشکال کے نام بھی ہین،

الف کی مصری اشکال مین سے ایک ( ) ایسی ہے، اس کی آواز آ اور ی کے بین بین تھی، چنانچہ اس کی تکرار کسرہ طویلہ کا کام دیتی ہے، فاعل مفعول اور مضاف الیہ تینون حالتون مین یہ شکل ضمیر واحد متکلم کا کام دیتی ہے، عربی کے صیغۂ اَفعَلُ مین ہمزہ مفتوحہ اور اُفعِلُ مین ہمزہ مضمومہ ضمیر متکلم کا کام دیتا ہے، غالبًا الف کو انا کا قائم مقام حضرت ابن عباسؓ نے اسی لئے قرار دیا، بعض لوگ الف کو "انا" کے حرف اول کا نام قرار دے کر حضرت ابن عباسؓ کے قول کی توجیہ کرتے ہین، نتیجہ جب ایک نکلتا ہے تو استدلال کے تنوع پر بحث کی ضرورت نہین ہے،

لام کی تحریری شکل اب "ل" ہے، پہلے ( ) تھی، یورپ مین جا کر یہی شکل L بنی جس کا تلفظ ال ہے، حمیری شکل لام کی ہے، دراصل یہ شکل کی بدلی ہوئی صورت ہے، قدیم حمیری تحریرون مین لام کی یہی شکل تھی مصری تحریرون مین دیوتاؤن اور ان اشخاص کے اسماء کے سامنے جو دیوتا قرار دیئے جاتے تھے، جیسا نقش ملتا ہے، خدا کے معبد کا لفظ جسے اہلِ مصر حیت نتر کہتے تھے، ایک کعبہ (چوکور نقش) کے اندر لام کی شکل مین لکھا جاتا تھا،

دیوتا کی مصری نتر ہے، لفظ نتر کے بعد بھی حمیری لام مصری تحریرون مین ملتا ہے، اس حرف کا حمیری نام ہم کو نہین معلوم، لیکن فینیقیون کے توسط سے اس نقش کی بدلی شکل یورپ گئی، اور اپنے ساتھ اپنا فینیقی نام ال لے گئی، اور ال کا مفہوم عربی وغیرہ سامی زبانون مین وہی ہے، جو مصری نتر کا ہے، حضرت ابن عباسؓ کا لام کو اللہ کا قائم مقام بتانا اس کی قدیم مکتوبی شکل کے مدلول کے مطابق ہے، لیکن عام مفسرین اُن کے قول کی توجیہ اسے اسم الٰہی اللہ کے حرف دوم بتا کر فرماتے ہین،

میم کی مکتوبی شکل اب تو کوئی خاص مطلب ادا نہین کرتی ہے، لیکن لسان مین ذوالرمہ کا ایک

شعر مذکور ہے کہ

کانھا عینھا منھا وقد ضمرت وضمھا فی بعض الاصا میمٌ

وہ اونٹنی لاغر اندام ہے، جب کہ وہ آنکھ چھپکاتی ہے، تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جھاڑی کے اندر

ایک میم لکھی ہوئی ہے،

ذوالرمہ حرف شناس نہین تھا، اس سے کسی نے پوچھا کہ تم نے میم کو کیسے جانا، اُس نے کہا مین بادیہ

مین سفر کر رہا تھا، ایک شخص کو ایک حرف لکھتے دیکھا، پوچھا یہ کیا ہے، تو کہنے لگا یہ ہے میم، اس لئے مین نے اونٹنی

کی آنکھ کو اس سے تشبیہ دی، اس روایت سے ظاہر ہے کہ میم کی شکل پہلے آنکھ کے مشابہ تھی، آنکھ کا عربی

نام عین اور اس کے مشتقات جن معانی کو ادا کرتے ہین، آنکھ کی شکل بھی تصویری تحریر کے ایام مین ان معانی کو

ادا کرتی تھی، دیکھنے اور جاننے کی ایک مصری [illegible] اور [illegible] تھی جسے را، ما دی اور ما پڑھا جاتا ہے، اس لئے

حضرت ابن عباسؓ کا میم کو اعلم کا مرادف بتانا بھی اس کی قدیم کتابی شکل کے مفہوم پر مبنی معلوم ہوتا ہے، اور

یہ حرف اعلم کا مقطع بھی ہے،

بہر حال الف لام میم کا مطلب یہ ہے، کہ مین اللہ ہون، مین سب سے بڑا عالم ہون، آیندہ کی بابت جو

خبر دے رہا ہون وہ علم پر مبنی ہے، تم نہین دیکھتے جو مین دیکھتا ہون، تم صرف حیات دنیا کے ظاہر کو دیکھتے ہو،

مستقبل کو نہین جانتے، مستقبل میرے سامنے اسی طرح حاضر ہے، جس طرح تمھارے سامنے حال موجود ہے،

یہ بات صاف لفظون مین کہنے کی بجائے رازدارانہ طریق بیان مین ارشاد فرمائی ہے، آدمی سے اس کے دکھ کے موقع

پر جب رازدار دوست کی طرح کوئی اس کو خفیہ توقع دلاتا ہے، خصوصاً ایسا شخص جو توقع پوری کرنے کی صلاحیت

رکھتا ہے، تو اس کے دل مین اس سے زیادہ خوشی اور اطمینان کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، جو واضح طریق بیان سے

پیدا ہوتی، جن اہل کتاب کو ۱۱۵ء مین پیشین گوئی کے بظاہر غلط ہونے سے تشویش پیدا ہوگئی تھی، اور جن

کا ایمان دانیالی بشارت سے متزلزل ہو رہا تھا، اُن کو خدا نے الم بول کر اطمینان دلایا، کہ خدا کا وعدہ

پورا ہوگا، اور اس کے پورے ہونے کا وقت آگیا ہے،

دانیالی بشارتیں سفر دانیال کے دوسرے باب میں بخت نصر کے ایک خواب کا ذکر ہے جس کی تعبیر خدا سے الہام پاکر حضرت دانیالؑ نے بتائی تھی، کہ خواب میں چار حکومتوں کا حال دکھایا گیا، پہلی سلطنت سے مراد خود بخت نصر اور اس کے جانشینوں کی حکومت تھی بخت نصر کو حضرت دانیالؑ نے بتایا کہ تیرے بعد دو سلطنتیں اور ہونگی، پھر ایک چوتھی حکومت برپا ہوگی،

"اور چوتھی سلطنت لوہے کی مانند مضبوط ہوگی، (دان ۲: ۴۱) پھر اس سلطنت میں تفرقہ ہوگا" (دان ۲: ۴۱) وہ سلطنت کچھ قوی اور ضعیف ہوگی، (دان ۲: ۴۲)

آسمانی راج اسی تفرقہ کے زمانہ میں ہیں،

یقیم الٰہ شمیم ملکو دی لعلمین	آسمانوں کا خدا ایک حکومت کھڑی کرے گا
لا تتحبل وملکوتہ لعما احرون	جو ابد تک ہلاک نہ ہوگی؛ اور اس کا راج
لا تستبتق (دان ۲-۴۴)	غیروں کے قبضہ میں نہیں جائے گا،

یہ ہے اس آسمانی بادشاہی کی پیش گوئی جس کا وعدہ دہرانے کے لئے حضرت مسیحؑ مبعوث ہوئے تھے؛

حضرت دانیالؑ کو یہ بتایا گیا تھا کہ پہلی سلطنت سے مراد کون ہے، اُن کو دوسری سلطنت کا نام نہیں معلوم تھا، لیکن انھوں نے دوسری سلطنت کو بچشم خود دیکھ لیا، خود ان کی زندگی میں دارا ماذی نے بابل کو فتح کر لیا، (دان ۵: ۳۰) حضرت دانیالؑ نے سفر دانیال کے مطابق خورس (بہمن بن اسفندیار) کا تیسرا برس (۵۳۶ قم) بھی پایا، تیسری سلطنت کا نام بھی اُن کو بتا دیا گیا تھا، فرشتے نے اُن سے ارشاد فرمایا تھا، کہ ایک وقت آئیگا جب ایران کا ایک بادشاہ

"سب کو ابھارے گا، کہ یونان کی سرزمین کے مخالف ہوں، لیکن وہاں ایک زبردست بادشاہ برپا ہوگا، جو بڑے تسلط سے حکومت کرے گا، اور جو چاہے گا کریگا، (دان ۱۱: ۳)

غالباً حضرت دانیالؑ کو چوتھی سلطنت کا نام بھی بتا دیا گیا تھا، لیکن شاید چوتھی سلطنت کے خوف سے یا اس لئے روما کا نام حذف کر دیا گیا، کہ رومی مسیحیت جو دین مسیحؑ اور قدیم رومن شرک کا آمیزہ ہے اسی چوتھی سلطنت کے اُس دور کی پیداوار ہے جب پیش گوئی کے مطابق اس کے دو حصے ہو گئے، اور ان قیصروں کے زور سے پھیلی جن کا سفر دانیالؑ میں مکروہ انداز میں ذکر آیا ہے،

طیطوس | حضرت دانیالؑ نے خود بھی ان چاروں سلطنتوں یعنی بابل، ایران، یونان اور روما کی حکومتوں کو چار جانوروں کی شکل میں دیکھا، اور خواب ہی میں ان کو بتایا گیا کہ چوتھی سلطنت کا ایک بادشاہ ایسا ہوگا،

"جو حق تعالیٰ کی مخالفت میں باتیں کرے گا اور حق تعالیٰ کے مقدسوں کو دکھ دے گا، اور
چاہے گا کہ وقتوں اور شریعتوں کو بدل ڈالے، اور وہ اس کے قبضہ میں دیئے جائیں گے یہاں تک
کہ ایک مدت اور مدتیں اور نصف مدت گذر جائے"، (دان ۷: ۲۵)

اس پیش گوئی میں جس قیصر کا ذکر ہے، وہ ہے طیطوس جس نے ۷۰ء میں یروشلم کو فتح کیا، اس پیش گوئی کے مطابق اس سال کے بعد ایک اور کئی اور نصف مدت گذرنے پر ایک اہم واقعہ ظہور پذیر ہونے والا تھا، اس واقعہ کے ذکر سے پہلے اس مدت کی مقدار کو سمجھ لینا چاہئے،

بعد طیطوس | مدت کے لئے اصل کلدانی لفظ اس جگہ "عدن" ہے۔ آگے چل کر دانیال ۱۲: ۷ میں بھی اس مدت کا ذکر ہے، مگر لفظاً مدت اس جگہ "موعد" ہے، اس مقدار کا تذکرہ مکاشفہ ۱۲: ۱۴ میں بھی ہے، وہاں "زمن" کا لفظ ہے، یہ زمن تو کسی ایسے یونانی لفظ کا ترجمہ ہے جو غالباً عدن یا موعد کا ترجمہ رہا ہوگا، مکاشفہ کی اصلی زبان عبری نہیں بلکہ یونانی ہے، مگر صاحبِ مکاشفہ عبرانی تھے، خیالات اُن کے دماغ میں زبان عبرانی ہی نے اُن کے خیال پر دانیالی بشارت بھی اثر انداز تھی، عدن یا موعد ہی کے لئے انھوں نے کسی یونانی لفظ کو استعمال کیا، جس کا ترجمہ زمن کے لفظ سے کیا گیا ہے، اس لئے زمن کی شرح ضروری نہیں، البتہ عدن یا موعد کی تشریح ضروری ہے، ایک اور کئی اور نصف کے الفاظ بتاتے ہیں کہ عدن اور موعد برسوں کی مقررہ تعداد

کے نام ہین، لیکن چونکہ اس تعداد کا علم موجودہ یہودیت اور نصرانیت کو بے وقت کی شہنائی ثابت کرتا ہے
اس لئے ان الفاظ کے معانی سے ہم کو نا واقف رکھا گیا ہے،

دور | موعد اور عدن سے ملتا جلتا ایک لفظ دور بھی ہے جس کا ترجمہ عموماً پشت کیا گیا ہے لیکن دراصل
یہ نام ہے اس قدر زمانہ کا جو عموماً ایک دادا کی پیدائش سے اس کے پوتے کی موت تک گذر جاتا ہے،
حضرت ابراہیم علیہ السلام کو توراۃ کے بیان کے مطابق خدا نے بنی اسرائیل کے مصر مین جانے کی پہلے
سے خبر دیدی تھی، کہ وہان وہ چار سو برس مقیم رہین گے،

ودور ربیعی یشوبو ھنہ (سلوسن ۱۵: ۱۶) اور چوتھے دور مین یہان واپس آجائین گے،

اس جگہ دور کا ترجمہ پشت کیا گیا ہے، حالانکہ ظاہر ہے کہ چار سو برس مین صرف چار پشتون کا گذرنا
قرین قیاس نہین ہے، ارض موعود مین آکر جو لوگ بسے ان مین سب سے معمر تھے حضرت یوشع بن نون
بن الیشمع بن عمی ہود بن لعدان بن تحن بن افرائیم بن یوسف۔ حضرت یوسف ایک بنیامین کو چھوڑ کر اپنے سب
بھائیون سے چھوٹے، بلکہ اپنے بعض بھتیجون سے بھی کم عمر تھے تحن کو اگرچہ افرائیم کا بیٹا بتایا گیا ہے، لیکن ان
کی اور ان کے بھائی بریعہ کی پیدائش شوتلح بن زبد بن تحت بن الیعد بن تحت بن برد بن شوتلح بن افرائیم
کی وفات کے بعد بتائی گئی ہے، (تواریخ ۱: ۷ تا ۲۷) اس سے ظاہر ہے کہ آیت بالا مین دور کا ترجمہ
پشت غلط ہے، چار دور سے مراد یقینی طور پر اتنی مدت ہے جس مین چار صدیان سما جائین،

تورانی حساب سے عمر بلوغ ۲۰ برس ہے چنانچہ عہد موسی مین جب بالغون کی مردم شماری ہوئی، تو ۲۰ برس
سے کم عمرون کو نہین گنا گیا، (عدد ۱: ۳) اور عمر طبعی زیادہ سے زیادہ ۸۰ برس ہے (زبور ۹۰: ۱۰) اس لئے
تین پشتون کا زمانہ ۱۲۰ برس ہوتا ہے، بابلی طریقہ سال شماری کا یہ تھا کہ ۱۱۹ برس تک ہر سال ۳۰×۱۲+۵
دن کا ہوتا تھا، ایک سو بیسویں برس مین ¼ × ۱۲۰ یوم مزید شامل کرکے حساب سنبھال لیتے تھے، اس کے
بعد نیا دور شروع ہوتا تھا،

بنو اسرائیل مصر مین ۴۳۰ برس رہے، (خروج ۱۲: ۴۰)

خروج کے بعد حضرت موسیٰؑ ۴۰ برس زندہ رہے، (خروج ۷: ۷ مثنیہ ۳۱: ۲)

حضرت یوشعؑ نے ۵ برس بعد ارض موعود کو فتح کیا، (یوشع ۱۴: ۱۰)

مفتوحہ علاقہ کی آبادی مین ۵ برس صرف ہوئے،

جملہ ۴۸۰ برس ہوئے، اس مدت کو ۴ سے تقسیم کرو تو تکوین ۱۵: ۱۶ مین مذکور دور کی مقدار ۱۲۰ برس معلوم ہو جائے گی،

موعد وعدن | یہود الفاظ کے عددی مفہوم سے بھی استدلال کے عادی تھے، قاعدہ جمل کے مطابق دانیال ۱۲: ۷ مین جو لفظ ہے، اس کا مطلب ہے،

م = ۴۰
و = ۶
ع = ۷۰
د ۴

۱۲۰ برس

اس قاعدہ کے مطابق عدن کا مطلب ہے ۱۲۴ برس، ایک اور کئی اور نصف عدن کے معنی ہوئے

(۱۲۴ + ۱۲۴ × ۳ + ۶۲) ۵۵۸ برس،

آسمانی راج | پیش گوئی کے مطابق سنہ کے بعد ۵۵۸ برس گذرنے پر یعنی سنہ ۱۹۲۶ء مین، یا اس کے عین بعد اس آسمانی حکومت کو قائم ہو جانا چاہئے تھا جس کی بابت فرشتہ نے حضرت دانیالؑ کو بتایا کہ اس شریر بادشاہ کے زمانہ سے ۳½ عدن گذرنے پر سلطنت اور مملکت اور سلطنت کی شوکت حق تعالیٰ کے مقدس لوگون کو بخشی جائے گی (دانیال ۷: ۲۷) اس موقع پر آ تنا کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سنہ ۱۲۲۶ء رمضان سنہ

مین شروع ہوکر شعبان ۸ھ پر ختم ہوگیا آسمانی بادشاہی کے قیام کی یہی تاریخ پہلے سے مقرر تھی اسی سال صلح حدیبیہ ہوئی، جسے قرآن کریم مین خدا نے فتح مبین کا نام دیا ہے، اور اسی سال ہرقل نے بھی جشن فتح منایا،

ذکر مسیح | حضرت دانیالؑ کو فرشتے نے یہ تو بتا دیا کہ چوتھی حکومت کے زمانہ کی تخریب یروشلم سے کتنے برس گذرنے کے بعد حق تعالی کے مقدسون کو ابدی حکومت ملے گی مگر وقت تخریب معلوم نہ تھا اس لئے انھون نے خدا سے مزید تشریح کی دعا کی، اور یہ درخواست کی کہ یرمیاہ نبی نے یروشلم کی ویرانی کے لئے جن ستر برسون کی پیشینگوئی کی ہے، اُن کے گذرنے کے بعد بنی اسرائیل پر رحم فرما تو ایک فرشتہ نے اُن کو خدا کا پیغام سنایا'

شبوعھم شبعیم نحتک عل عمك	ستر ہفتے مقرر کئے گئے تمھاری قوم اور
وعل عیر قدشك،	تمھارے مقدس شہر کے لئے،

عبرانی زبان مین، برسون کی مدت کو بھی شبوع کہتے ہین، ستر ہفتون سے مراد ۴۹۰ برس ہین یہ مدت مقرر کی گئی،

لکلئ هفشع	بد اخلاقی مٹنے کے لئے
ولحتم حطاوت	اور خطائین ختم کرنے کے لئے،
ولکپر عون	اور گناہ کا کفارہ دینے کے لئے،
ولهبی صدق علمیم	اور ابدی صداقت لانے کے لئے،
ولحتم حزون ونبی	اور ختم الہام وانبیا کے لئے،
ولمشح قدوش قدوشیم	اور سب سے بڑے قدوس کے مبعوث کرنے کے لئے،
(دانیال ۹: ۲۴)	

نصرانیون کے ادعا کے مطابق یہ قدوش قدوشیم حضرت مسیحؑ ہین، لیکن وہ تو خود پیش گوئی کے مطابق ان ستر ہفتون کے پورے ہونے سے پہلے گذر گئے، قدوش قدوشیم کو ان ستر ہفتون کے بعد آنا چاہئے تھا اُن

ستر ہفتون کا حساب عہد دانیال سے نہین شروع ہوتا بلکہ فرشتہ نے بتایا تھا،

وَتَدَعْ وَتَشْكِلْ	اور جان لے اور سمجھ لے،
مِنْ مَصَادَبَرْ لَحَشِيبْ	یکجائی اور تعمیر یروشلم کا
ولبنوت یروشلوعَلْ	حکم نکلنے سے شہزادہ مسیح
مشیح نجید شبوعیم شبعہ	تک سات ہفتے اور ۶۲
وشبوعیم ششیم وشنیم	ہفتے ہون گے،

تشوب (دانیال ۹ : ۲۵)

سفر نحمیاہ کے مطابق اردشیر اول کے ۲۰ سنہ جلوس یعنی ۴۴۵ ق م مین یہ اجازت ملی (نحمیا ۲ : ۱) ۳۹۶ سنہ مین پیشگوئی کے مطابق یروشلم اور اس کے بازار کی تعمیر ہو گئی، اس مدت کے بعد ۶۲ ہفتے یعنی ۴۳۴ برس گذرنے سے پہلے حضرت مسیحؑ دنیا سے اٹھ گئے، ۳۹۶ کو اس مدت سے گھٹا دو تو ۳۳ سنہ ع نکلتا ہے، نصرانی کہتے ہین، کہ ۳۳ سنہ مین حضرت مسیح کو صلیب دیدی گئی، کیونکہ پہلے سے طے تھا،

احری ہشبوعیم ششیم وشنیم	۶۲ ہفتون کے بعد مسیح کو کاٹ دیا جائے گا،
یکادِت مشیح واین لو (دانیال ۹ : ۲۶)	مگر اس کے لئے نہین،

اس عبارت مین تھوڑی سی تحریف ہے، اور اس تحریف نے " مگر اس کے لئے نہین " کو بیکار کر دیا،

اصل مین لفظ تھا،

יִכָּרֵת — یکرت (معاہدہ لے گا)

لیکن نصرانیون نے اُسے

יִכָּרֵת — یکّارت (کاٹ دیا جائے گا)

بنا دیا تاکہ اپنے غلط عقیدہ صلیب کے لئے پرانی پیش گوئی گھڑ لین، مطلب فرشتہ کا یہ تھا کہ ۳۳ سنہ تک مسیح

شاہزادہ مسیح معاہدہ دینگا مگر اپنے لئے نہین، بلکہ آسمانی بادشاہی قبول کرنے کے لئے جسے اُس کے بعد مبعوث ہونیوالا قدوس قدوشیم قائم کرے گا، اس معاہدہ کے تذکرہ کے بعد فرشتہ نے بتایا کہ

وهعير وهقدش يشميت عم	اور شہر اور مقدس غارت ہوگا، ساتھ اس
نجيد هبّاء (دانیال ۹:۲۶)	شہزادہ کے جو آئے گا،

اس عبارت مین نجید سے مراد وہی نجید ہے، جس کا سابق آیت مین تذکرہ ہے، نصرانی مترجمون نے اس عبارت کا ترجمہ کیا ہے،

"اور جو بادشاہ آوے گا اس کے لوگ شہر اور مقدس کو غارت کرین گے"

لیکن یہ ترجمہ دیانت پر مبنی نہین ہے، صحیح مطلب یہ ہے کہ مسیح شاہزادہ کی آمد کے زمانہ مین شہر یروشلم اور ہیکل بیت المقدس پھر غارت ہوگا،

وقصو بالشطف وعد قص ملحمة	اور اس (شاہزادہ) کا خاتمہ جلد ہوگا، اور
نحرصت شمموت،	لڑائی کے خاتمہ تک تباہیاں مقرر ہین،
وهجبّير بريت لربّيم شبوع	اور رستی میثاق کا زمانہ بہتون کے لئے ایک
احد وحصي هشبوع يشبّيت	ہفتہ ہوگا، اور اسی ہفتہ کے بیچ مین قربانی
زبح ومنحه وعل كنف شقوصيم	اور ہدیہ موقوف ہوگا، اور فصیل پر تباہ کن
مشمم وعل كلّه ونحرصه تتك	مکروہ (نصب) ہوگا، اور تباہی اور مقررہ بلا
عل شومم، (دانیال ۹:۲۷)	تباہ کارون پر واقع ہوگی،

اس عبارت کا ترجمہ بھی کچھ پیچیدہ کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ مترجمون نے دانستہ مطلب چھپانے کی کوشش کی ہے، حاصل اس پیش گوئی کا یہ ہے کہ

ا۔ ۴۲۵ قم کے بعد ۹ ۴ برس گذرنے پر ۳۹۶ ق م مین یروشلم دوبارہ تعمیر ہوگا،

(۲) ۱۳۵۰ء تک مسیح بادشاہ زادہ لوگون سے میثاق لے گا

(۳) ۱۴۳۰ء تک میثاق کی مدت مقرر ہے، اس مدت مین بنی اسرائیل نے خود کو درست کرلیا تو خیر ورنہ تباہ کارون کے لئے تباہی کے بغیر چارہ نہین،

خسرو و قیصر | اس خبر نے حضرت دانیال پر مستقبل کو روشن کر دیا لیکن ابھی کچھ اور وضاحت درکار تھی ۳ بسنہ خورس یعنی ۵۳۶ ق م مین اُن کو فرشتہ نے خبر دی کہ یونانی راج کے خاتمہ کے بعد

"شاہ جنوب زور پکڑے گا، (۱۱: ۵) برسون کے بعد شاہ جنوب کی بیٹی شاہ شمال کے پاس پاس آوے گی، تاکہ دونون مین اتحاد ہو، (۱۱: ۶) کچھ عرصہ بعد) شاہ جنوب اور شاہ شمال مین جنگ ہوگی، نتیجہ شاہ شمال کا استیلا ہوگا، (۱۱: ۶ تا ۳۰)

شاہ شمال سے مراد یقینی طور پر قیصر روم اور شاہ جنوب سے مراد خسرو ایران ہے، یہ خبر دے کر فرشتہ نے بتایا کہ شاہ شمال یعنی قیصر روم کے استیلاء کے زمانہ مین بیت المقدس دوبارہ غارت ہوگا اور اس مین تباہ کن مکروہ نصیب ہوگا، (دان ۱۱-: ۳۱) یہ پیش گوئی ۶۱۴ء مین پوری ہوی'

نصرانی تشریح | اس کے بعد ایک زبردست پیغمبر کی بعثت کا ذکر ہے، عیسائیون کی قدیم عادت ہے کہ ہر عمدہ خبر کو خواہ وہ پیش گوئی نہ بھی، ہو بزور ادعا حضرت مسیح کی پیش گوئی قرار دیتے ہین، اُن آیتون کے موعود کو حضرت مسیح سے تطبیق دینے کے لئے پیش نظر اردو بائبل کے محشی نے اس جگہ لکھا ہے،

"پوری ہوئی ۱۶۸ ق م کے قریب"

یہ تشریح نوین باب کے خلاف ہے، جس مین صراحۃً حضرت مسیح کے بعد اس پیش گوئی کے پورے ہونے کا زمانہ بتایا گیا ہے، علاوہ برین یہ تفسیر خود حضرت مسیح کی تکذیب ہے جنھون نے فرمایا،

"جب تم اس تباہ کن مکروہ کو جس کی خبر دانیال نے دی ہے، پاک جگہ مین دیکھنا تو جو یہودیہ میں ہون پہاڑون مین بھاگ جائین، (متی ۲۴: ۱۵)

اس سے ظاہر ہے کہ حضرت مسیحؑ کی اس دنیا مین موجودگی کے ایام تک یہ پیش گوئی پوری نہین ہوئی تھی

زمانۂ ختم المرسلین

فرشتہ نے حضرت دانیالؑ کو سنہ ۷۵ء کے واقعہ کی خبر دیکر دوبارہ شاہ شمال اور شاہ جنوب کی جنگ کا حال سُنا کر بتایا کہ سنہ ۷۵ء سے عرصہ بعد ایک شاہ شمال

اپنے آپ کو بلند کرے گا، اور اپنے تئین سارے معبودون سے بڑا جانے گا، اور الٰہون کے الٰہ کا مخالف ہوکر حیرت افزا باتین کرے گا، (۱۱ : ۳۶) اور آخر کے وقت مین شاہ جنوب اس پر ریلیگا، (۱۱ : ۴۰) اور اس وقت میکائیل وہ بڑا سردار جو تیری قوم کے لئے کھڑا ہے اُٹھے گا، (۱۲ : ۱)

اس آیت کو جس مین میکائیل کا ذکر ہے، پوری تشریح کے ساتھ ہم میکائیل کے ذکر مین نقل کرین گے، مختصراً اس جگہ اتنا کہنا کافی ہے، کہ ظہور میکائیل سے ایک عظیم الشان پیغمبر کی بعثت مراد ہے، جس کے زمانہ مین آسمانی راج قائم ہونے والا تھا،

حضرت دانیالؑ کو اس کی بڑی فکر تھی کہ اس آخری پیغمبر کا ٹھیک زمانہ معلوم ہو، عالم رویا مین انھون نے دو فرشتون کو باتین کرتے دیکھا، ایک نے کہا،

عدمتی قص بپّلئوت — کب تک خاتمہ ہوگا ان عجائب گا (۱۲ : ۶)

دوسرے فرشتہ نے خدائے حیّ وقیوم کی قسم کھاکر کہا،

لموعد وموعدیم وحِصّی، — ۱۲۰ برس اور کئی ۱۲۰ برس، اور ۱۲۰ برس کے آدھے تک، (۱۲ : ۷)

سنہ ۷۵ء کے بعد ۱۲۰ برس گذرنے پر سنہ ۱۹۵ء دوبارہ شاہ جنوب کے زور پکڑنے کا وقت مقرر تھا، اور یہی ساسانیون کے ظہور کا زمانہ ہے، سنہ ۷۵ء کے بعد (۱۲۰ + ۱۲۰×۳) ۴۸۰ برس گذرنے پر سنہ ۵۵۵ء مین شاہ جنوب اور شاہ شمال کو باہم بھڑ جانا چاہئے تھا، اس کے بعد ۶۰ برس گذرنے پر سنہ ۶۱۵ء مین میکائیل

کو آجانا چاہئے تھا، حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ۶۱۱ء مین دعوی نبوت فرمایا،

حضرت دانیالؑ کے لئے یہ خبر بھی تشفی بخش نہ تھی، کیونکہ ایک اور کئی اور نصف موعد کی ابتدا کا وقت ان کو نہین معلوم تھا، اس لئے انھون نے فرشتے سے کہا،

ادونی مہ احریت الہ (۱۲: ۸)　　　میرے جناب ان باتون کا آخر کیا ہے،

فرشتے نے جواب دیا

لک دانی ایل کی ستمیم و　　　جا، دانیال کیونکہ ان باتون کے تمام

حتومیم ہدبر یم عد عت　　　اور ختم ہونے سے آخر وقت تک نیک

قص تیبر رو و یتلبنوا و　　　نہین گے بہتیرے اور دودھ جیسے ہون گے

یصر فوا ربیم و ہرشیعو　　　اور پرکھے ہوئے ہون گے، لیکن جو بدکار

رشعیم و لا یبینو،　　　ہین، وہ بدی ہی کرتے رہین گے، اور

(۱۲: ۹ و ۱۰)　　　ان کی سمجھ مین نہین آئے گا،

مطلب یہ ہے کہ تم جن لوگون کی خیر خواہی کے جذبہ کے ساتھ کرید کر رہے ہو، وقت آنے پر بہشتی ہونے نہین جائین گے،

وہمشکلیم یبینو × × ×　　　البتہ جو سمجھ دار ہین سمجھین گے،

× × یومیم الف و ماتیم　　　× × × ×

اشری ہمحکہ ویگیع　　　مبارک ہے وہ جو راہ دیکھے اور وہ

لیومیم الف و شلش ماوت و شلشیم　　　اثنائے ۱۳۳۵ تک

وحمشیم،　　　(۱۲: ۱۱ و ۱۳)

یوم کا لفظ جب عدد کے پہلے ہو تو اس کا مطلب سن ہے، اس عبارت کو نقل کرتے وقت ہم نے

ایک تحریفی جملہ حذف کر دیا ہے جس نے پیش گوئی کو جھوٹی بنا دیا ہے، اور وہ ہے،

"جب دائمی قربانی موقوف ہوگی اور تباہ کن مکروہ نصیب ہوگا، اس وقت سے

یہ اضافہ اسلام کے ظہور کے بعد اخفائے حق کے لئے کیا گیا اس اضافہ کے مطابق سنہ ۱۲۶۰ء اور سنہ ۱۳۰۵ء میں پیش گوئی کو پوری ہونا چاہئے تھا لیکن ان سنین میں پیشین گوئی کے اندر مذکور حوادث میں سے ایک کا مثل بھی وجود پذیر نہ ہوا،

حضرت دانیالؑ بوقت بشارت سرزمین بابل میں مقیم تھے، انھوں نے سنہ ۱۲۹۰ و ۱۳۳۵ بابلی کا ذکر کیا ہے بخت نصر جس حکومت کا فرمان روا تھا، اس کا بانی اول مرودک بلدان (یشعیا ۳۹:۱ و سلاطین ۲۰:۱۲ وغیرہ) تھا، جس نے سنہ ۷۱۲ ق م میں حزقیاہ کو تحفے بھیجے تھے، وہ پہلے اشوری بادشاہ سرجون دوم کا ماتحت تھا، سنہ ۶۲۷ ق م میں اس نے اشوریون سے بغاوت کی، (ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ ج ا ص ۴۴۳) سنہ ۶۱۹ء کو بابلی حکومت کے قیام کی تاریخ اور سنہ بابلی کا آغاز خیال کیا جا سکتا ہے اس لئے

سنہ ۱۲۹۰ بابلی برابر تھا سنہ ۶۷۱ء کے

سنہ ۱۳۳۵ بابلی برابر تھا سنہ ۷۱۶ء کے

ان بشارتوں کا سورۂ روم سے تعلق سمجھنے سے پیشتر ایک بار تمام سنین کو پھر سے دماغ میں رکھ لینا چاہئے،

۱۔ سنہ ۵۱۶ ق م میں ہیکل سلیمانی کی دوبارہ تعمیر مکمل ہوئی،

۲۔ سنہ ۳۳ء میں مسیح نجید دنیا سے اٹھ گئے،

۳۔ سنہ ۳۶ء میں مقررہ میعاد توبہ و استغفار کی ختم ہوگئی،

۴۔ سنہ ۷۰ء میں بیت المقدس دوبارہ مسمار ہوا،

۵۔ سنہ ۱۹۰ء میں شاہ جنوب نے زور پکڑا،

۶۔ سنہ ۵۵۵ء میں شاہ جنوب اور شاہ شمال کی جنگوں کا آخری سلسلہ شروع ہونا چاہئے تھا

مگر ۵۴۲ء ہی سے شروع ہوگیا،

۷۔ ۵۷۱ء مین حضرت رسول خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) پیدا ہوئے،

۸۔ ۶۱۰ء مین ہرقل بادشاہ روم ہوا یہی وہ قیصر تھا جس کے حق مین بتایا گیا تھا کہ وہ شاہ جنوب کو شکست دیگا اور اس کے زمانہ مین میکائیل بڑا سردار مبعوث ہوگا، ۶۱۱ء مین حضرت رسول خدا صلعم نے نبوت کا اعلان کیا،

۹۔ ۶۱۶ء اس سال ہجرت حبشہ ثانیہ ہوئی، اسی سال سے اہل کتاب قرآن کے مخاطب ہوئے سورۂ قصص جس مین چند اہل کتاب کے ایمان کا ذکر ہے، انہی دنون اتری، یہی قدوش قدوشیم کے انتظار کی آخری تاریخ،

۱۰۔ ۶۲۸ء مطابق ۶ھ و ۶ش آسمانی حکومت کے قائم ہونے کی تاریخ مقرر تھی، اس سال صلح حدیبیہ ہوئی، اور قیصر ہرقل نے ایران پر فتح کا جشن منایا،

سورۂ روم کے نزول تک پیش گوئی کے تمام اجزا اپنے وقت پر پورے ہوئے لیکن آخری پیغمبر کے ایام ظہور مین شاہ شمال اور شاہ جنوب کی جنگ کا نتیجہ بظاہر اس پیشین گوئی کے خلاف ہوا کہ

وبعت قص ینجح عمو ملك	اور خاتمہ کے وقت لڑائی کرے گا، شاہ
ھنجب ویستعر علایو ملك	شمال سے شاہ جنوب، اور شاہ شمال اس
ھصفون برکب ویفرشیم و	پر گردباد کی طرح چڑھ دوڑے گا، بہت
بانیوت ربوت وباء بارصوت	سے رتھ اور سوار اور کشتیاں لے کر، او
شطف وعبر	ملکون مین گھس پڑے گا، اور ریلے گا، او
	آر پار جائے گا،

آگے بڑھ کر یہ بھی بتایا کہ مصر تک اس سے نہین بچے گا،

مغلوبیٔ روم | عام اہل کتاب کی توقع کے مطابق مقررہ میعاد کے اندر روم و ایران مین جنگ چھڑی، لیکن ۵۶۲ء مین رومیون نے خراج دینے پر صلح کر لی، ۵۷۲ء سے جسٹی نین نے خراج دینے سے انکار کر دیا، پھر متواتر لڑائیاں ہوئین، ہر جنگ مین ایرانی غالب آتے رہے، ۶۱۳ء مین انھون نے دمشق کو، اور جون ۶۱۴ء مین شہر یروشلم کو فتح کر لیا، سورۂ روم کی آیت مین اسی واقعہ کی بابت خدا نے فرمایا،

غلبت الروم فی ادنی الارض — روم والے پاس والی سرزمین مین غالب ہو گئے،

غلبۂ روم | یہ آیت یوم بدر (۱۷ رمضان ۲ھ مطابق ۱۴ مارچ ۶۲۴ء) سے پورے سات برس پہلے ۱۵ مارچ ۶۱۶ء مطابق ۸ رمضان ۵ ق ھ مین نازل ہوئی، مورخین کا بیان ہے کہ اس خبر سے کہ رومیون کو ایرانیون کے مقابلہ مین شکست ہوئی،

"ساری دنیاے مسیحیت لرز اٹھی، کیونکہ اہلِ ایران نہ صرف بطریقون کو بلکہ صلیبِ مقدس کو بھی اٹھا لے گئے تھے، (ہسٹورینز ہسٹری آف دی ورلڈ ج ۷ ص ۹۴)

عیسائی دنیا کے لرزنے کی اس سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ۶۱۰ء پر دانیال ۱۲: ۷ و مکاشفہ ۱۲: ۱۴ کی مدت ختم ہو گئی، بشارت کے مطابق ۶۱۰ء اور ۶۱۶ء کے درمیان اس شہسوار کے ظہور کی توقع تھی، جو

"امانتدار اور سچا کہلاتا ہے، راستی سے عدالت کرتا ہے، اور لڑتا ہے، .... اس کا نام کلام خدا ہے .... وہ لوہے کے عصا سے قومون پر حکومت کرتا ہے (مکاشفہ باب ۱۹)

۶۱۴ء کی شکست روم نے ساری بشارت سے ان کا ایمان متزلزل کر دیا تھا، اس خبر سے ان لوگون کے بھی دل ٹوٹ گئے تھے، جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کے لئے پیش گوئی کے اس

حصہ کے پورے ہونے کا انتظار تھا، اس لئے خدا نے فرمایا کہ ہان یہ تو واقعہ ہے کہ رومی ہار گئے لیکن

وھو بعد غلبھم سیغلبون فی بضع سنین چند ہی برسون کے اندر وہ غالب ہونگے،

ان آیتون کے اترنے پر حضرت ابو بکرؓ اس قدر خوش ہوئے کہ مکہ کی گلی گلی مین یہ آیتین پڑھ پڑھکر سنائین قریش نے کہا آؤ شرط کرین، حضرت ابو بکرؓ نے ۵ برس کی مدت مقرر کرکے کچھ اونٹون پر یہ شرط کرلی کہ رومی ضرور غالب ہون گے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سُنا تو شرط پر ناراض ہوئے، حضرت ابو بکرؓ نے کہا مین نے اللہ اور اس کے رسول کی تصدیق کے لئے یہ شرط باندھی ہے چونکہ اب تک قمار کی ممانعت کرنے والی آیت نہین اتری تھی، آپ نے حضرت ابو بکرؓ کو فسخ شرط کا حکم نہین دیا، بلکہ فرمایا کہ مدت کو بڑھا دو، کیونکہ بضع نام ہے تین سے ۹ تک کا، حضرت ابو بکرؓ نے قریش سے کہکر مدت بدلوا کر پانچ کی بجائے سات برس مدت مقرر کردی،

یہ عجیب ماجرا ہے کہ اس آیت کے نزول تک رومیون کو ایرانیون کے مقابلہ کی ہمت نہین پڑی، حضرت ابو بکرؓ نے شرط کی جو میعاد پہلے مقرر کی تھی، ۶۲۲ء پر ختم ہوئی، ہم دعویٰ نہین کرسکتے کہ اس آیت کے نزول اور حضرت ابو بکرؓ کی شرط کا ہرقل کو علم تھا لیکن جس سال شرط کی پہلی مدت ختم ہوئی، اسی سال سے اُس نے جنگ کی تیاری شروع کی،

"بالآخر ۵ ارمارچ ۶۲۳ء کو ہرقل ایک بڑی مہم پر روانہ ہوا، اب کی بار کئی مرتبہ وہ سلطنت ایران کے قلب مین گھس گھس پڑا، اُس نے ایران کے طول وعرض کو صلیب + کی شکل مین چھان مارا، اس مسرفانہ دلاوری نے اُس کے مستقر سے بار بار اس کا اتصال توڑ دیا، فوجون کی خورد و نوش مین اُسے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، لیکن ان تمام دشواریون مین اوس نے خود کو ایک کامیاب مدبر اور سپہ سالار ثابت کیا، اپنی مہم کے پہلے سال مین اُس نے ایرانیون کے مقدس ترین معبدون مین سے ایک کو یعنی گنجک کے آتش کدہ کو مسمار کردیا، یہ تعاہد وشلم

کی بربادی کا انتقام، (ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ ج ۸ ص ۹۴)

دوبارہ فتح | حضرت ابوسعید خدریؓ کا بیان ہے کہ بدر کے دن جب کہ مسلمانون کو مشرکین مکہ کے مقابلہ مین فتح ہوئی، تو حضرت جبرئیلؑ نے دوبارہ سورۂ روم کی آیتین بنصر اللہ تک سنائین مگر اب کی بار غُلِبَت کی بجائے غَلَبَتْ پڑھا، (ترمذی)

جہان اس نئی تلاوت نے غلبۂ روم کی خبر مسلمانون کو دنیا مین اس کی شہرت سے بہت پہلے دیدی وہان اس نے یہ بھی ظاہر کردیا کہ یومئذ یفرح المومنون بنصر اللہ کا مطلب کیا تھا، نزول اوّل کے وقت کوئی اس کا تصوّر بھی نہین کرسکتا تھا کہ جس دن رومیون کو ایرانیون پر فتح ہوگی بعینہٖ وہی دن میدان بدر مین مسلمانون کی فاتحانہ مسرت کا بھی ہوگا، اس نئی تلاوت نے ایک اور پیشگوئی کردی، وہ یہ کہ اہل روم دوبارہ

سیغلبون فی بضع سنین	چند برسون کے اندر غالب ہون گے،
ویومئذ یفرح المومنون	اور ان دنون (بھی) اہل ایمان
بنصر اللہ	اللہ کی مدد پر نازان ہون گے،

حضرت جبرئیلؑ نے حضرت دانیالؑ کو رومیون کی فتح کی بشارت دینے کے بعد یہ بھی فرمایا،

"لیکن پورب اور اتر کی افواہین اسے حیران کردین گی، اس لئے وہ بڑے غضب سے نکلے گا کہ بہتون کو ہلاک کردے"

اب کی بار حضرت جبرئیلؑ نے سورۂ روم کی تلاوت مین ذرا سا فرق کرکے گویا اپنی اس قدیم پیش گوئی کو دہرادیا،

پورب اور اتر کی افواہ جس نے ہرقل کو حیران کردیا تھا، وہ یہ تھی کہ ادھر تو وہ ایرانی علاقہ مین لڑرہا تھا، اُدھر ایرانیون کی فوج بڑھتی چلی جارہی تھی، اور باسفورس کے قریب تھی، دوسری

طرف سے ایک اور قوم نے قسطنطنیہ پر حملہ کر دیا تھا ۶۲۲ء میں یہ لپک کر اپنے مستقر میں پہنچا، اس کا پہنچنا تھا کہ ۰۰۰ نے میدان سے راہِ فرار اختیار کی، ایرانی فاسفورس عبور نہ کر سکے، اب دوبارہ اس نے ایرانیوں کو ریلا ۶۲۷ء میں اس نے ایران کے اندر گھس کر ایرانیوں کو بہت ذلیل شکست دی، اور اس فتح کی خوشی جنوری ۶۲۸ء میں اس نے بمقام دستگرد "عید نور" منائی "

(ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ ج ۸ ص ۹۴)

جنوری ۶۲۸ء رمضان و شوال ۶ھ کے مطابق تھی، ذی قعدہ ۶ھ میں صلح حدیبیہ واقع ہوئی، جس کی بابت قرآن میں خدا نے فرمایا ہے،

انا فتحنا لك فتحاً مبيناً، ہم نے تمھیں کھلی فتح دی ہے،

ہرقل کی پہلی فتح کے وقت مسلمانوں کو بدر میں اور دوسری فتح کے وقت حدیبیہ میں فتح نصیب ہوئی، کیا کوئی اس کا پہلے تصور بھی کر سکتا تھا،

قریش کے پاس ایرانیوں کی شکست اور رومیوں کی فتح کی خبر پہنچ چکی تھی، قریش میں بہت عیب تھے، مگر وہ وعدہ کے پکے تھے، حضرت ابو بکرؓ کو شرط کے اونٹ دیدیئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وہ اونٹ لائے گئے تو چونکہ اب جوا حرام ہو چکا تھا، آپ نے فرمایا،

تصدق فانه سحت صدقہ کر دو کیونکہ وہ حرام ہے، (درمنثور)

حرام چیز مسلمانوں کو نہیں دی جا سکتی تھی، اس لئے اونٹ واپس کر دیئے گئے،

۶۲۹ء یعنی ۸ھ میں ہرقل نے یروشلم میں جشن فتح منایا، اور اس طرح (دانیال ۱۱، ۲۰۵) کی نصف خبر کو سچ کر دکھایا، حضرت دانیالؑ کو فرشتہ نے اس کے اس جشن کی خبر دے کر یہ بھی بتایا تھا کہ اس کے بعد بہت جلد اس کا خاتمہ ہو جائے گا،

اس جشن فتح کے زمانہ میں حضرت ابو سفیانؓ وغیرہ کئی رؤسائے قریش یروشلم میں

موجود تھے، حضرت ابوسفیانؓ اور ہرقل کے درمیان بات چیت بھی ہوئی تھی، اس بات چیت کو نقل کرنا ہمارے موضوع میں داخل نہیں، اس بات چیت کے دوران میں ہرقل نے ایسی باتیں بھی کی تھیں جن سے اندازہ ہوتا ہے، کہ وہ دانیالی بشارت کے مطالب سے واقف تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوی نبوت کی صداقت کا قائل تھا، مگر برا ہو حُبِ جاہ کا اس نے اسلام قبول نہیں کیا، اور یہ پہلے سے مقدر تھا، کیونکہ فرشتہ نے حضرت دانیالؑ کو بتا دیا تھا کہ

"شریر شرارت کرتے رہینگے اس کے شریروں میں سے کوئی نہیں سمجھے گا"

(دانیال ۱۲: ۱۰)

حاصلِ کلام یہ کہ سورۂ روم کی ابتدائی آیتیں جن میں روم کا ذکر آیا ہے حضرت دانیالؑ کی بشارت سے جن لوگون کا ایمان متزلزل ہوگیا تھا، اُن کی فمایش کے لئے اور اہلِ ایمان کو تسکین دینے کے لئے اتریں کہ دانیالی بشارت کا وہ جزء بھی پورا ہو کے رہے گا، جس کی بظاہر توقع نہیں معلوم ہوتی تھی، دانیالی بشارت کے پسِ منظر کو سامنے رکھ کر آیتون کے پڑھنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے، مقصود تنزیلِ آیت کا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و پیغمبری کا اور قرآنی آیت (یجدونہ عندہم مکتوبا) کے مضمون کا اثبات تھا، لیکن ان آیتون کو تدوینِ مصحف کے وقت ایسی آیتون کے ساتھ ملا کر رکھا گیا کہ یہی آیت اثباتِ آخرت کا بھی ذریعہ بن گئی ہے،

اقبالؒ کے اخلاقی تصوّرات

از

جناب مولوی محمد عبد السلام خان صاحب رامپوری

اقبال کے افکار و خیالات کا عام جائزہ لیا جائے، تو پہلی ہی نظر میں محسوس ہو جاتا ہے کہ انکی ترتیب و ترکیب کچھ اس انداز سے کیگئی ہے کہ انسانی عمل کے لئے مابعد الطبعیاتی بنیاد کا کام دیسکے، اقبال کے فلسفہ کے عقب میں جو اصل محرک ہے، وہ اُن کی غیر معمولی خواہش عمل ہے، خود اقبال بھی اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے، اُن کے نزدیک بھی اُن کے فلسفیانہ افکار اور شاعرانہ تخیلات کی جو کچھ قدر ہے، وہ عمل کے اعتبار سے ہے، عمل سے علحدہ ہو کر شاعری ہو یا فلسفہ دونوں بے معنی ہیں،

تاریخی اسباب کچھ بھی ہوں یہ حقیقت ہے کہ صدیوں سے مسلم عقلیت کا عام میلان امن پسندی جمود اور ترک و رہبانیت کی طرف رہا، یہ منفی اخلاق بجائے خود کم مضر نہ تھا، کہ اُس نے عام ملت میں ایسے مثبت معائب پیدا کر دیئے کہ اُن کی انفرادی اور قومی زندگی سخت خطرے میں پڑگئی، اقبال کی تعلیم اسی میلان کا رد عمل ہے، اس لئے عمل اور جد و جہد پر انھوں نے جتنا بھی زور دیا کم ہے،

اقبال کی اخلاقیات میں مسلم تاریخ کے رد عمل کو تو سب سے زیادہ دخل ہے ہی مگر رومیؒ اور اُن جیسے بعض دوسرے مسلم مفکرین کے خیالات سے بھی وہ کافی متاثر ہیں، لیکن جہانتک تاریخی تسلسل کا تعلق ہے، مشرقی بزرگوں کے بجائے اُن کے افکار اساتذہ مغرب کے سلسلۂ فکر کی کڑی معلوم ہوتے ہیں، اقبال نے مغربی تصورات کی اساس پر اسلامی اعلی صفات کی نہایت دلکش و آویزہ

عمارت کھڑی کی ہے،

اخلاقیات مین ارادے کی اہمیت | آیا مادّی اور خارجی عالم کی طرح ہماری روح اور نفس کی دنیا بھی علت و معلول کی زنجیر مین جکڑی ہوئی ہے، اور ہماری تمام ذہنی حالتین بواسطہ یا بلا واسطہ خارجی عوامل و اسباب کی رہین منت ہین، جن اعمال کو ہم ارادی سمجھتے ہین اور اُن کے کرنے یا نہ کرنے مین اپنے آپ کو بالکل آزاد محسوس کرتے ہین، کیا درحقیقت ہم ان مین آزاد اور مختار ہین، یا ہماری تحت الشعوری خواہشیں یا فطری جبلتین اُن کو متعین کرتی ہین، اور ارادے اور آزادی ترجیح کی اگر کوئی حقیقت ہے تو مجبور کار کن جیسی؟ اگر ان سوالون کا جواب اثبات مین ہے، تو پھر اخلاق کے لئے کوئی حقیقی بنیاد نہین، اعمال پر صحیح اور غلط خیر و شر کا اطلاق محض سطحی اور دکھاوے کا ہے،

انسانی اعمال پر غلط اور صحیح یا خیر و شر کا حکم کرنے کے لئے ارادے کی آزادی کو کسی نہ کسی طرح تسلیم کرنا ضروری ہے، ہماری نفسیاتی حیات مین جب تک ارادے کے لئے معقول گنجایش نہ پیدا کیجائے، اعمال کی آزادی دھوکے اور فریب سے زیادہ نہین، کانٹ کے فلسفیانہ تنقید کا یہ سب سے بڑا کارنامہ ہے کہ اُس نے واقعیت کو مظہری اور ماورائی مین تقسیم کرکے حیات نفسی مین آزاد ارادے کو ماورائی واقعیت کے طور پر شامل کیا اور اخلاق کے لئے عقلی بنیاد تیار کردی، فشٹے، شیلنگ، شوپنہادر، نطشے، برگساں اور اقبال سب نے مابعد الطبیعیاتی اور اخلاقیاتی اختلافون کے باوجود اس اساسی تصور سے اپنے اپنے نظامہائے فکر مین پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے،

اقبال کی اخلاقیات کی بنیاد | اقبال نے عالم کی جو کونیاتی تشریح کی ہے، وہی اُن کے اخلاقی تصورات کا سرچشمہ ہے، کائنات اور اس مین انسان کی حیثیت انسانی آزادی اور مجبوری کے حدود کا تعین کرتی ہے، انسانی ارادہ، ارادی اعمال کا خیر و شر ہونا فضائل اور رذائل سب کی توجیہ کا ماخذ یہی تشریح ہے،

کائنات ایک حرکی ارتقاء ہے، اس کے بطن میں صاحب ارادہ و شعور تخلیقی طاقت پوشیدہ ہے، یہ طاقت اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لئے کائنات کو آگے بڑھاتے لئے جارہی ہے، یہ تخلیقی ارتقاء آزاد ہے، نہ پہلے سے کوئی متعین سمت ہے، اور نہ کوئی متعین راستہ مستقبل کھلے ہوئے سادے امکان سے زیادہ نہیں انسان کائنات کی ارتقاء کا اہم حلقہ ہے، اس پر ارتقاء کا ایک درجہ ختم ہو جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ پوری کائنات کا مقصد ہے، کائنات اس کے لئے ہے، وہ کائنات کے لئے نہیں،

انسانی حدود اختیار | کائنات میں جو تخلیقی قوت سرگرم عمل ہے، انسان اس کا کامل مظہر ہے، انسانی شخصیت یا خودی ایک مستقل اور ممتاز روحانی وحدت ہے، حیات و شعور اور ارادہ باہم دیگر اس میں پیوست ہیں، یہ وحدت تمام انسانی احوال اور شئون کے لئے نقطۂ ماسکہ ہے، ترقی پذیر کائنات کے بطن میں جو بااراوہ اور آزاد تخلیقی قوت پوشیدہ ہے، اس کے تخلیقی عمل میں یہ بھی اپنا حصہ ادا کر رہی ہے اس کی مخفی قوتوں اور پوشیدہ صلاحیتوں کی کوئی حد اور نہایت نہیں، ان کے اظہار کے لئے صرف ارادی عمل کی ضرورت ہے، درخشاں اور شاندار مستقبل اس کی اپنی جد و جہد پر موقوف ہے، جہاں عمل میں کوئی چیز حق کے طور پر نہیں بلکہ نتیجہ کے طور پر حاصل ہوتی ہے،

فطرت کی مخالفانہ قوتیں انسان کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں، اور لمحہ بلمحہ انسانی عزائم سے متصادم اور برسر پیکار ہیں، انسان ان مادی قوتوں کے سامنے ہیچ کارہ اور مجبور نظر آتا ہے لیکن مسلسل عزم و عمل سے یہ مجبوری اور ہیچ کارگی کم ہوتی چلی جاتی ہے،

نہ مختارم توان گفتن نہ مجبور   کہ خاک زندہ ام در انقلابم

اس میں اس قسم کی صلاحیتیں ہیں کہ ان سے کام لے تو فطرت کی تمام رکاوٹوں پر غالب آتا چلا جاتا ہے، اور اس کے اختیار کی حدیں وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی جاتی ہیں،

ممکنات قوت مردانہ کار   گرد واز مشکل پسندی آشکار

کبھی اپنی صلاحیتوں کو فطرت سے ہم آہنگ کرتا ہے، کبھی فطرت کو اپنے مقاصد سے ہم آہنگ بناتا ہے، فطرت پوری طرح اس کے قابو میں آجاتی ہے،

اگر گردون بکام او نہ گردد   بکام خود بگرداند زمین را

وہ جس طرف چاہتا ہے، فطرت کے رُخ کو پھیر دیتا ہے،

ما سوا از بہر تسخیر است و بس   سینۂ او عرضۂ تیر است و بس

اور جس طرح چاہتا ہے فطرت کی صورت گری کرتا ہے،

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں   یہ گنبد افلاک، یہ خاموش فضائیں

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے   کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردون

خودی شیر مولا جہان اس کا صید   زمین اس کی صید آسمان اس کا صید

مقصد و غایت | یہ تخلیقی قوت اور ارتقائی حرکت جو پوری کائنات کو چلا رہی ہے، کیا کوئی مقصد اور نصب العین رکھتی ہے، اور اس ضمن میں فطرت کو مسخر کرنے اور اوس کی معاندانہ قوتوں کو اپنی منشا کے مطابق ڈھالنے کا جو فریضہ انسان پر عائد ہے، کوئی مقصد اور غایت رکھتا ہے؟ اقبال کا جواب یہ ہے کہ اگر مقصد اور غایت کا مفہوم کوئی آخری مقصد اور انتہائی غایت ہے، جس کی طرف کائنات کو چار و ناچار پہنچنا ہے، تو نہ کائنات کا کوئی مقصد ہے اور نہ انسانی جد و جہد کی کوئی غایت،

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود   کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود

ہر ایک مقام سے آگے مقام ہے تیرا   حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں

اس قسم کے مقصد اور غایت کو ماننا ارتقائی تخلیق کو پابند کرنا اور اس کی آزادی کو سلب کر لینا ہے،

تاہم ارادی فعلیت کو ہر معنی میں بے مقصد کہنا بھی صحیح نہیں،

ہم اپنی نفسیاتی زندگی پر غور کریں تو ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ ارتقا کا ہر درجہ اپنی جگہ خود

ایک مقصد اور نہایت ہو جس پر پہنچنے کے بعد دوسرا نیا مقصد اور نئی غایت مستقبل کے کھلے امکان مین مقرر کی جاتی ہے،

چون نظر قرار گیرد بنگار خوبروئے تپد آن زمان دلِ من پئے خوبتر نگارے

اور پھر اس کو حقیقت بنانے کے لئے اپنی تمام توجہین اور قوتین صرف کر دیجاتی ہین، کائنات مین جو تخلیقی ارادہ کام کر رہا ہے، اس کی بھی یہی شان ہے، کائنات بھی ایک درجہ سے دوسرے درجہ کی طرف بڑھتی رہتی ہے، مقاصد کو پیدا کرنے اور ان کو حقیقت بنانے کا یہ سلسلہ اسی طرح متواتر جاری رہتا ہے،

ما زتخلیق مقاصد زندہ ایم در شعاعِ آرزو تابندہ ایم
زندگی در جستجو پوشیدہ است اصلِ او در آرزو پوشیدہ است

اقبال نے ارتقاء کی توجیہ مین کائنات کے لئے اگرچہ آخری مقصد اور اطلاقی غایت نہین تسلیم کی ہے، جیسا کہ غایاتی توجیہون مین عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے، تاہم درمیانی مقاصد مان کر اخلاقی احکام کے لئے گنجایش پیدا کر لی ہے، ورنہ اگر آزادی تخلیق کے حدود کو اتنی وسعت دیدیجائے کہ درمیانی مقاصد بھی باقی نہ رہین، تو اخلاقی قدرون کے لئے پھر کوئی حقیقی مقام نہین رہے گا،

خیر و شر کا معیار اخلاقی احکام کی مشہور افادی توجیہ یہ ہے کہ صرف وہ اعمال خیر ہین، جو بڑی سے بڑی تعداد کے لئے مسرت کی زیادہ سے زیادہ مقدار فراہم کرین، حقیقی یا اتیلافی لذت پر یہ توجیہ مبنی ہے، خواہ اس لئے کہ لذت کو اعمال کی مطلوبہ غایت بنانا انسان کی فطرت ہے، اور خواہ اس لئے کہ عقلاً لذت ہی انسانی اعمال کی مطلوبہ غایت ہوسکتی ہے، اس کے علاوہ جتنی غایتین مطلوب ہوتی ہین، اُن کی حیثیت وسائل لذت کے علاوہ اور کچھ نہین، اقبال اس توجیہ سے متفق نہین، اقبال کے نظریۂ حیات کا جا تنک تعلق ہے، یہ توجیہ اس کے موافق نہیں، حقیقت کے نئے نئے رخون مین

مظاہرۂ حیات کی بے چین خواہشوں کی تکمیل کے لئے یہ نظریہ پوری طرح کافی نہیں، برخلاف از ین مادی ارتقار کا نظریۂ اخلاق جس کو مشکل ہی سے اخلاقی نظریہ کہا جاسکتا ہے، اقبال کے طرزِ فکر سے زیادہ قریب ہے، اس نظریہ کے مطابق فطرت کا مقصد حیات اور بقاے حیات ہے، صرف ان اعمال کو خیر کہا جاسکتا ہے، جو فطرت کے مقصد میں امداد کریں اور بقاے حیات کی زیادہ سے زیادہ صلاحیت پیدا کریں، جو اعمال اس صلاحیت کو کم کریں وہ شر اور غلط ہیں،

اقبال کا معیار خیر و شر بقاے حیات کے بجائے شخصیت اور خودی ہے، مزید بران شعور اور آزاد ارادے کو اقبال کے نزدیک اعمال میں بنیادی دخل ہے، وہ کہتے ہیں کہ اعمال پر محض اس حیثیت سے نظر ڈالنی چاہئے، کہ وہ کس حد تک شخصیت کی بقا، اور پختگی میں معاون ہیں، اور کس حد تک اس کی تحلیل اور اضمحلال کے باعث، اعمال کی ذاتی قیمت کچھ نہیں وہ اپنی حد میں نہ اچھے ہیں نہ برے، اُن کے خیر و شر ہونے کا فیصلہ شخصیت کا استحکام اور ضعف کرتا ہے،

شخصیت کے ضعف اور استحکام کا کیا مفہوم ہے، اقبال نے اس بارے میں کوئی واضح اور تعیینی تشریح نہیں کی، مثنوی اسرار خودی میں چاند کے مقابلہ میں زمین کو اور زمین کے مقابلے میں آفتاب کو محکم کہا گیا ہے،

چون زمین بر ہستی خود محکم است ماہ پابند طوافِ پیہم است

ہستی مہر از زمین محکم تر است پس زمین مسحورِ چشم خاور است

زمین اور چاند کی کثافت مادہ کا جہانتک تعلق ہے، قریب قریب یکسان ہیں، چھوٹے اور بڑے کا فرق ہے، آفتاب اور زمین میں زمین کا مادہ زیادہ متکاثف سہی تاہم جسامت کی بنا پر کمیت مادہ کے اعتبار سے آفتاب غیر معمولی بڑا ہے، اور اسی اعتبار سے جذب اور توانائی میں بہت فرق ہے، اقبال کی افتادِ فکر کو دیکھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ اُن کے نزدیک استحکام کا مدار جذب اور توانائی

پر ہے، قطرۂ شبنم اور ریزۂ الماس کے تقابلی فرق میں صلابت کو جو مادہ کی کثافت کی فراوانی کا نتیجہ ہوتی ہے، استحکام کا معیار قرار دیا ہے،

قطرہ سخت اندام و گوہر خونہ بود ریزۂ الماس بود و او نہ بود

غافل از حفظ خودی یکدم مشو ریزۂ الماس شو شبنم مشو

پختہ فطرت صورت کہسار باش حامل صد ابر دریا بار باش

الماس اور کوئلے کے مقابلے میں بھی صلابت کو ہی استحکام اور پختگی کا نتیجہ مانا ہے،

گفت الماس اے رفیق نکتہ بین تیرہ خاک از پختگی گردد نگین

پیکرم از پختگی ذو النور شد سینہ ام از جلوہ ہا معمور شد

در صلابت آبروے زندگی ست ناتوانی ناکسی ناپختگی ست

تفصیل بالا سے کثافت یا قوت جو صاد ی الجسم اجسام میں کثافت مادہ سے متناسب رہتی ہے، استحکام کا پیمانہ قرار پاتی ہے،

انسانی شخصیت اور خودی کے استحکام میں گرچہ یہ فلسفہ مادی نقطۂ نظر کارآمد نہیں، خودی کی نوعیت اقبال کے نزدیک روحانی ہے، تاہم چونکہ خودی کے متعلق اقبال کا خیال یہ ہے کہ وہ افعال کی قوت ماسکہ اور ہر قسم کی صلاحیتوں کا مرکزی نقطہ ہے، اس لئے توانائی اور کثافت کے لئے مادی صورت میں نہ سہی، روحانی حیثیت میں گنجایش نکالی جاسکتی ہے، افعال اور قویٰ کی مرکزی وحدت انسانی خودی اور شخصیت میں جب تک انتشار اور پراگندگی باقی رہتی ہے، استواری نہیں آتی، یہ سیلانی اور سیمابی کیفیت دور کئے بغیر خودی کامل العیار نہیں ہوتی،

خویش را دریاب از ایجاب خویش سیم شو از بستن سیماب خویش

زندگی کی فعلیتوں اور قوتوں کا یہ سیمابی مرکز مدعا اور مقصد سے بستہ ہوتا ہے، مقصد اور مدعا

ہر قسم کی نفسی فعلیتوں اور قوتوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے، اور ان کو ایک مرکز پر جمع کرکے نفسی زندگی کی وحدت کو مکمل بنا دیتا ہے،

مدعا راز بقاے زندگی　　جمع سیماب قواے زندگی

مقصد اور مدعا اپنی معروضی حیثیت مین نفسی زندگی کی جمعیت اور بقا رمین کوئی مدد نہین دیتا، جب تک وہ انسانی جذبات اور خیالات پر حاوی نہ ہو جائے، اور اس سے محبت اور لگن نہ پیدا ہو انسانی قوتین اور فعلیتین سمٹ کر ایک نقطہ پر نہین آتین، چنانچہ اقبال عشق اور محبت کو خودی کی استواری مین کافی اہمیت دیتے ہین، مقصد اور مدعا کی محبت اور کشش انسانی شخصیت کی تالیفی فعلیتون کو ایک مرکز پر جمع رکھتی ہے،

نقطۂ نوری کہ نام او خودی است　　زیر خاک ما شرار زندگی ست
از محبت می شود پاینده تر　　زنده تر سوزنده تر تابنده تر
از نگاہ عشق خارا شق شود　　عشق حق آخر سراپا حق شود
از محبت چون خودی محکم شود　　قوتش فرمان دہ عالم شود

اس طرح خودی اور شخصیت کی عضوی تالیف مین نفسیاتی صلابت یا کثافت پیدا ہو جاتی ہے، اور انسانی خودی زیادہ سے زیادہ توانائی اور قوت کا منبع بن جاتی ہے،

سنگ شو اے ہمچو گل نازک بدن　　تا شوی بنیاد دیوار چمن

مذکورہ تشریح کے مطابق خودی کے استحکام کا مفہوم جمعیت اور قوت یا کسی مقصد کے حصول کی خاطر انسان کی تمام عقلی اور عملی قوتون کا سمٹ کر ایک نقطہ پر آجانا ہے، ضعف کا مفہوم انسانی فعلیتون اور قوتون کا انتشار اور پراگندگی ہے،

مستقل قدرین | جہان تک اطلاقی اور مستقل قدرون کا تعلق ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کے نزدیک

شخصیت اور خودی ہی ایسی خارجی حقیقت ہے، جو ذاتی قیمت رکھتی ہے یہی ہر قسم کے اضافی قدرون کے جانچنے کا پیمانہ ہے،

ایک تو ہو کہ حق ہو اس جہان مین باقی ہے نمود سیمیائی
تو زندگی ہے پایندگی ہے، باقی ہے جو کچھ سب خاکبازی

اس مستقل اور اخلاقی قدر کے علاوہ تمام قدرین انسان کی ساختہ پرداختہ ہین، جن کو اپنے مقرر کئے ہوئے مقاصد اور غایات کی کسوٹی پر پرکھا جانا چاہئے،

کسے کو فاش دید اسرار جان را نہ بیند جز بچشم خود جہان را

شخصیت اپنے دوران ارتقار مین نئے نئے مقاصد اور نئے نئے نصب العین بناتی ہے کیونکہ متعدد کھلی ہوئی راہون مین سے کسی ایک کی ارادی ترجیح و اختیار مقاصد کے تصور اور حوالہ کے بغیر ناقابل فہم ہے، ان مقاصد اور نصب العینون کو واقعیت میں تبدیل کرنیکے لئے انسانی شخصیت، ان مین مستغرق اور گم ہو جاتی ہے، تمام صلاحیتین اور قوتین ہر طرف سے سمٹ کر مقاصد کی طرف منعطف ہو جاتی ہین، یہ غیر معمولی میلان اور محویت مقاصد کی اضطراری کشش اور جاہانہ جاذبیت کا معلول اور نتیجہ نہین اس قسم کی غائیت کو اقبال طبعیاتی ماکینیت کا مرادف قرار دیتے ہین، اس قسم کی غائیت انسانی اختیار کو حقیقی معنی مین ختم کر دیتی ہے، یہ میلان درحقیقت اخلاقی نصب العین کے سامنے انسانی شخصیت کی آزاد اور اختیاری سپردگی ہے، اور سوچا سمجھا ہوا انتخاب،

عمل اور آرزو کائنات مین جس قسم کو ارتقار کے اقبال قائل ہین، وہ بالارادہ اور مستمر فعلیت کی اندرونی صلاحیتون کے اظہار کا نتیجہ ہے،

صورت گرے کہ پیکر روز و شب آفرید از نقش این و آن بتماشاے خود رسید

یہ فعال قوت جس کو ذات باری سے تعبیر کیا جاتا ہے، ارتقار کی ایک خاص منزل پر انسانی

شخصیت کی صورت گری کرتی ہے، وجود کے اعتبار سے گو یہ پچھلا ہے، مگر مرتبے مین سب سے بڑھ چڑھ کر ہے:

آیہ کائنات کا معنی دیر یاب تو | نکلے تیری تلاش مین قافلہ ہای رنگ و بو

اس منزل سے خود انسان اس فعّال قوت کا دست و بازو بنجاتا ہے، اور کائنات کی ارتقا مین اپنا حصہ ادا کرنے لگتا ہے،

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زبان تو ہے،
یقین پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گمان تو ہے

زندگی را می کند تفسیر نو | می دہد این خواب را تعبیر نو

ذات باری کی طرح انسانی فعلیت کا دار و مدار بھی ارادی اظہار پر ہے، اظہار کے بغیر نہ انسانی شخصیت کو بقا حاصل ہوسکتی ہے، اور نہ استحکام

خودی را زندگی ایجاد غیر است | فراق عارف و معروف خیر است

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی | فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

چنانچہ اقبال کے اخلاقی تصور مین انسانی فعلیت اور عمل کی اساسی اہمیت ہے، فطرت کا منشا اور مقصد عمل ہے اور بس،

در عمل مخفی ست مضمونِ حیات | ذوقِ تخلیق ست قانونِ حیات

پوری کائنات عمل کی جلوہ گری ہے، انسان مین جو صلاحیتین ودیعت ہین وہ ابھرنا چاہتی ہین، ان کے اس فطری تقاضے کا پورا کرنا انسانی فریضہ ہے،

تسلیم کی خوگر ہے جو چیز ہے دنیا مین
انسان کی ہر قوت سرگرم تقاضا ہے

فطرت کے تقاضوں پہ نہ کر راہِ عمل بند مقصود ہے کچھ اور ہی تسلیم و رضا کا

یہی آئین فطرت ہے یہی اسلوب فطرت ہے جو ہے راہ عمل میں گامزن محبوب فطرت ہے

ایسی تمام تعلیمیں اور ایسے تمام فلسفے جو انسان کو ترک عمل پر آمادہ کریں غیر فطری اور قابل رد ہیں، خونریزی اور جنگ و جدل کے خوف سے جد و جہد کو ترک نہ کرنا چاہئے، خونریزی اور جنگ و جدل فطرت سے بغاوت نہیں، بلکہ اس کی ہم نوائی ہے،

خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات فطرت لہو ترنگ ہے غافل نہ جل ترنگ

عمل جد و جہد کے بغیر جو چیز حاصل ہو اقبال کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں، انسان کی زندگی یہی ہے، کہ چیزوں کو خود پیدا کرے اسی میں اس کی قوت کا راز ہے،

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے سرِ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی

وہی جہاں ہے ترا جس کو تو کرے پیدا یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے

اقبال کے یہاں انسان کے تخلیقی عمل کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے، تخلیقی عمل کے بغیر کائنات کا نہ ارتقاء ممکن ہے، اور نہ انسان کے لئے خلاق فطرت کا دست و بازو بننا، ندرتِ عمل اور قدرت کی جد و جہد میں غلط کاریاں تک نہ صرف یہ کہ قابلِ درگذر ہیں، بلکہ لائقِ تحسین ہیں۔

اگر از دستِ تو کارے نادر آید

گناہے ہم اگر باشد ثواب است

قدرت کی طرف سے انسان کو جو فریضہ سپرد ہوا ہے، اس کی تعمیل کے لئے نت نئی آرزوئیں اور امنگیں ضروری ہیں، نئی آرزوؤں اور امنگوں کے بغیر نہ نئے مقاصد پیدا کئے جا سکتے ہیں، اور نہ اُن کو حاصل کرنے کے لئے نئی راہیں، اور نئے وسائل تلاش کئے جا سکتے ہیں، انسانی عزائم اونچی تمناؤں اور بلند جذبوں میں سے ہی اُبھرتے ہیں،

زندگی بر آرزو دارد اساس — خویش را از آرزوئے خود شناس

زندگی سرمایہ دار آرزوست — عقل از زائیدگان بطن اوست

سمجھا لہو کی بوند اسے تو اگر تو خیر — دل آدمی کا ہے فقط اک جذبۂ بلند

ہر ارادی عمل کا مقصد اگرچہ نتائج کی تحصیل ہے، تاہم اقبال کے نزدیک نتائج منزل نہیں بلکہ مزید نئے اعمال اور نئی جد وجہد کے لئے محرک ہیں، نتائج کو منزل سمجھ کر ان میں الجھ جانا منشاے قدرت کی خلاف ورزی ہے،

من نہ گویم در گزر از کاخ و کو — دولت تست این جہان رنگ و بو

دل برنگ و بو و کاخ و کو مده — دل حریم اوست جز با او مده

اس کا کام ہر منزل سے راہی کی طرح گذر جانا اور آگے منزلیں پیدا کر کے انھیں طے کرنا ہے، اس کی منزل ہر منزل سے ذرا آگے ہے،

نیاساید ز کار آفرینش — کہ خواب و خستگی بر وے حرام است

تو شاہین ہے پرواز ہے کام تیرا — ترے سامنے آسمان اور بھی ہیں

یقین اور اعتقاد | کوئی تصور کوئی مقصد کتنا ہی معقول اور ضروری کیوں نہ ہو جب تک اس میں اتنی قوت اور جذب نہیں ہوتا، کہ انسان کی ساری کی ساری عملی طاقتوں کو اپنی طرف متوجہ کرلے، سرگرم اور پرجوش عمل کے لئے وجہ تحریک نہیں ہوتا، تصورات اور مقاصد میں یہ قوت یقین اور عقیدہ سے پیدا ہوتی ہے،

عمل خواہی یقین را پختہ تر کن — یکے جو و یکے بین و یکے باش

زندگی سے تعلق رکھنے والا کوئی شعبہ ہو، اس میں ایج اور قوت ایقان اور اذعان کی قوت پر منحصر ہے، اقبال کے نزدیک عقلی تحقیق کا اعتبار نہیں قلبی تصدیق کی ضرورت ہے،

دین ہو فلسفہ ہو فقر ہو سلطانی ہو — ہوتے ہیں پختہ عقائد کی بنا پر تعمیر

جس معنیٔ پیچیدہ کی تصدیق کرے دل
قیمت میں بہت بڑھ کے ہے تابندہ گہر سے

شک اور تذبذب عملی طاقتوں کو کند کر دیتے ہیں، اور زندگی سرد اور جامد ہو جاتی ہے،

مے یقین سے ضمیر حیات ہے پرسوز
نصیب مدرسہ یا رب یہ آب آتشناک

اگر کسی نہ کسی طرح انسان عمل کے لئے کمربستہ بھی ہو جائے، تو راہ کی دشواریاں عام حالات میں آگے بڑھنے سے روک دیتی ہیں، اور وہ بجائے اس کے کہ جد وجہد سے ان پر قابو پاکر آگے بڑھے انھیں ناقابل شکست سمجھنے لگتا ہے، اور راہ کے پیچ وخم میں ہی الجھ کر رہجاتا ہے، رجائیت کے بجائے انسان پر قنوطیت طاری ہو جاتی ہے، اور وہ ترک و فرار کی راہ اختیار کر لیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اقبال بے یقینی کو سب سے بڑا عیب سمجھتے ہیں، بے یقینی قومی حیات کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیتی ہے، افراد و اقوام دونوں کے عروج وزوال میں سب سے بڑا دخل یقین اور بے یقینی کو ہے،

سُن اے تہذیب حاضر کے گرفتار
غلامی سے ہے بدتر بے یقینی

نظر اس قوم کا بے سوز عمل زار و زبوں
ہو گیا پختہ عقائد سے تہی جس کا ضمیر

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقین پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پر روح الامین پیدا

عقیدہ اور یقین پیدا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ مذہب ہے، انسانی عمل کو مذہب سے محروم کر دینے کے معنی اس کو عقیدے اور یقین سے محروم کرنا ہے، مقاصد اور نصب العینوں میں بلندی مذہب سے ہی پیدا ہوتی ہے، مذہب کے بغیر اعمال میں توازن اور ہم آہنگی باقی نہیں رہتی،

دین ہو تو مقاصد میں بھی پیدا ہو بلندی
فطرت ہے جوانوں کی زمیں گیر زمیں تاز

دین مسلک زندگی کی تقویم
دین سرِ محمد و براہیمؑ

قوت | جد وجہد کی نئی نئی راہیں پیدا کرنے اور نت نئے میدان عمل مہیا کرنے میں غیر معمولی دشواریوں اور سخت قسم کی مشکلات سے گذرنا پڑتا ہے، ہر منزل پر نئے ارتقائی مقاصد اور نئے اصلاحی نصب العین

قرار دینا اور اُن کو خارجی حقائق میں تبدیل کرنا آسان کام نہیں، ہر جگہ اور ہر لمحے فطری اور غیر فطری کاوشوں سے سامنا کرنا پڑتا ہے، افراد و اقوام کی شخصی اور قومی اغراض اور مفادوں سے تصادم ہوتا ہے، انسانی اور غیر انسانی طاقتیں مقابلے میں آتی ہیں، کائنات کی مادی قوتیں انسانی عزائم کے سامنے ابھی تک پوری طرح مسخر نہیں ہوئی ہیں، انسان کی خلاق فطرت کا تقاضا یہ ہے، کہ وہ خالق کائنات کے عمل میں بھی بے آہنگی اور نقص پاتی ہے، اور اس کے مقابلے میں بھی اُس طرح چاہئے اور اس طرح چاہئے" کہنے سے نہیں چوکتا،

گفت یزدان کہ چنین است و دگر ہیچ مگو گفت آدم کہ چنین است و چنان می بایست

دوسری طرف خود خالق کا منشا یہ ہے کہ انسانی عمل اپنے مقاصد کے تحت کائنات میں نظم و آہنگ پیدا کرکے اس کو آگے بڑھائے اور جس حد تک فطرت اس کے اعلیٰ مقاصد کے خلاف پڑے وہ قطع و برید کرکے فطرت کی خانہ بندی کرے، اس سلسلے میں اگر پورا نظم درہم برہم کرنا پڑے، تو اس میں بھی حیص و بیص نہ کرے،

گفتند جہان ما آیا بتو می سازد گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

نامساعد حالات کو موافق بنائے، بغیر خود اُن سے سازکرنا اپنی شکست کا اعتراف کرلینا ہے

با جہانِ نا مساعد ساختن ہست در میدان سپر انداختن

اقبال کے پورے فلسفے کا تقاضا یہ ہے کہ ساحل سے رزم خیر و شر دیکھنے کے بجائے طوفان خیز سمندروں کو دو چار ہونا چاہئے، اور فطرت کی ہر مخالف قوت سے لڑ جانا چاہئے،

ہست از حق خواہ وا ز گردون ستیز آبروے ملت بیضا مریز

حدیث بے خبران ہے کہ با زمانہ بساز زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

اس طرز فکر کا منطقی نتیجہ ہے "عزم للقوت" بغیر قوت کے انسان کے اس قدر بلند عزائم کی

تکمیل کسی طرح نہین ہو سکتی، چنانچہ اقبال کے اخلاقی تصورات مین جس صفت کی عمل کے پہلو بہ پہلو اہمیت ہے، وہ قوت اور اس کے حصول کی جد و جہد ہے، کہین زندگی کو قوت کہہ کر اس کے حصول پر آمادہ کیا ہے، کہین قوت کو زندگی کا حاصل کہا ہے، کہین اقتدار و تسلط کو زندگی کی بنیاد قرار دیا ہے، کہین اسی قوت کو خیر و شر تک کا معیار بنا دیا ہے۔

اصل او از ذوق استیلا ستے — زندگانی قوت پیداستے

شرح رمز حق و باطل زندگی ست — زندگی کشت است و حاصل زندگی ست

خیر را گوید شرے شری شود — از کہن او زہر کوثر می شود

حسن و جمال تک کی بنیاد قوت و اقتدار پر قائم ہے،

کہ سر بسجدہ ہین قوت کے سامنے افلاک — مری نظر مین یہی ہے جمال و زیبائی

چونکہ زندگی اور قوت ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہین، زندگی وہی ہے جو قوت سے اس لئے زندگی کا طول و قصر عمر کی درازی اور کوتاہی سے نہین ناپا جا سکتا، بلکہ قوت سے پیمائش کیا جائے گی،

یکدم شیری بہ از صد سال میش — زندگی را چیست رسم و دین و کیش

ضعف و ناتوانی بہت سے اخلاقی عیوب پیدا کر دیتی ہے، خوف دروغ بافی ناتوانی کے زائیدہ نتائج ہین، اس طرح زندگی کا صحیح اظہار نہین ہوتا،

بطن او از خوف و دم آبستن است — ناتوانی زندگی را رہزن است

رحم شفقت انکسار مجبوری اور معذوری سب کے باطن مین ایک ہی حقیقت پوشیدہ ہے، اور وہ ہے کمزوری اور ناتوانی، لوگون نے اس عیب کو چھپانے کے لئے رنگ برنگ کے خوبصورت پردے ڈال دیئے ہین،

گاہ ہی پوشد ردائے انکسار — گاہ او را رحم و نرمی پردہ دار

sion numbers
0.462....

گاہ او مستور در مجبوری است گاہ پنہان در تہِ معذوری است

اقبال کے نزدیک ضعف اور ناتوانی انسانیت کا ایسا جرم ہے، جس کی سزا فطرت کے نزدیک اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس سے کائنات کی سب سے بڑی چیز زندگی کو اوس سے سلب کر لیا جائے،

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

اقبال یہ برداشت نہین کرتے کہ انسان قوتون کا محکوم رہکر زندگی بسر کرے اگر حاکمانہ اقتدار کے ساتھ وہ زندہ نہین رہ سکتا، تو پھر اوس کو ہر قسم کے تعلقات کو منقطع کر دینا چاہئے اور زندگی کے جو دن بھی باقی ہون وہ اس طرح گذار دینے چاہئین، کہ

ع نے غلام اور انہ او کس را غلام

اُن کی تعلیم یہ ہے کہ

دنیا ے دون کی کب تک غلامی یا راہبی کر یا پادشاہی

صفاتِ فاضلہ | کائنات کی نو بہ نو تعمیر اور درجہ بدرجہ ارتقار کے لئے مخصوص حصہ لے کر نیابت الٰہی کا فریضہ ادا کرنا محض عمل اور قوت کے بل پر ممکن نہین، اس کے لئے مختلف قسم کی اعلیٰ صفات کی ضرورت ہے، چنانچہ اقبال نے اپنے کلام مین جا بجا اعلیٰ ملکات اور بلند صفات پر زور دیا ہے، اور ان کو پیدا کرنے کی تلقین کی ہے، اور اس بارے مین اسلامی تعلیم کو عام معیار کے طور پر پیش کیا ہے،

نیابتِ الٰہی یا امامت کے لئے صداقت، عدالت، شجاعت ضروری اوصاف ہین، محبت اور اخوت کے بغیر قدرت کے مقصد کی تکمیل نہین ہوتی،

ہزار خوف ہو لیکن زبان ہو دل کی رفیق یہی رہا ہے ازل سے قلندرون کا طریق

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

یہی مقصود فطرت ہے یہی رمز مسلمانی ۔۔۔ اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی

اطاعت کوشی آئین پسندی ضبط نفس تسلیم و رضا مرد حق کے ضروری اوصاف ہیں،

در اطاعت کوش اے غفلت شعار ۔۔۔ می شود از جبر پیدا اختیار

ہر کہ تسخیر مہ و پروین کند ۔۔۔ خویش را زنجیری آئین کند

ہر کہ بر خود نیست فرمانش رواں ۔۔۔ می شود فرمان پذیر از دیگراں

زندگی محکم ز تسلیم و رضا است ۔۔۔ موت نیرنج و طلسم و سیمیا است

جب تک انسان قید مقام و وطن سے آزاد نہیں ہوتا، اور اپنے زاویہ نظر میں وسعت پیدا نہیں کرتا، آفاق گیری کے صحیح ولولے پیدا نہیں ہوتے، کیونکہ آفاق گیری کا اصل مقصد افراد اور اقوام کو غلام بنانا نہیں، بلکہ عام اصلاح اور عام ارتقا ہے،

دلوں میں ولولے آفاق گیری کے نہیں اٹھتے ۔۔۔ نگاہوں میں اگر پیدا نہ ہو انداز آفاقی

بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام ۔۔۔ نے غلام او را نہ او کس را غلام

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی ۔۔۔ گھر میرا نہ دلی نہ صفاہان نہ سمرقند

خلافت بر مقام ما گواہی است ۔۔۔ حرام است آنچہ بر ما پادشاہی است

غیوری، خودداری، بلند حوصلگی، حق گوئی، بیباکی، شیرین سخنی، سوختہ جانی اور شفقت کے بغیر زندگی کے بلند و بالا مقاصد کی تکمیل نہیں ہو سکتی،

غیرت ہے بڑی چیز جہان تگ و دو میں ۔۔۔ پہناتی ہے درویش کو تاج سر دارا

نگہ بلند سخن دلنواز جاں پرسوز ۔۔۔ یہی ہے رخت سفر میر کارواں کیلئے

آئین جوانمرداں حق گوئی و بیباکی ۔۔۔ اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اس کی نفرت بھی عمیق اسکی محبت بھی عمیق ۔۔۔ قہر بھی اس کا ہے اللہ کے بندوں پہ شفیق

در جہان ہر فتح از کرّاری است — آبروے مرد از خودداری است

اعلیٰ سے اعلیٰ خوبیاں بلند سے بلند مقاصد شوق و ذوق اور علم و عمل ہر چیز بے کار ہے، اگر اس میں غرض اور ذاتی منفعت کی آمیزش ہے، قدرت کا ہاتھ بٹانے کے لئے قدرت جیسی پاکیزگی کی ضرورت ہے، ورنہ آدمی سب کچھ کرسکتا ہے لیکن نیابت الٰہی کا فریضہ ادا نہیں کرسکتا،

دست نہ در روح میں پاکیزگی تو ستانا کیا — ضمیر پاک خیال بلند و ذوق لطیف

جو خود دنیا میں پھنسا ہوا ہے، وہ دنیا کی اصلاح کس طرح کرسکتا ہے، دنیا کے غلام سے دنیا کی تسخیر کس طرح ممکن ہے،

حیات چیست جہان را اسیر جان کردن — تو خود اسیر جہانی کجا توانی کرد

اس پر قابو پانے کے لئے سب سے پہلی شرط اس کے پھندوں سے اپنے آپ کو آزاد کرنا ہے،

راکبش بودن از و وارستن است — از مقام آب و گل برجستن است

اقبال کے نزدیک دنیا کے علائق سے نجات حاصل کرنے کے معنی ترک و رہبانیت نہیں ہیں بلکہ اس پر قابو پالینا اور قدرت کے مقاصد سے ہم آہنگ کرلینا ہیں،

اے کہ از ترک جہاں گوئی مگو — ترک این دیر کہن تسخیر او

اگر اقبال کے کلام کا استقصا کیا جائے، تو بہت کم ایسے اعمال حسنہ اور اخلاق فاضلہ بھی نکلیں گے جن پر انھوں نے مختلف انداز اور نئے نئے پیرایہ بیان سے اپنے مخاطبین کو ابھارنے کی کوشش کی ہو، اُن کے اخلاقی تصورات کی یہ قابل لحاظ خصوصیت ہے، کہ وہ بڑی حد تک مثبت ہیں، حتی کہ بعض ایسی صفات بھی جو قطعی منفی زاویہ نظر کی ترجمانی کرتی تھیں، اقبال نے اُن کی تشریح بھی کچھ اس طرح کی ہے کہ وہ خالص مثبت ہوگئی ہیں، اور کچھ نہ کرنے کے بجائے اُن میں بھی بہت کچھ کرنے کی ضرورت پیدا کردی ہے،

اقبال کی اخلاقیات کا جماعتی پہلو

اقبال کائنات کو افراد اور شخصیتوں کا مجموعہ سمجھتے ہیں، چنانچہ عالم انسانیت بھی اُنکے نزدیک مستقل افراد اور شخصیتوں کا اجتماع ہے، افراد کے حاصل جمع کا نام جماعت ہے،

جماعت خود کسی ایسی حقیقت پر شامل نہیں ہوتی جس سے افراد عاری ہوں،

فرد و قوم آئینۂ یک دیگر اند سلک و گوہر کہکشان و اختر اند

اس لئے جماعت کی اصلاح اور ارتقا، افراد کی اصلاح اور ارتقار کا دوسرا نام ہے،

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

تاہم انسان کی قدرتی صلاحیتوں کی بہت بڑی تعداد ایسی ہے جس کا اظہار اجتماعی زندگی کے بغیر ممکن نہیں، فرد اپنی پوری صلاحیتوں کو روبکار لانے کے لئے دوسرے افراد سے تعاون کرنے پر مجبور ہے، جب تک افراد باہمی تعاون کے کسی معاشرے اور جماعت کی تشکیل نہ کریں، اُن کی اپنی تکمیل نہیں ہوتی،

فرد را ربط جماعت رحمت است جوہر او را کمال از ملت است

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

جماعت اور معاشرے کی تشکیل اس کے بغیر ممکن نہیں، کہ افراد اپنے شخصی مقاصد اور نصب العین کی اس انداز سے تعمیر کریں، کہ جماعت سے ہم آہنگی پیدا ہو سکے، ورنہ تصادم جماعت کے شیرازے کو منتشر کر دے گا، اور معاشرت تشکیل نہیں پائے گی،

حضور ملت از خود در گذشتن دگر بانگ "انا الملت" کشیدن

آئین پسندی، اطاعت کوشی، عدالت وغیرہ صفات اچھے افراد کی نسبت اچھی جماعت کے لئے زیادہ ضروری ہیں، ان اوصاف پر اقبال کا زور دینا جماعتی اخلاق کی بنیاد رکھنا ہے،

اقبال ایسے معاشرے کی بنیاد جس کا مقصد کائنات کی اصلاح اور ارتقا ہے، ملک، نسب یا رنگ و بو پر نہیں رکھتے،

نیست از روم و عرب پیوندِ ما   نیست پابند نسب پیوند ما

اُن کے نزدیک جمعیت افراد کا مرکز اور ملی وحدت کا شیرازہ محبوب حجازی کا سے تشبہ یا سیرت محمدی کا اتباع ہے،

دل با محبوب حجازی بستہ ایم   زین جہت با یکدگر پیوستہ ایم

اقبال کے نزدیک محبوب حجازی سے وابستگی جارحانہ فرقہ بندی نہین بلکہ عالم انسانی کا حیات کی اعلیٰ قدرون اور بلند نصب العینون پر بلاامتیاز جمع ہوجانا ہے،

در جہان وابستۂ دینش حیات   نیست ممکن جز بآئینش حیات

اقبال جس طرح کی معاشرت چاہتے ہین، وہ جاگیر دارانہ یا سرمایہ دارانہ معاشرت نہین، جو کمزورون کی لوٹ کھسوٹ کے بل بوتے پر قائم ہو، نہ وہ اشتراکیت یا اشتمالیت کو صالح معاشرت کی بنیاد سمجھتے ہین، ان کا معاشرہ اخوت، محبت اور خلوص پر قائم ہے، اس معاشرے کا ہر فرد اعلیٰ اخلاق کا مجسمہ اور بلند روحانی قدرون کا پیکر ہونا چاہئے، مادی قوتون سے مسلح ہوکر ایمانی طاقتون پر بھروسہ رکھنے والا کائنات کی زندہ اور فعال قوت اور اس طرح "خیر اُمۃ اخرجت للناس" کا صحیح مصداق ہے،

برگ و ساز ما کتاب و حکمت است   این دو قوت اعتبار ملت است

این فتوحات جہان ذوق و شوق   وین فتوحات جہان تحت و فوق

تبصرہ | اقبال کے اخلاقی تصورات کا یہ سرسری بیان ہے جو اُن کے منظوم کلام اور خطبات وغیرہ کو ادھر اودھر سے پڑھکر مرتب کیا گیا ہے، تاہم یہ کوشش کی گئی ہے کہ اس سلسلہ کا کوئی اہم اور ضروری نقطہ نہ رہ جائے، کائنات کی مقصدیت، جبر و اختیار اور ارادی فعلیت پر مین نے اپنے دوسرے مقالون مین بحث کی ہے، یہان صرف ان بعض مسائل پر اچٹتی سی نظر ڈالنی ہے، جو اقبال کی اخلاقیات مین خاص اہمیت رکھتے ہین، مقصد اقبال پر نقد نہین، بلکہ اہلِ علم کے سامنے فکر اقبال کے بعض ان گوشون

کوشش کرنا ہے، جو مجھ جیسے فلسفہ کے کم سواد طلبہ کے لئے تاریک اور مبہم معلوم ہوتے ہیں،

اقبال اعمال کی قدر و قیمت پر شخصیت کے موقف سے نظر ڈالتے ہیں، اعمال کے خیر و شر ہونے کا مستقل معیار شخصیت کا ضعف اور استحکام ہے، اگر ضعف اور استحکام کا مفہوم شخصیت کی جمعیت اور قوت یا ناتوانی اور انتشار ہے تو ہر مقصد جس کو حاصل کرنے کی دل میں لگن اور ہوک جمعیت خاطر کا سامان بن سکتا ہے، اور انسان کی مخفی صلاحیتوں اور عملی طاقتوں کو ایک مرکز پر جمع کرکے خود اظہاری کا موقع فراہم کر سکتا ہے، ایسی صورت میں کسی مقصد کو اور اس کے وسائل حصول یعنی عمل کو خیر و شر کیسے کہا جا سکتا ہے،

کائنات کی عام فکری خصوصیت ارتقاء پر نظر رکھتے ہوئے مقاصد اور وسائل یعنی اعمال کے خیر ہونے کے لئے ان کا ارتقائی ہونا ضروری قرار دیا جائے، تو خیر و شر کا معیار استحکام اور ضعف کے بجائے ارتقاء اور انحطاط کو ماننا پڑے گا، علاوہ ازیں خود ارتقاء اور انحطاط کا تعین کس پیمانے سے ہوگا، خصوصاً ارادی ارتقاء کا، کیونکہ مقصد کے حوالہ کے بغیر ارتقاء خود بے معنی ہے، اقبال استحکام شخصیت کے علاوہ کسی قسم کی مستقل قدر کو تسلیم نہیں کرتے، کہ اُن کے تحت انسانی اعمال کا محاسبہ کیا جا سکے، اور وہ عام اخلاقی معیار کا کوئی م دین، وہ تو ہر کارنامہ کو وہ گناہ ہی کیوں نہ ہو ثواب کہکر انسان کی خفتہ صلاحیتوں کو طرح طرح کے نئے نئے عملوں کے تئے بیدار کرنا چاہتے ہیں، تاکہ مظاہرۂ حیات اثبات خودی کا فکری تقاضا پورا ہو، اور جو صد جہانِ خودی کے بطن میں آرزوؤں کی شکل میں پوشیدہ ہیں، حقیقت بن کر خارجی دنیا میں جلوہ ریز ہوں،

صد جہاں پوشیدہ اندر ذاتِ او ۔۔۔ غیرِ او پیداست از اثباتِ او

بے ذوقِ نمود زندگی موت ۔۔۔ تعمیر خودی میں ہے خدائی

اقبال نے فنیاتی حیات یا شخصیت کے استحکام کی آخری حد یہ قرار دی ہے، کہ موت کا صدمہ بھی اس میں اضمحلال اور انتشار پیدا نہ کر سکے، اور خودی کی عنصری تالیف بحالہ باقی رہے، اور یوں شخصی

بقار کا خواب حقیقت بن جائے،

ازین مرگے کہ می آید چہ باک است خودی چون پختہ شد از مرگ پاک است

خودی ہو زندہ تو ہے موت اک مقامِ حیات کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحانِ ثبات

اس قسم کا استحکام نہ ہمارا طبیعاتی تجربہ ہے، اور نہ نفسیاتی یا وجدانی مشاہدہ، مزید بران خود اقبال کی مابعد الطبیعاتی تشریح کا بھی منطقی نتیجہ نہین، مذہب حیات بعد الموت کو تسلیم کرتا ہے لیکن صفت اور استحکام پر کسی قسم کی روشنی نہین ڈالتا، اقبال خودی کی اس غیر معمولی پختگی کو انسان کی عام قسمت نہین سمجھتے بلکہ خاص اعمال کا نتیجہ قرار دیتے ہین، یہ خاص اعمال، اعمالِ خیر کے سوا نہین، یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ شخصیت یا ارتقار کے موقعت سے اعمال کے خیر و شر مین تقسیم کافی دشوار ہے، مستقل اقدار کا سوال نہین صرف مذہب رہجاتا ہے، اور اس کو آئین حیات کی تفسیر مان کر خیر و شر کے بارے میں اس کی رہنمائی پر اعتماد کر سکتے ہین،

علم حق غیر از شریعت ہیچ نیست اصل سنت جز محبت ہیچ نیست

ہست دینِ مصطفےٰ دینِ حیات شرعِ او تفسیر آئین حیات

لیکن اقبال خود مذہب کو بھی اطلاقی قدر نہین تسلیم کرتے، بلکہ اس کے لئے بھی شخصیت کو ہی معیار مانتے ہین، ایسی حالت مین اُن کے فلسفۂ اخلاق مین صفاتِ فاضلہ اور اعمال حسنہ کے لئے گنجایش نکالنا کافی دشوار ہے،

جاوید نامہ مین ایک مقام پر حق تعالی کے احکام کو مردِ حق کی رسم و راہ اس کے دین و آئین اور خوب و زشت کا معیار قرار دیا ہے،

رسم و راہ و دین و آئینش ز حق

زشت و خوب و تلخ و نوشینش ز حق

حق تعالیٰ کے احکام کو دریافت کرنے کا ذریعہ وحی الٰہی ہے، وحی الٰہی کی عام خصوصیت یہ بیان کی ہے کہ سب کی فلاح اور فائدہ پر اسکی نظر رہتی ہے،

وحی حق بینندۂ سود ہمہ در نگاہش سود و بہبود ہمہ

خیر وشر کے بارے مین سود و بہبود ہمہ کا نظریہ خالص افادی نظریہ ہے، جس کو تسلیم کرنا بقول اقبال گویا عقلیت کے سامنے اعتقاد کا ہتھیار ڈال دینا ہے،

خیر وشر کے بارے مین اس اختلاف سے شاعرانہ تخیلی اضطراب کہہ کر صرف نظر نہین کیجا سکتی، یہ اضطراب حقیقۃً زیادہ گہری بنیادین رکھتا ہے،

خیر وشر کا مسئلہ قدیم سے مسلم مفکرین کی بحث و نظر کا آماجگاہ رہا ہے، اگر شریعت اور وحی الٰہی کو خیر وشر کا آخری معیار قرار دیا جائے، جیسا کہ اشاعرہ کہتے ہین، تو اس منطقی دشواری سے قطع نظر کہ خود شریعت اور وحی بھی شریعت اور وحی پر موقوف ہو جائے گی، بڑی مشکل یہ ہے کہ ہر قسم کے آئینی، اخلاقی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظامون اور ضابطون پر نقد و نظر مین ہمارا موقف تجزیہ اور منفی ہو جائے گا، علاوہ ازین مادی دنیا کی عقل عمومی اس کو کس طرح باور کرے گی کہ صرف وہ اعمال حسن ہین، جن کو شریعت نے حسن کہا ہے، مادی نتائج کچھ بھی ہون اُن سے بحث نہین، اور اگر عقل کو اس بارے مین حاکم مطلق مانا جائے تو شریعت کی ضرورت خطرے مین پڑ جاتی ہے، ساتھ ساتھ جزئیات شریعت مین عقل و نقل کی تطبیق کی دشواری سے دوچار ہونا پڑتا ہے،

عام اہل سنت نے اس گتھی کو یون سلجھایا کہ باری تعالیٰ کے وجود اور نبی علیہ السلام کی راست گوئی کو ابتداءً عقل سے ثابت کرنے کی کوشش کی شرعی اوامر اور نواہی کے حسن و قبح کو دریافت کرنے کا ذریعہ اصولاً عقل کو تسلیم کیا اور جہان انسانی عقل معطل نظر آئی، وہان اس وجہ سے کہ حکیم و خبیر ذات کے اوامر و نواہی مصلحت عامہ سے عاری نہین ہو سکتے ہین، اپنی عقل کی کوتاہی کا اعتراف کرلیا،

غور سے دیکھا جائے تو دونوں خیالوں کی بنیاد اعتقاد پر ہے کہیں بواسطہ اور کہیں بلا واسطہ، اقبال کی مذہبیت نہ تو انھیں محض عقل کی راہبری پر بھروسہ کرنے دیتی ہے، اور نہ اُن کی منطقی فکر محض نقل پر قانع رہ سکتی ہے، عام اہلِ سنت کا زاویۂ نظر بھی انھیں کچھ زیادہ مطمئن نہیں کرتا، اقبال کی فکر کا یہ داخلی خلفشار حقیقۃً علت ہے، اس عام اضطراب اور اختلاف کی جو خیر و شر کے سوال پر اُن کے کلام خصوصاً نظم میں جا بجا نمایاں ہے، اقبال کی ہی خصوصیت نہیں، بلکہ اس دور کے بعض دیگر مسلم اہلِ فکر بھی جو اپنے زاویۂ نظر کو زیادہ سے زیادہ اسلامی بنانا چاہتے ہیں، اس ذہنی خلفشار سے اپنے کو محفوظ نہیں رکھ سکے اور مروجہ نظاموں پر ان کا انتقاد تعمیری ہونے کے بجائے زیادہ تر تخریبی ہو گیا،

صفاتِ فاضلہ کے بارے میں اقبال کی پوری تعلیم پر یک جائی نظر ڈالی جائے تو متضاد تصورات سامنے آتے ہیں، قوت کے بارے میں اُن کی تعلیم نٹشے کے مقتدرانہ اخلاق کا چربہ معلوم ہوتی ہے، جس کو انھوں نے عام اخلاق بنانے کی کوشش کی ہے، لیکن یہ کوشش بہت زیادہ کامیاب نہیں، "کشت زندگی کا حاصل قوت ہے"، "دم بھر کی شیری سو سال کی میشی سے افضل ہے"، "زندگی کی اصل ذوقِ استیلا ہے"، "رحم، نرمی، انکسار، ناتوانی کو چھپانے کے پردے ہیں"، "فطرت لہو ترنگ ہے"، "کبوتر پر جھپٹنے میں خود ایک مزہ ہے[۱]"، "خودی رستے ہیں، راہبی یا سلطانی"، یہ اور اس جیسی تعلیم کو عام اخلاق کی بنیاد کس طرح بنایا جا سکتا ہے، افراد کو ملت میں گم کر کے "انا الملت" کے نعرے کی اول تو اُن کے فلسفے میں گنجائش نہیں، خودی کو عمل اور جد و جہد سے توانا اور مستحکم بنانا فرد کا فریضہ ہے، اعلیٰ مقاصد پر شکوہ آرزوؤں اور بلند جذبات رکھنے اور ان کو عمل میں لانے میں کسی کو کسی پر ترجیح کی اس فلسفے میں کوئی معقول وجہ نہیں، اگر ہر چیز محو خود نمائی ہے[۲]، رائی زورِ خودی سے پربت ہو سکتی ہے[۳]،

---

[۱] جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزہ ہے اے پسر — وہ مزہ شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں،
[۲] ہر چیز ہے محو خود نمائی — ہر ذرہ شہید کبریائی
[۳] رائی زورِ خودی سے پربت — پربت ضعفِ خودی سے رائی

افراد کی بہت بڑی تعداد چند اشخاص کی قیادت برداشت کرکے مظاہرۂ حیات کی قربانی خواہش
دن دہائے، تاہم اگر فرد کے بجائے قوم کو مستقل وحدت مان کر اس تعلیم پر قومی اخلاق کی تعمیر کیجائے
انسانی دنیا کتنی پرآشوب ہو جائے گی،

واقعہ یہ ہے کہ اقبال نے اپنے اخلاقی تصورات میں اسلامی اخلاق کو مرکزی حیثیت دینی چاہی
ساتھ ساتھ عام مسلمانوں کے ضعف اور اضمحلال سے وہ متاثر ہوئے، مغربی اقوام کی جد وجہد اور مادی
قوتوں کی تسخیر کو انھوں نے محسوس کیا، فلسفۂ اخلاق کے مختلف مکاتب خیال کا مطالعہ ان سب پر
مستزاد، نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی فکر کو نہ تو پوری طرح منطقی آزادی میسر آسکی اور نہ وہ اپنی فکر اوس کے منطقی
نتائج تک پہنچا سکے، کائنات کی مابعد الطبعیاتی تشریح نے مستقل اور معروضی اقدار کے لئے کوئی
بنیاد نہیں چھوڑی، جس کی وجہ سے صفاتِ فاضلہ کو اخلاق میں پیوست کرنا بڑا دشوار ہو گیا، حالات
اور تاثرات تصورات کے اس توازن کو قائم رکھنے میں کامیاب نہ ہوئے جن کے وہ مستحق تھے،

امام ذہبی کے چند نادر رسالے

از

جناب مولوی مجیب اللہ صاحب رفیق دار المصنفین

امام ذہبی متوفی ۷۴۸ھ ان اساطین امت مین ہین جن کی تصانیف سے رجال و طبقات اور حدیث کا کوئی طالب علم بے نیاز نہین ہو سکتا، اُن کی تصانیف کی تعداد سو سے متجاوز ہے جن مین سے بیشتر حیدرآباد اور مصر سے چھپ کر عام ہو چکی ہین، حال ہی مین ان کے چند نادر رسالے لجنۃ احیار المعارف النعمانیہ حیدرآباد کے زیر اہتمام مصر سے شائع ہوئے ہین۔ ان رسالون کی اہمیت اس کی متقاضی تھی، کہ انکا اردو ترجمہ شائع کیا جاتا، لیکن یہ کام فی الحال دشوار ہے، اس لئے اہل ذوق کی دلچسپی کی خاطر سر دست ان کا مختصر تعارف اور ان کی خصوصیات کا تذکرہ کر دینا مناسب معلوم ہوا،

امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ جلد اول مین امام ابوحنیفہ کے ذکر مین لکھا ہے، کہ مین نے امام صاحب کے حالات مین ایک الگ رسالہ لکھا ہے، اسی طرح ...... امام ابو یوسف کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے، کہ مین نے امام ابو یوسف اور اُن کے "صاحب" محمد بن الحسن (امام محمد) کے حالات کو بھی الگ الگ رسالہ مین جمع کر دیا ہے، تذکرون مین ان رسالون کے حوالے تو ضرور آتے تھے، مگر اُن کے موجود ہونے کا کوئی علم نہین تھا، مولانا شیخ ابوالوفا صاحب مجلس احیاء المعارف کے صدر اور علامہ احمد الکوثری مصری قابل مبارکباد ہین کہ انھون نے کوشش کر کے ان نوادر کو حاصل کیا، اور مفید حواشی اور تعلیقات کے ساتھ طبع کرا کے شائع کیا، جو حصہ امام صاحب پر ہو

اس کی ضخامت ۳۲ صفحے اور جو امام ابو یوسف پر ہے اس کی پندرہ صفحے، اور جو امام محمد پر ہے، اس کی ضخامت آٹھ صفحے
ان رسالون کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ائمۂ ثلاثہ کے متعلق جو بہت سی غلط روایتین مشہور ہو گئی ہین اور جنھیں عام ارباب تذکرہ تحقیق و تنقید کے بغیر نقل کرکے اپنی کتابون کو داغدار بناتے ہین، ان روایتون کی کوئی اصل نہین، وہ محض قصے کہانیان ہین، مثلاً مشہور ہے کہ امام صاحب خلق قرآن کے قائل تھے امام ذہبی نے اس بارہ مین امام احمد بن حنبل کا یہ قول نقل کیا ہے،

لم یصح عندنا ان اباحنیفة	ہمارے نزدیک یہ بات صحیح نہین ہے کہ امام
قال القران مخلوق،	امام ابو حنیفہ خلق قرآن کے قائل تھے'

اسی طرح خطیب بغدادی وغیرہ نے بعض ایسے اقوال نقل کئے ہین جن مین امام صاحب کو جہمی و مرجی وغیرہ کہا گیا ہے لیکن امام ذہبی نے عبد الحمید الحمانی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ مین نے اپنے والد سے سُنا ہے کہ امام صاحب فرماتے تھے کہ جہم بن صفوان کا فر ہے" (ص ۲۷)

یہ بات قابل غور ہے کہ امام صاحب اہل قبلہ کی تکفیر میں بہت سخت تھے، اُن کا قول تھا کہ اہل قبلہ کی تکفیر حرام ہے لیکن اس شدت کے باوجود انھون نے جہم کی تکفیر کی ہے، جس کے معنی یہ ہوئے کہ امام صاحب جہم بن صفوان کے عقائد کو اہل قبلہ کا اختلاف نہین سمجھتے تھے،

امام صاحب کی عبادت اور زہد و ورع ایک مسلّم واقعہ ہے لیکن اس بارے مین عام ارباب تذکرہ نے مبالغے سے کام لیا ہے، مثلاً مشہور ہے کہ امام صاحب رات کو بالکل سوتے نہین تھے، لیکن امام ذہبی نے امام ابو یوسف سے روایت نقل کی ہے کہ وہ ایک روز امام صاحب کے ساتھ کہین جا رہے تھے، راستہ مین ایک شخص نے دوسرے شخص سے امام صاحب کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ یہ امام ابو حنیفہ ہین جو رات کے وقت بالکل نہین سوتے، امام صاحب نے سنا تو فرمایا:-

"میرے بارے مین ایسی باتین نہین کرنی چاہئے جو مجھ مین نہین ہین" (ص ۱۷)

اسی بارے مین ایک دوسری روایت امام صاحب کی ام ولد سے ہے، کہ امام صاحب کو مین جب جانتی ہون انھین بستر پر سوتے نہین دیکھا، بلکہ گرمیون کے زمانہ مین دن کے وقت ظہر و عصر کے درمیان اور رات کو مسجد مین سو رہتے تھے، اور جاڑون مین رات کے پہلے حصہ مین سو جایا کرتے تھے" (ص ۱۲)

اس سے معلوم ہوا کہ امام صاحب زہد و ورع کی وجہ سے بستر وغیرہ کا اہتمام نہین کرتے تھے، لیکن یہ بات کہ وہ بالکل سوتے ہی نہ تھے، روایت و درایت کے خلاف ہے،

امام صاحب کے اخلاق و عادات کے متعلق امام ذہبی نے اس رسالہ مین بہت سی ایسی روایتین نقل کی ہین، جو دوسری کتابون مین نہین ملتین، مثلاً مثنی بن رجار کا بیان ہے کہ امام صاحب سچی قسم بھی کھاتے تھے، تو غایت احتیاط مین ایک دینار صدقہ کرتے تھے، اور ان کا دستور تھا کہ جتنا وہ اپنے اہل و عیال پر صرف کرتے تھے، اتنا ہی غربا پر صدقہ کرتے تھے،

شیخ خریبی بیان کرتے ہین کہ مین امام صاحب کی مجلس مین موجود تھا کہ ایک شخص آیا اور امام صاحب سے کہا کہ مین نے ایک خط بالکل آپ کی تحریر مین آپ کی طرف سے فلان شخص کے پاس بھیجا تھا، اس نے مجھے چار ہزار درہم دیئے ہین، امام صاحب نے فرمایا تم لوگ اس طرح (میرے نام سے) فائدہ اٹھاتے ہو تو اٹھاؤ (ص ۱۱)

امام ذہبی نے امام صاحب کی توثیق و تعدیل کی بہت سی روایتین نقل کی ہین، اور احتجاج بالحدیث کی ایک علحدہ سرخی قائم کی ہے، اور اس کے تحت لکھا ہے کہ امام صاحب کی احادیث کے بارے مین علماء مین اختلاف ہے بعض لوگ ان کی حدیثون کو قبول کرتے ہین اور ان سے احتجاج کرتے ہین، اور کچھ لوگ اس سلسلہ مین ان کو کچھ ضعیف سمجھتے ہین، اس کے بعد لکھتے ہین کہ امام صاحب نے اپنی توجہ زیادہ تر قرآن و فقہ پر مبذول رکھی، احادیث کے الفاظ اور ان کی اسناد کے ضبط و حفظ پر ائمہ فن کی طرح توجہ نہین دی، یہی حال تمام اہل فن کا ہے کہ ان کا جو خاص فن ہوتا ہے، وہ دوسرے فنون سے اپنی ساری توجہ ہٹا کر اسی مخصوص فن پر مرکوز کر دیتے ہین، اس سے ان کی عدالت اور ثقاہت پر کوئی اثر نہین پڑتا، اور

پھر امام صاحب کی ذات تو تنقیص و تکذیب سے بہت بلند ہے، (ص ۴۰)

اس سے زیادہ منصفانہ بات امام صاحب سے احتجاج بالحدیث کے بارے مین نہین کی جاسکتی،

امام ذہبی نے امام صاحب کا تذکرہ عباد وانحار کے اس خواب پر ختم کیا ہے، جو دوسرے تذکرون مین

نہین ہے، عباد کا بیان ہے کہ مین نے امام صاحب کو خواب مین دیکھا، اور ان سے دریافت کیا کہ آپ

کس حال مین ہین، انھون نے فرمایا کہ خدا کی وسیع رحمت مین، مینے پھر پوچھا کہ کیا یہ مرتبہ علم کی وجہ سے

ملا ہے، فرمایا افسوس! علم کیسا تھ کچھ شرطین اور کچھ آفتین لگی ہوئی ہین، کم ہی لوگ ان آفتون سے بچتے ہین،

مین نے پوچھا کہ پھر یہ مرتبہ آپ کو کس نیکی کے صلہ مین حاصل ہوا، فرمایا کہ میری نسبت لوگون کے ان باتون کے

کہنے کے سبب سے جو مجھ مین نہیں ہیں، (ص ۴۳)

امام ابو یوسف | امام ابو یوسف کے ترجمہ مین عام ارباب تذکرہ یہ روایت نقل کرتے ہین کہ وہ امام صاحب کے درس

مین شریک رہا کرتے تھے، ان کی والدہ آکر ان کو اٹھا لیجایا کرتی تھین، ایک روز امام صاحب نے اُن سے فرمایا

کہ نیک بخت جا! یہ علم سیکھ کر فالودہ روغن پستہ کے ساتھ کھائے گا، چنانچہ جب وہ قاضی القضاۃ ہوئے تو

ایک بار ہارون رشید کے دسترخوان پر فالودہ پیش ہوا، خلیفہ نے اُن سے کھانے کو کہا، اور کہا کہ روزانہ تیار

نہین ہوتا، پوچھا امیر المومنین یہ کیا ہے، کہا کہ فالودہ اور روغن پستہ، اس پر امام ابو یوسف ہنس پڑے اور

امام صاحب کی یہ پیشین گوئی سنائی (تاریخ بغداد)

امام ذہبی نے درس سے اٹھا لیجانے کا واقعہ ان کے والد کی طرف منسوب کیا ہے، اور پورا

واقعہ بیان کرنے کے بعد بہت کمزور انداز مین (ذکر) یہ لکھا ہے کہ بعض ... لوگ اُن کی والدہ

کی طرف بھی اسے منسوب کرتے ہین، لیکن اسی کے ساتھ انھون نے اُن کی والدہ یا والد کے قصہ

مین یہ فالودہ کا واقعہ بالکل نظر انداز کر دیا ہے،

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کی حیثیت قصہ سے زیادہ نہین ہے،

جن روایتون مین امام ابو یوسف کی تنقیص یا ان پر سخت جرح کی گئی ہے، ان روایتون کے متعلق امام ذہبی فرماتے ہین، کہ امام ابو یوسف کی سیادت و کرم، اخلاق و مروت اور علم و فضل کے بارے مین ائمۂ ثقات سے اس کثرت سے اقوال منقول ہین کہ ان مخالف روایتون کو کسی طرح صحیح تسلیم نہین کیا جا سکتا، یہ جرح و تنقیص کی روایتین زیادہ تر عقیلی اور ابن ثابت کی طبع زاد ہین؛

امام محمد | امام محمد کے متعلق بھی تذکرون مین بعض ایسی روایتین داخل ہو گئی ہین جن سے اُن کی شخصیت پر حرف آتا ہے، اور عقل سلیم اُن کے قبول کرنے پر آمادہ نہین ہوتی، امام ذہبی کو اللہ تعالیٰ جزاے خیر دے کہ انھون نے مستند طور پر ان روایتون کو مجروح کر دیا ہے،

عہدۂ قضا کے سلسلہ مین امام ابو یوسف اور امام محمد کے درمیان تھوڑی سی شکر رنجی ہو گئی تھی جس کی بنا پر ان بزرگون کے درمیان آمد و رفت منقطع ہو گئی تھی، اس شکر رنجی کے اسباب کے بارہ مین خطیب نے تاریخ بغداد مین اور امام سرخسی نے مبسوط مین یہ لکھا ہے کہ امام محمد کی ذکاوت و ذہانت اور اُن کی طرف لوگون کے عام رجحان اور اُن کے درس کی شہرت کی بنا پر امام ابو یوسف اُن سے حسد کرتے تھے اور ان کی شہرت پر پردہ ڈالنے کی تدبیرین کیا کرتے تھے کہ اگر ہارون رشید کو ان کے ان اوصاف کی اطلاع ہو گئی اور اس نے امام محمد کو دربار شاہی سے منسلک کر لیا، تو ان کی عزت کم ہو جائیگی،

لیکن اگر ذرا تامل سے کام لیا جائے، تو خود عقل ... اس روایت کے قبول کرنے سے اِبا کرتی ہے؛ اس لئے کہ امام ابو یوسف اور امام محمد کا تعلق معاصرانہ نہین، بلکہ استاد و شاگرد کا تھا، اور اس تعلق مین رشک و حسد خصوصًا ان برگزیدہ ہستیون کے درمیان بے معنی سی بات ہے، اور پھر امام ابو یوسف بغداد مین قاضی تھے، اور امام محمد کی مجلس درس کوفہ مین تھی، اس بعد مسافت کے باوجود امام محمد کی ذہانت و ذکاوت یا اُن کی طرف عام رجحان کا اثر امام ابو یوسف کی شخصیت پر کیا پڑ سکتا تھا اور جب کہ دونون کے فرو اعزاز کی نوعیت بالکل جدا تھی،

یہ عجیب بات ہے کہ عام ارباب تذکرہ نے امام محمد کے جن اوصاف کے اخفار کو ..... امام ابو یوسف سے ان کے اختلاف کا سبب قرار دیا ہے، امام ذہبی نے انہی اوصاف کے اظہار و اعلان کو ان کی رنجش کا سبب بتایا ہے، محمد بن سماعہ کا جو امام محمد کے محبوب شاگرد ہین، بیان ہے کہ امام محمد اور امام ابو یوسف مین رنجش کا سبب یہ ہوا کہ قاضی ابو یوسف سے رقہ کے قاضی کے انتخاب کے سلسلہ مین مشورہ کیا گیا، انھون نے فرمایا کہ میری نگاہ مین امام محمد سے زیادہ بلند مرتبہ اور اس منصب کے لئے موزون دوسرا نہین ہے، اُن کے اسی مشورہ پر امام محمد کو کوفہ سے بغداد بلایا گیا، بغداد آنے کے بعد وہ سیدھے امام ابو یوسف کے پاس پہنچے، اور اُن سے اس انتخاب کی وجہ دریافت کی، امام ابو یوسف نے کہا کہ یہ مشورہ مین نے ہی یہ سوچ سمجھ کر دیا کہ کوفہ و بصرہ مین ہمارے مسلک کی کافی اشاعت ہو چکی ہے، اگر آپ قاضی ہو کر شام سے چلے جائین گے، تو وہان بھی آپ کے ذریعہ اس کی اشاعت ہو گی، امام محمد نے اس کو کچھ پسند نہین کیا امام ابو یوسف اُن کو یحیٰی برمکی کے یہان لے گئے، اور اس سے کہا، یہ امام محمد آپ کے سامنے موجود ہین، اُن سے (قضا کے) معاملات طے کر لیجئے، چنانچہ یحیٰی نے امام محمد سے کچھ اس طرح اصرار کیا کہ وہ عہدۂ قضا قبول کرنے کے لئے مجبور ہو گئے، امام محمد غالباً امام صاحب کے اتباع کی وجہ سے اس عہدہ کو ناپسند کرتے تھے، اور چونکہ اس کا وسیلہ امام ابو یوسف ہوئے تھے، اس لئے امام محمد اُن سے کبیدہ ہو گئے یہ پوری روایت نقل کرنے کے بعد امام ذہبی فرماتے ہین،

وکان ذلک سبب فساد الحال	امام ابو یوسف اور امام محمد کے درمیان
بین ابی یوسف ومحمد بن الحسن (ص ۵)	اختلاف کا سبب یہی واقعہ ہے،

امام دارقطنی امام صاحب اور اُن کے اصحاب کے بارے مین سخت رائے رکھتے ہین، لیکن امام ذہبی نے ان سے یہ روایت نقل کی ہے،

لا یستحق محمد عندی	میرے نزدیک (امام محمد (کی روایتین)

المترک، (ص ۵۰) چھوڑنے کے قابل نہیں ہیں،

امام ذہبی نے اس کا بھی اہتمام رکھا ہے، کہ بعض جگہ وہ صحیح روایت نقل کرنے کے بعد اس بابے جو ضعیف روایتیں ہوتی ہیں، اسے بھی حکی یا قیل وغیرہ کے کمزور الفاظ کے ساتھ ذکر کرکے اس کے ضعف کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں، اور بعض جگہ مشہور اور صحیح روایت کو نقل کرنے کے بعد پھر کمزور روایت جو پہلی روایت کے بالکل ضد ہوتی ہے، نقل کر دیتے ہیں، غالباً یہ اس لئے کرتے ہیں، کہ ضعیف روایت کے رد کرنے کے قوی اسباب ان کے پاس نہیں ہوتے، اس لئے اس کے مقابلہ میں ایسی روایت جو سند و متن کے لحاظ سے قوی ہوتی ہے، اُسے نقل کر دیتے ہیں، اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے، کہ دونوں پہلو بھی سامنے آجاتے ہیں، اور اہلِ نظر خود صحیح فیصلہ کر لیتے ہیں،

لیکن اس احتیاط کے باوجود ان رسالوں میں بعض کمزور اور غیر صحیح روایتیں بھی داخل ہو گئی ہیں، مگر امام ذہبی پر یہ کوئی الزام نہیں ہے اور نہ اُن کی دیانت پر شبہ کیا جا سکتا ہے ممکن ہے اُن کو ان روایتوں کے سند و متن کے اسقام کا علم نہ ہو سکا ہو، بڑے بڑے ائمۂ فن سے بھی اس قسم کی چوک ہو جاتی ہے، دو ایک روایتیں مثال کے طور پر ملاحظہ ہوں،

امام صاحب کے نسب کے سلسلہ میں عام ارباب تذکرہ کی طرح امام ذہبی نے ثابت کو زوطی کا لڑکا بتایا ہے، حالانکہ ثابت اور زوطی کے درمیان نعمان بن مرزبان کا نام بھی مستند کتابوں میں ہے، جیسا کہ امام مسعود بن شیبہ نے اپنی کتاب تعلیم میں اس کی تصریح کی ہے،

امام ذہبی نے امام صاحب کے والد کے متعلق ابن اسمٰعیل ایک مجہول شخص کی یہ روایت نقل کی ہے، کہ وہ کابل سے قید کر کے لائے گئے تھے، یعنی امام صاحب غلام تھے لیکن تاریخ بغداد اور کتاب الصیمری وغیرہ میں امام صاحب کے پوتے سے یہ روایت صحیح سند کے ساتھ منقول ہے کہ

(انا اسماعیل بن حماد بن النعمان بن اسمٰعیل فرماتے ہیں کہ میں حماد کا بیٹا، اور

ثابت بن النعمان بن مرزبان من ابناء فارس الاحرار ما وقع علینا رق قط،

(وہ امام صاحب کے بیٹے اور امام صاحب ثابت کے پوتے اور بیٹا نعمان کے نعمان مرزبان کے لڑکے ہیں جو فارس کے رہنے والے تھے، خدا کی قسم ہمارے خاندان پر کبھی غلامی نہیں واقع ہوئی یعنی ہم لوگ ہمیشہ سے آزاد ہیں)

اس کے علاوہ اور بھی بعض روایتیں امام صاحب اور صاحبین کے متعلق ایسی ہیں جن پر کلام کیا جا سکتا ہے،

باب التقریظ والانتقاد

مراقبات

از

جناب مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی

کتاب "مراقبات" مصنفہ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب صدر شعبۂ فلسفہ، اگرچہ بظاہر دعاؤن کی ایک وردی اور حزبی کتاب معلوم ہوتی ہے، لیکن اس کتاب کو ختم کر لینے کے بعد اپنے اندر جن تاثرات کو مین پارہا ہون، سمجھ مین نہین آرہا ہے کہ ان کو تعبیر کے کس پیرایہ مین ادا کرون، تاہم اب ادا ہو یا نہ ہو کچھ نہ کچھ کہنے کے لئے اپنے آپ کو مضطر اور بے چین پاتا ہون،

واقعہ یہ ہے کہ "تعلیم و تعلم" کی جس نشأۃ جدیدہ کا ظہور سرزمین مغرب مین پہلی چند صدیون کے اندر جن خصوصیتون کے ساتھ ہوا، ان مین ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ تدریسی و تعلیمی علوم و فنون تک کی افادیت کو بھی عملی نتائج و ثمرات کے ساتھ وابستہ کرنے کا رجحان روز بروز بڑھتا جارہا ہے، غالبًا یہی وجہ ہے کہ فلسفہ جس مین علم کو صرف علم کے لئے سکھایا جاتا تھا، اس کے دائرے سے بتدریج ایسے علوم و فنون باہر ہوتے چلے گئے، جن کے معلومات سے عملی زندگی کے مشکلات کے حل اور سہولتون کی فراہمی مین مدد ملتی تھی، عناصر، جمادات، نباتات، حیوانات قدیم عہد مین فلسفہ کی مختلف شاخون کے موضوع بحث تھے لیکن عملی افادیت کے اسی رجحان کا نتیجہ ہے کہ بجائے فلسفہ کے اب ان تمام امور سے بحث کرنے والے علوم سائنس کے دائرے مین شریک کر لئے گئے ہین،

اسی بنا پر چاہئے تو یہی تھا، کہ انسانی وجود یا نفس انسانی سے بحث کرنے والے علم کو بھی فلسفہ کے حلقہ سے نکال کر سائنس ہی کی صف مین اس کو بھی جگہ دیدی جاتی، لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ نفسِ انسانی کے امکانات یا مضمرات و مشتملات کو قوت سے فعلیت کی شکل مین لانے کے لئے جن معلومات سے استفادے کی ضرورت ہے، ان تک رسائی کا واحد ذریعہ مذہب تھا، لیکن علم کی نشات جدیدہ کے اس دور مین پہلے تو مذہبی نمایندون کی بے دینی سے بے زار ہو کر خود اُن سے یورپ باغی ہوا، چاہا گیا کہ بجاے مذہبی نمایندون کے خود اس مذہب کی تعلیم و تاریخ مین وثوق و اعتماد کے جراثیم تلاش کئے جائین، جس کے موروثی طور پر اس ملک کے باشندے پابند چلے آرہے تھے، لیکن تحقیق و جستجو کی اس راہ سے بھی بصد ناکامی و نامرادی لوگون کو واپس ہونا پڑا، ان کا موروثی دھرم یا دین تاریخی استناد و وثوق کی قوت کھو چکا تھا، نیز اس مذہب کے تعلیمی عناصر مین بھی جانچنے والون کو ایسی چیزین نہ مل سکین، جن پر واقعی یقین و اعتماد کی بنیاد کھڑی ہو سکتی ہو، مذہب کے متعلق ان مایوسیون کا احساس دبے پاؤن خواص کے حلقہ سے آگے بڑھ کر عوام مین جس وقت اپنے قدم جماتا چلا جاتا تھا ٹھیک انہی دنون مین بنی نوع انسان کے متعلق وہی قدیم پرانا طبعی نظریہ نئے رنگ و روپ اور الفاظ کے نئے قالب مین بعضون کی طرف سے پیش ہو کر غیر معمولی حسن قبول حاصل کرنے لگا، تال جس کا یہی تھا کہ

طین (دیچر) [1] کے زندہ حیوانی مجموعون مین ایک حیوانی مجسمہ آدمی بھی ہے، بالفاظ دیگر اپنی بیرونی شکل وصورت آنکھ، ناک، کان، پیشانی وغیرہ کے لحاظ سے انسان جو کچھ باہر نظر آتا ہے سمجھا جا رہا تھا، کہ یہ اس کا سب کچھ ہے، اس فیصلہ کی ہر دلعزیزی جون جون عوام مین بڑھتی چلی گئی، انسانی وجود کی اہمیت جیسا کہ چاہئے تھا عہد کہن کی ایک خرافی داستان کے قالب مین ڈھلنے لگی، یون سمجھئے کہ

---

[1] مطلب یہ ہو کہ انسانی وجود کے احترام اور اس کے بلند مقام کو ظاہر کرنے کے لئے دائرۂ ملکوت کہہ دینے والو

اس طینی نظریہ نے کریلے کو گویا نیم ہی پر چڑھا دیا، آج اسی کا نتیجہ ہے کہ جانورون، چوپایون، بلکہ سانپ بچھو، کیڑے، مکوڑون جیسے رینگنے والے حشرات الارض تک پر بحث کرنے والے علوم کے لئے سائنس کی تعلیم گاہون مین مستقل کرسیان قائم ہوتی چلی گئین، اور قائم ہوتی چلی جا رہی ہین،

لیکن وہ علم جس کی بحث کا موضوع انسانی وجود یا نفس انسانی تھا، اسی طرح فلسفہ کی بھول بھلیون مین اس علم کو جھولنے کے لئے چھوڑ دیا گیا، جیسے ہزارون سال سے فلسفہ کی کال کوٹھری مین دوسرے علوم کے ساتھ یہ غریب جھول رہا تھا،

دوسرے علوم و فنون مین عملی افادیت کی کوششون کا جو سلسلہ جاری ہے، اس کو دیکھ دیکھ کر چاہنے والون نے چاہا بھی کہ فلسفہ کی اس شاخ (نفسیات) کے مسائل سے بھی عملی نتائج و ثمرات کے پیدا کرنے کی صورت نکالی جائے لیکن انسانی وجود کے امکانات اور اس کی پوشیدہ صلاحیتون کا ظہور جس واقعی حقیقت سے تعلق پذیری پر موقوف ہے، یہ واقعہ ہے کہ اس کے متعلقہ معلومات پر کام کرنے والے اپنے اندر اعتماد و قوت کی اس کیفیت کو نہین پاتے تھے، جس کے بغیر ان صحیح عملی نتائج کا حصول ناممکن ہے جن کی توقع اس راہ مین کیجانی چاہیے،

تاہم جد و جہد کے اس سلسلے مین یہ بات کہ آدمی وہی سب کچھ ہے جو کچھ وہ باہر سے نظر آ رہا ہے

(بقیہ حاشیہ ص ۱۶) کو اس کے آگے جھکنے کے لئے جب حکم دیا گیا تو جن کی نظر انسان کے باطنی امکانات، اور اندرونی صلاحیتون پر تھی، حکم کے ساتھ ہی تعمیل مین وہ مشغول ہو گئے لیکن جیسا کہ معلوم ہے اس موقع پر انسانی احترام کے اس قدرتی حکم پر احتجاج کی صدا بھی بلند ہوئی تھی، اعتراض کرنے والے نے اس وقت یہی کہا تھا، کہ طین (کیچڑ) سے بنے ہوئے جسد کو اتنی اہمیت کیون دیجائے، قرآن مین اسی اعتراض کو خَلَقۡتَهُۥ مِن طِينٖ" (پیدا کیا ہو تو نے اس کو کیچڑ سے) کے الفاظ مین ادا کیا گیا ہے، اسی مناسبت سے اس نظریہ کا نام "طینی نظریہ" رکھدیا گیا ہے، مسئلہ ارتقاء کی آڑ لیکر پچھلے دنون انسانی وجود کے احترامی احساسات کو مجروح کرنے کی جو کوشش کی گئی ہے، وہ اسی قدیم تاریخی احتجاج یا اعتراض کی آواز بازگشت ہے،

یعنی قدیم طینی نظریہ والے مغالطے کا رازیہ مدتیں ان پر بھی واضح ہونے لگا یہان تک پہونچنے کےلئے تو ابھی مدت درکار ہے، عارف رومی نے جس کی طرف اپنے اس مشہور شعر مین اشارہ فرمایا ہے کہ

ظاہرش را پشۂ آرد بچرخ

باطنش باشد محیط ہفت چرخ

لیکن تجربہ کرنے والون کے ایک طبقہ کو اس کا اعتراف تو بہرحال کرنا ہی پڑا کہ

"آدمی باہر سے جو کچھ نظر آرہا ہے، یہ اوس کے مقابلے مین کچھ نہین ہے، جو نظر نہین آرہا ہے"

ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب نے اس اعتراف کی تعبیران تشبیہی الفاظ سے اس کتاب کی ابتدائی سطرون مین کی ہے کہ

"انسانی شخصیت کی مثال برف کے اس انبار کی سی ہے، جو سمندرون مین بہتا نظر آتا ہے، اس کا تھوڑا حصہ سطح سمندر کے اوپر اور باقی سب اوس کے نیچے پوشیدہ ہوتا ہے"

گویا:- ع تو ہنوز ناپدیدی کہ جمال خود ندیدی

عارف رومی کی اس تعبیر کے لحاظ سے انسانی وجود کے "ناپدید حصہ" کا بھی یہ اعتراف ہے اور مین خیال کرتا ہون کہ گرتی ہوئی ہڈیون اور بوسیدہ استخوانون کو بنیاد بنا کر "طینی نظریہ" کی تعبیر شاعرانہ تشبیہون اور خیالی رنگ آمیزیون کی مدد سے پچھلے دنون جو کھڑی کی گئی تھی، اس کے انہدام کی طرف بھی یہ ایک مجوبانہ اقدام ہے،

بہرحال انسانی وجود کے ناپدید پہلوؤن کا قصہ چونکہ کسی دوسرے کا نہین بلکہ آدمی کا اپنا ذاتی قصہ ہے، اس لئے اون کی یافت یا ان تک رسائی چندان دشوار بھی نہین ہے لیکن جس وجود

یا واقعی حقیقت سے مربوط کرنے پر ان ناپدید پہلوؤن کی عملی افادیت موقوف ہے۔ اس کے متعلق مشتبہ و مشکوک معلومات پر اعتماد ان نتائج کی پیدایش کے لئے قطعًا کافی نہین ہین، جو صحیح معنون مین اس واقعی حقیقت سے مربوط ہونے کے بعد پیدا ہو سکتے ہین، یا ہوتے رہتے ہین، ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب نے اپنی اس کتاب کے ص ۴۲ مین "صحت" کا عنوان قائم کر کے جس عملی مراقبہ کا ذکر ان الفاظ مین فرمایا ہے، کہ آہستہ اور طمانیت کے ساتھ ان الفاظ کو دہراتا ہون، کہ میرے اندر ایک قوتِ الٰلیہ موجود ہے، جو صحت بخش ہے اور صحت کو قائم و برقرار رکھتی ہے، (خاموشی) اور بار بار ان ہی الفاظ کے اعادے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے یہ توقع جو دلائی ہے، کہ اس تدبیر سے گویا عملًا صحت و تندرستی کے حاصل کرنے اور اس کے قائم رکھنے مین، آدمی اسی طرح بلکہ شاید اس سے زیادہ کامیاب ہو سکتا ہے جتنی کامیابی اس راہ مین طبی تدبیرون اور مشورون پر عمل کر کے وہ حاصل کر سکتا ہے،

مین یہی کہنا چاہتا ہون کہ میرے اندر ایک قوتِ الٰلیہ موجود ہے، خود اس قوتِ الٰلیہ کے متعلق یہ یقین بھی کہ وہی قوت صحت کی بخشنے والی اور اس کو قائم و برقرار رکھنے والی ہے، ان امور کے جاننے کا غیر مشکوک قطعی ذریعہ ان لوگون کے پاس کیا ہے، جن کے مذہبی معلومات قوت و اعتماد کی قوتون سے دوسرون کے ہی نزدیک نہین، بلکہ خود اُن کے نزدیک بھی محروم ہو چکے ہین،

ایک انجانی حقیقت کے وجود کو اپنے اندر فرض کر لینا اور اپنے اس فرض پر اصرار بیجا کئے چلے جانا اس کے سوا بتایا جائے کہ قدم جمانے کے لئے اس راہ مین اُن کو اور کیا چیز مل سکتی ہے؟

صحیح منطقی راہ سے جن معلومات کے متعلق آدمی اپنے اندر غیر متزلزل یقین کی خنکی پاتا ہے، کیا اطمینان و وثوق کی یہ کیفیت ان اصراری مفروضات کو کسی حیثیت سے بھی میسر آسکتی ہے،

یہ ہو سکتا ہے کہ اس قسم کے مفروضات پر اصرار بھی بعض نفسیاتی امکانات کے ابھارنے مین تجربۃً کسی حد تک مفید ثابت ہوا ہو، لیکن اُن کے اُبھارنے مین ان مفروضات کو دخل ہوتا ہے، یا قدرۃً اس

قسم کے بلیغ و موکد امرار سے یک سوئی کی کیفیت باطن مین جو پیدا ہو جاتی ہے، یہ اس کے کرشمے ہوتے ہین،
اس سوال کا جواب آسان نہین ہے، اس راہ کے تجربہ کار ہی جانتے ہین، کہ ان امور کا ظہور کسی خاص
قسم کے فرض کے ساتھ وابستہ نہین ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ بغیر کسی فرض کے بھی یک سوئی کے حصول
مین کامیابی اگر میسر آجائے توان ہی آثار و نتائج کو لوگ اپنے سامنے پا سکتے ہین، بلکہ پاتے ہین،

بہرحال نفسیاتی انکشافات و تجربات کی علمی افادیت کا پہلو اس حد تک جو نمایان نہین ہوا ہے
کہ بجائے "فلسفہ" کے ان کو سائنس کے حلقہ مین شریک کر لیا جائے، تو بڑی وجہ اس کی جہان تک مین
سمجھتا ہون یہی ہے کہ جس حقیقتِ کبریٰ سے مربوط کرنے پر نفس انسانی کے امکانی مضمرات کی شگفتگی موقوف
ہے، اس حقیقت کے متعلق صحیح معلومات کی فراہمی کا کوئی ایسا غیر مشتبہ یقینی ذریعہ کام کرنے والون کے
پاس نہین ہے، جو ہر قسم کے شکوک و شبہات سے بالاتر اور پاک ہو،

جدید نفسیات کے حکما اور اساتذہ مین غالباً ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب پہلے حکیم و استاد ہین، جو
اس راہ مین ان معلومات کے سُراغ رسانی مین کامیاب ہوئے ہین، جن سے زیادہ معتبر صحیح، ہر قسم
کی آلایشون سے پاک وصاف ذخیرہ نسلِ انسانی کے پاس موجود نہین ہے،

سوچنا چاہئے کہ براہِ راست خود اپنے الفاظ مین عالِم [1] اپنے اس علم کو جو اپنی ذات و صفات کے متعلق
وہ رکھتا ہے، اگر ظاہر کرے تو جس قسم کے معلومات اس "خود افشانی علم" کی روشنی مین پانے والے پا سکتے
ہین، کیا اُن کا مقابلہ کسی حیثیت سے بھی معلومات کا وہ سرمایہ کر سکتا ہے، جو دوسرون کی فکر و نظر
یا ظن و تخمین کی مدد سے مہیا کیا گیا ہو، باقی اس راہ کے یہ خود افشانی معلومات کہان ہین، اور اپنی تمام
تحقیقی خصوصیتون کے ساتھ بے کم و کاست پشتہا پشت سے دنیا کی کسی اُمت کے پاس ایک لمحہ کی جدائی
کے بغیر مسلسل نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتے چلے آرہے ہین، شاید اسے سب جانتے ہین لیکن ماننے کے لئے
اس وقت تک سب آمادہ نہین ہوئے ہین،

---

[1] یعنی حق سبحانہ تعالیٰ نے اپنی ذات و صفات کی جن خصوصیات سے بندون کو مطلع کیا ہو،

ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب کے آگے تبریک و تہنیت کے پھول میں پیش کرتا ہوں کہ ماحول مخالف کے دباؤ سے قطعاً بے پروا ہو کر انھوں نے بڑی جرأت رندانہ سے اپنی اس کتاب میں کام لیا ہے، پہلے تو ان معلومات کی روشنی میں خود ذاتی تجربوں سے وہ سرفراز ہوئے، اور اپنے ان ہی تجربات کو ایک خاص رنگ میں ان لوگوں کے سامنے بھی انھوں نے پیش کر دیا ہے، جو جدید نفسیات میں عملی افادیت پیدا کرنے کے لئے بے چین ہیں، بلا خوفِ تردید میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ جاہلی عصبیتوں، نسلی نخوتوں، قومی تنگ نظریوں سے ہٹ کر ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب کے تجربات کی اگر آزمایش کی جائے گی، تو اس پر مجھے قطعاً تعجب نہ ہوگا، اگر فلسفہ کے حلقہ سے نکل کر "نفسیات" کا علم بھی سائنس کی سب سے بڑی قیمتی شاخ بن جائے، ڈاکٹر صاحب نے علمائے نفسیات کے سامنے ایک نیا تجربہ اور تجربے کی ایک نئی راہ کھولی ہے، کاش دنیا اس سے مستفید ہونے کی توفیق پائے۔

میرے نزدیک کتاب "مراقبات" کی اصلی روح تو یہی ہے، اور اس نقطۂ نظر سے اس کا خطاب دنیا کی تمام قوموں کے لئے عام ہے، لیکن اسی کے ساتھ اُن کی اس کتاب میں مجھے ایک اور خصوصیت بھی نظر آئی، جس پر چاہئے کہ وہ طبقہ بھی غور کرے جو مذکورۂ بالا خود افشائی معلومات سے مستفید تو ہورہا ہے لیکن بجائے طبعی طریقہ کے بعض بیرونی موثرات کے تحت اس راہ سے ہٹ گیا ہے، جس سے چاہئے تو یہی تھا کہ وہ نہ ہٹتا،

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ فطرتِ انسانی میں قدرت نے جن تقاضوں کو گوندھ دیا ہے، مثلاً رزق اور معاشی ضرورتوں کا محتاج بن کر آدمی پیدا ہوا ہے، یہی نہیں بلکہ اس کی یہ سرشت ہے کہ روزی میں قدرۃً وہ وسعت اور زیادتی کا طلب گار رہے، وہ عافیت اور صحت چاہتا ہے، بیمار رہنا اٹھانا و ضعف سے گریز یہ سارے مطالبات اس کے فطری مطالبات ہیں، خوف و دہشت غم و الم کو وہ قطعاً اپنا مطلوب اور مقصود نہیں بنا سکتا،

یہ اور اس قسم کے دوسرے فطری تقاضے انسان مین اسی لئے ودیعت کئے گئے ہین، تاکہ جس حقیقت کیساتھ مربوط رہنے پر اس کے نفسیاتی امکانات کی فعیت موقوف ہے اس حقیقت کی تلاش وجستجو مین فطرت کے یہی تقاضے ممد ومعاون ثابت ہون،
مگر کیا کیجئے کہ اس راہ کے چلنے والون مین ایک طبقہ ایسا پیدا ہوگیا ہے جسے اصرار ہے کہ اپنے اندر سے ان فطری تقاضون کو نکالے بغیر ایک قدم بھی آگے نہین اٹھا سکتا، اس معکوس غیر فطری منطق پر جہان تک کم از کم مین نے غور کیا کوئی ربط دعوی اور دلیل مین نظر نہین آتا، سمجھ مین نہین آتا کہ جس کے لئے صحت ومرض فقر وغنا، مسرت والم، سکھ دکھ دونون برابر ہو چکے ہون بلکہ جو بجائے صحت مند رہنے کے بیمار رہنے کو، بجائے مسرور رہنے کے مغموم رہنے ہی کو پسند کرتا ہو اس کو کیا ضرورت پڑی ہے جو اس حقیقت کی تلاش مین سرگردان ہو جس کے مل جانے کے بعد وہ سب کچھ مل جاتا ہے جسے انسان چاہتا ہے، اس شخص نے اپنے اندر سے جب "چاہ" کے جذبہ ہی کو نکال دیا، تو انسانی چاہون کی پوری کرنے والی قوت کو وہ کیون ڈھونڈھے گا،

مگر کیا کیجئے شاعرانہ تعبیرون کے زور مین مصنفون نے اس راہ کے چلنے والون یا چلنے کی خواہش رکھنے والون کے سامنے پہلی شرط یہی پیش کی کہ اپنے اندر سے ان چاہون یا تقاضون کو نکال دو، اس شرط کا ڈھنڈورا پیٹنے والون نے اس زور سے پیٹا کہ ان تقاضون کا ذکر بھی شاید عام ذہنیتون کے لئے ناقابل برداشت بن گیا ہے،

مین ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب کو دوبارہ مبارکباد دیتا ہون کہ انھون نے جیسے جدید ماحول کے جدید مطالبون کی پروا کئے بغیر اپنے علمی تجربات دنیا کے آگے رکھدیئے ہین، ٹھیک اسی طرح پرانے ماحول کے اس پرانے رواج کے عام دباؤ سے آزاد ہوکر انھون نے اپنی اس کتاب مین فطرت انسانی کے سارے جائز تقاضون کو زندہ رکھنے ہی کو طلب وجستجو کا ذریعہ قرار دیا ہے، اور "لومۃ لائم" سے بے خوف ہوکر انھون نے ان عنوانات کے قائم کرنے مین پوری جسارت سے کام لیا ہے جنھین دیکھ کر ممکن ہے کہ دیکھنے والے ان پر تھوڑی دیر کیلئے پست حوصلگی کوتاہ نظری وغیرہ کی تہمتون کو منسوب کرنے کے لئے تیار ہو جائین لیکن ان کی تسلی کے لئے "رہبانیۃ ابتدعوھا" کی قرآنی ضمانت قطعاً کافی ہے، اللھم ایدہ بروح القدس وانزل علیہ من لدنک سکینۃ ورحمۃ،

اردو کے نئے رسالے اور اخبارات

پاکستان کے قیام اور ہندوستان کے خونریز واقعات اور ناخوشگوار حالات کی بنا پر یہان کے بہت سے اہل قلم اور ادیبون نے پاکستان کی راہ لی، اور دلی اور لکھنؤ کی بزم ادب لاہور اور کراچی مین آراستہ کی، لاہور تو مدتون سے اردو ادب کا مرکز تھا، اب کراچی بھی سندھ کا علاقہ نہین، بلکہ دلی اور یوپی کا خطہ معلوم ہوتا ہے، یہ انقلاب دیکھ کر بے اختیار زبان پر غنی کشمیری کا یہ شعر جاری ہو جاتا ہے،

غنی روز سیاہ پیر کنعان را تماشا کن — کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخارا

چنانچہ گذشتہ سال ڈیڑھ سال کے عرصہ مین کراچی سے بکثرت اردو کے اچھے رسالے اور اخبارات نکلے، جن مین پوری علمی و ادبی شان موجود ہے، اور یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے، کہ ہندوستان سے اردو کی جلا وطنی کے بعد وہ خانہ خراب نہین ہوئی،

اس وقت پاکستان اور ہندوستان دونون کے ادیبون کا فرض ہے کہ وہ علم و ادب کی خدمت کے ساتھ ایسا صالح لٹریچر پیدا کرین، جو نسلی، جغرافی اور غلط قسم کی مذہبی فرقہ بندی کے بجائے، عالم انسانیت کی وحدت اور دونون مملکتون مین اتحاد و یگانگت کے جذبات پیدا کرے،

معارف مین عرصہ سے اخبارات و رسالون پر ریویو کا اتفاق نہین ہوا تھا، لیکن کچھ اڈیٹرون کے مسلسل تقاضون اور زیادہ تر اس خیال سے کہ ہندوستان خصوصاً صوبہ متحدہ مین اردو کی کس مپرسی کے بعد ہندوستان اور پاکستان دونون کے اردو رسالون اور اخبارات کا تعارف اور ان پر تبصرہ ضروری فرض ہوگیا ہے، آج مدت کے بعد ان پر ریویو کیا جاتا ہے،

فردوس: مرتبہ جناب محمد واحدی صاحب تقطیع اوسط ضخامت ۱۰۰ صفحے، کاغذ کتابت و بہتر قیمت سالانہ ؎ فی پرچہ ۸، پتہ رسالہ فردوس مقابل خالق دینا ہال پوسٹ بکس نمبر ۲۱۱ کراچی

دہلی کے مشہور صاحب قلم جناب واحدی صاحب نے یہ رسالہ کراچی سے نکالا ہے، اس کے بیشتر مضمون نگار ہندوستان کے ہیں، اس لئے وہ اچھے ادبی رسالوں کی تمام خصوصیات کا حامل ہے، اگر مقام اشاعت معلوم نہ ہو، تو یہ قیاس بھی نہیں کیا جا سکتا کہ یہ رسالہ کراچی سے نکلتا ہے، مضامین میں تنوع معلومات میں افادہ، اور ذہنی لطف و تفریح ہر پہلو کا لحاظ رکھا گیا ہے، کوئی مضمون بھی دلچسپی سے خالی نہیں، دلی کے ادیب بے بدل خواجہ محمد شفیع صاحب کا مضمون "ہماری رسموں کا فلسفہ" پرنسپل مشتاق احمد صاحب زیدی کا مضمون "دلی سنہ ۱۹۱۱ء سے سنہ ۱۹۴۷ء تک" اور قابل خاطر خواتین کے ساتھ بہت دلچسپ ہیں، سندھ میں صحیح ادبی مذاق پیدا کرنے کے لئے ایسے مضامین کی بڑی ضرورت ہے، ہم کو امید ہے کہ اردوئے معلّی کا یہ پودا سندھ کے ریگستان میں نہ صرف بار آور ہوگا، بلکہ اس کو زبان و ادب کا لہلہاتا ہوا چمن بنا دے گا،

ماہِ نو مرتبہ جناب وقار عظیم صاحب تقطیع بڑی ضخامت ۷۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت سالانہ صہ فی پرچہ ۸ر پتہ: دفتر ماہ نو پاکستان پبلیکیشنز پوسٹ بکس نمبر ۱، کراچی،

ماہ نو ہندوستان کے رسالہ "آج کل" کے طرز کا ادبی پرچہ اور غالباً نیم سرکاری ہے، ادبی حیثیت سے خاصہ بلند ہے، اس کے دو نمبر ہم نے دیکھے، دونوں مفید ولائق مطالعہ مضامین اور معلومات پر مشتمل نظر آئے، یہ دیکھکر خوشی ہوئی کہ اس کے پہلے ہی نمبر میں ہندو مسلمانوں کی باہمی منافرت اور وحشت و درندگی کی اصلاح سے متعلق کئی اچھے مضامین ہیں، خواجہ غلام السیدین صاحب کا مضمون "آندھی کا چراغ" نہایت مفید اور کرشن چندر اور خواجہ احمد عباس صاحب کے افسانے "لال باغ" اور "میں کون ہوں" سبق آموز ہیں، موجودہ ناخوشگوار حالات میں اس قسم کے مضامین بہت ضروری ہیں، فضل حق صاحب قریشی دہلوی کا مضمون "مغلوں کے عہد کی مصوری" گو مختصر ہے لیکن مفید معلومات پر مشتمل ہے، امید ہے کہ ماہ نو ادبی حیثیت سے کراچی کے افق پر بدر کامل بن کر چمکے گا،

نقوش مرتبہ جناب احمد ندیم قاسمی و ہاجرہ مسرور صاحبہ تقطیع اوسط ضخامت ۷۰ صفحے، کاغذ، کتابت بہتر قیمت سالانہ عـ۵ر فی پرچہ ۱۰ عہ ر پتہ :- ادارہ فروغ اردو لاہور،

یہ ادبی رسالہ حال ہی مین لاہور سے نکلا ہے، اس کا مقصد زبان و ادب دونون کی خدمت ہے اور اُن سے متعلق مفید مضامین و معلومات اور عام دلچسپی کے لئے دلچسپ افسانے اور ستھری منظومات پیش کرتا ہے، پہلے نمبر مین خالد حسن صاحب قادری کے قلم سے اردو کے مستقبل پر اچھا تبصرہ ہے، مرزا فرحت اللہ بیگ کا مزاحیہ اسلوب جناب عزیز احمد کمال الدین اصفہانی، غلام رسول صاحب مہر، مفید مضامین ہین، افسانون مین کرشن چندر اور احمد ندیم صاحب کے افسانے دلچسپ ہین، مجموعی حیثیت سے یہ رسالہ ادبی ذوق رکھنے والون کے مطالعہ کے لائق ہے،

چراغ راہ، مرتبہ جناب نعیم صدیقی تقطیع بڑی ضخامت ۴۰ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت: سالانہ صہ ر فی پرچہ ۲ار، پتہ: دفتر چراغ راہ لوٹیا بلڈنگ آرام باغ روڈ کراچی نمبرا

لائق مرتب جماعت اسلامی کے ممتاز صاحب قلم ہین، یہ رسالہ بھی اسی جماعت کا ہے، جماعت کے مقاصد کی مناسبت سے اس رسالہ کا مقصد اسلامی اصولون پر ادب کی تعمیر، اسلامی انقلاب کی تحریک، اسلام کے سیاسی و معاشی نظام کی توضیح اور بین الاقوامی مسائل پر نقد و تبصرہ ہے، اس لئے اس کے تمام مذہبی، سیاسی، علمی، ادبی، معاشی، تمدنی، مضامین و معلومات مین اسی نقطۂ نظر کی ترجمانی ہوتی ہے، اس لحاظ سے یہ پرچہ عام مسلمانون کے مطالعہ کے لائق ہے، جماعت اسلامی کے بنیادی مقصد سے کس کو اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن جماعتی انقلاب اشخاص کے تزکیہ و اصلاح کے بغیر ممکن نہین ہے، بدر کی معرکہ آرائی مین کامیابی اور حکومت الٰہیہ کے قیام کے لئے حرا کی خلوت گزینی، صفہ کا حلقۂ ذکر و فکر اور فیض صحبت ضروری ہے،

تو خاک مین مل اور آگ مین جل جب اینٹ بنے تب کام چلے
ان خام دلون کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر

آموزش: مرتبہ جناب بشیر ہاشمی صاحب تقطیع بڑی ضخامت ۲، صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت :۔ سالانہ پانچروپیہ، پاکستان کے لئے چھ روپے، غیر ممالک سے آٹھ روپیہ، پتہ :۔ دفتر رسالہ آموزش کشمیری بازار لاہور،

یہ تعلیمی رسالہ ہے اور مختلف علمی و تعلیمی مسائل پر مفید مضامین و معلومات پیش کرتا ہے، اس کے جو نمبر ہماری نظر سے گذرے ان مین "اردو کے نصاب تعلیم کے متعلق اشارات" "روداد اردو" "نسخ و نستعلیق"، اور "تعلیم بالغان" اچھے مضامین ہین، انگریزی اصطلاحون کے ترجمہ کا سلسلہ بھی مفید ہے، یہ رسالہ اساتذہ اور معلمین کے مطالعہ کے لائق ہے،

عصمت: مرتبہ جناب رازق الخیری صاحب قیمت سالانہ چھ روپئے، ممالک غیر سے ۱۲ شلنگ، والیان ریاست سے سو روپئے، فی پرچہ ۸ر، پتہ: دفتر رسالہ عصمت ماما پارسی گرنمبرا اسکول کراچی نمبر ۳،

یہ دلی کا پرانا اور مشہور نسوانی رسالہ ہے جو دلی کے ہنگامہ کے بعد کراچی منتقل ہوگیا ہے، یہ اتنا معروف و مشہور ہے، کہ اس کے لئے کسی مزید تعارف و تبصرہ کی ضرورت نہین، امید ہو کہ اس کے پرانے قدردان اب بھی اپنی قدردانی قائم رکھین گے،

ہمدرد صحت: مرتبہ جناب حکیم محمد سعید صاحب دہلوی قیمت سالانہ ہندوستان و پاکستان کے لئے ۵ر، ممالک غیر سے ۵ر، طلبہ سے للعہ، فی پرچہ ۸ر، پتہ ہمدرد منزل کراچی نمبرا و ہمدرد منزل لال کنوان دہلی،

یہ رسالہ بھی دلی کا مشہور طبی رسالہ ہے، جو اب کراچی سے نکلتا ہے، امید ہے کہ اس کے شائقین بھی نقل مکانی سے اس کی قدردانی مین کمی نہ کرین گے،

بساطِ عالم: مرتبہ جناب جوش ملیح آبادی و جگن ناتھ صاحب آزاد تقطیع بڑی ضخامت ۸۸ صفحے،

کاغذ بہتر، کتابت و طباعت معمولی، قیمت سالانہ چھ روپے، ششماہی سے ٹی پرچہ ۴ر، پتہ:-

دفتر بساط عالم اولڈ سکریٹریٹ روڈ دہلی،

اردو مین ادبی رسالون کی کمی نہین لیکن ایسا کوئی رسالہ نہین ہے، جو بیرونی ممالک کے مختلف النوع اہم حالات اور معلومات مہیا کرتا ہو، یہ رسالہ اسی کمی کو پورا کرنے کے لئے نکلا ہے، اس کا مقصد، عوام کو غیر ملکی سیاسیات، اقتصادیات، معاشیات، ادبیات، علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کے نئے نئے نظریات ورجحانات سے آشنا کرنا ہے، اس مقصد کے مطابق اس کے پہلے نمبر مین حسب ذیل مضامین ہین، ایٹم کی قوت، سوویٹ ازبکستانی ادب، مشرق وسطی مین سیاسی اثرات، مارشل پلان، اسٹرلنگ بیلنس، جدید تحریکون کا سیاسی پس منظر جہان نما کے عنوان سے ہندوستان و بیرونی دنیا کے اہم سیاسی واقعات کا مختصر تذکرہ اور رفتار زمانہ کے ماتحت ہر مہینہ کی اہم سیاسی خبرین ہوتی ہین، اس لحاظ سے یہ رسالہ بین الاقوامی حالات و معلومات سے عوام کی واقفیت کے لئے نہایت مفید ہے،

آستانہ مرتبہ جناب محسن صاحب فاروقی ضخامت ۸۰ صفحے قیمت سالانہ للعہ را فی پرچہ چھ روپئے

پتہ:- عقب جامع مسجد پوسٹ بکس نمبر ۲۰۶ دہلی،

آستانہ، مرحوم نظام المشائخ دہلی کے رنگ کا مذہبی اور صوفیانہ رسالہ ہے، اور اسی طرز کے مختصر مذہبی، اخلاقی، ادبی مضامین، بزرگان دین و صوفیائے کرام کے سبق آموز واقعات، ملفوظات و کرامات منظوم و منثور مناجاتین اور اس نوع کے دوسرے متفرق معلومات پیش کرتا ہے، جن لوگون کو ان کا ذوق ہو اُن کے مطالعہ کے لائق ہے،

شیدا: مرتبہ جناب اشرف بھوپالی و حکیم زین الدین صاحب جامعی تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۴ صفحے کاغذ معمولی کتابت و طباعت بہتر قیمت سالانہ ۔ صر رشید ز پبلشنگ ہاؤس دہلی،

یہ پندرہ روزہ ادبی رسالہ ہے، مضامین کا معیار بہت معمولی ہے، اس کا اصل مقصد و اُن کا

اشتہار معلوم ہوتا ہے، ادبی مضامین عام دلچسپی کے لئے شامل کر دیئے گئے ہیں، اس لئے کہ اشتہارات کی تعداد مضامین سے بھی زیادہ ہے،

ہفتہ وار الجمعیۃ، مرتبہ جناب عثمان فارقلیط وابرار احمد صاحب آزاد تقطیع اوسط اخباری ضخامت ۱۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت سالانہ عہ ششماہی ہے فی پرچہ ہر پتہ دفتر الجمعیۃ گلی قاسم جان، دہلی،

جمعیۃ العلماء کے مشہور اخبار الجمعیۃ کا یہ ہفتہ وار اڈیشن چند دنوں سے نکلنا شروع ہوا ہے اس وقت اردو کیا ہندوستان کے انگریزی اخبارات میں بھی الجمعیۃ ہی ایسا اخبار ہے، جو موجودہ فرقہ وارانہ فضا میں بھی جب کہ بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا گئے ہیں، کانگریس کے صحیح مسلک پر قائم ہے، اور ملک و ملت دونوں کی صحیح خدمت و رہنمائی کا فرض انجام دے رہا ہے، ہفتہ وار الجمعیۃ بھی اس خصوصیت کا حامل ہے، ہفتہ بھر کی ضروری خبروں کے خلاصہ اور ملکی اور غیر ملکی اہم معاملات و سیاسی مسائل پر مبصرانہ نقد و تبصرہ کے ساتھ مختلف النوع سیاسی معلومات اور علمی مذہبی اور تاریخی مضامین و دلچسپ منظومات بھی پیش کرتا ہے، اس اخبار کا مطالعہ اور اسکی امداد ہر صاحب ذوق اور ملک و ملت کے ہوا خواہ کا اخلاقی فرض ہے،

آفاق مرتبہ جناب محمد سرور صاحب و محمد شفیع صاحب تقطیع اوسط اخباری ضخامت ۲۲ صفحے، کاغذ، کتابت، و طباعت بہتر، قیمت سالانہ عہ فی پرچہ ہر، پتہ :- دفتر آفاق نمبر ۵ ٹمپل روڈ لاہور،

یہ ہفتہ وار اخبار چند دنوں سے لاہور سے نکلنا شروع ہوا ہے، پاکستان کے سیاسی حالات و کوائف پر نقد و تبصرہ اور تعمیری مسائل پر مفید مشورہ اور بین الاقوامی اہم واقعات پر تبصرہ کے کے علاوہ ہر ہفتہ التزام کے ساتھ مختلف علمی ادبی اور تاریخی مضامین، اور مختلف اسلامی

مسائل پر مفید معلومات پیش کرتا ہے، مکتوب کراچی، مکتوب پشاور، اور لاہور کی ڈائری کے عنوان سے ان صوبوں کے سیاسی مسائل پر بہت دلچسپ تبصرہ کرتا ہے، سالک صاحب کے قلم سے "مہدی سوڈانی کے جہاد کی تاریخ" نہایت مفید مضمون ہے، محمد شفیع صاحب کی "جیل یاترا کی روداد بہت دلچسپ اور "فریدون مرزا کراچی مین" سبق آموز افسانہ ہے، یہ اخبار نہ صرف سیاسی، بلکہ علمی و ادبی حیثیت بھی بلند پایہ ہے، اور اس کے مضامین اچھے علمی و ادبی رسائل کے مضامین سے کسی طرح کم معیار کے نہین ہوتے،

قومی زبان: تقطیع اوسط اخباری، ضخامت ۱۲ صفحے کاغذ، کتابت وطباعت،

قیمت :- سالانہ ہیر، ششماہی للعہ، فی پرچہ ۳ر، پتہ :- دفتر قومی زبان شاردا مندر، ہاسپٹل روڈ، کراچی،

یہ انجمن ترقی اردو ہند دہلی کا پرانا اخبار "ہماری زبان" ہے، جو اب انجمن ترقی اردو پاکستان کی جانب سے قومی زبان کے نام سے نکلتا ہے، اس کی خدمات اور خصوصیات معلوم و مشہور ہین، یہی خدمت اب وہ پاکستان مین انجام دے رہا ہے، لیکن اردو زبان کو یہ شکایت کرنے کا حق ہے، کہ اسے ہندوستان مین بے یار و مددگار چھوڑ کر پاکستان کی راہ لینا آئینِ وفا سے بعید ہے، طبیب کی ضرورت صاف اور صحت بخش آب و ہوا مین نہین، بلکہ وبا زدہ علاقہ مین ہوتی ہے، اردو پاکستان کی سرکاری زبان قرار پا چکی ہے، وہان تو دیر سویر اس کی ترقی و اشاعت ہوتی ہی رہے گی، پھر اس کی خدمت کے لئے پنجاب کے باہمت اہلِ قلم کافی ہین، اردو کی اصل خدمت اور اس کی دستگیری کی ضرورت تو ہندوستان مین ہو، جہان وہ گھر سے بے گھر کیجارہی ہے،

نشان منزل: مرتبہ جناب مولانا اشفاق الرحمن صاحب، تقطیع اوسط ضخامت ۸ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت معمولی، قیمت سالانہ للعہ ششماہی عار، بیرون ریاست کے لئے

سالانہ صہ، ششماہی ۱۲؍ فی پرچہ ۲؍، پتہ دفتر نشان منزل بھوپال

نشان منزل مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغی دعوت کے طرز کا دس روزہ دینی و اصلاحی اخبار ہے، جس کا مقصد دینی اصولون پر مسلمانون کی اصلاح و تعمیر ہے، اس لئے اس کے تمام مضامین خالص مذہبی مثلاً کلام مجید کی تفسیر احادیث نبوی کے ترجمے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ، صحابۂ کرام اور بزرگانِ دین کے سبق آموز واقعات اور اس نوع کے دوسرے مضامین ہوتے ہین، ایک صفحہ مین دس دنون کی اہم سیاسی خبرون کا خلاصہ بھی دیدیتا ہے، دینداد مسلمانون کے مطالعہ کے لائق ہے، "م"

نوائے حیات

جناب یحیٰی اعظمی کے کلام سے صاحب ذوق طبقہ پوری طرح واقف ہے، اُن کی پرجوش مذہبی و ملی، قومی و سیاسی، اور مختلف النوع و دلکش و دلپذیر نظمون اور پُر کیف غزلون کا مجموعہ نوائے حیات کے نام سے چھپ گیا ہے، دیوان کے شروع مین مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ کے قلم سے بصیرانہ مقدمہ ہے،

ضخامت ۱۷۵ صفحے، قیمت للعہ مجلّد ملنے کا پتہ:- دار المصنفین اعظم گڈھ

رقعاتِ عالمگیر

اورنگزیب عالمگیر کے خطوط ورقعات جو زمانہ شہزادگی سے برادرانہ جنگ تک اعزہ کے نام لکھے گئے، اس جلد مین جمع کئے گئے ہین، اور ان سے علم وادب، سیاست اور تاریخ کے بیسیوں حقایق کا انکشاف ہوتا ہے، قیمت سے ر، ضخامت:- ۲۸۸ صفحے،

"منیجر"

ادبیات

رحمۃ للعالمین

از

جناب ابوالمجاہد صاحب زاہد سیتاپوری

جہالت مین ڈوبی ہوئی تھین فضائین ضلالت سے بہکی ہوئی تھین ہوائین
گھٹا کفر و الحاد کی چھا رہی تھی شعائرِ عدالت مٹی جا رہی تھی
بجھی جا رہی تھین اخوت کی شمعین مٹی جا رہی تھین محبت کی رسمین
نگاہِ خرد سے اُبلتی تھی ظلمت ہر انسان تھا دشمنِ آدمیت
غریبون پہ ہر ظلم بے جا روا تھا خودی مین جو ڈوبا ہوا تھا خدا تھا
الگ تھے سبھی شاہراہِ ہدیٰ سے بہت دور تھے بارگاہِ خدا سے
ہر اک قوم اور ملک کے بُت جدا تھے خدا کی خدائی مین لاکھون خدا تھے
خُدا کو ترس آیا اہلِ زمین پہ مشیت نے انگڑائی لی مسکرا کر

فَجَاءَ الرَّسُولُ بَشِيرًا نَذِيرًا
فَصَلُّوا عَلَيْهِ كَثِيرًا كَثِيرًا

وہ سلطانِ دین تاجدارِ رسالت وہ جس کی محبت خدا کی محبت
وہ جس نے عداوت کی زنجیر توڑی وہ جس نے جہالت کی گردن مروڑی

وہ بندوں کو جس نے خدا سے ملایا | وہ کانٹوں کو جس نے گلستاں بنایا
وہ جس نے عروج آدمیت کو بخشا | وہ ابرِ کرم جو کہ ہر سمت برسا
وہ ذرّوں کو دی رونقِ طور جس نے | اندھیرے پہ کی بارشِ نور جس نے
فضاؤں کو جس نے منوّر بنایا | ہواؤں کو جس نے معطّر بنایا

وہی ہے وہی غایتِ ہر دو عالم
وہی ہے وہی رحمتِ ہر دو عالم

غزل

از

جناب مولوی محمد عزیر صاحب لکچرار مسلم یونیورسٹی

فضائے دل پہ چھائے جا رہے ہیں | ہمیں بیخود بنائے جا رہے ہیں
فلک کی آنکھ نے جن کو نہ دیکھا | وہ نظروں میں سمائے جا رہے ہیں
یہ کس کی یاد میں ہر دم زباں پر | سخن حسرت کے لائے جا رہے ہیں
بنائے زندگی ہو خاک محکم | جو یوں آنسو بہائے جا رہے ہیں
جنھیں تم بھی سمجھتے ہو کہ کیا ہیں | وہ محفل میں بٹھائے جا رہے ہیں
وہ جن سے نام زندہ ہے وفا کا | بہر صورت مٹائے جا رہے ہیں

عزیرؔ اس آخری منزل کی جانب
قدم ہم بھی بڑھائے جا رہے ہیں

مطبوعات جدیدہ

مسلمانون کا نظام حکومت مترجمہ جناب مولوی محمد علیم اللہ صاحب صدیقی فاضل دیوبند بی اے جامعہ تقطیع بڑی ضخامت ۴۰۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد پانچ روپیہ، غیر مجلد للعہ پتہ ندوۃ المصنفین دہلی،

عہد نبوی میں جب اسلام اور اس کی حکومت کا دائرہ جزیرۃ العرب کے اندر تک محدود تھا اس کا نظام حکومت بھی سادہ تھا لیکن اسلام کا مقصد مخلوق کی ہدایت و رہنمائی کے ساتھ احکام الٰہی کی تنفیذ کے لئے حکومت الٰہیہ کا قیام بھی تھا، اس لئے اسلامی تعلیمات میں اس کے تمام اہم شعبون کے متعلق بنیادی اصول اور ہدایات موجود تھیں، چنانچہ خلفائے راشدین کے عہد میں جب اسلامی حکومت کا دائرہ بڑھا، اور نئے نئے ملک اور نئی نئی قومیں اس کے زیر نگین ہوئیں، تو خلفا نے انھی بنیادون پر نظام حکومت کی توسیع کی اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک نہایت مکمل نظام قائم ہوگیا، پھر زمانہ کے حالات و ضروریات کے مطابق اس میں اضافے اور ترمیمیں ہوتی رہیں، اسلامی نظام حکومت، اور اس کے مختلف شعبون پر عربی میں قدیم ائمہ کی متعدد کتابیں موجود ہیں، ان میں ابوالحسن علی ماوردی اور قاضی ابویعلی حنبلی کی احکام السلطانیہ امام ابویوسف کی کتاب الخراج اور ابو عبید کی کتاب الاموال زیادہ مشہور ہیں، اور چھپ کر شائع ہوچکی ہیں، لیکن جدید طرز کی کوئی کتاب نہیں تھی، مصر کے ایک فاضل ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن پروفیسر تاریخ فواد یونیورسٹی جنھون نے اسلام کی سیاسی و ثقافتی تاریخ پر کئی جلدون میں ایک کتاب لکھی ہے، اسلامی حکومتوں کے نظام پر بھی "النظم الاسلامیۃ" کے نام سے ایک کتاب

تالیف کی ہی، مذکورۂ بالا کتاب اسی کا اردو ترجمہ ہے، اس مین خلافت راشدہ، دولت بنی امیہ، بنی عباس، آل عثمان اور مصر و مغرب کی حکومتون کے نظام کی تفصیل بیان کی ہے، کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب مین مذکورۂ بالا حکومتون کے عہدون یعنی خلافت، وزارت، حجابت و کتابت، دوسرے مین شہری نظام، دفاتر کی تنظیم، سکہ، بری و بحری فوج، ڈاک اور پولیس، تیسرے مین مالیات یعنی بیت المال اور اس کے محاصل اور مصارف، چوتھے مین نظام عدالت اور ان کے عہد بعہد کے تغیرات کی تفصیل، اور پانچوین مین غلامی کی تاریخ، اسلام مین غلامی کی صورت، اور اس کی اصلاحات کا ذکر ہے، اردو کیا عربی مین بھی مسلمانون کے نظام حکومت پر ایسی جامع کتاب نہین تھی، اس لئے لائق مترجم نے اس کا ترجمہ کرکے ایک قابل قدر کتاب کا اضافہ کیا ہے، ترجمہ صاف اور سلیس ہے، اور کتاب تاریخ اسلام سے دلچسپی رکھنے والون کے مطالعہ کے لائق ہے،

شعور و لاشعور، مترجم جناب مولوی عبدالوہاب صاحب ظہوری تقطیع اوسط ضخامت ۳۵۹ صفحے کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد ہے، سکۂ عثمانیہ سے رکلدار، پتہ:۔ نفیس اکیڈمی حیدرآباد دکن،

نفسیات کی رو سے نفس لاشعوری یا تحت الشعور، نفس شعوری سے زیادہ اہم ہے، وہ غیر محسوس طور سے انسان کے جذبات و میلانات، افکار و تصورات، اقوال و اعمال اور اخلاق و کردار انسان کے پورے وجود پر اثر انداز ہوتا ہے، اور انہی اثرات کے مطابق اس کے کردار و سیرت کی تعمیر ہوتی ہے، اس موضوع پر مصر کے مشہور صاحب قلم سلامہ موسیٰ نے العقل الباطن کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی، شعور و لاشعور اسی کا ترجمہ ہے، اس مین نفس لاشعور کی حقیقت اور انسانی زندگی مین اس کے اچھے برے اثرات کی تفصیل کیساتھ ان طریقون کو بھی بیان کیا گیا ہے، جن کے ذریعے نوجوان اپنے نفس کی اصلاح اور اس مین ترقی کرسکتے ہین، جن لوگون کو نفسیات سے

ذوق ہو انھین اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئے،

ناموران اسلام مرتبہ نواب محمد صابر قلی خان دیر جنگ صفدر جنگ والی ریاست محمد گڈہ، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۶۶ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت تحریر نہین، پتہ :- سید سلیمان پبلشنگ ہاؤس، ریاست محمد گڈھ مالوہ،

اکثر نوجوان کیا، بلکہ سن رسیدہ روٗسا و امرار کو بھی عیش و تنعم اور لطف و تفریح کی مصروفیتون سے سنجیدہ علمی و ادبی مشاغل کی جانب توجہ کرنے کی فرصت نہین ملتی لیکن ان مین مستثنیات بھی ہوتے ہین، انھی مستثنیات مین نوجوان تعلیم یافتہ رئیس مصنف بھی ہین، جن کا علمی ذوق دولت و امارت کے گہوارہ مین بھی قائم ہے، گذشتہ معارف مین مانڈو کے آثار قدیمہ پر ان کا ایک مضمون بھی نکل چکا ہے، زیر نظر کتاب ایک اسلامی موضوع پر اُن کی سنجیدہ اور مفید تالیف ہے، اس مین دارالمصنفین کی کتابون، اور اردو کی دوسری معتبر تصانیف سے آنحضرت صَلَّی اللہ علیہ وسلّم کی سیرت مبارک، عشرہ مبشرہ، حضرت حسنین، خالد بن ولید اور عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما اور امام مالک، شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی، امیر سعود بن عبد العزیز، سلطان عبد العزیز بن سعود والی نجد و حجاز، اور امام یحیٰی والی یمن کے مختصر سوانح اور سبق آموز حالات لکھے ہین، جو مسلمان بچّون، اور عورتون کے پڑھانے کے لائق ہین، یہ کتاب اس حیثیت سے کہ ایک نوجوان والی ریاست کی سنجیدہ تالیف ہے، بہت قابل قدر ہے،

"م"

مؤلفہ مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی دسنوی سابق رفیق دار المصنفین اعظم گڑھ

ہندوستان مین مسلمانون کا پہلا قافلہ سندھ مین اترا تھا، اور اُن کی پہلی حکومت یہین
ائم ہوئی تھی اور وہ ایک ہزار سال سے اوپر یہان حکمران رہے، آج بھی سندھ کے
رو دیوار سے اُن کے آثار نمایان ہین، لیکن اس کے باوجود اُردو مین اسلامی سندھ
ی کوئی مفصّل و محققانہ تاریخ موجود نہین تھی، دار المصنفین نے تاریخ ہندوستان کے سلسلہ
ین یہ جامع و محققانہ تاریخ مرتب کرائی ہے، اس مین سندھ کا جغرافیہ، مسلمانون کے حملہ سے
پیشتر کے مختصر اور اسلامی فتوحات کے مفصل حالات، خلافتِ راشدہ کے زمانہ سے
لے کر آٹھوین صدی ہجری تک سندھ جن جن حکومتون کے ماتحت رہا، اُن کی پوری تاریخ
اور ان تمام دورون کے نظامِ حکومت، علمی و تمدنی حالات، اور رفاہ عام کے جو جو کام
نجام پائے، ان سب کی پوری تفصیل ہے، مسلمان اس قدیم اسلامی خطہ کی تاریخ فراموش
کر چکے تھے، اب پھر اس کو یاد کرنے کی ضرورت ہے، یہ کتاب ایسے وقت مین شائع
ہو رہی ہے، جب کہ سندھ کی تاریخ کا ایک نیا باب کھل رہا ہے، اور وہان ایک نئی
حکومت کی بنیادین استوار ہو رہی ہین،

ضخامت: ۴۰۰ صفحے قیمت: چھ روپیے،

"منیجر"

دارالمصنفین کی دینی علمی و ادبی مین کتا

اقبالِ کامل

ڈاکٹر اقبال کے فلسفہ و شاعری پر اگرچہ بکثرت مضامین، رسالے اور کتابین لکھی گئین لیکن ان سے اُن کی بلند پایہ شخصیت واضح اور مکمل طور پر نمایان نہ ہو سکی یہ کتاب اس کمی کو پورا کرنے کے لئے لکھی گئی ہے، اس مین اُن کے مفصّل سوانح حیات کے علاوہ اُن کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارنامون کے اہم پہلوون کی تفصیل کی گئی ہے، اور سوانح حیات کے بعد پہلے اُن کی اردو شاعری پھر فارسی شاعری پر ان کے بہترین اشعار کے انتخاب کے ساتھ مفصّل تبصرہ کیا گیا ہے، اور اُن کے کلام کی تمام ادبی خوبیان دکھلائی گئی ہین، پھر اُن کی شاعری کے اہم موضوعون یعنی فلسفۂ خودی، فلسفۂ بیخودی، نظریۂ تعلیم، سیاست، صنفِ لطیف (یعنی عورت) فنونِ لطیفہ اور نظام اخلاق وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے، مرتبہ مولانا عبدالسلام ندوی، ضخامت ۰۰م صفحے، قیمت: پتے

بزمِ تیموریہ

بابر ایک بے مثل اہل قلم تھا، ہمایون نے شعر و شاعری کے علاوہ ہیئت و نجوم کی بھی انجمن آرائی کی، اکبر کا عہد علوم و فنون کی روشنی سے جگمگا اُٹھا، جہانگیر نے ادب و انشار کو چمکایا، شاہجہان نے شعراء اور فضلاء کو سیم و زر مین تلوایا، عالمگیر نے معارف پروری اور انشاپردازی کے اعلیٰ نمونے پیش کئے، تیموری دور کے آخری بادشاہون نے بھی اپنے اسلاف کی روایات کو قائم رکھنے کی کوشش کی، بہادر شاہ ظفر نے عروس سخن کے گیسو سنوارے تیموری شہزادون اور شہزادیون نے بھی علم و ادب کی محفلین سجائین، دربار کے امراء، شعراء اور فضلا نے شاہانہ سرپرستی مین گوناگون کمالات دکھائے، ان کی تفصیل مذکورۂ بالا کتاب مین ملاحظہ فرمائیے، مرتبہ صباح الدین عبدالرحمٰن ایم اے، قیمت: ؏ ؏

رجسٹرڈ نمبر ا ۱۸۱ ۔ فروری سنہ ۱۹۴۹ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت: چھ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

سلسلۂ تاریخ اسلام

دارالمصنفین کے سلسلۂ تاریخ اسلام کو بڑا حسن قبول حاصل ہوا، علمی و تعلیمی اداروں نے خصوصیت کے ساتھ اس کی قدر دانی کی، بعض یونیورسٹیوں نے اس کو اسلامی تاریخ کے نصاب میں داخل کر لیا، اس لئے چند برسوں کے اندر تقریباً اس کے سب حصے ختم ہو گئے جن کے دوسرے اڈیشن مزید اصلاح و ترمیم اور اضافوں کے ساتھ چھپ کر تیار ہو گئے ہیں اور بعض زیر طباعت ہیں، اب یہ سلسلہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہو گیا ہے،

تاریخ اسلام حصۂ اوّل

(عہد رسالت و خلافت راشدہ)

یعنی آغاز اسلام سے لے کر خلافت راشدہ کے اختتام تک اسلام کی مذہبی، سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ، ضخامت ۵۹۶ صفحے، قیمت: ستے،

تاریخ اسلام حصۂ دوم

(بنو امیہ)

یعنی اموی سلطنت کی صد سالہ سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ کی تفصیل،

ضخامت ۳۶۳ صفحے،

(زیر طبع)

تاریخ اسلام حصۂ سوم

(بنی عباس اوّل)

یعنی ابو العباس سفاح ۱۳۲ھ/۷۵۰ء سے ابو اسحاق متقی اللہ ۳۳۳ھ/۹۴۴ء تک دو صدیوں کی سیاسی تاریخ،

(زیر طبع)

تاریخ اسلام جلد چہارم

(بنی عباس دوم)

یعنی مستکفی باللہ کے عہد سے آخری خلیفہ مستعصم باللہ تک خلافت عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی سیاسی تاریخ،

ضخامت:- ۳۲۴ صفحے

قیمت:- صہ

"منیجر"

جلد ۶۳ ماہ ربیع الثانی ۱۳۶۸ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۴۹ء عدد ۲

مضامین

شذرات

افسوس ہے کہ گذشتہ ۱۰ جنوری کو ملک کے نامور وکیل اور قانون دان سر تیج بہادر سپرو نے ۷۴ سال کی عمر مین انتقال کیا، عرصہ ہوا ان پر فالج کا حملہ ہوا تھا جس کے بعد ان کی صحت بگڑ گئی تھی، اور جس نے بالآخر انکی زندگی کا چراغ گل کر دیا، وہ ایک بڑے قانون دان بلکہ قانون ساز اور عالی دماغ مدبر تھے، اپنے پیشہ مین بڑا نام پیدا کیا، اور بڑی دولت کمائی، اور صوبائی و مرکزی اسمبلیون سے لے کر وائسراے کی اکزیکٹیو کونسل کی ممبری اور پریوی کونسل کی رکنیت تک کے اعزازات کو حاصل ہوئے، وہ سیاسیات مین اعتدال پسند تھے، اور اس دائرہ کے اندر انھون نے ملک و قوم کی بھی مفید خدمات انجام دین اور انھی حیثیتون سے ان کا ماتم کیا گیا،

لیکن قومی نقطۂ نظر سے ان سب سے بڑھکر اُن کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار، اردو زبان کے بڑے حامی و مددگار اور ہماری پرانی مشترک تہذیب کا اعلی نمونہ اور اس صوبہ مین غالبًا اس کی آخری یادگار تھے، اور اس فرقہ پرستی کے زمانہ مین بھی جب کہ بڑے بڑے قوم پرستون کے قدم ڈگمگا گئے ہین، وہ اپنی جگہ پر قائم رہے، اور مشترک زبان اور مشترک تہذیب کا دامن اُن کے ہاتھ سے نہ چھوٹا، وہ برسون ہندوستانی اکیڈمی الٰہ آباد کے صدر رہے، کل ہند انجمن ترقی اردو کے مربی و سرپرست تھے اور تقسیم ہندوستان سے پہلے تک وہ اس کے مستقل مدد گار تھے، ابھی حال مین انھون نے اردو زبان کی خدمت کے لئے الٰہ آباد مین روح ادب کے نام سے ایک مجلس قائم کی تھی، اردو کی تاریخ مین ان کا یہ فقرہ ہمیشہ یادگار رہے گا کہ اردو زبان ہندو مسلمانون کا مشترک اور ناقابل تقسیم ترکہ ہے، وہ خود اردو اور فارسی دونون کا نہایت بلند اور ستھرا مذاق رکھتے تھے، اور نہایت فصیح اور شستہ اردو بولتے

اور لکھتے تھے اردو کی متعدد نظم و نثر کی کتابوں پر اُن کے دیباچے اور مقدمے اُن کی ادبی یادگار ہیں،

کئی سال ہوئے کسی مقدمہ کے سلسلہ میں اعظم گڈھ آنا ہوا تو دارالمصنفین دیکھنے کے لئے بھی آئے، کتبخانہ میں فارسی کی الماری میں کلیاتِ صہبائی دیکھ کر کہا کہ میرے دادا مولانا صہبائی کے شاگرد تھے، اور کلیات نکال کر دیر تک الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے، ہندوستان میں آیندہ اُن سے بھی بڑے وکیل، قانون دان اور مدبر پیدا ہونگے لیکن ہندو مسلم اتحاد اور دونوں کی مشترک تہذیب کا ایسا نمونہ شاید اب نہ پیدا ہو سکے، اس لئے اُن کا ماتم تنہا ایک مقنن اور مدبر کا ماتم نہیں، بلکہ مشترک تہذیب کی یادگار اور اردو زبان کے ایک بڑے محسن کا ماتم ہے،
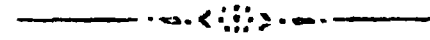
آج تک کسی ملک و قوم نے علم و فن میں ملکی اور غیر ملکی کی تفریق نہیں کی، اور نہ مفید غیر ملکی علوم کے حصول اور اُن سے استفادہ میں عار کیا، بلکہ انھیں سیکھ کر اُن سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، لیکن یہ فخر ہمارے صوبہ کی حکومت کے حصہ میں آنے والا ہے کہ وہ علم و فن میں بھی ملکی و غیر ملکی کی تقسیم کرنا چاہتی ہے، ہندوستان میں ایک ہزار سال سے طب یونانی رائج ہے، اور آیورویدک کے مقابلہ میں اس کو زیادہ مقبولیت حاصل تھی اس لئے انگریزی حکومت نے بھی اپنے زمانہ میں اس کو مٹایا نہیں، بلکہ دیسی طبوں کی ترقی کے لئے بورڈ آف انڈین میڈیسین قائم کیا، جس کی نگرانی میں دونوں طبیں اپنے راستہ پر چل رہی تھیں لیکن قومی حکومت کے قیام کے بعد طب یونانی غیر ملکی قرار پاگئی، اور اس کو مٹانے کی تدبیریں شروع ہو گئیں،
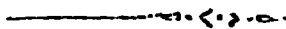
چند دن ہوئے حکومت نے دونوں طبوں کی جدید تنظیم اور ترقی کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی تھی جس میں یونانی اطبا برائے نام تھے، اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں طب یونانی کے مستقل وجود ہی سے انکار کر دیا ہے، اور اس کو آیورویدک کا محض ضمیمہ بنا دیا ہے، اسکی سفارش کی ہے کہ اسکے مطابق حکومت طب یونانی کو آیورویدک میں ضم کرنے کا

ارادہ رکھتی ہے، جو اس کے مٹانے کی جانب پہلا قدم ہے،

طب یونانی اور ویدک کے اصول اور طریقۂ علاج بالکل جدا ہیں، طب یونانی کو ویدک سے ماخوذ بتانا اور اس کی مستقل حیثیت سے انکار کرنا روز روشن کا انکار کرنا ہے، طب یونانی صدیوں سے ہندوستان میں رائج ہے، اس کی بڑی بڑی درسگاہیں قائم ہیں، اس کے بڑے بڑے نامور اطبا پیدا ہوئے اور آج تک نہ کسی نے اس کی مستقل حیثیت سے انکار کیا، اور نہ اس سے پہلے ملکی و غیر ملکی کا سوال پیدا ہوا، ایسی حالت میں سمجھ میں نہیں آتا کہ ان سوالات کو اس کے علاوہ اور کس چیز پر محمول کیا جائے کہ طب یونانی کا جرم صرف یہ ہو کہ وہ اسلامی عہد کی یادگار ہے ورنہ جیسا کہ خود اس کے نام سے ظاہر ہے وہ عربی یا اسلامی نہیں بلکہ یونانی طب ہے، اور مسلمانوں کا اس سے صرف اس قدر تعلق ہے کہ انھوں نے اس کو سیکھ کر ترقی دیا، اور آگے بڑھایا لیکن اگر یہ تعلق بھی مخالفت کا سبب بن سکتا ہے تو پھر ہندوستان کو بہت سے علوم و فنون سے دست کش ہونا پڑے گا، اور اس کی کتاب تہذیب کے بہت سے اوراق سادہ رہ جائیں گے، ایک وہ زمانہ بھی تھا کہ مسلمان بادشاہوں نے ہندوستانی ویدوں کو بغداد بلا کر ان سے علاج کرایا، اور ویدک کی کتابیں منگا کر عربی میں ترجمہ کرائیں، اور ایک یہ زمانہ بھی ہے کہ طب یونانی کی محض اس لئے مخالفت ہو رہی ہے کہ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کی نشانی ہے، یہ تو پرانی داستان ہے، ابھی کل کی بات ہے کہ فدائے وطن حکیم اجمل خان مرحوم نے طب یونانی اور آیورویدک کی ترقی کے لئے کیا کیا کوششیں نہیں کیں، اور آج ان کے محبوب فن کے ساتھ کیا سلوک کیا جا رہا ہے، حکیم صاحب کی ذات اور ان کی خدمات اس قدر جلد بھلا دینے کی چیز نہیں،

علم و فن میں ملکی و غیر ملکی کی تقسیم و تفریق دنیا میں کہیں نہیں کیجاتی، اس لئے حکومت کو چاہئے کہ وہ دونوں طبوں کی طبی حیثیت کو مساوی درجہ دے، اُن کی ترقی کے لئے یکساں مواقع فراہم کرے، اور طب یونانی کو مٹانے یا اس کا درجہ گھٹانے کا بدنما داغ اپنے دامن پر نہ لے،

مقالات

اخوان الصّفاء

از

مولانا عبد السلام ندوی

قدیم زمانہ مین موجودہ زمانہ کی طرح یہ طریقہ نہ تھا کہ اہل علم کی ایک جماعت مل کر انسائیکلوپیڈیا کے طرز پر کوئی کتاب لکھے، اور اس کو کسی خاص شخص کے انتساب کے بغیر شائع کرے، لیکن چوتھی صدی کے نصف حصہ مین اہل علم کی ایک جماعت نے جو اپنے آپ کو اخوان الصفاء کے نام سے موسوم کرتی تھی، اس قسم کی متفقہ کوشش کی اور مختلف فلسفیا موضوع پر ۵۱ رسالے لکھے جو رسائل اخوان الصفاء کے نام سے عام طور پر مشہور و معروف ہین، جہان تک تاریخ فلسفہ کا تعلق ہے، قدیم زمانے مین ان رسائل کو کوئی خاص فلسفیانہ اہمیت حاصل نہیں تھی، یہی وجہ ہے کہ حکماء کے حالات مین جو کتابین لکھی گئی ہین، ان مین ان رسالون کا ذکر نہایت معمولی طور پر کیا گیا ہے، شہرزوری نے تاریخ الحکماء مین ان رسائل اور ان کے مؤلفین کا ذکر صرف چند سطرون مین کیا ہے[1]، قاضی صاعد اندلسی نے طبقات الامم مین صرف اس قدر لکھا ہے کہ کرمانی نے مشرق کا سفر کیا، اور اپنے ساتھ رسائل اخوان الصفاء لایا، جو اس سے پہلے اندلس مین نہین آئے تھے، علامہ ابن اصیبعہ نے کرمانی کے تذکرہ مین ضمناً اسی کو نقل

---

[1] شہرزوری ص ۱۱۹

کر دیا ہے، اور اس سے زیادہ کچھ نہیں لکھا ہے،[1] ان رسائل کا ذکر سب سے زیادہ مفصل طور پر قفطی نے اخبار الحکما میں کیا ہے، لیکن اُن کی فلسفیانہ اہمیت کا وہ بھی منکر ہے، چنانچہ لکھتا ہے کہ

"اخوان الصفا و خلان الوفا ایک جماعت کا نام ہے، جس نے جمع ہو کر قدیم فلسفہ کے مختلف انواع پر ایک کتاب لکھی، اور اس کو چند مقالات پر مرتب کیا، جن کی تعداد ۵۱ ہے، ان میں پچاس رسالے فلسفہ کے پچاس انواع پر ہیں، اور اکیاونواں رسالہ تمام مقالات کا اختصار و خلاصہ ہے، لیکن یہ رسالے صرف تشویقی حیثیت رکھتے ہیں، نہ ان میں مسائل کا استقصار کیا گیا ہے، نہ ان کے دلائل واضح ہیں، بلکہ وہ انواع فلسفہ کی ہر نوع کے طالب کے لئے صرف تنبیہ و اشارہ ہیں[2]"

اس بنا پر دور جدید کے بعض مورخین فلسفہ کے یہ الفاظ کہ

"ان رسائل میں فلاسفۂ اسلام کے مباحث کا خلاصہ درج ہے، اور ان میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مولفین نے دقیق بحث اور طویل غور و فکر کے بعد ان کو مرتب کیا ہے"

مبالغہ آمیز لفاظی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے، اُن کی حیثیت تبلیغی رسالوں سے زیادہ نہیں ہے، ان میں صرف پروپگنڈے کا کام لیا گیا ہے، البتہ تاریخی حیثیت سے ان رسائل کے متعلق چند باتیں بحث طلب ہیں

۱- ایک یہ کہ ان کو کن کن لوگوں نے لکھا ہے،

۲- دوسرے یہ کہ یہ لوگ مسلمانوں کے کس فرقہ سے تعلق رکھتے تھے،

۳- تیسرے یہ کہ ان رسائل کے لکھنے سے ان کا کیا مقصد تھا؟

اور ہم اسی ترتیب سے ان امور پر بحث کرتے ہیں،

(۱)

قفطی نے ان رسائل کے مولفین میں صرف ابو سلیمان محمد بن معشر البستی (مقدسی) ابو الحسن

[1] طبقات الاطبا جلد دوم ص ۴۰، [2] اخبار الحکما قفطی ص ۵۸،

ہارون الزنجانی، ابو احمد المہرجانی اور عوفی کا نام لیا ہے، اور لکھا ہے کہ ان کے علاوہ اور لوگ تھے جنھوں نے ان رسائل کو لکھا لیکن اپنے نام کا اخفار کر کے ان کو مسودہ نویسوں میں پھیلایا اور ان کو تقسیم کیا، شہرزوری نے زید بن رفاعہ کے نام کا اور بھی اضافہ کیا ہے، اور لکھا ہے کہ ان رسائل کی عبارت مقدسی نے لکھی ہے لیکن قفطی کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ زید بن رفاعہ ان رسائل کی تدوین و ترتیب میں شامل نہ تھا، بلکہ وہ محض ان مؤلفین کا شریک صحبت تھا، چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ "مجھکو ان رسائل کے مولفین کے حالات کی نہایت تلاش تھی، اسی حالت میں مجھ کو ابو حیان توحیدی کا ایک مضمون ملا جس کو اُس نے وزیر صمصام الدولہ بن عضد الدولہ کے ایک سوال کے جواب میں ۳۷۳ھ میں لکھا تھا، وزیر اس سے پوچھتا ہے کہ مجھکو ایک اہم بات بتاؤ میں زید بن رفاعہ سے ہمیشہ ایک بات سنتا ہوں جو مجھے شبہہ میں ڈالتی ہے، وہ حروف اور نقطوں کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ب کو جو ایک نقطہ دیا گیا، ت پر جو دو نقطے لگائے گئے، اور الف کو جو بغیر نقطے کے چھوڑ دیا گیا اس کا کوئی نہ کوئی سبب اور کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہو گا؟ اسی کے ساتھ وہ اور بھی بڑے بڑے دعوے نہایت بلند آہنگی کے ساتھ کرتا ہے، تو بتاؤ کہ اس کی کیا حالت ہے؟ اور اس کے اخلاق کیسے ہیں، کیونکہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم اس کے یہاں آمد و رفت رکھتے ہو، اس کے پاس بیٹھتے ہو اور خوش گپی کرتے ہو، اور جو شخص کسی کی صحبت میں رہتا ہے، وہ اس کے مخفی خیالات اور مخفی مذہب سے زیادہ واقفیت رکھتا ہے"،

ابو حیان پہلے تو ٹال مٹول کرتا ہے، پھر وزیر کے اصرار پر بیان کرتا ہے کہ "وہ ایک نہایت ذہین شخص ہے نظم و نثر پر نہایت قدرت رکھتا ہے، حساب، بلاغت، تاریخ اور مختلف مذاہب و عقائد سے ماہرانہ واقفیت رکھتا ہے، یہ سُن کر وزیر پوچھتا ہے کہ "اس کا مذہب کیا ہے"؟ ابو حیان جواب دیتا ہے کہ اس کا کوئی خاص عقیدہ نہیں، وہ کسی خاص فرقہ کی طرف منسوب نہیں، بلکہ وہ سب کچھ کہتا ہے، اس نے بصرہ میں ایک طویل زمانہ تک قیام کیا ہے اور وہاں اس کو اہلِ علم کی ایک جماعت مثلاً

ابو سلیمان محمد بن معشر البستی (مقدسی)، ابو الحسن علی بن ہارون زنجانی، ابو احمد المہرجانی اور عوفی وغیرہ کی صحبت اور خدمت کا موقع ملا ہے، جو دوستانہ اور خیر خواہانہ اصول پر قائم ہوئی تھی، اور اس نے ایک خاص مذہب ایجاد کیا تھا، جس کی نسبت اس کا خیال تھا، کہ اس کے ذریعہ سے اس نے رضائے الٰہی کا راستہ قریب تر کر دیا ہے، کیونکہ وہ کہتی ہے کہ شریعت جہالت اور ضلالت سے گرد آلود ہو گئی ہے، اور یہ غبار صرف فلسفہ کے ذریعہ سے دور کیا جا سکتا ہے، اور جب یونانی فلسفہ اور عربی شریعت ایک لڑی میں پرو دیئے جائیں گے تو کمال کا درجہ حاصل ہو جائے گا، اس غرض سے اس نے فلسفہ کے تمام علمی اور عملی اجزاء پر پچاس رسالے لکھے، جن کا نام رسائل اخوان الصفاء رکھا لیکن اپنے نام نہیں ظاہر کئے[1]، اس تصریح سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ زید بن رفاعہ ان رسائل کے مولفین کا شریک صحبت تھا، ان کا خادم تھا، اُن کے خیالات سے متاثر تھا، لیکن ان رسائل کا مؤلف نہ تھا"

۲- اس سے زیادہ اہم بحث یہ ہے کہ ان لوگوں کے عقائد کیا تھے؟ اور وہ کس فرقہ سے تعلق رکھتے تھے؟ قفطی نے لکھا ہے کہ چونکہ ان رسائل کے مولفین نے اپنے نام کا اخفاء کیا اس لئے لوگوں میں اختلاف پیدا ہوا، کہ کس نے ان کو مرتب کیا، اور ہر گروہ نے ظنی اور قیاسی طور پر رائیں قائم کیں، ایک گروہ کہتا ہے کہ یہ بعض ائمہ کا کلام ہے جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی نسل سے تعلق رکھتے تھے، پھر اس امام کے نام میں بھی اختلاف کرتے ہیں، جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے، دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ قدیم زمانے کے بعض متکلمین معتزلہ کی تصنیف ہیں[2]، لیکن خود قفطی کو اس پر اطمینان نہ تھا، اس لئے اس نے مزید تحقیق کی تو اس کو معلوم ہوا کہ یہ ایک آزاد خیال گروہ تھا، جس کو کسی خاص فرقہ یا کسی خاص مذہب سے تعلق نہ تھا، اور خود ان رسائل کے مولفین بھی کہتے ہیں، کہ ہمارے بھائیوں کو کسی علم سے دشمنی نہیں رکھنی چاہئے، کسی کتاب کو نہیں چھوڑنا چاہئے کسی مذہب سے تعصب نہیں رکھنا چاہئے کیونکہ ہماری رائے اور ہمارا مذہب

---

[1] اخبار الحکماء قفطی صفحہ ۵۹ [2] ایضاً صفحہ ۵۸

تمام مذاہب اور تمام علوم کو شامل ہے"[1] بالخصوص معتزلہ سے تو ان کو کوئی تعلق ہی نہیں اور انھون نے اپنے رسائل مین معتزلہ کے بعض مشہور عقائد کی تردید کی ہے، مثلاً معتزلہ قیامت کے دن رویت باری کے منکر ہین، لیکن ارباب رسائل اخوان الصفار لکھتے ہین کہ "اس مناظرہ پسند گروہ کا خیال ہے کہ آنکھ سے صرف اجسام و اعراض دیکھے جا سکتے ہین، اور خداوند تعالیٰ بالاجماع جسم نہین ہے، اسی قیاسی وجہ سے انھون نے خداوند تعالیٰ کی رویت کا انکار کیا ہے، حالانکہ یہ واقعہ نہین ہے، . . . .

. . . .

. . . . کہ صرف اجسام و اعراض دیکھے جا سکتے ہین، بلکہ اجسام تو درحقیقت دیکھے ہی نہین جا سکتے، جب تک رنگ کا وجود نہ ہو اور رنگ بھی اس وقت تک نظر نہین آ سکتا جبتک نور نہ ہو، لیکن خود نور نہ جسم ہے، نہ عرض، کیونکہ اگر نور جسم ہوتا تو وہ سخت اور شفاف اجسام مثلاً شیشہ اور بلور مین سرایت نہ کر سکتا، کیونکہ جسم بالاجماع دوسرے جسم مین داخل نہین ہو سکتا، کیونکہ اگر ایک جسم دوسرے جسم مین داخل ہو سکے، تو کل اجسام ایک جسم مین داخل ہو جائین، اسی طرح نور عرض بھی نہین ہے، جو کسی جسم مین حلول کئے ہوئے ہو، کیونکہ روح بھی جسم نہین ہے، گو اس کے افعال صرف جسم ہی سے ظہور پذیر ہوتے ہین، فرشتے، شیطان، جن، روح، نفس، عقل فعال، ان مین سے کوئی چیز جسم یا عرض نہین ہے، لیکن اُن کے افعال کا صدور جسم ہی کے ذریعہ سے ہوتا ہے، بعینہٖ اسی طرح نور بھی جسم نہین ہے، گو وہ ہم کو صرف جسم ہی کے ذریعہ سے نظر آتا ہے، اگر خدا دیکھا نہ جا سکتا تو وہ یہ کیون کہتا،

کلا انھم عن ربھم یومئذ لمحجوبون،	ہرگز نہین آج کے دن وہ لوگ اپنے پروردگار سے آڑ مین ہون گے،

خدا کی تجلی پہاڑ پر نمایان ہوئی، کیونکہ تجلی اور حجاب کا اطلاق اُن اشیاء پر نہین ہوتا جو نظر نہین آسکتین[2]،

---

[1] رسائل اخوان الصفار جلد ۴ ص ۱۰۵، [2] ایضاً ص ۱۰۵،

غرض اسلامی فرقون سے بالاتر و ہ خود اپنے آپ کو صرف ایک عقلی گروہ کہتے ہین، اور عقل ہی کی سرپرستی مین زندگی بسر کرنا چاہتے ہین، چنانچہ ایک موقع پر لکھتے ہین، کہ ہر جماعت کی نظم و ترتیب و اصلاح کیلئے ایک رئیس کی ضرورت ہوتی ہے، اور ہم نے اپنے بھائیون کی جماعت کے لئے اپنا رئیس عقل کو مقرر کیا ہے، اور ان شرائط کے مطابق جن کو ہم نے اپنے رسالون مین بیان کیا ہے، اور اپنے بھائیون کو اس کی وصیت کی ہے، اس کے فیصلون پر راضی ہوگئے ہین، تو جو شخص عقل کے شرائط و موجبات پر راضی نہ ہو، اور ان شرائط کو قبول نہ کرے، جن کی ہم نے اپنے بھائیون کو وصیت کی ہے، یا ان مین داخل ہونے کے بعد ان سے نکل آئے، تو اس کی سزا یہ ہے کہ ہم اس کی دوستی سے الگ ہو جائین، اس کے ساتھ معاشرت و معاملت نہ رکھین، اور اس کو اپنے اسرار نہ بتائین، اور اپنے بھائیون کو اس سے الگ رہنے کی ہدایت کرین[1]

لیکن با اینہمہ وہ صرف عقل ہی کے تبع نہین ہین، بلکہ مذہبی حیثیت سے فرقۂ شیعہ سے تعلق رکھتے ہین، اور اسی کی ایک شاخ ہین، یہ رسائل انھون نے خاص اسی فرقہ کے لئے لکھے ہین، چنانچہ ایک موقع پر لکھتے ہین، کہ اے بھائی ہم نے مختلف علوم و فنون مین ۵۱ رسالے لکھے ہین، جن مین ہر ایک کی حیثیت تمہید، مقدمہ اور نمونہ کی ہے تاکہ اس کو ہمارے بھائی دیکھین، اس کی قرأت سنین، اس کے بعض مطالب سمجھین، اور فضیلت اہلبیت کی حقیقت کو جس کے وہ معترف ہین، جانین، کہ وہ لوگ خدا کے علم کے خازن اور نبوتون کے علم کے وارث ہین[2]

ایک جگہ خاص طور پر شیعون کو مخاطب کرکے لکھا ہے کہ

خدا نے ہم مین چند باتین ایسی جمع کر دی ہین، جو باہمی برادرانہ محبت اور دوستی کو مضبوط کرتی ہین، اور ان ہی مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اور آپ کے اہلبیت کی محبت، اور امیر المومنین علی بن ابی طالب خیر الوصیین کی ولایت ہے[3]

---

[1] رسالہ اخوان الصفار جلد ۴ ص ۱۸۱ [2] ایضاً ص ۲۳۳، ۲۳۴ [3] ایضاً ص ۲۴۲،

لیکن انھون نے شیعون کی مختلف جماعتون پر تنقید کر کے شیعیت کا درجہ بہت بلند کرنا چاہا ہے، چنانچہ لکھتے ہین، کہ بدترین لوگون کی ایک جماعت نے شیعیت کو محض ایک پردہ بنا رکھا ہے، وہ ہر قسم کی برائیان کرتی ہے، اور جب حکام اُن پر دار و گیر کرتے ہین تو وہ کہتی ہے کہ ہم شیعہ ہین، علوی ہین تاکہ اُس کی آڑ مین پناہ لین،

ایک جماعت ایسی ہے جس کے جسم ہم سے ملے ہوئے ہین لیکن اس کی روح ہم سے الگ ہے، وہ اپنے آپ کو علوی کہتی ہے لیکن وہ علوی نہین ہے، وہ صرف قرآن کا نام جانتی ہے، اور اسلام کی صرف سطح سے واقف ہے، نہ علم سیکھتی، نہ فقہ کو جانتی، نہ نماز پڑھتی، نہ زکوٰۃ دیتی، نہ حج کرتی، نہ جہاد کو جانتی، نہ حرام سے بچتی، نہ برائی سے باز آتی، اور ہر قسم کی برائیون کی مرتکب ہوتی ہے، تو یہ جماعت ہمارے اہلِ ملت سے بہت دور ہے، اور ہمارے شیعون کی بہت بڑی دشمن ہی،

ایک اور جماعت ہی جس نے نوحہ گر عورتون اور قصہ گو واعظون کی طرح شیعیت کو ذریعۂ معاش بنا لیا ہے، یہ جماعت صرف تبرّا، گالی گلوج، لعن طعن، اور نوحہ گر عورتون کے ساتھ گریہ و زاری کو شیعیت سمجھتی ہے، اور ان کا شعار مشاہد کی مجاوری اور قبرون کی زیارت ہے بعض شیعون کا قول ہی کہ ائمہ آوازون کو سنتے ہین، اور دعاؤن کو قبول کرتے ہین لیکن وہ اس کی حقیقت سے واقف نہین ہین، بعض لوگ کہتے ہین کہ امام منتظر مخالفین کے خوف سے چھپا ہوا ہے، حاشا وہ اُن کے سامنے موجود ہے، ان کو پہچانتا ہے، اور وہ اس کے منکر ہین[1]،

اسی فرقہ کی ترقی یافتہ شکل کا دوسرا نام باطنیت ہے، اور باطنیون کی تعلیمات کی بہت سی خصوصیات ان مین موجود ہین، مثلاً باطنیون کی ایک خصوصیت یہ ہی کہ وہ اپنے عقائد صرف اس شخص پر ظاہر کرتے ہین جس سے یہ قسم لے لیتے ہین، کہ وہ ان کے اسرار کسی غیر پر ظاہر نہ کرے گا[2]، اور رسائل اخوان الصفاء

---

[1] رسائل اخوان الصفاء، جلد ۴ ص ۱۹۹ [2] الفرق بین الفرق ص ۲۰۰،

کے مولفین بھی اپنی تعلیمات مخفی طور پر دیتے ہین، چنانچہ ایک موقع پر لکھتے ہین، کہ اے بھائی ہم لوگون سے اپنے اسرار اس لئے نہین چھپاتے کہ ہم دنیا کے بادشاہون کے اقتدار سے ڈرتے ہین، یا یہ کہ عوام کے شور وغل سے بچنا چاہتے ہین، بلکہ اس لئے کہ خداوند تعالیٰ کے عطیے کو محفوظ رکھین، جیسا کہ مسیح علیہ السلام نے فرمایا ہے، کہ حکمت نااہلون کو نہ سکھاؤ، اگر ایسا کروگے تو اس پر ظلم کروگے، لیکن جو لوگ اس حکمت کے اہل ہون، اُن سے اس کو نہ روکو، اگر ایسا کروگے تو اُن پر ظلم کروگے، [۱]

باطنیون کی تعلیم کی ایک خصوصیت یہ ہو کہ وہ ہر چیز کے اسرار و خواص کو معلوم کرنا چاہتے ہین مثلاً حروف تہجی کے کیا معنی ہین ؟ حروف تہجی صرف ۲۹ کیون ہین ؟ بعض حروف پر کیون نقطے لگائے گئے، اور بعض حروف پر کیون نہین لگائے گئے، [۲]

یہی بات ہو جس کو زید بن رفاعہ اس طرح کہتا ہے، کہ ب کو جو صرف ایک نقطہ دیا گیا، اور ت پر جو دو نقطے لگائے گئے، اور الف پر کوئی نقطہ نہین لگایا گیا، اس کا کوئی نہ کوئی سبب ہوگا، لیکن چونکہ ان حقائق کا علم ہر شخص کو نہین ہو سکتا، اس لئے وہ اس کو علم باطن کہتے ہین جس سے صرف ائمۂ اہلبیت ہی واقف ہو سکتے ہین، چنانچہ ایک موقع پر لکھتے ہین کہ

" اے بھائی اکثر فلسفیون اور حقائق اشیاء پر بحث کرنے والون سے انبیاء علیہم السّلام کی کتابون کے اسرار مخفی رہ گئے، کیونکہ ان لوگون نے اُن سے بحث نہین کی اس لئے کہ وہ اُن کی سمجھ سے بالاتر تھے کیونکہ اُن کے معانی اُن ملائکہ سے ماخوذ ہین جن کو ملاء اعلیٰ کہتے ہین" اے بھائی تجھ کو اُن لوگون مین شامل نہین ہونا چاہئے جو دنیوی زندگی کے ظاہر سے تو واقف ہین، لیکن آخرت سے غافل، جنکی خدا نے اپنی کتاب مین اس طرح بُرائی بیان کی ہے،

صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ — بہرے گونگے، اندھے ہین اسلئے یہ لوگ نہین دیکھتے،

---

[۱] رسائل اخوان الصفا، جلد ۴ ص ۲۱۵ [۲] الفرق بین الفرق ص ۲۹۲،

توکیا تمھارے خیال مین یہ لوگ آواز نہین سنتے تھے ؟ یا رنگ کو نہین دیکھتے تھے ؟ یا معاش کے معاملے کو نہین سمجھتے تھے ؟ یہ کچھ نہین، بلکہ خدا نے اُن کی بُرائی اس لئے بیان کی ہے، کہ وہ اُن معانی کو نہین سمجھتے تھے، جو پیغمبرون کی کتابون مین مذکور ہین، اور جن کی طرف ہم ان رسالون مین اشارہ کرتے ہین، اور اپنے بھائیون کو اُن کی دعوت دیتے ہین، پیغمبرون کا یہی دین ہے، اور ربانیون اور احبار کا یہی مذہب ہے، جنھون نے خدا کی کتاب مین اُن مخفی اسرار کا تحفظ کیا ہے، جن کو صرف پاک لوگ چھو سکتے ہین، اور یہ لوگ اہلبیت ہین، جن سے خدا نے نجاست کو دور کر دیا ہے، اور اُن کو خوب پاک و صاف کیا ہے[۵۱]،

ان تمام تصریحات سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ یہ لوگ فرقہ باطنیہ سے تعلق رکھتے تھے، اور صرف اس مذہب یا اُن اسرار و معانی کی دعوت دیتے تھے، جو اہلبیت سے ماخوذ ہین،

(۳) لیکن اس دعوت کا جو مقصد تھا، اس کے لئے ہم کو اس گروہ کی تنظیم و ترتیب پر غور کرنا چاہئے، اس سلسلہ مین سب سے مقدم بات یہ تھی کہ اخوان الصفاء کا انتخاب نہایت غور و فکر سے کیا جاتا تھا، اور اس گروہ کے ہر فرد کو یہ ہدایت تھی کہ جب وہ کسی کو اپنا دوست یا بھائی بنانا چاہے، تو اس کو اس طرح پرکھے جس طرح درہم و دینار پرکھے جاتے ہین، یا بیج بونے یا درخت لگانے کیلئے عمدہ مٹی والی زمین کا انتخاب کیا جاتا ہے[۵۲]، اگر کوئی شخص خود پسند، جھگڑالو، سخت دل، حاسد، کینہ پرور، منافق، ریاکار، بخیل، بزدل، مکار، بیوفا، متکبر، سرکش، حریص، اپنے استحقاق سے زیادہ مدح پسند ہو، یا اپنے ہمسرون کو حقیر سمجھتا ہو، یا اپنی قوت پر اعتماد رکھتا ہو، وہ مودت اور اخوت کے قابل نہین[۵۳]، ان بوڑھون کی اصلاح مین جو بچپن ہی سے بری رایون کے معتقد، اور بری عادتون اور وحشت انگیز اخلاق کے خوگر ہین، وقت ضائع نہین کرنا چاہئے کیونکہ کسی علم کے حاصل ہونے یا کسی عقیدہ کے معتقد ہونے سے پہلے روح کی حالت اس سادہ کاغذ کی ہوتی ہے، جس مین کچھ لکھا نہ گیا ہو، پھر جب اس مین حق یا باطل جو کچھ لکھدیا جاتا ہے

---

[۵۱] رسائل اخوان الصفاء جلد ۴ ص ۲۲۳ [۵۲] ایضاً ص ۱۰۰ [۵۳] ایضاً ص ۱۰۹،

تو اس مین کوئی دوسری بات نہین لکھی جا سکتی، اور جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا مٹانا مشکل ہوتا ہے، بعینہٖ اسی طرح جب روح مین کوئی علم، کوئی اعتقاد، کوئی عادت خواہ وہ حق ہو یا باطل جاگزین ہو جاتی ہے تو اس کا مٹانا دشوار ہو جاتا ہے اسلئے صرف سلیم القلب اور مبتدی جوانون کا انتخاب کرنا چاہئے، کیونکہ خدا نے صرف ان لوگون کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے، جو جوان تھے، اور اس بندے کو حکمت عطا فرمائی ہے، جو جوان تھا خدا کے ہر پیغمبر کی سب سے پہلے تکذیب اس کی قوم کے فلسفی اور مناظرہ پسند بوڑھون نے کی ہے[1]، انسانون کے چار درجے ہین، بعض لوگ صاحبِ مال اور صاحبِ علم دونون ہوتے ہین، بعض لوگ دونون سے محروم رہتے ہین، بعض لوگون کے پاس مال تو ہوتا ہے لیکن علم نہین ہوتا، بعض لوگون کے پاس علم تو ہوتا ہے لیکن مال نہین ہوتا، تو ہمارے بھائیون مین سے جس کے پاس علم اور مال دونون ہون وہ ان مین اپنے اس بھائی کو شریک کرلے، جو دونون سے محروم ہے، اور اس پر احسان نہ جتائے، اور اس کو حقیر نہ سمجھے جس طرح باپ اپنے بیٹے پر احسان نہین جتاتا، لیکن اگر ایک بھائی کے پاس مال تو ہو، اور علم نہ ہو تو اس کو اپنے ساتھ اُس بھائی کو شریک کر لینا چاہئے، جو صاحبِ علم ہو، یہ مال سے اس کی خدمت کرے اور وہ علم سے اس کو بہرہ اندوز کرے، اور صاحبِ مال بھائی اپنے صاحبِ علم بھائی پر احسان نہ جتائے لیکن اگر صاحبِ علم بھائی کو جو مال سے محروم ہے، ایسا شخص نہ مل سکے جو مال سے اس کی اعانت کرے تو اس کو صبر کرنا چاہئے خدا کسی نہ کسی طرح اس کی مصیبت کو دور کر دے گا لیکن جس بھائی کے پاس نہ علم ہے، نہ مال تو اس کے پاس پاکیزہ روح ہے، عمدہ اخلاق ہین، اس کا دل آراء فاسدہ سے محفوظ ہے وہ خیر اور اہلِ خیر کا دوست ہے، خدا نے اس کو جو کچھ دیا ہے، اس پہ صابر اور راضی ہے، اس لئے اسکو جاننا چاہئے کہ یہ چیزین مال اور علم دونون سے بہتر ہین، کیونکہ ہم نے بہت سے فلسفی اور علماء کو دیکھا کہ وہ فنِ اخلاق مین کتابین لکھتے ہین، اور لوگون کو اخلاق کی تعلیم دیتے ہین، لیکن خود اُن کے اخلاق

---

[1] رسائل اخوان الصفاء جلد ۴ ص ۱۱۴–۱۱۵۔

نہایت بُرے ہیں، اسی طرح ہم نے بہت سے لوگون کو دیکھا ہے جن کے پاس علم تو کم ہے لیکن اُن کے اخلاق عمدہ ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ خوش خلقی خدا کی ایک نعمت ہے[۱]۔

غرض علمی، مالی، اخلاقی، اور معاشرتی اشتراک کی بنا پر اس جماعت مین ہر طبقہ کے لوگ شامل تھے اور ہر ملک مین اس کا جال پھیلا ہوا تھا، اور اُن کی تعلیم و تربیت کے لئے ہر جگہ ایک خاص شخص مقرر تھا، چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہین کہ ہمارے بہت سے شریف اور فاضل بھائی اور دوست مختلف ملکون مین پھیلے ہوئے ہین، ان مین ایک گروہ سلاطین، امراء، وزراء، عمال اور کتاب کی اولاد کا ہے، ایک گروہ اشراف، دہقانون، تجار، اور مجاہدین کی اولاد کا ہے، ایک گروہ علماء، ادباء، اور فقہاء کی اولاد کا ہے، ایک گروہ کاریگرون اور عام کاروباری لوگون کی اولاد کا ہے، اور ہم نے ان مین سے ہر گروہ کے لئے اپنے ایک بھائی کو جس کی بصیرت اور علم کو ہم نے پسند کیا، مقرر کر دیا ہے تاکہ وہ ہمارا قائم مقام ہو، اور اُن کو نرمی، مہربانی اور شفقت سے نصیحت کرے[۲]، اس جماعت کی ایک خاص مجلس تھی، لیکن جو لوگ اس مجلس مین شریک نہین ہو سکتے تھے، اُن کی اصلاح و تربیت کے لئے یہ رسالے لکھے گئے تھے، جو اُن کو تقسیم کئے جاتے تھے، چنانچہ لکھتے ہین کہ

"ہمارے بھائیون کو اس علم کی جن چیزون کی ضرورت ہے، ہم نے ان کو ۵۱ رسالون مین بیان کر دیا ہے، تو اگر تم ہماری مجلس مین حاضر نہ ہو سکو، تو ان کو دیکھو، اور اپنے جن بھائیون کو تم پسند کرو اور ان مین ہدایت کے آثار پاؤ، اُن کے سامنے اُن کو پیش کر دو[۳]"

جب یہ لوگ اس مجلس مین آتے تھے، اور اُن کے ساتھ کوئی نوخیز اور نو آموز شخص شریک ہوتا تھا، تو اس کے سامنے ایک خطبہ دیا جاتا تھا جس کے الفاظ یہ تھے، کہ ہر سلطنت کا ایک وقت ہوتا ہے، جس سے اس کی ابتدا ہوتی ہے، اس کی ترقی کا ایک درجہ ہوتا ہے، جہان تک وہ ترقی کرتی ہے، اور ایک حد پر پہنچ کر اس کی انتہا ہو جاتی ہے، لیکن جب وہ اپنے انتہائی درجہ کو پہنچ جاتی ہے، تو اس کو زوال

---

[۱] رسائل اخوان الصفا، جلد ۲ ص ۱۱۵-۱۱۶-۱۱۰ [۲] ایضاً ص ۱۱۲ [۳] ایضاً ص ۲۲۱، ۲۲۲

ہونے لگتا ہے، اور دوسری سلطنت مین قوت ونشاط پیدا ہوجاتا ہے، اور وہ روز بروز طاقتور اور یہ روز بروز ضعیف ہوتی جاتی ہے، یہان تک کہ پہلی سلطنت بالکل مٹ جاتی ہے، اور دوسری نوخیز سلطنت اس کی جگہ لے لیتی ہے،

جس طرح زمانے مین تغیرات ہوتے رہتے ہین، اسی طرح نیکی اور بدی کی سلطنت مین اہل زمانہ کی حالت بھی ہوتی ہے، کبھی دنیا مین قوت وغلبہ نیک لوگونکو حاصل ہوتا ہے اور کبھی بدلوگونکو، جیسا کہ خداوند تعالیٰ

تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ہم زمانہ کو لوگون مین بدلتے رہتے ہین،

تو اے بھائیو! تم دیکھتے ہو کہ بد لوگون کی قوت اس زمانہ مین اپنے انتہائی درجہ کو پہنچ گئی، اور انتہائی درجہ کے بعد صرف انحطاط اور نقصان ہی کا درجہ ہے، سلطنت ہر زمانہ مین ایک گروہ سے دوسرے گروہ ایک خاندان سے دوسرے خاندان اور ایک ملک سے دوسرے ملک مین منتقل ہوتی رہتی ہے، لیکن نیک لوگون کی سلطنت کی ابتدا نیک اور فاضل لوگون سے ہوتی ہے، جو ایک شہر مین جمع ہوتے ہین، ایک رائے، ایک دین اور ایک مذہب پر اتفاق کرتے ہین، باہم مضبوط عہد وپیمان کرتے ہین کہ ایک دوسرے کی مدد کرین گے، اُن کو بے یار ومددگار نہ چھوڑین گے، اور تمام معاملات مین یک جان دو قالب ہوجائین گے، تو اے بھائیو! یہ اعتماد رکھو کہ اگر تم نے کوشش سے کام کیا، تو خدا تمھاری مدد کرے گا، جیسا کہ اوس نے وعدہ کیا ہے کہ

وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَن يَنْصُرُهُ، خدا اس کی مدد کرے گا جو اسکی مدد کرتا ہے،

وان حزب الله هم الغالبون[۱]، صرف خدا ہی کا گروہ غالب ہوگا،

جو لوگ اس مجلس مین شریک نہین ہوتے تھے، اُن کے پاس داعی اور مبلغ بھیجے جاتے تھے، اور داعی کے ذریعہ سے ان تک یہ پیغام پہنچایا جاتا تھا، چنانچہ ایک موقع پر لکھتے ہین کہ "اے بھائی ہم نے تجھکو

---

[۱] رسائل اخوان الصفا، جلد ۴ ص ۲۲۴ - ۲۲۵،

ایک نیک اور دینی کام کے لئے انتخاب کیا ہے، تو ہمارے ایک بھائی کے پاس جا اور اس سے رفق و ملاطفت کے ساتھ اس کی خلوت میں جب وہ فارغ البال ہو مل اور اس کو ہمارا سلام پہنچا، اور اس کے سامنے اس نصیحت کو پیش کرتا کہ وہ اس پر غور کرے، اور اس کو بتا کہ اس کے جن بھائیون نے اس کو بھیجا ہے ان کی ایک مجلس ہے، جس مین وہ خلوت مین جمع ہوتے ہین، علوم و فنون پر بحث کرتے ہین مخفی اور راز کی باتون پر گفتگو ہوتی ہے، انھون نے اس مجلس مین ایک دن زمانہ کے انقلابات، مذاہب کے تغیرات اور سلطنتون کے ادل بدل پر گفتگو کی، تو سب نے اس رائے پر اتفاق کیا کہ عنقریب دنیا مین ایک انقلاب رونما ہوگا، جس مین دین و دنیا کی بھلائی ہوگی، اور وہ یہ ہے کہ ایک نئی حکومت قائم ہوگی، اور سلطنت ایک قوم سے دوسری قوم مین منتقل ہو جائے گی، دلیل عقل، تجربہ، قیاس، زجر، فال، کہانت، فراست، نجوم اور خواب، سب سے ہم نے اس کو معلوم کر لیا ہے، اور نئے بادشاہ کے اوصاف سے واقف ہو گئے ہین، اور اس سال اس مہینہ کو جان لیا ہے جس مین یہ انقلاب رونما ہوگا، اگر وہ اس نصیحت کو قبول کرلے تو فبہا، اور اگر توقف کرے، اور یہ کہے کہ اس کی علامت کیا ہے؟ اور اس کی تصدیق کیونکر کیجا سکتی ہے؟ تو ہم کہتے ہین کہ اس کے دلائل و علامات تو ظاہر ہین، لیکن اُن کو وہی شخص جان سکتا ہے، جو علوم پر ہماری طرح نگاہ ڈالے، اور اُن سے ہماری طرح واقف ہو[۵]،

ان تصریحات سے ثابت ہوتا ہو کہ اس جماعت کا اصلی مقصد ایک سیاسی انقلاب اور ایک نئی سلطنت کا قیام تھا، انھون نے علم، مذہب اور اخلاق کے ذریعہ سے اس انقلاب کو پیدا کرنا چاہا ہے، اور چونکہ انسانون کے مختلف گروہ ہین، اور ہر گروہ پر مختلف علوم، مختلف مذاہب اور مختلف عقائد کا اثر پڑتا ہے، اس لئے انھون نے ہر علم، ہر مذہب، اور ہر عقیدہ کو اس کا ذریعہ بنایا ہے، اور اپنے بھائیون کو یہ نصیحت کی ہے، کہ وہ کسی علم سے دشمنی نہ رکھین، یا کسی کتاب کو نہ چھوڑین، کسی مذہب سے تعصب نہ رکھین، کیونکہ ان کا مذہب تمام مذاہب

---

۵ رسائل اخوان الصفا، جلد ۴ ص ۲۳۶، ۲۳۷،

کو شامل ہے،

عام طور پر اُن کے علم کے ماخذ چار ہین،

۱۔ وہ کتابین جو حکمانے ریاضیات اور طبیات پر لکھی ہین،

۲۔ وہ کتابین جو پیغمبرون پر نازل ہوئین، مثلاً توراۃ، انجیل، قرآن، اور انبیاء کے دوسرے صحیفے

۳۔ صحیفۂ فطرت، یعنی آسمانون کی ترکیب، بروج کے اقسام، ستارون کی حرکت، ان کے اجسام کی مقدار، عناصر کے تغیرات، کائنات کی مختلف قسمین مثلاً معدنیات، حیوانات، نباتات، انسانی مصنوعات،

(۴) کتب الٰہیہ جس کو صرف پاک لوگ یعنی فرشتے چھو سکتے ہین، اور یہ جواہر نفوس کے اجناس انواع اور جزئیات ہین، جو اجسام مین تصرف کرتے ہین، ان کو حرکت دیتے ہین، اُن کی تدبیر کرتے ہین اور وقتاً فوقتاً اُن کے افعال کو پیدا کرتے ہین[1]

لیکن طرز تحریر فلسفیانہ اور متکلمانہ نہین ہے، بلکہ خطیبانہ شاعرانہ اور انشاپردازانہ ہے، غالباً کلیلہ ودمنہ کا ان پر اثر پڑا ہے، اور بہت سی باتین جانورون کی زبان سے بیان کی گئی ہین، اور جا بجا قصص وحکایات کے ذریعہ سے مطالب کو سمجھایا گیا ہے، اس لئے کتاب دلچسپ تو ضرور ہوگئی ہے لیکن اس کو فلسفہ کی کتاب نہین کہا جا سکتا، اس لئے قدیم زمانہ کے فلسفیون نے اس کو بہت زیادہ دلچسپی کے ساتھ نہین دیکھا، چنانچہ ابو حیان توحیدی سے جب وزیر صمصام الدولہ نے پوچھا کہ "تم نے ان رسالون کو دیکھا ہے"؟ تو اس نے کہا کہ "مین نے ان کو دیکھا ہے، وہ ہر فن پر مشتمل ہین لیکن وہ بالکل ناکافی ہین اور ان مین خرافات، کنایات اور رنگ آمیزیان بہت ہین، مین نے ان مین سے چند رسائل اپنے شیخ ابو سلیمان منطقی سجستانی محمد بن بہرام کی خدمت مین پیش کئے، اور انھون نے ان کو چند دنون تک غور و فکر

[1] رسائل اخوان الصفا جلد ۴ ص ۱۰۵ و ۱۰۶،

کے ساتھ دیکھ کر واپس کر دیا، اور کہا کہ ان لوگون نے تکلیفین تو بہت اٹھائین لیکن لا حاصل چشمے کے گرد گھومتے رہے لیکن اس کے کنارے اتر نہ سکے، راگ تو گائے لیکن کسی کو حال نہ آیا، بال تو سنوارے لیکن اس مین اور پیچ وخم پڑ گئے، اُن لوگون نے ایک ناممکن خیال قائم کیا، یہ گمان کیا کہ فلسفہ یعنی علم نجوم، علم آفلاک ومقادیر مجسطی، آثار طبیعہ، موسیقی اور منطق کو شریعت مین شامل کر کے شریعت اور فلسفہ کو باہم مربوط کر دین لیکن یہ بڑی دشوار گذار راہ ہے، ان سے پہلے ایک قوم نے جو اُن سے بہت زیادہ تیز دست، طاقت ور، سرمایہ دار اور بلند رتبہ تھی، اس قسم کی کوشش کی تھی لیکن ناکامیاب رہی، نجاستون مین آلودہ ہو گئی، اور اس کا انجام نہایت ذلت انگیز ہوا اس موقع پر بخاری ابن العباس نے اُن سے پوچھا کہ ایسا کیون ہوا؟ انھون نے کہا کہ شریعت بذریعہ ایک سفیر کے خداوند تعالیٰ سے وحی مناجات، شہادت آیات، اور ظہور معجزات کے طریقہ سے ماخوذ ہے، اور یہ ایسی چیزین ہین، جن پر بحث وتدقیق نہین کی جا سکتی، ان کو صرف مان لینا چاہئے، اور یہان اس قسم کے سوالات نہین کرنے چاہئین، کہ ایسا کیون ہوا؟ کیونکر ہوا، یہ کیون نہین ہوا؟ کاش ایسا ہوتا؟ بلکہ اُن کی بنیاد ان حدیثون پر قائم ہے، جو اہل ملت مین مشہور ہین، اور اُن پر امت نے اتفاق کر لیا ہے، ان مین ستارون کے اثر کے متعلق نجومیون کی طبیعت کے آثار، حرارت، برودت، رطوبت اور یبوست، اور فعل وانفعال کے متعلق طبیعین کی، اشیار کی مقدار کے متعلق مہندسون کی، اور اقوال اور اسمار وافعال* کے متعلق منطقیون کی باتین شامل نہین ہین، ایسی حالت مین اخوان الصفار کے لئے یہ کیونکر جائز ہے کہ وہ ایک ایسی ہمہ گیر دعوت کا پروگرام بنائین، جو شریعت مین فلسفیانہ حقائق کی جامع ہو، ان لوگون کے علاوہ صاحب عزیمت، صاحب کیمیار، صاحب طلسم، معبرین خواب، مدعیان سحر اور شعبدہ بازون کی ایک جماعت بھی ہے، جو اسی قسم کے مقاصد رکھتی ہے، تو اگر یہ باتین جائز ہوتین تو خداوند تعالیٰ اُن پر تنبیہ کرتا، اور صاحب شریعت اُن کو استعمال کر کے اپنی شریعت کو مکمل بناتا اور

اُن کے اضافہ سے شریعت کے نقص کی تلافی کرتا، اور فلسفیون کو اُن کی توضیح وتکمیل پر آمادہ کرتا، لیکن نہ تو اُس نے خود ایسا کیا اور نہ یہ کام اپنے خلفاء کے سپرد کیا، بلکہ ان چیزون پر غور و فکر کرنے کی ممانعت کی، اور فرمایا کہ جو شخص، عراف، کاہن، اور منجم کے پاس اس غرض سے گیا کہ اس کو غیب کی باتین معلوم ہو جائین، اُس نے خدا سے لڑائی مول لی، اور جو شخص خدا سے لڑے گا، اور اس پر غلبہ حاصل کرنا چاہے گا، وہ خود مغلوب ہو جائے گا. اس کے بعد انھون نے کہا کہ امت نے اصول و فروع مین بہت سے اختلافات کئے، حلال و حرام، تفسیر و تاویل، اور عادت و اصطلاح کے متعلق ان مین نزاعین پیدا ہوئین، لیکن انھون نے ان مباحث مین منجم، طبیب، منطقی، ریاضی دان، موسیقی دان، صاحب عزیمت، شعبدہ باز، ساحر اور ارباب کیمیا سے مدد نہین لی، کیونکہ خدا نے اس دین کی تکمیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے کی، اور اس بیان کے بعد جس کا ذریعہ وحی تھا، آپ کو ایسے بیان کا محتاج نہین کیا جس کا ذریعہ رائے ہے، جس طرح یہ امت ارباب فلسفہ کی محتاج نہین ہے، اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اُمت یعنی یہود، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت یعنی عیسائی، اور مجوسی بھی ارباب فلسفہ کے محتاج نہین ہین، اس کی مزید توضیح اس سے ہوتی ہے کہ اس امت مین رائے اور مذاہب کے لحاظ سے بہت سے اختلافات پیدا ہوئے، اور ان اختلافات کی بنا پر بہت سے فرقے مثلاً معتزلہ، مرجیہ، شیعہ، اہلسنت والجماعة، اور خوارج پیدا ہوگئے، لیکن اُن مین کوئی گروہ فلسفیون کا محتاج نہین ہوا، اور نہ اُن کے دلائل سے اپنے عقائد ثابت کئے، اسی طرح فقہاء نے بھی جن مین ابتدائی زمانہ سے اب تک حلال و حرام کے احکام مین بہت سے اختلافات پیدا ہوئے فلسفیون سے مدد نہین لی، پھر دین اور فلسفہ مین کیا تعلق ہے؟ اور جو چیز وحی سے ماخوذ ہے، اس کو اس چیز سے کیا علاقہ جو رائے سے ماخوذ ہے؟ اگر وہ عقل سے استدلال کرتے ہین، تو اگر عقل کافی ہوتی، تو وحی کا کیا فائدہ تھا؟ اس کے علاوہ عقل مین لوگون کے درجے باہم مختلف ہین، کل عقل ایک ہی شخص کو نہین ملی ہے، بلکہ اس مین

سب لوگ شریک ہیں، اس لئے اگر عقل کے بھروسہ پر ہم وحی سے بے نیاز ہو جائیں، تو کیا کر سکتے ہیں؟ اگر کوئی شخص جہالت سے یہ کہے کہ ہر عاقل کے لئے صرف اس کی عقل کافی ہے، اس کو دوسرے کی عقل کی ضرورت نہیں، تو اس میں کوئی شخص اس سے اتفاق نہ کرے گا، اگر دین و دنیا کے تمام کاموں میں ایک شخص صرف اپنی عقل پر اعتماد کرے تو اس کو اپنی دین و دنیا کی تمام ضرورتوں میں اپنی ہی قوت پر اعتماد کرنا ہوگا، اور تمام علوم و صنائع میں وہ اپنے اور بھائیوں کا محتاج نہ ہوگا، اور یہ ایک ایسی بات ہے جس کی تائید کسی نے نہیں کی، اس پر بخاری نے یہ اعتراض کیا کہ وحی میں انبیاء کے درجے بھی مختلف ہیں، اور جب وحی میں یہ جائز ہے، اور اس سے اس میں کوئی نقص نہیں پیدا ہوتا، تو یہ عقل میں بھی جائز ہوسکتا ہے؛ لیکن انھوں نے اس کا یہ جواب دیا کہ اصحابِ وحی کے درجات کے اختلاف نے اُن کے قابلِ اعتماد ہونے پر کوئی اثر نہیں ڈالا، لیکن مختلف عقلوں سے کام لینے والوں میں یہ اعتماد مفقود ہے، اب وزیر نے کہا کہ کیا مقدسی نے بھی یہ باتیں کہیں؟ اُس نے کہا کہ باب الطاق میں مسودہ نویسوں کے سامنے میں نے یہ اور اسی قسم کی اور باتیں گھٹا بڑھا کر اور آگے پیچھے کرکے اس سے کہیں لیکن وہ خاموش رہا، اور مجھکو اس کے جواب کے قابل نہیں سمجھا، لیکن ابن طرارہ کے غلام حریری نے اس کو مسودہ نویسوں کے سامنے اسی قسم کی باتوں سے اشتعال دلایا، تو اس نے مشتعل ہوکر کہا کہ شریعت مریضوں کی طب اور فلسفہ صحیح و تندرست لوگوں کی طب ہے، پیغمبر لوگ مریضوں کا علاج کرتے ہیں، تاکہ ان کا مرض بڑھنے نہ پائے، یہاں تک کہ مرض زائل ہو جائے، اور صحت عود کر آئے، لیکن فلاسفہ حفظانِ صحت کا فرض انجام دیتے ہیں، تاکہ لوگوں میں مرض پیدا ہی نہ ہونے پائے، اور مریض اور تندرست لوگوں کے مدبرین میں جو فرق ہے، وہ ظاہر ہے، کیونکہ مریض کی تدبیر کے یہ معنی ہیں، کہ اگر دوا موثر ہو، طبیعت میں اس کے اثر کے قبول کرنے کی صلاحیت ہو، اور طبیب مخلص ہو تو صحت عود کر آئے، اور تندرست آدمی کی تدبیر کا مقصد یہ ہے کہ صحت محفوظ رہے، اور جب صحت محفوظ ہوگی تو

وہ تمام فضائل کو حاصل کرسکے گا، اور وہ سعادت عقلی کے حاصل کرنے مین کامیاب ہوگا، اور خدائی زندگی کا مستحق ہوجائے گا، جس کے معنی دائمی بقا کے ہین، اگرچہ وہ شخص بھی جو طبیب کی دوا سے مرض سے شفایاب ہوتا ہے، ان فضائل کو حاصل کرسکتا ہے، لیکن یہ فضائل پہلے فضائل سے مختلف ہین کیونکہ ایک تقلیدی ہے، دوسرا برہانی، ایک ظنی ہے، اور دوسرا یقینی، ایک روحانی ہے، دوسرا جسمانی، ایک ابدی ہے، اور دوسرا وقتی، [1]

ان رسائل کے متعلق گذشتہ دور مین اس سے زیادہ تفصیلی رائے نہین مل سکتی، لیکن موجودہ دور مین ان کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے، کہ

۱- اسماعیلی شیعون کی ایک انقلاب انگیز سیاسی جماعت تھی، جو ابو سلیمان نہر جوری کے مکان مین جمع ہوتی تھی، اور جب کوئی اجنبی اوس مین شریک ہوجاتا تھا، تو رمز و کنایہ مین گفتگو کرتی تھی، زید بن رفاعہ ان اجتماعات مین شریک ہوتا تھا، اور اسی طریقۂ اجتماع نے وزیر صمصام الدولہ کے دل مین اس کے متعلق شکوک و شبہات پیدا کئے،

۲- چوتھی صدی مین مسلمانون کا سیاسی زوال انتہائی درجہ کو پہنچ گیا تھا، اور ہر جگہ طوائف الملوکی پھیل گئی تھی، لیکن اسی کے ساتھ مسلمانون کی عقلی زندگی نہایت ترقی یافتہ ہوگئی تھی، اور تمام دنیا کی قومون کے علوم و فنون اسلامی تمدن کا جزو ہوگئے تھے،

۳- اخوان الصفاء کی جماعت اسی سیاسی نظام کو الٹنا چاہتی تھی لیکن اسی کیساتھ وہ نظام عقلی مین بھی انقلاب پیدا کرکے ایک جدید نظام عقلی قائم کرنا چاہتی تھی، اور اس نے اس معاملہ مین یونانیون کی تقلید کی تھی، کیونکہ فیثاغورثیون کی جماعت بھی یونانی نظام سیاست کو سخت ناپسند کرتی تھی، اور اس مین انقلاب پیدا کرنا چاہتی تھی جس کیلئے انھون نے بہت سے طریقے ایجاد کئے تھے، جن مین سب سے اہم طریقہ یہ تھا کہ انھون نے نظام عقلی کو

---

[1] اخبار الحکماء قفطی صفحہ ۹۰۔ ۹۱۔ ۹۲۔ ۹۳

بدل کرایک نیا فلسفہ پیدا کرنا چاہتا تھا جس کے ذریعہ سے ایک ایسی عقلی اور عملی زندگی پیدا ہو جائے جو اس نئی سیاست کے لئے موزون ہو، اور عام معاملات اس جماعت کے زیر اقتدار آجائین،

افلاطون نے بھی عقلی حیثیت سے ایک سیاسی نظام قائم کیا تھا جس کی تفصیل اُس نے کتاب جمہوریت مین کی ہے، یہ نظام افلاطونی فلسفہ کی بنیاد پہ قائم ہوا تھا جس طرح فیثاغورثی جماعت کے سیاسی نظام کی بنیاد فیثاغورثی فلسفہ پر قائم تھی، تمام یونانی فلسفیون کا اس پہ اتفاق ہے کہ کوئی سیاسی نظام اُس وقت تک کامیاب نہین ہو سکتا جب تک ایک ایسا نظام تربیت نہ قائم کیا جائے، جو اس سیاسی نظام کے لئے موزون ہو، اور فرد و جماعت کو اس کی تائید و مدافعت کیلئے تیار کر دے، افلاطون نے جمہوریت مین اور ارسطو نے کتاب السیاستہ مین اسی نظام تربیت کو اہمیت دی ہے، اور اخوان الصفاء کی جماعت اس معاملے مین افلاطون اور فیثاغورث دونون سے متاثر ہے، اور جس طرح فیثاغورث کو کسی قدر سیاسی کامیابی یونان مین حاصل ہوئی تھی، اسی طرح اس جماعت کو بھی سیاسی کامیابیان حاصل ہوئین، اور اسماعیلیون کو عالم اسلامی کے بعض حصون مین اقتدار حاصل ہو گیا،

۴- اگرچہ اس قسم کی مخفی جماعتون کا قائم ہونا بذاتِ خود اس بات کی دلیل ہے کہ اس زمانہ مین مسلمانون کی سیاسی حالت کس قدر ابتر ہو گئی تھی، تاہم ان رسائل مین اس زمانہ کی سیاسی حالت سے زیادہ اس زمانہ کی عقلی زندگی کی مکمل تصویر نظر آتی ہے، ہم کو صاف نظر آتا ہے کہ اسلامی عقل نے یونان کے فلسفہ، ہندوستان کی حکمت، ایرانیون اور عربون کے آداب، اور ہر آسمانی اور غیر آسمانی مذہب کے حقائق کو اخذ کر لیا ہے، اور ان کی ترتیب و تنظیم سے ایک ایسا موزون مجموعہ تیار کر لیا ہے، جو ہر روشن خیال شخص کے لئے قابلِ قبول ہے، اس لئے یہ رسائل فلسفہ کی ایک انسائیکلوپیڈیا ہین جن مین افلاطون، فیثاغورث اور ارسطو سب کا فلسفہ موجود ہے،

اس کے علاوہ اس دور مین اسلامی فلسفہ پر مذہب، اخلاق اور تصوف وغیرہ کا جو اثر پڑا ہے اُن سب کی تفصیل ہے، یہان تک کہ ان مین خرافات کا ایک حصہ بھی شامل ہے، فارابی اور ابن سینا نے فلسفہ کی جو کتابین لکھی تھین، وہ مخصوص لوگون کے لئے تھین لیکن ارباب رسائل اخوان الصفا نے یہ رسالے عام لوگون کے لئے لکھے ہین، اس لئے اس مین فلسفیانہ دقیق عبارتین نہین پائی جاتین بلکہ صاف وسلیس ادبی رنگ پایا جاتا ہے، لیکن باین ہمہ اُن سے فلسفہ کی تعلیم دینا مقصود نہین بلکہ ایک ایسا مجموعہ تیار کرنا مقصود ہے جو ایک خاص قسم کی سیاست کے لئے ایک جماعت کو تیار کر دے اس لئے انھون نے اُس کی عام اشاعت نہین کی،

اعلان

(۱) یکم جنوری ۴۹ء سے دار المصنفین کی مطبوعات کی سابقہ قیمتون مین صفحات کے اعتبار سے مناسب ترمیم کر دی گئی ہے، اُمید ہے کہ خریدارون اور تاجرون کو قیمت کے متعلق کوئی غلط فہمی نہ ہوگی،

(۲) یکم جنوری ۴۹ء سے کمیشن کے قواعد پر بھی نظر ثانی کی گئی ہے، کمیشن اب صرف مستقل تاجرون کو جو کم از کم ۱۰۰ روپیہ تک کی کتابین خریدین گے، سیرت پر ۱۲½ اور دیگر مطبوعات دار المصنفین پر ۲۵ فی صدی دیا جائیگا، اس سے کم قیمت کی فرمایش پر کوئی کمیشن نہین دیا جائے گا،

(۳) سیرت النبی اور سیر الصحابہ کے مکمل سٹ مین جن جلدون کی کمی تھی، ان کی دوبارہ طباعت ہو رہی ہے، امید ہے آیندہ ششماہی مین یہ دونون سٹ مکمل ہو جائین گے،

ہندوستان کے کتب خانے

از مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی

اس مضمون کا انگریزی ترجمہ اسلامک کلچر حیدرآباد میں چھپ چکا ہے، لیکن
اصل مضمون شائع نہیں ہوا تھا، جو اب شائع کیا جاتا ہے،

دوسری قوموں کی طرح ابتدا میں ہندوؤں میں بھی لکھنے کی رسم نہ تھی، بھوج پتر کی ایجاد اور چینیوں کے ریشمی کپڑے کی آمد کے بعد یہاں لکھنے کا رواج شروع ہوا، ابتدا میں وید، مہابھارت، گیتا، وغیرہ مذہبی کتابیں لکھی گئیں، لکھنے پڑھنے والوں کا خاص فرقہ برہمنوں کا تھا، جس کا بڑا وقت پوجا پاٹ، قربانی اور تعلیم میں صرف ہوتا، اور یہ سب کام مندروں یا مندر سے متعلق عمارتوں میں انجام پاتے، چنانچہ ان کی لکھی ہوئی کتابیں بھی انہی مقامات میں ہوتیں،

برہمنوں کے بعد جب بدھوں کا دور آیا، تو انھوں نے مندروں کے علاوہ خاص قسم کی خانقاہیں تعمیر کرائیں، تعلیم و تربیت، طالب علموں اور معلموں کا قیام انہی میں ہوتا، اور انہی کے ایک حصہ میں کتب خانہ ہوتا، جس کو "پستک بھنڈار" کہتے تھے،

مشہور چینی سیاح ہونگ شیانگ جب ہندوستان آیا ہے (۶۳۰ء) تو اس نے ہر خانقاہ میں ایک کتب خانہ دیکھا، راج گڑھ کے پاس مشہور دار العلوم نالندہ میں جو کتب خانہ تھا، اس سے بہت سی کتابیں نقل کرکے وہ اپنے وطن چین ساتھ لے گیا[1]، یہ کتب خانہ عرصۂ دراز تک قائم رہا،

---

[1] سفرنامہ ہونگ شیانگ سفر نالندہ ص ۵۰ لاہور،

یہاں تک کہ محمد بن بختیار خلجی نے رن گڑھ فتح کر لیا[1]، اس وقت برہمنوں کی نادانی سے یہ کتب خانہ ضائع ہوگیا، اس کے علاوہ پاٹلی پتر (پٹنہ)، اجین (مالوہ)، بھروچ (گجرات)، متھرا، اور بنارس وغیرہ میں بھی بہت کتب خانے تھے، مندروں میں جو کتب خانے تھے، ان میں سے بعض فیروز شاہ تغلق کے عہد میں مسلمانوں کو دست یاب ہوئے، چنانچہ جوالا مکھی کے مندر میں ایک ہزار سے زیادہ کتابیں موجود تھیں، جن میں سے بعض کا ترجمہ بھی فیروز شاہ تغلق نے کرایا تھا،[2]

تغلق کے زمانہ میں کتب خانہ سلطان محمد شاہ تغلق متوفی ۷۵۲ھ ہندوستان کے ان بادشاہوں میں سے ہے، جس کا حال ملکی اور غیر ملکی دونوں مورخوں نے لکھا ہے، اس کا دربار علما، فضلا، شعرا اور ادیبوں سے معمور تھا، سعد منطقی، عبید اور بدر چاچی شاعر، ضیا برنی مورخ، مولانا عضد الدین، مولانا ناصر الدین، ملک غازی فقیہ شاعر، قاضی غزنین، مولانا رکن عالم، مولانا نصیر الدین چراغ دہلوی، جیسے یگانہ روزگار اس کے دربار کے روشن ستارے تھے، قلقشندی نے لکھا ہے، کہ محمد تغلق کے زمانہ میں صرف دہلی میں ایک ہزار مدرسے تھے۔[3]

خود محمد تغلق کی نسبت مورخین لکھتے ہیں کہ تقریر فصیح اور کلام شیریں کرتا تھا، عربی اور فارسی میں مراسلات فی البدیہہ لکھتا، نہایت خوشخط اور بڑا طباع اور ذہین تھا، ابتدائی باتوں سے لوگوں کا مافی الضمیر سمجھ لیتا، حافظہ اس قدر قوی تھا کہ ایک بار جو سن لیتا عمر بھر نہ بھولتا، فن تاریخ کا ماہر تھا، فلسفہ سے خاص رغبت تھی، طب، نجوم، ریاضی، منطق میں کمال رکھتا تھا،[4] یہ ظاہر ہے کہ جو بادشاہ زیور علم سے اسقدر آراستہ اور علم کا ایسا قدردان ہو، اس کا کتب خانہ ضرور ہوگا، لیکن زمانہ کی ستم ظریفی دیکھیے کہ مورخوں نے اس کی ۲۵ سالہ سلطنت کے ایک ایک خط و خال کا نقشہ کھینچا ہے، مگر کتب خانہ کا نام تک نہیں لکھا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں مسجدوں اور خانقاہوں میں کتب خانے ہوتے تھے،

---

[1] طبقات ناصری ص ۱۴۷، کلکتہ [2] فرشتہ ج اول ص ۱۴۳ نولکشور، [3] صبح الاعشیٰ ج ۵ ص ۶۹ [4] فرشتہ ج اول حالات محمد تغلق،

نظام الدین اولیا کا کتبخانہ | چنانچہ اسی زمانہ میں (یعنی علاء الدین خلجی سے لیکر سلطان محمد تغلق کے عہد تک) دہلی کے مشہور بزرگ نظام الاولیا حضرت نظام الدین بدایونی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۷۲۵ھ کی خانقاہ میں ایک بڑا کتب خانہ تھا آپ کی خانقاہ دہلی (قدیم) کے محلہ غیاث پور میں تھی، (اور آج بھی وہیں ہے مگر اب اس محلہ بلکہ کل آبادی کو جو اس جگہ ہے "نظام الاولیا" کہتے ہیں)

آپ کی خانقاہ کا کتب خانہ وقف تھا، اور ہر صاحب علم بلا امتیاز اس سے فائدہ اٹھا سکتا تھا، شیخ عبد الحق محدث دہلوی ایک جگہ شیخ سراج الدین عثمان کے حالات میں لکھتے ہیں:۔

در بعد ازاں پیش مولانا رکن الدین کافیہ و مفصل و قدوری و مجمع البحرین تحقیق کردہ و بعد از نقل شیخ نظام الدین قس، سہ سال دیگر تعلیم کرد و بعضے کتب از کتاب خانۂ شیخ کہ وقف بود و جامہ و خلافت نامہ کہ از خدمت شیخ یافتہ بود با خود برد[1]

فیروز شاہی کتب خانہ | سلطان محمد کی طرح سلطان فیروز شاہ تغلق، متوفی ۷۹۰ھ بھی صاحب علم اور صاحب تصنیف تھا، فتوحات فیروزی اس کی مشہور تصنیف ہے، علم کا بڑا قدردان تھا، اور اس کا دربار علماء، فضلاء، شعراء اور دوسرے اصحاب کمال سے بھرا رہتا، ضیاء برنی اور عفیف سراج جیسے مورخ، اور ادیب، مطہر ہندی جیسے شاعر، تاتار خاں جیسے عالم اور مفسر علماء سے اس کا دربار آراستہ تھا اس نے اپنے زمانہ میں بڑی بڑی مسجدیں اور مدرسے بنوائے، اور ان کے مصارف کے لیے ہزاروں روپے کے اوقاف مقرر کیے، اس کے شاہی کتب خانہ کا ذکر تاریخوں میں نہیں ملتا، لیکن ظاہر ہے کہ جو شخص خود صاحب تصنیف اور علم کا قدردان ہو اس کا قصر شاہی کتب خانہ کے وجود سے کیونکر خالی رہ سکتا ہے، پھر جوالامکھی کے مندر سے جو کتابیں ہاتھ لگیں جن کی تعداد ایک ہزار تین سو تھی، وہ آخر کہاں گئیں؟[2]

تاریخی تتبع سے یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ اس زمانہ میں محکمہ تراجم بھی قائم تھا، چنانچہ فرشتہ نے ایک جگہ

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۰۱ [2] فرشتہ ج اول ص ۱۴۶ و طبقات اکبری ص ۲۳۳

لکھا ہے :-

پادشاہ علماے آن طائفہ را طلب کردہ بعضے ازان کتب را ترجمہ فرمود،

ازاں جملہ اعزالدین خالد خانی کہ شعرا آن عصر بود، کتابے در حکمت طبعی و شگون و تفاولات

در سلک نظم کشیدہ" دلائل فیروز شاہی" نام کردہ والحق آن کتابیست متضمن اقسام حکمت عملی و علمی،[1]

تاتارخانی کتب خانہ | اس زمانہ میں علمی مذاق عام ہوگیا تھا، دربار کے امرار صاحب علم اور علم کے قدردان تھے،

چنانچہ اسی دربار کا امیر تاتارخاں بڑا فاضل شخص تھا، کلام مجید پر اس کو بڑا عبور تھا، اس نے ایک تفسیر لکھی تھی،

جس میں خلافیات کو تفصیل بیان کیا تھا، عفیف سراج لکھتا ہے :-

تاتارخان کی صحبت میں ہمیشہ علما اور مشائخ رہتے، تفسیر تاتارخانی جو دنیا میں مشہور ہے وہ اسی کی لکھی ہوئی ہے، لوگوں کا بیان ہے کہ جب اس نے تفسیر لکھنے کا ارادہ کیا، تو اس کے لیے ہر قسم کی تفسیریں جمع کیں اور علما، کے سامنے مفسروں کے اختلافات کو جمع کرکے یکجا کیا، اور بڑی تندہی سے یہ تفسیر مرتب کی، جابجا تفسیروں کا حوالہ بھی دیا، کتاب مکمل ہونے کے بعد اس کا نام "تفسیر تاتارخانی" رکھا،[2]

اسی طرح درمختار، او شامی کی شل ایک فتوی کی کتاب ترتیب دینے کا ارادہ کیا جس میں فقہ کے تمام مختلف فیہ مسائل درج ہوں، چنانچہ مورخ مذکور اس کی نسبت لکھتا ہے :-

اسی طرح خان اعظم (تاتارخاں) نے ایک کتاب فتاوی کی مرتب کی، اس کی ترتیب اس طرح کی کہ دہلی کے تمام فتاووں کو جمع کرکے ہر مختلف فیہ مسئلہ کو اپنی کتاب میں درج کیا، اور اختلاف کرنے والے مفتی کے نام کا حوالہ بھی دیا، بڑی کاوش اور محنت کے بعد تیس (یا تین جلدوں) میں یہ کتاب مکمل ہوئی، تکمیل کے بعد اس کا نام "فتاوی تاتارخانی" رکھا،[3]

اس بیان کے بعد اس کا کیونکر یقین کیا جاسکتا ہے کہ تاتارخاں کے پاس کوئی بڑا کتبخانہ نہ رہا ہوگا،

---

[1] فرشتہ ج اول ص ۱۴۸، وطبقات اکبری ص ۲۲۳ [2] تاریخ فیروز شاہی کلکتہ ص ۳۹۲ [3] ایضاً

غازی خاں کا کتب خانہ | تغلق کے بعد ہندوستان میں طوائف الملوکی پھیل گئی، ہر صوبہ دار خود مختار بادشاہ بن گیا، اس وقت پایہ تخت دہلی اولوالعزم اشخاص کا سیاسی مرکز تھا، اس لیے اس پر مغل (تیمور) سادات اور لودی یکے بادیگرے قابض ہوئے، لیکن ان کو کبھی اطمینان سے سلطنت کرنا نصیب نہ ہوا کیونکہ انکو ہر وقت کسی نہ کسی دعویدار سلطنت کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا، پھر بھی علمی ذوق امرا تک عام ہو چکا تھا، اور وہ اپنے محلوں میں کتب خانہ کا قیام ضروری سمجھتے تھے، چنانچہ غازی خاں جو سلطان ابراہیم لودی کے دربار کا ایک بڑا معزز امیر تھا، اس کا ایک خاص کتب خانہ قلعہ کے اندر تھا، ۹۳۲ھ میں جب بابر نے اس کو فتح کیا تو یہ کتب خانہ بھی اس کے قبضہ میں آیا، تزک بابری میں ہے،

دوشنبہ کے دن قلعہ میں سیر کرتا ہوا غازی خاں کے کتب خانہ میں پہنچا، چند اچھی کتابیں اس میں سے نکال کر کچھ ہمایوں کو دیں اور کچھ کامران مرزا کو کابل بھجوا دیں، دینی کتابیں اس میں زیادہ ہیں، اور میرے خیال کے بموجب عمدہ کتابیں اس میں کم نکلیں[۱]،

اس بیان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسی طرح دوسرے امرا کے ذاتی کتب خانے بھی موجود ہوں گے، جن کے ذکر سے تاریخیں خالی ہیں،

بابر کا کتب خانہ | بابر، شاعر، ادیب، مصنف اور صاحب علم فرمانروا تھا، زمانہ نے اس کو اطمینان سے ایک جگہ بیٹھنے نہ دیا، آخر عمر میں جب کابل اور دہلی پر اس کا قبضہ ہوا تو ایک گونہ اطمینان سے زندگی بسر ہونے لگی، اس وقت امور سلطنت سے جب اس کو فرصت ملتی تو علمی مشاغل کی طرف توجہ کرتا، شاہی کتب خانہ کے علاوہ اس کا ذاتی کتب خانہ بھی تھا، جہاں اپنے مذاق کی چیدہ کتابیں رکھتا تھا[۲]، چنانچہ جب اس کو زہر دیا گیا تو اسی کتب خانہ میں اس نے آکر تھوڑی دیر آرام لیا تھا،

ہمایوں کا کتب خانہ | الولد سر لابیہ کے مطابق ہمایوں بھی علمی مذاق میں اپنے باپ سے پیچھے نہ تھا،

[۱] تزک بابری قلمی دارالمصنفین فارسی [۲] تزک بابری قلمی مذکور، ترجمہ اردو ص ۳۳۶ مطبوعہ دہلی،

اس کو ادب، شاعری، اور علم ہیئت سے خاص دلچسپی تھی، اور اس کی خاص مجلسوں میں ہمیشہ علمی چرچے رہتے، مشہور امیر البحر سید علی ترکی نے اپنے سفرنامہ میں متعدد جگہ اس کا تذکرہ کیا ہے، ایک جگہ لکھتا ہے کہ "القصہ ان دنوں نظم اور مشاعروں کا بڑا زور تھا، اس لیے مجھے ہمیشہ بادشاہ کے حضور میں رہنا پڑتا تھا"[1]

ہمایوں کے دربار میں جب کوئی ماہر فن آجاتا تو اس سے اس فن میں کام لینے کی کوشش کرتا، سید علی ترکی شاعری کے علاوہ علم ہیئت سے بھی پوری واقفیت رکھتا تھا، ہمایوں نے پہلے اسکو ایک ضلع کی حکومت دیکر ملازم رکھنا چاہا، مگر جب اس نے ہندوستان میں رہنا منظور نہ کیا تو اس سے کہا گیا کہ کم از کم تین مہینے دہلی میں قیام کرنا پڑے گا، کیونکہ برسات کے باعث تمام سڑکیں زیر آب ہیں۔ اس درمیان میں سورج گرہن کے حساب کی جانچ کا کام اس کے سپرد ہوا، چنانچہ وہ ہندوستانی علمائے ہیئت کے ساتھ ہمایوں کے مرتے تک برابر اس کام میں مصروف رہا، ایک جگہ لکھتا ہے:۔

بادشاہ نے درخواست منظور کی، مگر فرمایا کہ برسات کے باعث سڑکیں اچھی حالت میں نہیں ہیں اس لیے تین ماہ کے بعد سفر کے لائق ہوں گی، اس مدت میں چاند اور سورج گرہن کا حساب کیجئے اور علمائے ہیئت کو آفتاب کی گردش اور خط استوا کے نکات پڑھنے میں مدد دے، یہ سب باتیں متانت کے ساتھ مجھے سمجھائی گئیں، لہذا میں مجبور ہوا، ...... اور فوراً کام میں مصروف ہوگیا، اور بغیر آرام کیے رات دن مشغول رہ کر فلکی مشاہدات کا کام ختم کیا[2]

ایسے صاحب ذوق بادشاہ کی نسبت یہ کہنا کہ اس کے عہد میں متعدد کتب خانے نہ ہونگے غیر موزوں ہوگا، صدر جہاں (یعنی قاضی القضاۃ) کے محکمہ میں جہاں سے تمام دینی اور دنیاوی مو

---

[1] سفرنامہ ص ۸۰ وطن لاہور [2] سفرنامہ ترکی امیر البحر (مرآۃ الممالک) اردو ص ۶۰ لاہور

کے فتوے جاری ہوتے تھے، کسی کتب خانہ کا نہ ہونا عقل سے بعید ہے، پھر شاہی کتب خانہ جو ہمایوں بادشاہ کے عہد میں رہا ہے، دہلی میں موجود ہوگا، اس کے علاوہ بابر کا ذاتی کتب خانہ بھی اس کے مرنے کے بعد ہمایوں کے قبضہ میں آیا، اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ بابر کی طرح ہمایوں کے پاس بھی ذاتی کتبخانہ موجود تھا، چنانچہ اس کی موت بھی اسی کتبخانہ کی چھت سے اترتے وقت ہوئی، طبقات اکبری میں ہے:-

عجیب باتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ۸ ربیع الاول کو غروب آفتاب کے وقت جنت آشیانی (ہمایوں بادشاہ) کتب خانہ کی چھت پر گئے، اور تھوڑی دیر کے بعد وہاں سے اترنے لگے، جب دوسری سیڑھی پر پہنچے تو موذن نے اذان دی، کمال ادب سے بیٹھ گئے، پھر جب اٹھنے لگے تو پیر پھسل گیا، اور زینہ سے زمین پر آ گئے،[۱]

اس کتب خانہ کی نسبت "ذاتی کتب خانہ" کہنے کی وجہ یہ ہے کہ راقم الحروف نے اس کتب خانہ کی عمارت خود دیکھی ہے، جو قدیم قلعہ کے اندر محکمۂ آثار قدیمہ کی بدولت اب تک موجود ہے، خود قلعہ پرانی دلی سے فاصلہ پر ہے، اور غالباً اس زمانہ میں اس کی آبادی قلعہ تک ہوگی، قلعہ کے اندر جو عمارتیں ہوتی ہیں ان کا تعلق عوام سے نہیں ہوتا، بلکہ بادشاہ یا محکمۂ جنگ سے ہوتا ہے، اس لیے اس کتب خانہ کی عمارت کا قلعہ کے اندر ہونا ہی اس کا ثبوت ہے کہ یہ بادشاہ کا ذاتی کتب خانہ تھا،

یہ عمارت در اصل شیر شاہ کی بنوائی ہوئی ہے، اب اس کا نام شیر منڈل ہے، عمارت میں سنگ سرخ زیادہ استعمال کیا گیا ہے، وسط میں ایک کمرہ ہے، اور اس کے گرد غلام گردش، عمارت کے اوپر ایک برج ہے، شیر شاہ نے محض تفریح کے لیے یہ بلند مقام بنوایا تھا، اس لیے اس کا اصلی نام شیر گاہ ہوا، سید علی ترکی نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ "ہمایوں شیر گاہ کی سیڑھی سے گر کر مر گیا"[۲] ہمایوں نے جب ہندوستان پر دوبارہ قبضہ کیا تو اس کو اپنا کتب خانہ بنایا، وہ کبھی کبھی علم ہیئت کے تجربات

---

[۱] طبقات اکبری ص ۱۴، کلکتہ [۲] سفرنامہ سید علی ص ۴۳ لاہور

بہیں کیا کرتا تھا، اس کتب خانہ کا ناظم نظام نامی شخص تھا جس کی شہرت باز بہادر کے نام سے زیادہ تھی،
سوری خاندان میں صرف شیر شاہ اور سلیم شاہ ایسے بادشاہ گذرے ہیں جو علم اور اہل علم کے
قدردان تھے، ان کو فتوحات اور خانہ جنگی سے اتنی فرصت نہ ملی کہ اس طرف زیادہ توجہ کرتے،
پھر بھی جس قدر موقع مل سکا رفاہ عام کے کام بھی انجام دیے،
تاریخ میں صاف طور سے تو کہیں اس کا ذکر نہیں ہے کہ ان کے زمانہ میں کوئی کتب خانہ
قائم کیا گیا لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ان کا عہد اس سے خالی رہا ہوگا، بلکہ جہاں جہاں مدرسے
جامع مسجدیں، اور خانقاہیں تھیں ان کے ساتھ کتب خانہ کا ہونا لازمی تھا، یہی حال محکمۂ قضاء کا تھا،

اکبر کا کتب خانہ ہمایوں کے بعد اکبر تخت نشین ہوا، اکبر ان خوش نصیب بادشاہوں میں سے ہے،
جس کے عہد میں بڑی علمی ترقی ہوئی، اس کا دربار بڑے بڑے علماء، ادباء، حکماء، شعراء، اور ہر فن کے
اصحاب کمال کا مرکز تھا، اس کے دربار کے نورتن کی شہرت آج تک ہے،
اکبر اگرچہ معمولی لکھا پڑھا تھا، لیکن علمی ذوق میں وہ اپنے اسلاف سے کسی طرح کم نہ تھا،
اس نے محکمۂ تراجم بھی قائم کیا تھا، جس کے ذریعہ سنسکرت کی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ ہوا، اور مستقل
تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی شروع ہوا، جس میں تاریخ کے علاوہ تقریباً ہر فن پر کتابیں لکھی گئیں،
اکبر خود بھی کتابوں کا بڑا شائق تھا، اس کو جب کوئی نئی کتاب مل جاتی تو اس کو ضرور کتاب دار سے
منگوا کر سنتا، اور ایک رات میں جہاں تک سنتا وہاں نشان لگا دیتا، دوسرے دن پھر اسی جگہ سے
شروع کراتا، یہاں تک کہ کتاب ختم ہو جاتی،[۱]
اس کے پاس ایک بڑا عظیم الشان کتب خانہ تھا۔ اپنے بزرگوں سے ورثہ میں جو کتب خانہ
پایا تھا اس کے علاوہ گجرات، جونپور، بہار، کشمیر، بنگالہ اور دکن کی فتوحات میں یہاں کے کتبخانوں

---

[۱] اکبر نامہ جلد اول ص ۲۰۴، نولکشور

سے جو کتابیں اس کو دستیاب ہوئیں ان کی بڑی تعداد اس نے اپنے کتب خانہ میں داخل کی،
اس طرح اس کا کتب خانہ نوادر کتابوں کا بیش بہا خزانہ بن گیا، اسی میں نصیر الدین ہمایوں شاہ
کا فارسی دیوان بھی تھا، جس کی چند رباعیاں ابوالفضل نے اکبر نامہ میں نقل کی ہیں[1]، قلعہ آگرہ میں
ثمن برج کے بغل میں جو لمبا کمرہ تھا، وہی شاہی کتب خانہ تھا، کیونکہ موجودہ ثمن برج شاہجہان
کا بنوایا ہوا ہے، نظر بندی کے زمانہ میں وہ اسی جگہ رہتا تھا[2]،

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ اس عہد میں بادشاہ کی قدر دانی سے علم و فن کا بڑا چرچا
ہوگیا تھا، دربار میں بکثرت علما، و ماہرین فن جمع ہوگئے تھے، اور جنکی رسائی دربار شاہی تک
نہ ہو سکی، وہ ان امراے دولت سے وابستہ ہوگئے جو علم و فن کے قدر دان اور مربی تھے،

ابوالفضل، فیضی، مولانا فتح اللہ شیرازی، حکیم ابوعلی گیلانی، حکیم ابوالفتح گیلانی،
حکیم ہمام عبدالرحیم خان خاناں، مولانا عبدالحق محدث دہلوی، ملا عبدالقادر بدایونی، ملا مبارک
نظام الدین بخشی، ان میں سے ہر شخص خود ماہر علوم و فنون، صاحب ذوق اور علم کا قدر دان
تھا، ہر شخص کے پاس اپنا ذاتی کتب خانہ موجود تھا،

کتب خانۂ خان خاناں خان خانان مرزا عبدالرحیم بن بیرم خان، ممکن ہے علمی قابلیت میں اپنے
ہم عصروں سے کم رہا ہو، لیکن علم کی قدر دانی میں ان سے بہت آگے تھا، اس کا کتب خانہ شروع
میں احمد آباد میں تھا، جبکہ وہ وہاں کا حاکم تھا، یہ بہت اعلیٰ درجہ کا کتب خانہ تھا، کتابوں کی مرمت،
اصلاح اور حفاظت کے لیے بہت سے ملازمین مقرر تھے، کاتب، جلد ساز، وراق، صحاف،
نقاش اکثر وہ ہوتے جو اپنے فن میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے، مولانا ابراہیم نقاش اسی کتب خانہ
میں ملازم تھے، یہ خوشنویس، طلاکار، صحاف اور حکاک بھی تھے، علمی استعداد بھی ان کی اچھی تھی،

---

[1] اکبر نامہ ج ۱ ص ۲۶۱-۲۶۲ [2] تاریخ آگرہ ص ۵، مطبوعہ آگرہ،

طبع موزوں بھی رکھتے تھے۔

ان کی نسبت مآثر رحیمی میں ہے کہ

وہ ایک مدت تک اس کتاب خانہ میں کتاب داری کے عہدہ پر ممتاز رہے، انکے ہاتھ کی لکھی ہوئی چیزیں، تصویریں، اور طلاکاری کے نمونے بکثرت ہیں،[۱]

اس کے بعد (غالباً انھیں کی جگہ) مشفق نقاش کا تقرر ہوا، جو فن نقاشی میں یکتائے روزگار تھا،

خوشنویس | بہبود مرزا مشہور خوشنویس تھا، جو میر علی خوشنویس کا بھائی تھا، نقاشی اور خوشنویسی میں اسکو کمال حاصل تھا، خانخانان کے کتب خانہ میں اسی کام پر ملازم تھا،

شجاع شیرازی، اس کو خط ثلث اور نسخ میں بڑی مہارت تھی، ۹۹۹ھ میں اس نے مقام ٹھٹھ میں شرف ملازمت حاصل کیا، پھر کچھ دنوں کے بعد کتب خانہ کی خدمت اسکے سپرد ہوئی،

ملا عبد الرحیم ہروی، ان کا خطاب "عنبریں قلم" تھا، خط نسخ اور نستعلیق میں ان کو کمال حاصل تھا، محمد حسین کشمیری (خوشنویس) کے سوا کوئی ان کا حریف نہ تھا، اس کتب خانہ کی اکثر کتابیں اسی کے قلم کی مرہون منت ہیں،

مصور و شبیہ ساز میاں ندیم، میاں فہیم کے بھائی تھے، یہ دونوں آبو (گجرات) کے راجپوت زادہ کے لڑکے تھے، خانخانان نے ان کی تربیت اپنے بچوں کی طرح کی تھی، فن مصوری میں اس زمانہ میں ان کا کوئی حریف نہ تھا، اسی کتب خانہ سے ان کا تعلق تھا،

مادھو، فن مصوری کے علاوہ شبیہ سازی میں بے مثل تھا، اس کتب خانہ کی اکثر کتابوں کی تصویریں اسی کی بنائی ہوئی ہیں،

جلد ساز | محمد امین خراسانی، ایک مشہور جلد ساز اور رنگ طلائی کا ماہر تھا، اس نے مشہد کے کتب خانہ

---

[۱] مآثر رحیمی ص ۱۶۰۶ ج ۳ حصہ ۲ کلکتہ،

یں بہت دنوں تک کام کیا تھا، چار سو روپے ماہانہ اس کی تنخواہ تھی، اسی کتب خانہ میں ملازم تھا،
یہ محمد امین خراسانی وہی ہے جس نے ابری کاغذ کی ایجاد سے شہرت دوام حاصل کی،

ملا محمد حسین جلد ساز اپنے فن میں ماہر تھے، مصوری کا کام بھی خوب جانتے تھے، ۲۵ سال تک
اس کتب خانہ میں ملازم رہے، کتب خانہ میں سب سے زیادہ معتمد یہی تھے،

داروغۂ کتب خانہ | شیخ برہی، بہرائچ کے باشندے اور ہندی (بھاکھا) زبان کے بڑے اچھے شاعر تھے،
اسی کتب خانہ سے ان کا تعلق تھا، جب وہ حج کو جانے لگے تو اپنے لڑکے شیخ عبدالسلام کو داروغہ بنا گئے،
جس نے خانخاناں کے زیر تربیت رفتہ رفتہ بڑی اعلیٰ لیاقت حاصل کر لی،

مترجم | ملا محمد علی کشمیری، عربی اور فارسی میں بڑے صاحب استعداد تھے، ان کو ترجمہ کرنے میں خاص
مہارت تھی، ۱۰۲۰ھ میں خواجہ صائن الدین کی ایک عربی کتاب کا فارسی میں ترجمہ انہی نے کیا تھا،

مصحح | مولانا صوفی ایک متبحر عالم تھے، غالباً یہ تصحیح کا کام کرتے تھے، ملا شکیبی بھی اسی کتب خانہ سے وابستہ
تھے، لیکن ان کے ذمہ کیا کام تھا، اسکی تصریح نہیں ملتی، شاید تصحیح کے بعد مقابلہ کا کام انجام دیتے تھے،

جدول ساز | ملا محمد امین جلد ساز اپنے فن کے کامل تھے ان ہی کے ساتھ محمد حسین کامی، بقائی اور
عنی ہمدانی بھی اس کتب خانہ میں کام کرتے تھے،

ناظم | میر باقی اس کتب خانہ کے افسر اعلیٰ، بڑے صاحب علم و استعداد تھے، ترکستان کے
باشندے، اور خاندان سادات سے تعلق رکھتے تھے، اس کتب خانہ کے عملے کی کل تعداد ۹۵ تھی،
اسی سے اس کی عظمت معلوم کر سکتے ہیں،

خصوصیات | اس کتب خانہ میں خاص بات یہ تھی کہ اس عہد کے اکثر مصنفین کی تصنیفیں خود انکے
ہاتھ کی لکھی موجود تھیں، بعض مصنفوں نے خود ہی اپنی تصانیف پیش کی تھیں، ان میں سے بعض یہ ہیں:

(۱) دیوان نظیری نیشاپوری، جس نے ۱۰۲۲ھ میں آگرہ کی ملاقات میں دیوان نذر گزرانا،

(۲) خواجہ حسین ثنائی خراسانی کے کلام کا مسودہ جو ملا عبدالرحیم خوشنویس کا لکھا ہوا تھا، خاص کتب خانہ میں بھیجا،

(۳) محتشم کاشی کی مثنوی، جو امیر معزالدین محمد کاشی خوشنویس کی لکھی ہوئی تھی، اور جس کی نقل ہاتھ ایک لاکھ روپیہ خرچ ہوا تھا، اس کتب خانہ میں موجود تھی،

(۴) مشہور شاعر عرفی شیرازی کے دیوان کا مسودہ اسی کتب خانہ میں موجود تھا جس سے اس کے موجودہ دیوان کو مرتب کیا گیا،

(۵) ملا نورالدین ظہوری کے ہاتھ کے لکھے ہوئے اشعار بھی اس کتبخانہ کی زینت تھے،

(۶) محمد وقوعی نیشاپوری متوفی ۱۰۲۱ھ ایک بلند پایہ شاعر تھا، اس کے خود نوشتہ قصائد اس کتب خانہ میں موجود تھے،

(۷و۸) سادجی صرفی، اور ملا شکیبی کے بھی خود نوشتہ قصائد کتب خانہ میں تھے،

خانخانان کے کتب خانہ کی بعض کتابیں اسوقت ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں، ان میں سے ایک کتاب تصوف میں خواجہ عبداللہ انصاری کی ہے، اسکو ۹۱۲ھ میں سلطان علی مشہدی نے لکھا، اور خانخانان نے اس کو ۱۰۲۲ھ میں جہانگیر کی نذر کیا، اس پر جہانگیر کے قلم سے اس کا نام مع سنہ تحریر ہے، پھر ۱۰۳۷ھ میں شاہجہاں کے کتب خانہ میں داخل ہوئی، شاہجہاں نے بھی اپنے قلم سے نام اور سنہ لکھا، آجکل یہ رام پور کے کتب خانہ میں ہے،

دوسری کتاب تصوف میں مجالس العشاق ہے جو امیر تیمور کے پوتے سلطان حسین کی تالیف ہے، اس میں ۵۲ ایرانی آرٹ کی تصویریں ہیں، ۹۹۹ھ میں داخل کتب خانہ ہوئی، ۱۲۶۳ھ میں فرخ آباد کے حاکم شجاع الملک سعادت مندخان کے قبضہ میں آئی، یہ بھی رامپور کے کتبخانہ میں موجود ہے،

ایک کتاب تعبیر رؤیا میں تھی جس میں قرآن پاک سے خواب کی تعبیر نکالنے کا طریقہ بتایا گیا ہے،

یہ کتاب اکبر نے ۲۲ جلوس میں خانخاناں کو مرحمت کی، یہ کتاب کتبخانہ آصفیہ حیدرآباد میں ہے،

ششم، رسالہ سعدی، ۹۶۲ھ میں بمقام اودے پور اس کے ہاتھ لگا، پھر شاہجہاں کے کتبخانہ میں آیا، اس پر شاہجہان کی تحریر ہے، اس کے بعد عالمگیر کے کتب خانہ میں داخل ہوا، اب بانکی پور پٹنہ کے کتب خانہ میں ہے،

یوسف زلیخا سنہ ۹۳۰ھ میں میر علی نے ہرات میں لکھی، ۱۰۱۹ھ میں جہانگیر کو خانخاناں نے تحفہ میں دی، جہانگیر نے اپنے قلم سے اس میں اس واقعہ کو لکھا ہے، اس کی قیمت ایک ہزار اشرفی تھی، یہ مصوری اور طلاکاری کا بہترین نمونہ ہے[۱]، یہ بھی بانکی پور پٹنہ کے کتب خانہ میں اس وقت موجود ہے،

قرآن پاک، طول (۱۱) انچ اور عرض (۷) انچ ہے، بین السطور ۱۲ ہیں، شنگرف سے نشانات رکوع، ربع، نصف، ثلث بنے ہیں، اور آیات کے نشانات لاجوردی نیلگوں سنہر ہیں، شروع کے دو عنوان مرصع اور مزین ہیں، تمام سورتوں کے عنوان زرافشاں ہیں، کاتب کا نام نہیں ہے مگر نہایت پختہ نسخ میں ہے، یہ قرآن ۱۰۳۲ھ میں خانخاناں کے پاس تھا، اس پر اس کی تحریر موجود ہے، پھر اللہ وردی کے کتب خانہ میں داخل ہوا، ۱۹۱۹ء سے رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے کتب خانہ میں موجود ہے،[۲]

سلیمہ سلطانہ کا کتب خانہ | اسی عہد میں سلیمہ سلطانہ بیگم بھی تھیں، یہ ہمایوں کی بھانجی، یعنی ان کی بہن گل رخ بیگم کی صاحبزادی ہیں، عالمہ اور شاعرہ تھیں، ۹۶۱ھ میں پیدا ہوئیں، ساٹھ برس کی عمر

---

[۱] یوسف زلیخا قلمی مصور طلائی جدول پاکیزہ خط نسخ، چھوٹی تقطیع کا شانتی نکیتن بنگالی کے کتب خانہ میں بھی موجود ہے، جو ۱۰۱۲ھ کا لکھا ہوا ہے، جو خاص کابل سے تحفۃً لایا گیا ہے۔ [۲] یہ تمام حالات مولوی حافظ نذیر احمد صاحب محقق آثار قدیمہ عجائب خانہ کلکتہ کے ایک لکچر سے ماخوذ ہیں جو ۱۹۳۴ء میں مشرقی کانفرنس میں آپ نے دیا تھا (بحوالہ معارف جلد ۳۴)

پاکر ۱۰۱۱ھ میں وفات پائی، جہانگیر نے بھی اپنی تزک میں ان کی قابلیت اور فضیلت کی تعریف کی ہے، ان کو کتب بینی کا بڑا شوق تھا، اور ان کے پاس ایک ذاتی کتب خانہ بھی تھا،[1]

منعم خان کا کتب خانہ: اکبر ہی کے زمانہ میں سپہ سالار منعم خان خانخاناں جونپور کا حاکم تھا، عمر رسیدہ تجربہ کار اور علم کا قدردان تھا، اسی نے دریائے گومتی پر جونپور میں پل تیار کرایا تھا جو آج تک موجود ہے، اس کے پاس بھی ایک کتب خانہ تھا، وہ کتابوں کا بڑا شائق تھا، جہاں کہیں سے اس کو کتاب دستیاب ہوسکتی حاصل کرنے کی کوشش کرتا، احباب بھی اس کے اس شوق سے واقف تھے، جو کتاب نایاب سمجھتے، فوراً اس کے پاس روانہ کر دیتے، اور اس کے صلہ میں وہ گران قدر عطیے دیتا، جب وہ جونپور کا حاکم تھا تو اس کے ایک دوست بہادر خاں ازبک نے کلیات سعدی کا ایک نسخہ اس کو تحفۃً ارسال کیا تھا، اس کتاب کی پشت پر منعم خاں نے جو کتابی چہرہ تحریر کیا ہے وہ حسب ذیل ہے:۔

این کلیات حضرت شیخ سعدی قدس سرہٗ را آن عزیز بہادر خان در بلدۂ پر سرور جونپور بدین فقیر فرستادہ بود، پانصد روپیہ انعام شد، و تاریخ نہصد و ہفتاد و شش (۹۷۶ھ) عدد اوراق این کتاب سی صد و نود و چہار است، عدد ابیات و سطور شش از متن و ما فیہ نوزدہ ہزار و ہفتصد، حاشیہ چہار ہزار و ہفت صد و بست و ہشت است، مشتمل بر دو سہ دیباچہ مصور و چہار لوح شیرازی۔ العبد منعم بن بیرم غفر اللہ ذنوبہا و ستر عیوبہا۔[2]

اسی طرح اس کے کتب خانہ کی ایک اور کتاب اس وقت تک خوش قسمتی سے محفوظ ہے، یہ مرزا کامران کا دیوان ہے، جو ایک عرصہ تک اس کے کتب خانہ کی زینت رہا، اس نے اپنے قلم سے اس پر جو عبارت لکھی تھی وہ یہ ہے:۔

اللہ اکبر، دیوان مرزا کامران بخط خواجہ محمود اسحاق شہابی...... منعم خانخانان ۳۲ فرد — قیمت مہر

---

[1] کچھ تحقیق آثار قدیمہ کلکتہ بحوالہ معارف ج ۱۴۔ [2] ایضاً

اس سے معلوم ہوا کہ یہ بھی اس نے خرید کر داخل کتب خانہ کی تھی[1]۔

نور جہاں کا کتب خانہ: علوم و فنون کی قدر دانی میں نور جہاں بیگم بھی اپنے مردہم عصروں میں کسی سے کم نہیں تھی، اس کے پاس بھی ایک ذاتی کتب خانہ تھا، اور وہ کتابیں خرید کر اس میں اضافہ کرتی رہتی تھی، چنانچہ مرزا کامراں کا دیوان اس نے تین مہر میں خرید کر داخل کتب خانہ کیا تھا، دیوان کے اول صفحہ پر یہ عبارت درج ہے[2]،

تین مہر قیمت اموال، نواب نور النساء بیگم،

اس سے معلوم ہوا کہ نور جہاں کے خطاب ملنے سے قبل یہ کتاب دستیاب ہوئی تھی، اور کتب بینی کا شوق شاہی محل میں داخل ہونے سے پہلے ہی اس میں موجود تھا،

شیخ فرید کا کتب خانہ: شیخ فرید بخاری جہانگیر کے ان امیروں میں سے ہے جس پر بادشاہ کی خاص نظر عنایت رہتی تھی، لاہور اور احمد آباد میں عرصہ تک ناظم (صوبہ دار) رہا تھا، غیر متعصب، فیاض، اور صاحب علم تھا، اس کے پاس بھی ایک کتب خانہ ذاتی تھا، چنانچہ دیوان حسن دہلوی کا جو نسخہ اس نے اپنے کتبخانہ کے لیے خرید کیا تھا وہ آج بھی خدا بخش خان لائبریری میں موجود ہے[3]۔

فیضی کا کتب خانہ: فیضی فیاضی ان لوگوں میں ہے جن کا علمی ذوق بہت بلند ہے، وہ اپنے یگانۂ روزگار باپ کا خلف الصدق تھا، اس نے اپنے کتب خانہ میں بڑی نایاب اور نادر کتابیں جمع کی تھیں، ان میں بڑی تعداد ایسی کتابوں کی تھی جو خود مصنفین کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھیں، یا ان کے قریب زمانہ کی تھیں اور بڑی محنت سے ان کی تصحیح کی گئی تھی،

ان کتابوں کی بڑی نفیس جلدیں تھیں، خود فیضی کی ایک سو ایک تصانیف اس میں تھیں، کتبخانہ کی کتابوں کی مجموعی تعداد چار ہزار چھ سو تھی، فیضی کے انتقال کے بعد یہ سب کتابیں شاہی کتب خانہ میں داخل

---

[1] دیوان کامراں کا پہلا صفحہ کتب خانہ بانکی پور پٹنہ [2] ایضاً [3] اورینٹل لائبریری بانکی پور پٹنہ کی فہرست ج اول ص ۲۲۲

کی گئیں[۱]، فنون کے لحاظ سے ادب، طب، نجوم، موسیقی، حکمت، تصوف، ہیئت، ہندسہ، تفسیر، فقہ و حدیث کی کتابیں اس کتب خانہ میں تھیں،

جہانگیر کا کتب خانہ سلاطین مغلیہ میں شہنشاہ جہانگیر اپنی خوش ذاقی اور علمی ذوق کے لیے بہت مشہور ہے، اس کی تزک پڑھنے سے اس کے علمی ذوق کا اندازہ ہوتا ہے، اس کے پاس شاہی کتب خانہ کے علاوہ اپنا ذاتی کتب خانہ بھی تھا، جو سفر و حضر میں اس کے ساتھ رہتا تھا جس کا مہتمم مکتوب خاں تھا، چنانچہ جب وہ گجرات گیا ہے تو وہاں کے علما کو اس نے اس کتب خانہ سے متعدد کتابیں تحفۃً دیں، جہانگیر لکھتا ہے:۔

۲۰ تاریخ سہ شنبہ کے دن گجرات کے مشائخ میرے پاس دوبارہ آئے، میں نے پھر ان کو خلعت، زاد راہ اور اراضی دیکر رخصت کیا، اور ان میں سے ہر ایک کو اپنے خاص کتب خانہ سے ایک ایک کتاب مثل تفسیر کشاف، تفسیر حسینی اور روضۃ الاحباب کے مرحمت کی اور ان سب کی پشت پر اپنی گجرات کی آمد اور عطیہ کی تاریخ تحریر کر دی[۲]،

کتب خانہ کے داروغگی (مہتمم) کے عہدہ پر ۱۰۵۶ھ تک عبدالرحمن رشیدی خوش نویس تھا، اسکے بعد میر صالح ولد عبداللہ مشکین رقم متوفی ۱۰۶۱ھ اس عہدہ پر مامور رہا[۳]، ۱۰۶۳ھ میں کتب خانہ کا داروغہ محمد شفیع تھا، جیسا کہ ایک کلام مجید کی مہر سے معلوم ہوتا ہے، جو اسوقت رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں موجود ہے[۴]،

ایک جرمن سیاح جو ۱۶۳۸ء میں سورت آیا تھا اور یہاں عرصہ تک قیام کر کے واپس گیا، اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے کہ شاہجہاں کے کتب خانہ میں ۲۴ ہزار کتابیں اعلیٰ قسم کی جلد بندھی ہوئی موجود تھیں[۵] (باقی)

[۱] منتخب التواریخ ج ۳ ص ۳۰۵ کلکتہ [۲] تزک جہانگیر ص ۱۱۰ علی گڑھ [۳] شاہجہاں نامہ ص ۵۰۰ ج دوم [۴] معارف ج ۱۴ ص ۲۲۴ [۵] سفرنامہ مرتبہ مین ڈلسو ص ۱۱۰

فرمان محمد شاہ غازی

اور

مخدوم شاہ صدر الدین صوفیؒ

از جناب مولوی سید محمد عبد الرؤف صاحب اورنگ آبادی

میں ایک عزیز کی تقریب شادی کی شرکت کی غرض سے جب قصبہ "کابر"[1] گیا، تو فاتحہ پڑھنے کے لیے مخدوم شاہ صدر الدین صوفی کے مزار مبارک پر حاضر ہونے کا موقع ملا، اور مزار کے مجاورین اور جاگیر موقوفہ کے وارثوں سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا تھا، دریافت حال کرنے پر امیر علی خاں صاحب[2] مرحوم متوطن علی پور کابر نے چند فرامین[3] ۱۸۳۲ء و ۱۸۱۸ء و ۱۸۴۷ء و ۱۸۵۵ء کے اسکے علاوہ ایک فرمان ۱۱۱۵ھ کا قاضی احسان[4]

---

[1] قصبۂ مذکور عہد قدیم میں راجا لادن مہی سنگھ کے نام سے موسوم اور شاہجہاں کے عہد میں ملک جہاں کے نام سے مشہور تھا۔ قصبۂ مذکور کی ایک توزیع اتبک اس نام سے مشہور ہے، مغلیہ عہد میں اسکی حیثیت جب پرگنہ کی ہوئی تو کابر کے نام سے زبان زد خلائق ہوا، مگر اب بحذف الف کابر سے مشہور خاص و عام ہے، قصبۂ مذکور میں مٹی کا ایک بلند اور بہت وسیع گڈھ ہے، جسکا رقبہ شاید باون بیگھہ ہے، یہ سادات کی قدیم بستی ہے، یہاں کے بیشتر باشندے نکل کر مختلف مقامات میں آباد ہو گئے ہیں، قصبہ مذکورہ ضلع گیا کے صدر سب ڈویزن میں اور ریلوے اسٹیشن اسمٰعیل پور سے تین میل سمت مغرب واقع ہے [2] خانصاحب موصوف بہادر خان عرف پہاڑ شاہ جمعدار خاص قلعہ شاہی دہلی کے اولاد و احفاد سے ہیں، واللہ اعلم، جنکا ذکر فرمان مندرجہ میں ہے [3] یہ کل فرامین عہد انگلیشیہ کے حکام اعلیٰ سے متعلق ہیں [4] فرمان مذکور کے سرنامہ پر احسان ۱۱۱۵ھ مسطور ہے، اور تحریر ہے کہ سند معافی سہ بیگھہ و پانزدہ و ہور زمین بھا و لی مع دخان و باغ تحریر تاریخ پنجم شہر شوال ۱۲۰۶ھ

کی مہر کا، دوسرا خاص محمد شاہ غازی کی مہر کا جس پر شجاع الدین[1] محمد خاں ناظم بنگالہ و بہار کی تصدیق بھی ہیں، اس دوسرے فرمان کی نقل صحیح میں نے لیلی ہے، فرمان مذکور کی مہر مدور سیاہ تھی، جو سرنامہ پر لگی ہوئی تھی، اور اس میں محمد شاہ غازی مسطور تھا،

عبارت مندرجہ فرمان شاہی:۔

چون ....[2]. صوبہ خاص قصبہ بہار متعلقہ خاص عملہ پرگنہ کابر .... چون مواضی چہل و دو ونیم بگیہ زمین مع تاڑ و باغ در زمین قصبہ کابر خاص پرگنہ خاص سند بحالی کہ بطور نیاز درگاہ شاہ صدالدین قدس سرہٗ کہ از پیش قدیم بنام بہار خاں عرف بہار شاہ مجعدار خاص جاپناہ تخت صدر و ،لی یکے از مرید و مجاور خاص شاہ صدر الدین قدس سرہٗ .... می آید حالا از سرکار بدستور سابق بحال و برقرار داشتہ محاصل زمین چہل و دو ونیم بگیہ مع تاڑ و باغ مزاحم و معترض نشوند، تاکید اکید دانند و نامزدہ محاصل زمین و تاڑ و باغ سال بسال قابض و متصرف باشد، دریں باب تاکید اکید دانستہ حسب المسطور بالا بعمل آرند، فقط [illegible] بگیہ تاریخ پنجم شہر ربیع الثانی ۲۰ سنہ جلوس والا قلمی شد

---

[1] تاریخ ہند کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ امرائے شاہی میں یہ پہلا شخص ہے جس نے بیک وقت بنگالہ اور بہار کی صوبہ داری اور نظامت کی ذمہ داریوں کو انجام دیا، نواب مرشد قلی خاں ناظم بنگالہ کا یہ داماد ہے، نواب مذکور نے اپنی نظامت کے زمانہ میں اسکو اڑیسہ کی صوبہ داری دلوائی تھی، مگر اس نے قلی خاں کے منشا کے خلاف صوبہ بنگالہ کی سند صوبہ داری حکومت سے خود حاصل کر کے نواب ممدوح کی وفات کے بعد ۱۱۳۹ھ میں مرشد آباد میں مسند امارت پر متمکن ہو گیا، اور فخر الدولہ کی معزولی کے بعد ۱۱۴۲ھ میں صوبہ بہار کی سند صوبہ داری حاصل اور بہار کو بنگالہ میں شامل کر کے دونوں صوبوں کی حکومت کے فرائض انجام دیتا تھا، پھر نواب محمد علی وردی خاں مہابت جنگ کو بہار کی صوبہ داری اور منصب پنج ہزاری اور خطاب مہابت جنگ حکومت وقت سے دلوایا، (ماخوذ از سیر المتاخرین فارسی)

[2] یہ عبارت پڑھی نہ جا سکی،

فرمان مذکور کی پشت پر شجاع الدین محمد خاں خادم جانپناہ وزیر اعظم بصورت دستخط رقم ہے،

فرمان مذکور کی عبارت سے ظاہر ہے کہ روشن اختر بن خجستہ اختر بن جہاں دار شاہ، ابو المظفر محمد شاہ غازی کے عہد حکومت اور موتمن الملک ناصر الدین نواب شجاع الدولہ شجاع الدین محمد خاں اسد جنگ ناظم بنگال وبہار کے عہد نظامت میں فرمان مذکور بادشاہ کی بارگاہ سے جمعدار خاص تخت صدر دہلی، بہار خاں عرف بہار شاہ کے نام صادر ہوا تھا، جو آج تک جمعدار مذکور کی اولاد میں وراثۃً محفوظ ہے، مذکور الصدر باغ کی صورت اس وقت کشت زار کی ہے، اور جمعدار مذکور کے ورثہ کے تصرف میں ہے، جمعدار مذکور شاہ صدر الدین صوفی رحمہ اللہ کے مرید باصفا اور کابر کے اکابر سے تھے، جن کے اخلاف تا حال مزار مبارک[1] کی مجاوری اور خدمت کے فرائض انجام دیتے اور مزار مبارک کے نذر و نیاز اور متعلقہ کشت زار کی آمدنی سے متمتع ہوتے ہیں،

مخدوم شاہ صدر الدین صوفی رحمہ اللہ، مخدوم جہاں حضرت شیخ شرف الدین احمد یحیٰی منیری بہاری نور اللہ مرقدہٗ کے خاص مریدوں سے تھے، مخدوم بہاری کے ملفوظات اور مکتوبات میں بعض حکایات اور واقعات کے سلسلہ میں آپ کا ذکر خیر آتا ہے، مگر صوفی موصوف کے سوانح حیات سے متعلق کوئی مستقل تذکرہ دستیاب نہیں ہوا،

سیر المدار، کا اقتباس بلا قید صفحہ و باب ایک بزرگ نے بندہ کے پاس ارسال کیا ہے جسکی عبارت

---

[1] مزار مبارک پختہ چہار دیواری کے اندر بلا قبہ بستی کے باہر شمال سمت میں واقع ہے جسکے پائیں انداز میں ایک بڑا سیاہ پتھر پڑا ہوا ہے، اور دوسرا بڑا سنگ سیاہ در کے سامنے نصب ہے جس پر مختلف نقوش اور انسانی شکلیں بنی ہوئی ہیں، کسی برات کا مع ساز و سامان کے نقشہ کندہ ہے، سا بر کے باشندوں میں ان اشکال و نقوش کے متعلق صاحب مزار کے تصرفات و کرامات کی عجیب عجیب داستانیں زبان زد ہیں، مقبرہ ایک وسیع باغ میں جو عوام میں جبدل باغ کے نام سے مشہور ہے، واقع ہے، باغ کے آثار سے چند درخت باقی ہیں، باقی کشت زار ہے، وسیع گڈھے اور ٹاٹ معائنہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ بستی بہت قدیم ہے اور کسی زمانہ میں اسکو مرکزیت حاصل رہی ہوگی عجب نہیں یہ وہ عہد سے پر متعلق ہوں۔ واللہ اعلم

مندرجہ سے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایک خدا رسیدہ بزرگ اور مخدوم بہاری کے علماء میں تھے، چنانچہ صاحب سیر الدار لکھتے ہیں کہ مخدوم بہار کے خانقاہ مدار کے سلسلہ میں مذکور ہے کہ ایک خلیفہ شیخ صدر الدین البہاری مجذوب اور مغلوب الحال تھے، جو شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا تو دنیا بے اختیار ترک دیتا تھا، ان کا مزار کوچ کا بریت ہے جو توابع بہار سے ہے۔

نفحۃ الصدری، ایک قدیم فارسی مخطوطہ[1] موسوم بنفحۃ الصدری مرتبہ مولوی محمد شریف مولانا قاضی حبیب اللہ خلف الصدق مخدوم شاہ صدر الدین صوفی عبد الغفور مرحوم متوطن بھوریا منورہ ضلع گیا کی دستاویزات میں دستیاب ہوا ہے، جس سے صوفی موصوف کے نسب وحسب اور اخلاف کے کچھ حالات معلوم ہوتے ہیں، اس میں آپ کے اور آپ کے نبیرہ قاضی شاہ ابو القاسم رحمۃ اللہ کے مناقب وکرامات مندرج ہیں، مگر سنہ وتاریخ سے عاری ہے۔

حالات: صوفی موصوف نسباً عثمانی، ارادۃً فردوسی اور وطناً حلبی بہاری تھے۔

مخدوم شاہ صدر الدین صوفی بن علامہ عطاء اللہ بن فاضل العصر شاہ فتح اللہ بن معرفت دستگاہ شاہ خلیل سیاح بن مقبول اللہ امین دین حضرت شاہ قمر الدین حلبی بن شاہ عباد اللہ بن شاہ غلام احمد بن حضرت شاہ یعقوب نوری بن حضرت اسحاق دانشمند بن زکریا بغدادی بن قطب الاقطاب شیخ ہارون بن عارف باللہ شیخ عبد اللہ اصغر بن امیر المومنین امام المتقین ناشر القرآن کامل الحیاء والایمان حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ

اخلاف میں چند اشخاص قابل ذکر ہیں، قاضی باب اللہ، قاضی بایزید، قاضی حبیب اللہ، قاضی شاہ ابو القاسم، قاضی فیض اللہ، قاضی عنایت اللہ، قاضی عطاء اللہ، شاہ غوث الاعظم استاد وغیرہ

[1] مخطوط مذکورہ اصل نسخہ سے منقول ہے جس کی کتابت ۱۲۶۳ھ ہے، کاتب کا نام شیخ امجد علی متوطن موضع بھوریا پرگنہ منورہ ضلع بہار ہے، عبد الغفور صاحب مرحوم صوفی صاحب موصوف کے اخلاف سے ہیں، انکی دستاویزات میں موضع مذکورہ کی معافی کی چند مستند سندیں بھی محفوظ ہیں جن کا ذکر آگے آئیگا۔

مولانا شاہ عبدالحی،

شاہ قمر الدین حلبی رحمہ اللہ ایک ناخوشگوار واقعہ کے سبب بادشاہ وقت سے آزردہ ہو کر حسب ہدایت
زرگان خاندان و پیران طریقت زن و فرزند کے ہمراہ حلب سے روانہ ہوئے، ہر منزل پر وہاں کے
شندوں نے بہت اخلاص و محبت سے خیر مقدم اور خاطر داریاں کیں جب شاہجہاں آباد پہنچے تو بادشاہ وقت
جانب سے خیر مقدم کے ساتھ اقامت گزینی اور عہدہ اور منصب کی قبولیت کی درخواست کی گئی،
ر آپ نے بے نیازی ظاہر کی، اور شاہجہاں آباد سے بہار روانہ ہوئے، جب صوبہ بہار پہنچے تو ناظم
وبہ نے عمال و حکام کے ہمراہ آپ کا استقبال کیا، اور بڑی خاطر مدارات کی، معافی و وظیفے پیش کیے،
ر آپ نے قبول نہیں کیا، اور فرمایا کہ حلب کی حکومت و امارت اور منصب دینی و دنیوی چھوڑ کر
دستان اور پھر بہار حکومت و امارت اور وظیفہ خواری کی غرض سے نہیں آیا ہوں، ہاں اگر
د گاؤں بالمعاوضہ حکومت کی جانب سے بندوبست کر دیے جائیں تو مضائقہ نہیں، یہ صورت
ہ معاش کے لیے کافی ہوگی، چنانچہ ایک مغل زمیندار کی زمینداری جو ہرپور ہدیو پرگنہ مسوڑہ میں
اور سرکاری مالگذاری ادا نہ کرنے کے سبب ضبط ہوگئی تھی، حسب فرمائش ناظم صوبہ حکومت سے اس کا
بست کرا کے مقام مذکور میں مالکانہ حیثیت سے سکونت پذیر ہوئے، جس زمیندار کی زمینداری
بست کرائی تھی، اس نے حکومت سے ساز و باز کر کے اور عمال کو رشوت دے کر زمینداری مذکور پر
لمانہ طریقہ سے قبضہ کرنے کی کوشش کی چنانچہ جب شاہ موصوف اپنے تین فرزندوں کی بارات لیکر
ہے تھے تو اثنائے راہ میں اس بد اندیش زمیندار نے عمال حکومت کے ہمراہ برات پر حملہ کر دیا، شاہ موصوف
بھائیوں، فرزندوں، عزیزوں، خادموں، مخلصوں نے مقابلہ کیا مگر ناکام رہے، اور کل ہمراہیوں
بت شہید ہوئے،[1]

---

[1] ماخوذ از مخطوطہ قدیم فارسی موسوم بفضل الصمدی مرتبہ شیخ احمد علی متوطن بھوڑیا منورہ گیا، بہار، مکتوبہ ۱۲... ف

مندرجہ سے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایک خدا رسیدہ بزرگ اور مخدوم بہاری کے خلفا میں تھے، چنانچہ صاحب سیر المدار لکھتے ہیں کہ مخدوم بہار کے خلفائے نامدار کے سلسلہ میں مذکور ہے کہ ایک خلیفہ شیخ صدر الدین البہاری مجذوب اور مغلوب الحال تھے، جو شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا تو دنیا بے اختیار ہو کر ترک دیتا تھا، ان کا مزار کورچ ڈاریمیں ہے جو توابع بہار سے ہے،

رشید
فضل الصدری، ایک قدیم فارسی مخطوطہ[1] موسوم بفضل الصدری مرتبہ مولوی محمد شریف تلمیذ مولانا قاضی حبیب اللہ خلف الصدق مخدوم شاہ صدر الدین صوفیؒ عبد الغفور مرحوم متوطن بھڈولیا پرگنہ منورہ ضلع گیا کی دستاویزات میں دستیاب ہوا ہے، جس سے صوفی موصوف کے نسب و حسب اور اسلاف و اخلاف کے کچھ حالات معلوم ہوتے ہیں، اس میں آپکے اور آپکے نبیرہ قاضی شاہ ابو القاسم رحمہ اللہ کے مناقب و کرامات مندرج ہیں، مگر سنہ و تاریخ سے عاری ہے،

حالات | صوفی موصوف نسباً عثمانی، ارادةً فردوسی اور وطناً حلبی بہاری تھے،

مخدوم شاہ صدر الدین صوفی بن علامہ عطاء اللہ بن فاضل العصر شاہ فتح اللہ بن معرفت دستگاہ شاہ خلیل سیاح بن مقبول اللہ امین دین حضرت شاہ قمر الدین حلبی بن شاہ عباد اللہ بن شاہ غلام احمد بن حضرت شاہ یعقوب نوری بن حضرت اسحاق دانشمند بن زکریا بغدادی بن قطب الاقطاب شیخ ہارون بن عارف باللہ شیخ عبد اللہ اصغر بن امیر المومنین امام المتقین ناشر القرآن کامل الحیاء والایمان حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ

اخلاف میں چند اشخاص قابل ذکر ہیں، قاضی حبیب اللہ، قاضی بایزید، قاضی حبیب اللہ، قاضی شاہ ابو القاسم، قاضی فیض اللہ، قاضی عنایت اللہ، قاضی عطاء اللہ، شاہ غوث الاعظم، شاہ دلگیر،

---

[1] مخطوطہ مذکورہ اصل نسخہ سے منقول ہے جسکی کتابت ۱۲۰۶ھ ہے، کاتب کا نام شیخ امجد علی متوطن موضع بھڈولیا، پرگنہ منورہ ضلع گیا ہے۔ جناب عبد الغفور صاحب مرحوم صوفی صاحب موصوف کے اخلاف سے ہیں، انکی دستاویزات میں موضع مذکور کی معافی کی چند مستند سندیں بھی محفوظ ہیں جنکا ذکر آگے آئیگا،

مولانا شاہ عبدالحی،

شاہ قمر الدین حلبی رحمۃ اللہ ایک ناخوشگوار واقعہ کے سبب بادشاہ وقت سے آزردہ ہو کر حسب ہدایت بزرگان خاندان و پیران طریقت زن و فرزند کے ہمراہ حلب سے روانہ ہوئے، ہر منزل پر وہاں کے باشندوں نے بڑے اخلاص و محبت سے خیر مقدم اور خاطر داریاں کیں جب شاہجہاں آباد پہنچے تو بادشاہ وقت کی جانب سے خیر مقدم کے ساتھ اقامت گزینی اور عہدہ اور منصب کی قبولیت کی درخواست کی گئی، مگر آپ نے بے نیازی ظاہر کی، اور شاہجہاں آباد سے بہار روانہ ہوئے، جب صوبہ بہار پہنچے تو ناظم صوبہ نے عمال و حکام کے ہمراہ آپ کا استقبال کیا، اور بڑی خاطر مدارات کی، معافی و وظیفے پیش کیے، مگر آپ نے قبول نہیں کیا، اور فرمایا کہ حلب کی حکومت و امارت اور منصب دینی و دنیوی چھوڑ کر ہندستان اور پھر بہار حکومت و امارت اور وظیفہ خواری کی غرض سے نہیں آیا ہوں، ہاں اگر چند گاؤں بالمعاوضہ حکومت کی جانب سے بندوبست کر دیے جائیں تو مضائقہ نہیں، یہ صورت وجہ معاش کے لیے کافی ہوگی، چنانچہ ایک مغل زمیندار کی زمینداری جو ہر پور ہدیو پرگنہ مسوڑہ میں تھی، اور سرکاری مالگذاری ادا نہ کرنے کے سبب ضبط ہوگئی تھی، حسب فرمایش ناظم صوبہ حکومت سے اس کا بندوبست کرا کے مقام مذکور میں مالکانہ حیثیت سے سکونت پذیر ہوئے، جس زمیندار کی زمینداری بندوبست کرائی گئی تھی، اس نے حکومت سے سازو باز کر کے اور عمال کو رشوت دیکر زمینداری مذکور پر ظالمانہ طریقہ سے قبضہ کرنے کی کوشش کی چنانچہ جب شاہ موصوف اپنے تین فرزندوں کی بارات لیکر بہار شریف جا رہے تھے تو اثنائے راہ میں اس بد اندیش زمیندار نے عمال حکومت کے ہمراہ برات پر حملہ کر دیا شاہ موصوف کے بھائیوں، فرزندوں، عزیزوں، خادموں مخلصوں نے مقابلہ کیا مگر ناکام رہے، اور کل ہمراہیوں سمیت شہید ہوئے۔[۵]

---

[۵] ماخوذ از مخطوطہ قدیم فارسی موسوم بفضل الصمدی مرتبہ شیخ احمد علی متوطن بٹھولیا جو نذر ہو گیا، بہار، مکتوبہ ۱۳۰۰ھ

مخدوم شاہ صدر الدین صوفی اور مولوی شاہ بہاری حضرت مخدوم شاہ شرف الدین قدس سرہ کی بارگاہ میں علوم صوری و معنوی کے حصول اور کمالات باطنی کے اکتساب میں مشغول تھے، اس لیے وہ اس قتل عام سے بچ رہے، اس حادثۂ جانکاہ کی خبر پانے کے بعد بھی صوفی موصوف صبر و شکر کے ساتھ اذکار و اشغال میں مشغول رہے، چند دنوں کے بعد برداشتہ خاطر اور وارفتہ مزاج ہوکر حسب حضرت مخدوم قدس کے حکم کے مطابق حج بیت اللہ اور زیارت روضۂ اقدس کے لیے روانہ ہوگئے، مدینہ طیبہ پہنچکر روضۂ اقدس کی جاروب کشی اختیار کی، اور تین چلے کامل یہاں مقیم رہے، چوتھا چلہ پورا نہ ہونے پایا تھا، کہ صاحب روضہ علیہ السلام کی جانب سے ہندوستان کی مراجعت اور خلق کی ہدایت کی بشارت ہوئی، اس لیے حسب ہدایت ہندوستان واپس آئے، اور مخدوم بہاری کی خدمت میں حاضر ہوکر تعلیم و تزکیہ میں مشغول ہوگئے، کچھ مدت کے بعد بحکم مرشد شاہ عبدالجلیل مالک موضع بانی وغیرہ پرگنہ دادر سرکار بہار کی دختر نیک اختر سے عقد مناکحت کرکے چند سال مقام مذکور میں مقیم رہے[۱] پھر قصبہ کاکو میں سکونت پذیر ہوئے[۲]، اور تاحیات تعلیم و تزکیہ کی خدمت انجام دیتے رہے، اور مدرسہ و خانقاہ قائم کرکے مخلوق کو ظاہری و باطنی فیوض سے فیضیاب کرتے رہے، آپ کے تین فرزند صاحب علم اور صاحب منصب و جاہ ہوئے، اور وہ سب مختلف مقامات میں مختلف حالات کے ماتحت سکونت پذیر ہوگئے، چنانچہ شیخ المشائخ مولانا باب اللہ کاکو ہی پرگنہ دادر میں مالکانہ اور زمیندارانہ حیثیت سے، مولانا قاضی بایزید چک قاسم پرگنہ دادر میں حاکمانہ حیثیت سے، مولانا قاضی حبیب اللہ محی الدین پور پرگنہ دادر میں مالکانہ و حاکمانہ حیثیت سے سکونت پذیر ہوئے، مولانا قاضی بایزید کی اولاد میں مولانا قاضی شاہ ابوالقاسم رحمۃ اللہ[۳] ظاہری و باطنی ہر حیثیت سے ممتاز تھے،

---

[۱] ماخوذ از مخطوطہ فارسی، [۲] بزرگان کہن سال کا بیان ہے کہ عہدہ قضا پر مامور ہوکر آپ کاکو تشریف لائے، اور جب آپکے اخلاف اس عہدہ کے لائق ہوگئے تو آپ اس منصب سے سبکدوش ہوگئے۔ [۳] مخطوطہ فارسی میں آپ کے بعض مناقب و کرامات مذکور اور مختصر حالات بلا قید تاریخ و سنہ مرقوم ہیں، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ علوم ظاہری و باطنی سے بہرہ ور اور خدا رسیدہ بزرگ تھے، آپ کا مزار موضع بیتھولیا پرگنہ منیر و سب ڈویزن اورنگ آباد ضلع گیا میں ایک باغ میں بلا کسی چار دیواری اور قبہ کے ہنوز موجود ہے، مقام مذکور کے بیشتر باشندے آپکے معتقد ہیں، راقم الحروف کا بھی مادری سلسلہ آٹھ واسطوں سے آپ تک پہنچتا ہے،

حکومت وقت کی جانب سے عہدۂ قضا پر مامور ہو کر مختلف مقامات پر فرائض قضا انجام دیتے رہے، پرگنات داور منورہ، گوہ، انچھا کے جب قاضی ہوئے تو دادر سے نکل کر منورہ کے متصل ایک پرفضا مقام بھولیا میں سکونت پذیر ہو گئے۔

شاہ صاحب موصوف نے یکے بعد دیگرے تین شادیاں مختلف مقامات میں مختلف حالات کے تحت کیں،

شاہ صاحب کے نام بادشاہ وقت اور ناظمین صوبہ کی جانب سے بیشتر معافیاں تھیں جو آپ کی وفات کے بعد آپ کے اخلاف کے نام بسلسلۂ نیاز درگاہ حضرت شاہ ابوالقاسم منتقل کر دی گئیں، جو اب تک باقی ہیں اور سب ذاتی تصرف میں ہیں، صرف چند بیگہہ زمین اور چند درختوں کی آمدنی ... نذر و نیاز پر صرف ہوتی ہے، چند اسناد معافی شیخ امیر اللہ کی دستخطی و مہری جو محمد شاہ اول، احمد شاہ اور شاہ عالم کے عہد حکومت کا صاحب منصب و جاہ جاگیر دار تھا، اب تک محفوظ ہیں[1]، اسناد مذکور کی نقل صحیح درج ذیل ہے:

اسناد معافی:- "نیاز حضرت غوث الاعظم قدس سرہٗ پنج بیگہہ دہ بسوہ زمین مزروعہ بصیغہ نیاز محمد دلیر مع فرزندان از سنہ ۱۱۰۰ فصلی تحریر فی التاریخ پنجم ربیع الثانی سنہ ۱۳ جلوس والا مطابق سنہ ۱۱۰۰ فصلی بدستخط امیر اللہ

ایضاً، سند جاگیر بمقام ہولی چک پرگنہ منورہ سرکار صوبہ بہار موازی سہ بیگہہ دہ بسوہ زمین مزروعہ نیاز شیخ دلیر از سنہ ۱۱۴۰ فصلی بدستخط امیر اللہ، تاریخ غرہ صفر المظفر سنہ جلوس والا قلمی الاسم

ایضاً، بنام محمد دلیر سنہ ۱۱۹۴ فصلی موازی یک بیگہہ موضع ہولی محلہ پرگنہ منورہ، بدستخط امیر اللہ

ایضاً، بنام شیخ محمد دلیر از سنہ ۱۱۴۶ فصلی موازی دو بیگہہ دہ بسوہ مزروعہ نیاز درگاہ حضرت شاہ محمد قاسم قدس سرہٗ تحریر فی التاریخ صفر المظفر سنہ جلوس، ایضاً قطعہ سند موازی پنج بیگہہ زمین بوجہ نیاز بموجب تفصیل ذیل، بنام خلیفہ حبیب اللہ وارث خلیفہ محمد دلیر مرحوم بحال نمودہ شد تاریخ نہم .... سنہ ۱۲۰۴ فصلی،

ایضاً، سند زمین بنام خلیفہ دلیر بوجہ نیاز در موضع ہولی چک،

[1] وغیرہ راقم عبد الغفور مرحوم کے یہاں یہ چند اسناد معافی اب تک موجود ہیں، میں نے ان اسناد اور مخطوطۂ فارسی مرتبہ شیخ محمد علی مرحوم کی نقل انہی کی حیات میں ان کی اجازت سے حاصل کی تھی، جزاہ اللہ خیر الجزاء، انکی اولاد کے نذر و ارث چند موجود ہیں جنکے پاس سندیں موجود ہیں،

مختصر اللطیف

از

جناب شیخ محمد فرید صاحب برہان پور

کتاب ادبیاتِ فارسی مین ہندوؤن کا حصہ" مین روپ نراین کھتری کی دو کتابون (۱) شش جہت[1] (۲) مخزن العرفان[2] کا ضمناً ذکر کیا گیا ہے، کھتری موصوف کی لغت کی کتاب" نصاب جامع" کا سراپا[3] بزم شبلی مین سنایا جا چکا ہے،

عہدِ عالمگیری کے اس صاحبِ علم و فضل کی ایک اور تالیف "مختصر اللطیف" ہے، جس کے متعلق مختصر معلومات ناظرینِ کرام کی خدمت مین پیش کرتا ہون،

تالیف مذکور کا پیشِ نظر مصوّر مخطوطہ ۹ ½ × ۵ ½ تقطیع کے ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے، ہر صفحہ پر ۱۴ سطرین ہین، بیچ کے چند اوراق غائب ہین، سنہ تصنیف ۱۱۲۹ھ ہے، اور کتابت ۱۲۱۲ھ کی ہے، اس نسخہ مین شہاب الدین غوری، جلال الدین خلجی، غیاث الدین، محمد شاہ بن فرید خان اور معزالدین وغیرہ سلاطین کی رنگین و مینار کار تصویرین ہین، یہ تصویرین دیدہ زیب اور دلآویز ہین، اور قلم کاری اور نقاشی مین یکسانیت پائی جاتی ہے، سلاطین کی شباہت مین معمولی سا فرق کر دیا گیا ہے،

تصویر کے خاکے کے لئے تصوّر کو ذرا زحمت دیجئے،

ایک معمولی تخت پر وائی تاج و سر پہ ہاتھ مین گل سُرخ لئے، رونق افروز ہے، سر پر چتر سایہ فگن ہے،

---

[1] ادبیاتِ فارسی مین ہندوؤن کا حصہ ص ۱، [2] ایضاً ص ۱۲۴ [3] معارف اکتوبر ۱۹۶۲ء،

پیش خدمت حاضر خدمت ہے، خادم جانب پشت مگس رانی کر رہا ہے،

مخلص، روپ نراین نے کتاب کے دیباچہ مین لکھا ہے کہ مختصر اللطیف "بندرابن داس بہادر شاہی کی کتاب "لب[1] التواریخ" کا خلاصہ ہے جس مین شاہان دہلی، گجرات، دکن، مالوہ، سندھ وغیرہ کے حالات کا تذکرہ ہے، اور اورنگزیب عالمگیر (علیہ الرحمہ) کی حکومت کے صرف ۳۰ سال کے واقعات مختصراً درج کئے گئے ہین، لطف اللہ خان صادق کے حکم سے ۱۱۲۶ھ مین یہ کتاب تالیف کی گئی،

"احقر ہیچ مدان، روپ نراین کھتری، متوطن سیال کوٹ بمضاف صوبہ دار السلطنت لاہور معروض والامنشان می گرداند کہ حالات اورنگزیب عالمگیر را منشی محمد کاظم تا سنہ دہ جلوس بہ حکم آنحضرت درحیز تحریر درآوردہ و بعد ازان آنحضرت از کمال خضوع و انکسار کہ جبلت ذات بابرکات بود، منع نمودہ فرمودند کہ "احوال ماکراماً الکاتبین می نویسند، چرا این امر محال بے حاصل دیگر از انچہ داریم" لہذا ازان موقوف ماند، اما راے بندرابن داس بہادر اصل کہ از بندہ ہاے قدیم و صاحب استعداد بود، وقائع عہد آنحضرت تا سنہ سی جلوس بہ طور خود بہ طریق اختصار و اجمال نوشتہ و احوال سلاطین دہلی را از ابتداے ظہور اسلام با کیفیت سلاطین دکن و گجرات و مالوہ و خاندیس و بنگالہ و جونپور و سندھ و ملتان و کشمیر بر آن اضافہ نمودہ لب التواریخ ہند موسوم ساختہ و چون آن نسخہ، بہ مطالعہ نواب لطف اللہ خان[2] صادق بہادر نیک نام والاشان کہ در سنہ

---

[1] ادبیات فارسی مین ہندوؤن کا حصہ ص ۵۹، بزم تیموریہ دار المصنفین اعظم گڑھ ص ۲۸۰ [2] صاحب ماثر الامرا نے لکھا ہے کہ شیخ زادہ نواب لطف اللہ خان پانی پتی نے قطب الدین محمد معظم المخاطب بہ بہادر شاہ کے عہد مین دربار مین رسوخ حاصل کر لیا، اور جلد ہی اعلیٰ مراتب پر فائز ہو گیا، جہاندار شاہ کے عہد مین معتوب ہوا، منقولہ در غیر منقولہ تمام جائداد ضبط ہو گئی، بعد مین فرخ سیر سے ربط و ضبط بڑھا لئے، اس کے عہد حکومت مین سید عبداللہ خان

یک ہزار و یک صد و بست و شش ہجری (۱۱۲۶ھ) بمطابق سال سوم از جلوس فرخ شاہی بہ تقریبے بعد از دستوری پایکاہ و الا در لاہور تشریف آوردہ بودند، در آمدہ، باین فدوی بے مقدار کہ نقش بندگی از مدتے در خدمت آن قدر داشت، فرمودند کہ این کتاب اگرچہ مختصر است؛ اما ہنوز طویل، اگر این را در مجلدے بہ نہایت اختصار در آوردہ نشو و نما حالات جمیع سلاطین درج گردد، مناسب خواہد بود، بنا برین احقر کج مج زبان بہ طبق امر محکم آن والا مرتبت آنرا بہ عبارت عام فہم کہ برآن قادر بود، در سلک اختصار کشیدہ و مجمل احوال[1] حضرت عالمگیرؒ تا زمان تستغفار شدن ایشان با وقائع مختصر عہد حضرت شاہ عالمگیر بہادر تا اوائل سنہ جلوس فرخ شاہی نیز مندرج نمودہ بہ مختصر اللطیف مسمی گردانید و تاریخ اتمام آن را بدین گونہ در رشتۂ نظم کشیدہ،

ہزار شکر کہ این مختصر بہ فضل خدا
تمام گشت بہ طرز بدیع ذات لطیف

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۵) کے ایما سے دار الخلافہ کا انتظام اس کے سپرد کیا گیا، قطب الملک نے دیوان خالصہ اس کے نام تجویز کی، بادشاہ نے اس عہدہ پر چھبیلہ رام ناگر کو نامزد کر دیا تھا، یہ اختلاف رنجش مین تبدیل ہوگیا، اور قطب الملک نے کہلا بھیجا کہ "اگر وزیر اول کی تجویز قبول نہ ہوئی، تو بادشاہ کا استقلال معلوم" آخر کار خالصہ دیوانی کی خدمت اس کے سپرد کی گئی، محمد شاہ کے عہد مین "خانساماں" کی خدمت سپرد ہوئی، ہشش ہزاری منصب اور شمس الدولہ تہور جنگ کے خطاب سے سرفراز ہوا، پھر چند "ناشایستہ" حرکات کی وجہ سے نادر شاہ کی آمد کے بعد معتوب ہوا، اور احمد شاہ کے عہد مین انتقال کیا، اس کے نام کے ساتھ صادق لقب کا اضافہ کر دیا گیا ہے اور یہی زبان زد خاص و عام ہے۔

[1] افسوس کہ کتاب کا یہ حصہ جو حضرت عالمگیر رح کے حالات پر مشتمل تھا، ایک فاضل "ہدایت یافتہ" جلد ساز کی نذر ہوگیا، یہ جلد مولوی سید احکام اللہ صاحب بخاری مالک کتاب مذکور کا ہے،

چو یافت عز قبولیت خطاب لطیف
بہ فکر سال تمامیش ز ہاتف غیب
ندا رسید مکرر کنند و کتاب لطیف"

ذو کتاب لطیف کی تکرار سے سال اتمام ۱۱۲۶ھ نکل آتا ہے،

اس کتاب کو کئی وجوہ سے اہمیت و امتیاز حاصل ہے،

(۱) عہد عالمگیر کی تاریخ ہے،

(۲) مؤلف غیر جانب دار ہندو ہے،

(۳) برار، خاندیس اور کلبرگہ جیسی چھوٹی چھوٹی حکومتوں کے تذکرے مختلف تاریخی کتب مین بکھرے ہوے ہین، اس لئے بسا اوقات ان کے تاریخی واقعات، اور ان کے مشاہیر کے حالات کی تلاش و تحقیق مین ایک ضمنی تذکرہ بڑا بیش قیمت ہوتا ہے، اور اس چھوٹی سی کتاب مین اُن کے تذکرے علحدہ علحدہ عنوانات کے تحت مجملاً مل جاتے ہین، جو تاریخ کے طلبہ کے لئے مفید ہین،

(۴) معز الدین جہان شاہ، فرخ سیر اور دوسرے تخت و تاج کے وارثون مین جو جنگین ہوئین، اُن کی تفصیل ایک علحدہ باب مین ہے،

(۵) آخری باب مین فرخ سیر کے عہد کے حالات ہین،

(۶) ضمناً لطف اللہ خان صادق کی کارگذاریون کا بھی ذکر کیا گیا ہے،

اس کتاب کا پہلا باب شاہان دہلی کے تذکرہ پر مشتمل ہے، اور دوسرا باب سلاطین دہلی کے حالات پر، اس ضمن مین چھ فصلین ہین،

فصل اول۔ حالات سلاطین گلبرگہ،

فصل دوم :- واقعات سلاطین بیجاپور،

فصل سوم :- حالات حاکمان احمد نگر،

فصل چہارم :- احوال پادشاہان تلنگ (حیدرآباد)

فصل پنجم :- وقائع والیان برار،

فصل ششم :- سوانح حکام بندر

بقیہ ابواب عنوانات ذیل پر ہیں :-

باب سوم :- حالات کارفرمایان گجرات

باب چہارم :- ذکر حکام مالوہ

باب پنجم :- وقائع سلاطین خاندیس،

باب ششم :- احوال حکام بنگالہ،

باب ہفتم :- حالات سلاطین شرقیہ،

باب ہشتم :- واقعات حکام سندھ

باب نہم :- ذکر حاکمان ملتان

باب دہم :- کیفیات فرمانروایان کشمیر

خاتمۂ کتاب کی عبارت یہ ہے،

"کتاب روپ نراین کھتری، متوطن سیالکوٹ بمضافات صوبہ پنجاب، بتاریخ بست وچہارم ذی الحجہ سنہ یک ہزار ودوصد ودوازدہ باتمام رسید"

ادبیات

جبر و اختیار

از

جناب محمد حسن صاحب لدھیانوی

بھٹکا ہوا راہی

چھایا ہے اُس غریب پہ کیا حزن بے پناہ ۔۔۔ پردیس مین جو بھول گیا ہو وطن کی راہ

غربت کی شام ہو کوئی پُرسانِ غم نہین ۔۔۔ اک آہ لے کسی تھی اب اس مین بھی دم نہین

ٹوٹین جو دست و پا سرِ منزل پڑا رہے ۔۔۔ جب دل ہی ٹوٹ جائے تو بیچارہ کیا کرے

گم کردہ راہ کون ہے مین ہی غریب ہون ۔۔۔ فردوس سے نکالا ہوا بدنصیب ہون

ٹھیرا گناہ گار خدا کے حضور مین ۔۔۔ پکڑا گیا ہون آہ ذرا سے قصور مین

اک دن وہ تھے کہ مین بھی وطن مین تھا شادمان ۔۔۔ مجھ کو کچھ اس جلاوطنی کا نہ تھا گمان

یادش بخیر کیا ہی مبارک زمانہ تھا ۔۔۔ جب گلستانِ خلد مرا آشیانہ تھا

حاصل مجھے بھی رتبۂ اوجِ قبول تھا ۔۔۔ گلچینِ حسنِ گل کی نگاہون مین پھول تھا

اس خاکدان پہ آکے یہ رہرو بھٹک گیا ۔۔۔ دشتِ گمان و وہم مین پھر پھر کے تھک گیا

اسوارِ رخشِ جبر ہون کس اضطراب مین ۔۔۔ "نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب مین"

کندھون پہ اپنے بارِ امانت لئے ہوئے ۔۔۔ "آیا ہون اختیار کی تہمت لئے ہوئے"

تہذیبِ نو کا سیل بہالے چلا مجھے اے ناخدائے دینِ ہدیٰ تھامنا مجھے

ہو اپنے بس کی بات تو چارہ کرے کوئی
قسمت بگڑ گئی ہو تو پھر کیا کرے کوئی

ضمیر کی آواز

آئی ندا کہ جبر پہ مجبور تو نہین با عقل و اختیار ہے معذور تو نہین
پیدا کیا ہے احسنِ تقویم مین تجھے اور حق شناس دل ملا تقسیم مین تجھے
جس وقت مان کے پیٹ سے تو نے جنم لیا لایا تھا اپنی فردِ عمل پاک و باصفا
آواگون کے سارے بکھیڑون سے پاک تھا اور تجھ پہ کوئی بوجھ تھا اس کا نہ باک تھا
اسلام نے اُتار کے سارے یہ تیرے بار آزادیِ عمل کا دیا تجھ کو اختیار
تیرا یہ جسم، تیرا عمل، تیرے یہ قویٰ دیتے ہین سب ثبوت ترے اختیار کا
مین بھی تجھے جتا تا رہا ہون یہ بار بار تجھ کو بدی سے بچنے کا حاصل ہے اختیار
جب تجھکو اختیار کا چابک دیا گیا پھر کس لئے تو جبر کے کھونٹے سے جا بندھا
تمیز نیک بد بھی تجھے سب عطا ہوئی پھر تو نے اپنی فردِ عمل کیون سیاہ کی
طاقت بدی سے بچنے کی جب تجھکو مل چکی ناحق تو آڑ ڈھونڈتا پھرتا ہے جبر کی

تجھ پر بھی اختیار کی حجت ہوئی تمام
مختار بھی حبیبِ خدا کا ہے ایک نام

خلعت ترا ہے کرمنا[1]، انی جاعل[2] نخلِ شرف مین لگنے نہ دے بے کسی کا گھن

[1] لقد کرمنا بنی آدم [2] انی جاعل فی الارض خلیفہ،

اک گونہ جبر و صبر بھی ہیں داخلِ صفات — اہل اُن کے بھی ہیں موردِ صد رحمت و صلوٰۃ

لیکن ہے جبر و صبر بڑے حوصلے کا کام — اہلِ ہمم ہی پیتے ہیں یہ تلخ و تند جام

تو نے انھیں بنایا خطاؤں کا عذرِ لنگ — رنگِ رضا و صبر میں اے کم نظر یہ بھنگ؟

تو خود تو خوابِ غفلت و شک میں پڑا رہا — تقدیر کے سر اپنی خطا تھوپتا رہا

تقدیر کا تو اصل میں مفہوم ہے کچھ اور — تو نے سمجھ لیا اُسے قدرت کا جبر و جور

علمِ خدا کی وسعتیں جتلائی ہیں تجھے — آیندہ واقعات کا بھی علم ہے اُسے

یعنی وہ ہے خبیر و بصیر و فہیم کُل — دانائے علم و حاضر و غائب علیم کُل

ہر نیک و بد کا ہے اسے سب علمِ پیشگی — اُس کی کتابِ علم میں ہر بات ہے لکھی

تو نے سمجھ لیا اسے قسمت کا فیصلہ — ہمت کا ہے قصور سمجھ کی ہے یہ خطا

قسمت کسی کی حق نے بنائی نہیں بُری[1] — تقدیر خود بشر نے بہ شر اپنی پھوڑ لی

جب جانتا ہے تو نہیں حق کو بدی پسند — بہتر یہ ہے کہ تو بھی ہو نیکی پہ کاربند

ناحق کی بدگمانیاں تجھے حق سے یہ کیوں ہیں تو — وہ تیرا خیر خواہ ہے[2]، بدخواہ تو نہیں

تو نے سمجھ لیا جسے تقدیر کی کمی

لائی ہوئی مصیبتیں ہیں تیری[3] ہاتھ کی

اُس نے تو اپنی رحمت و لطفِ عمیم سے — درجہ دیا ہے اشرفِ مخلوق کا تجھے

عقل و حواس و قوتِ تسخیر و دست و پا — سب کچھ تجھے اُسی کے کرم سے ہوا عطا

---

[1] خدا کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا، جب تک وہ خود اپنی حالت کو نہ بدلے (قرآن ۱۳/۱۱) [2] کتب علی نفسہ الرحمۃ [3] ذلک بما قدمت ایدیکم وان اللہ لیس بظلام للعبید ۰، وما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم ویعفوا عن کثیر [4] وما اصابک من سیئۃ فمن نفسک (۴-۹)

تو اپنے ان قومی سے اگر ٹھیک کام لے
ہے بالیقین تاجِ خلافت ترے لئے

دُنیا یہ آز مایشون ہی کا مکان ہو
صبر و ثبات، حوصلے کا امتحان ہے

اے رُوحِ حق نصیب ترا تیرے ہاتھ ہو[1]
جب تو ہے حق کے ساتھ تو حق تیرے ساتھ ہو

گر کوشش اور حسنِ تدبر سے کام لے
تائید ایزدی سے سبھی کچھ ملے تجھے

تائیدِ حق تو ہمتِ مردان کیساتھ ہو
قسمت کو لکھنے والا قلم تیرا ہاتھ ہے

دو پہیون ہی سے گاڑی یہان چلتی ہو سدا
تقدیر ایک پہیہ ہے انسان دوسرا

جب وعدہ ہو چکا ہے لدینا مزید کا[2]
کھوئی ہوئی بہشت کو رونے سے فائدہ؟

ہین حق کے پاس اور بھی باغِ جنان کئی
گر ایک خلد جاتا رہا دوسرا سہی

یون تو ہے کل جہان کا رزق شانِ خدا
انسان کی دوڑ دھوپ بہانہ ہو رزق کا

سر چشمہ دودھ کا نہین آتا ہے جوش مین
جب تک نہ اس کے ساتھ ہون بچے کی کوششین[3]

سعی و ثبات و کاوشِ پیہم ہے زندگی
ہو خوذ نگر تو فاتحِ عالم ہے زندگی

وہم و گمان کو چھوڑ تجھے یہ پتا بھی ہو
انسان کے جدّ و جہد مین دستِ خدا بھی ہو[4]

جبتک نہ پہلے کوشش کامل سے کام لین
زیبا نہین کہ کام توکل پہ چھوڑ دین

---

[1] کافر ہے تو ہو تابع تقدیر مسلمان — مومن ہے تو آپ ہی تقدیر الٰہی
عبث ہے شکوۂ تقدیر یزدان — تو خود تقدیر یزدان کیون نہین ہو — اقبالؒ

[2] لَهُمْ مَا يَشَاؤُنَ فِيهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْد (وہان جو چاہین گے اُن کے لئے حاضر ہے، اور ہمارے پاس اور بھی بہت کچھ ہے) قرآن [3] "تا نہ گرید طفل کے جوشد لبن" (رومیؒ)، [4] جن لوگون نے ہمارے لئے کوشش کی ہم اُن کو ضرور اپنے رستے دکھا دین گے، اور خدا تو نیکو کارون کے ساتھ ہے، (قرآن)

کہا جب عمرؓ سے رسولِ کریمؐ نے — فرمایا پہلے زانوے اُشترکو باندھ لے[۱]

دنیا و دین بھی ہے عمل خیر و نیک سے — گردش گئی یہان وہان تشتر گنا ملے

در کارِ خیر حاجتِ ہیچ استخارہ نیست — انسان بخیر کوش کہ عالم دوبارہ نیست

مغرب کی آب وتاب بظاہر تو خوب ہی — لیکن یہ آفتاب قریب غروب ہی

ہے نور شرق ہی کے سراجِ منیر سے — جس کی شعاعین دھارہی ہین آب حیات کے

بہر منیر شرق ہے پیغام آب وتاب

ظُلمت کا پیش خیمہ ہے مغرب کا آفتاب

---

[۱] حدیث :- اعقل ثمّ توکّل ع :- بر توکّل زانوے اشتر بہ بند،

سلسلۂ سیر الصّحابہؓ

سیرۃ النبی (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کے بعد مسلمانون کے لئے جن مقدس ہستیون کے کارنامے اور سوانح حیات مشعل راہ ہوسکتے ہین، وہ حضرات صحابۂ کرام ہین، جن کے حالات ۱۰ ضخیم جلدون مین دار المصنفین نے شائع کئے ہین جو حسب ذیل ہین:-

جلد اوّل	خلفاء راشدین طبع سوم	صہ ر	جلد ششم	سیر الصحابہ	سے ر
جلد دوم	(مہاجرین اوّل) زیر طبع		جلد ہفتم	سیر الصحابہ	سیہ ر
جلد سوم	" دوم	للعہ ر	جلد ہشتم	سیر الصحابیات طبع سوم	
جلد چہارم	سیر انصار اوّل (طبع دوم)	سے ر	جلد نہم	اسوۂ صحابہ اوّل	سیہ ر
جلد پنجم	" دوم "	سے ر	جلد دہم	" دوم	للعہ ر

"منیجر"

باب التقریظ والانتقاد

چند اور نئے رسالے اور اخبارات

گذشتہ مہینہ بعض اخبارات و رسائل اور ان کے خاص نمبروں پر ریویو باقی رہ گیا تھا جو اس مہینہ میں کیا جاتا ہے

الجامعہ، مرتبہ جناب مولوی عبدالواحد صاحب برلاس، تقطیع بڑی ضخامت ۴۸ صفحے، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت بہتر، قیمت سالانہ معہ رنگین پرچہ، مرتبہ جامعہ محمدی شریف، ضلع جھنگ، پنجاب،

پنجاب کا عربی مدرسہ جامعہ محمدی عرصہ سے دینی علوم اور مذہبی تعلیم کی مفید خدمت انجام دے رہا ہے اب اس نئے زمانہ کے حالات اور مقتضیات کے مطابق قدیم عربی نصاب و نظام تعلیم کی اصلاح و ترقی عربی مدارس کی تنظیم، عربی علوم و فنون کی تحقیقات و اشاعت، اور اس قبیل کے دوسرے کاموں کا ایک وسیع پروگرام بنایا ہے، یہ مقاصد قریب قریب وہی ہیں جن کے لئے آج سے نصف صدی پیشتر ندوۃ العلماء قائم ہوا تھا، اور گو اس کو ان تمام امور میں پوری نہ سہی تاہم بڑی حد تک کامیابی ہوئی اور کم از کم علماء کی جماعت میں ان چیزوں کا عام احساس پیدا ہو گیا، اور آج اس قسم کی جو آواز بھی اٹھتی ہے، وہ اسی کی صدائے بازگشت ہے تاہم جامعہ محمدی کے یہ مقاصد نہایت مبارک اور مفید ہیں اور پاکستان کے علماء کو ان کا خیر مقدم کرنا چاہئے، مذکورۂ بالا رسالہ انھی مقاصد کی اشاعت اور تکمیل کے لئے نکالا گیا ہے، ہم نے اس کے صرف ایک ہی دو نمبر دیکھے ہیں، اس لئے یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ ان مقاصد کے حصول کے ذرائع کیا اختیار کئے گئے ہیں، اگر کچھ دیندار مخلص اور ہوشمند علماء اس کام کے لئے تیار ہو جائیں

تو پاکستان میں اس کی تکمیل دشوار نہیں ہے کہ خود پاکستان کے لئے اس کی ضرورت ہے۔

جمیل: مرتبہ جناب اخلاق دہلوی و جمیل دہلوی، تقطیع بڑی ضخامت ۴۴ صفحے، کاغذ معمولی کتابت وطباعت بہتر قیمت سالانہ ۵ر فی پرچہ ۸ر، پتہ :- دفتر جمیل کوچہ استاد داغ چاندنی چوک دہلی

یہ رسالہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی کی سرپرستی میں اردو زبان وادب کی خدمت کے لئے نکلا ہے، چنانچہ زیر نظر نمبر میں اردو زبان سے متعلق متعدد چھوٹے چھوٹے مفید مضامین ہیں، ان میں ایک مضمون ایک ہندو صاحب قلم موہن ناتھ صاحب شرر کا بھی ہے، جناب اخلاق کے قلم سے مولانا صہبائی دہلوی کی مشہور کتاب حدائق البلاغۃ کی تلخیص شعراء کے لئے بہت مفید ہے، دہلی کے نئے ادیب اور شاعروں کا مسلسل تذکرہ مولوی شفیع صاحب نیر دلچسپ بھی ہے، اور مفید بھی، افسانوں کا حصہ بھی ستھرا ہے، افسانوں میں تصویر والا جتندر کمارجی، اور "ذوق نظر" جناب شوکت تھانوی کے افسانے دلچسپ ہیں، ادبی حیثیت سے جمیل اسم بامسمیٰ ہے۔

روح ترقی: جناب محمد مظہر صاحب، تقطیع بڑی ضخامت ۴۰ صفحے کاغذ، اور کتابت وطباعت معمولی قیمت سالانہ ۵ر ششماہی ۳ر فی پرچہ ۹ر پتہ: دفتر روح ترقی کوچہ دادے صاحب نظام شاہی حیدرآباد دکن،

یہ علمی وادبی پرچہ حال ہی میں حیدرآباد سے نکلا ہے، تاریخ، ادب، معاشیات، معاشرت، اور تعلیم اس کے خاص موضوع ہیں، زیر نظر نمبر میں تقریباً ان سب پر مختصر مضامین ہیں، ڈاکٹر محمد یوسف الدین ایم اے، پی ایچ ڈی کے مضمون "اسلام کے معاشی نظریے" کو گو سرخی سے کم مناسبت ہے لیکن معلومات کے لحاظ سے اچھا مضمون ہے، اس کے علاوہ "سفر انگلستان" جناب عبدالہادی صاحب "امریکہ کی ڈاک" جناب مجدالدین محمد جعفر صاحب بھی مفید مضامین ہیں، غلام جیلانی صاحب نے "دہلی مختلف شعراء کی نظر میں" کے عنوان سے دہلی کے متعلق مختلف دور کے شعراء کے تاثرات کو جمع کر دیا ہے، رسالہ معلومات کے اعتبار سے خاصہ ہے لیکن مضامین کی ترتیب مناسب نہیں ہے،

نئی روشنی مرتبہ جناب ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب تقطیع اوسط اخباری ضخامت ۱۲ صفحے، کاغذ، کتابت، طباعت بہتر، قیمت سالانہ آٹھ روپے ششماہی للعہ، پتہ:- دفتر نئی روشنی، جامعہ نگر دہلی،

یہ ہفتہ وار اخبار جامعہ ملیہ دہلی کے لائق کارکنوں نے نکالا ہے، اس کا مقصد نئے بدلے ہوئے حالات کے مطابق مسلمانوں کی سیاسی تربیت اور اُن کی رہنمائی ہے، اس کے فاضل اڈیٹر اور بیشتر لکھنے والے سیاسیات کے واقف کار اور آزمودہ کار اہل قلم ہیں، اس لئے ہندوستان و پاکستان کے ساتھ عالمی سیاسیات پر بھی نئی روشنی کا تبصرہ ناقدانہ اور اس کی رائیں ماہرانہ ہوتی ہیں جن سے سیاست میں درحقیقت روشنی حاصل ہوتی ہے، اور ان مسائل پر وہ التزام کے ساتھ لکھتا ہے، سیاسی مباحث کے علاوہ مختلف علمی، ادبی اور دوسرے مفید موضوعوں پر مضامین و معلومات بھی ہوتے ہیں ستھرے اور پاکیزہ ادبیات کی بھی چاشنی رہتی ہے، اس لئے یہ اخبار نہ صرف سیاسی بلکہ علمی و ادبی حیثیت سے بھی امتیازی درجہ رکھتا ہے، جامعہ ملیہ قدیم و جدید، ملک و ملت اور دین و سیاست کا سنگم ہے، اس لئے توقع ہے کہ ان تمام پہلوؤں پر اس کی نظر رہے گی، اور وہ اس فرقہ پرستی کے دور میں جب کہ اشخاص سے لے کر جماعتوں تک کے خیالات میں اعتدال و توازن باقی نہیں رہا ہے، اور بڑے بڑے کو ہ وقار صحیح راستہ سے ہٹ گئے ہیں، ملک و ملت دونوں کی صحیح رہنمائی، اور اُن کی سچی خدمت کا فرض انجام دے گا، اور ملک کے بہی خواہ اس کی پوری قدر دانی کریں گے، لیکن ملک، قوم اور حکومت کی صحیح خدمت محض ان کی تائید ہی نہیں بلکہ ان کی اصلاح کے لئے اُن کی غلط روی پر تنقید بھی ضروری ہے، "م"

رسالوں کے خاص نمبر

ہمایوں سالگرہ نمبر مرتبہ جناب میاں بشیر احمد صاحب بیرسٹرایٹ لا تقطیع بڑی ضخامت ۱۲۸ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت خاص نمبر عہ، پتہ: نمبر ۳۲ لارنس روڈ لاہور،

ہمایوں ایک وضعدار رسالہ ہے، جو ہمیشہ ایک روش پر قائم رہا، اور زمانہ کے تغیرات و حوادث کا اس پر کوئی اثر نہ پڑتا تھا لیکن قیام پاکستان کے بعد سے اس نے اس کے ان مسائل کو بھی جو اس کے موضوع سے متعلق ہو سکتے ہیں، اپنے دائرہ میں شامل کر لیا ہے، اور علمی و ادبی مضامین کے ساتھ وہ پاکستان کے سیاسی، ادبی اور لسانی مسائل کے متعلق بھی معلومات اور مفید مشورے دیتا اور ان پر نقد و تبصرہ کرتا ہے، اس کا یہ سالنامہ بھی ان مضامین و معلومات کا اچھا مجموعہ ہے، حسب معمول "بزم ہمایون" میں ۱۹۵۱ء میں اردو زبان کی مختصر سرگذشت بیان کی گئی ہے، جہان نما کے ماتحت پاکستان ہندوستان اور دوسرے ملکوں کی اہم سیاسی خبروں کا خلاصہ ہے، اور "دنیا ۱۹۵۱ء میں" کے عنوان سے تمام دنیا کے اہم سیاسی واقعات و حوادث پر تبصرہ ہے، اور "پاکستان میں" کے عنوان سے پاکستان کے حالات و کوائف کی مختصر روداد ہے، علمی و ادبی مضامین میں "۱۹۵۱ء کے بعد افسانوی ادب میں زندگی کا شعور" وقار عظیم صاحب "غالب کی شاعری میں حسن و عشق" حمید احمد خان صاحب "اس داستان میں راز میری زندگی کا ہے" منظر انصاری، "اردو اپنے نئے ماحول میں" ڈاکٹر سید محمد عبد اللہ مفید مضامین ہیں، منظر انصاری صاحب نے اسلامی تاریخ کے چند اخلاقی واقعات کو نہایت موثر انداز میں پیش کیا ہے، مضمون نگار نے صرف چند واقعات لکھے ہیں، اسلامی تاریخ تو اس قسم کے واقعات سے معمور ہے، اگر وہ چاہیں تو اس سلسلہ کو مستقل قائم رکھ سکتے ہیں، ایسے مضامین کی بڑی ضرورت ہے، ڈاکٹر سید عبد اللہ نے پاکستان میں اردو کی موجودہ حالت اور اس کی آیندہ ترقی کی صورتوں پر تبصرہ کیا ہے، اور اس سے متعلق مفید تجویزیں پیش کی ہیں، جو پاکستان کے ادیبوں اور ارباب حکومت دونوں کے لئے لائق غور ہیں، ان علمی و ادبی مضامین کے علاوہ میاں عبد العزیز فلک پیما کا افسانہ ریاکار، شوکت تھانوی کا "ایک ملازم کی ضرورت ہے" اور آغا بابر کا ڈرامہ "جہانگیر کی موت" دلچسپ ہیں، منظومات کا حصہ بھی ستھرا اور پاکیزہ ہے، قومی و ملی نظمیں بہت گرم ہیں، یہ مجموعہ

علمی ادبی لسانی اور سیاسی ہر حیثیت سے مطالعہ کے لائق ہے،

ادبی دنیا مرتبہ جناب صلاح الدین احمد صاحب تقطیع بڑی ضخامت ۲۰۰ صفحے کاغذ معمولی، کتابت و طباعت بہتر قیمت سالانہ دس روپیہ ششماہی ۵ روپے فی پرچہ مرتبہ دفتر ادبی دنیا لاہور،

پنجاب کے گذشتہ خونین انقلاب میں اردو کے مشہور ادبی رسالہ ادبی دنیا کا دفتر اور اسی کے ساتھ اس کا سارا اثاثہ تباہ ہو گیا تھا، اس لئے وہ سال سوا سال تک بند رہا، گذشتہ دسمبر سے پھر نکلنا شروع ہوا ہے اور تلافی مافات کے لئے فی الحال اس کی ضخامت دونی سے بھی زیادہ کر دی گئی ہے، جو شاید چند نمبروں تک قائم رہے، اس لئے اس کی حیثیت خاص نمبر کی ہو گئی ہے اور مضامین میں بھی کافی تنوع پیدا ہو گیا ہے، اس کا بڑا حصہ ادب و افسانے پر مشتمل ہے، لائق اڈیٹر کے قلم سے ملک کی تقسیم کے بعد ہندوستان و پاکستان میں اردو زبان کے مستقبل پر نہایت مفید اور بڑی حد تک صحیح تبصرہ کیا گیا ہے، ادبی مضامین میں ڈاکٹر یوسف حسین خان صاحب کا مضمون" اردو غزل اور حسن اور آہبت اچھا ہے"، ادب و جمالیات" جناب ریاض احمد صاحب محبت کا تدریجی ارتقا" جناب وزیر آغا، اور" امامن فیری کے فلسفیانہ خیالات" چودھری محمد علی صاحب دو دوی دلچسپ مضامین ہیں، افسانوں میں بیشتر پنجاب کی دیہاتی زندگی کی تصویریں ہیں، جناب قیوم نظر صاحب کا ڈرامہ" من کی جیت" اور چودھری محمد علی صاحب کا افسانہ" زندگی کا مقصد" بہت پر لطف ہیں، چودھری صاحب ان صاحب طرز ادیبوں میں ہیں، جن کی تقلید نہیں کی جاسکتی، اُن کے خیالات اور تحریر دونوں میں جدت و قدامت کی بڑی لطیف آمیزش ہوتی ہے، ان دونوں مضامین میں اس زوال پذیر تہذیب کی دلکش جھلک ہے جس کے مٹے ہوئے نقوش میں بھی ایک طرح کی آب و تاب نظر آتی ہے، منظومات کا حصہ بھی خاصہ ہے لیکن اب پنجاب کے رسالوں کو حقیقت پسندی کی جانب توجہ کرنی چاہئے اور اپنی ملکی ضروریات کے مطابق ایسا صالح ادب اور لٹریچر پیدا کرنا چاہئے جو ان میں زندگی کا شعور و احساس پیدا کرے،

"م"

مطبوعاتِ جدیدہ

راشٹریہ سیوا سنگھ (انگریزی) تقطیع اوسط ضخامت ۰۰ صفحے، کاغذ اور ٹائپ عمدہ،

قیمت ۵ روپیہ، سکریٹریٹ، لکھنؤ، یوپی،

یہ مختصر مگر مفید کتاب ہمارے صوبہ کی حکومت کے لائق پارلیمنٹری سکریٹری گووند سہائے صاحب نے لکھی ہے، اس میں "راشٹریہ سیوا سنگھ" کی حقیقت اور اس کے مقاصد بیان کئے گئے ہیں، اس ادارہ کے نام اور بعض کاموں سے تو عوام و خواص سب واقف ہیں، لیکن اس کی اصل حقیقت سے اس کے خاص اور بڑے لیڈروں کے سوا، اس کے عام شرکاء تک آگاہ نہیں، یہ کتاب اس کا آئینہ ہے جس سے اس کے ایک ایک خط و خال ظاہر ہو جاتے ہیں، گو اس وقت اس جماعت نے اپنی ظاہری عملی سرگرمیاں اور حکومت کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک ختم کرکے قانونی حیثیت سے اپنی زندگی بچالی ہے، لیکن ضرورت ہے کہ عوام اس کی حقیقت سے پوری طرح واقف رہیں، اور آیندہ کسی غلط فہمی کی بنا پر اس کے دام میں نہ آئیں، اس کتاب کے مطالعہ سے اس ادارہ کا مقصد، اس کا نظام، اور طریقۂ کار بالکل واضح ہو جاتا ہے، اور یہ حقیقت بھی ظاہر ہو جاتی ہے، اگرچہ گو اس نے عوام کو پھنسانے کے لئے ہندوستان میں ہندو حکومت کا قیام، یہاں سے مسلمانوں کا اخراج، پاکستان کا دوبارہ حصول، اور ہندو تہذیب و تمدن وغیرہ بہت سے عوام فریب سلوگن اختیار کئے ہیں، لیکن اس کا اصلی مقصد صرف ہندوستان کی جمہوری حکومت کو ختم کرکے ایک خاص طبقہ کی ڈکٹیٹرشپ کا قیام ہے جس کے دوسرے معنی ہندوستان کی تباہی کے ہیں، یہ کتاب اس لائق تھی کہ اس کا ہندی اور اردو ترجمہ بھی شائع کیا جاتا تاکہ زیادہ سے زیادہ عوام تک

پہنچ سکتی، گووند سہائے صاحب کی یہ ہمت اور دیانت قابلِ تعریف ہی،

سفینہ از جناب سہیل مالیگانوی تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۴۰ صفحہ، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی

قیمت:- عدر پتہ قصر الادب مالیگاؤن ناسک،

مصنف اردو کے روشناس شاعر ہین، سفینہ ان کی رباعیون کا مجموعہ ہے، اردو شاعری میں خیالات اور بحر و وزن کے اعتبار سے سب سے زیادہ مشکل صنف رباعی ہی اور اس کے لئے بڑی مشق و مہارت کی ضرورت ہی، مصنف نے حتی الامکان ان دشواریون سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی ہے، اور بعض رباعیان ان کے قلم سے ایسی نکل گئی ہین جو دماغ کو متوجہ کر لیتی ہین، باقی فروگذاشتون کے متعلق انھون نے یہ تصریح کر دی ہو کہ "اوزان کی پابندی جہانتک ممکن نظر آئی کی، اور کہین کہین آزادی بھی اختیار کی ہو تعقید کا زیادہ لحاظ نہین رکھا، قوافی مین ایطا کی قید سے الگ ہون" اس معذرت کے بعد کسی تبصرہ کی ضرورت نہین، یہ معذرت مصنف کے قلم سے ان رباعیات پر خود اچھی تنقید ہے،

ارتقاء مرتبہ جناب سرشار صدیقی تقطیع اوسط ضخامت ۲۴۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر،

قیمت تحریر نہین، پتہ:- مکتبہ توسیع الادب اردو منزل احاطہ کمان خان کانپور،

کانپور اگرچہ ایک تجارتی شہر ہی لیکن اسکی مرکزیت لکھنو کے قرب اور اسکے ساتھ علمی و ادبی تعلقات کی بنا پر یہان ہمیشہ شعر و ادب کا مذاق رہا اور ادبی مجالس بھی قائم ہوتی رہین، توسیع الادب بھی اسی قسم کا ادارہ ہی، ارتقاء کے نام سے اس نے موجودہ دور کے کانپوری یا کانپور سے تعلق رکھنے والے شعرا کے کلام کا نمونہ شائع کیا ہی، رئیس المتغزلین حسرت موہانی، حافظ محمد صدیق، ثاقب کانپوری، تسلیم ناطقی، شارق ایرایانی، کلام بی اے، وفا شاہجہانپوری، ندرت کانپوری، عیان حیدری، کوثر عابدی اور انور کانپوری کی ایک ایک غزل اور نشور واحدی، سالک کانپوری کی نظم اور فرحت [illegible] کی رباعیات دی ہین، نثر مین پرنسپل عبدالشکور صاحب اور پروفیسر اویس احمد صاحب ادیب کے مضامین کے نمونے دیئے ہین لیکن [illegible] ہین کہ ان پر مضمون کا اطلاق بھی مشکل ہی، اس مجموعہ کو نام سے بھی کوئی مناسبت نہین معلوم ہوتی اور نام دیکھ کر خیال ہوتا ہو کہ شاید مسئلہ ارتقاء پر بحث ہوگی،

تاریخِ سندھ

مؤلفہ مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی سینوی سابق رفیق دار المصنفین اعظم گڈھ

ہندوستان مین مسلمانون کا پہلا قافلہ سندھ مین اترا تھا، اور اُن کی پہلی حکومت یہین قائم ہوئی تھی اور وہ ایک ہزار سال سے اوپر یہان حکمران رہے، آج بھی سندھ کے درو دیوار سے اُن کے آثار نمایان ہین، لیکن اس کے باوجود اُردو مین اسلامی سندھ کی کوئی مفصّل و محققانہ تاریخ موجود نہین تھی، دار المصنفین نے تاریخ ہندوستان کے سلسلہ مین یہ جامع و محققانہ تاریخ مرتب کرائی ہے، اس مین سندھ کا جغرافیہ، مسلمانون کے حملہ سے پیشتر کے مختصر اور اسلامی فتوحات کے مفصل حالات، خلافتِ راشدہ کے زمانہ سے لے کر آٹھوین صدی ہجری تک سندھ جن جن حکومتون کے ماتحت رہا، اُن کی پوری تاریخ اور ان تمام دورون کے نظامِ حکومت، علمی و تمدنی حالات اور رفاہ عام کے جو جو کام انجام پائے، ان سب کی پوری تفصیل ہے، مسلمان اس قدیم اسلامی خطہ کی تاریخ فراموش کر چکے تھے، اب پھر اس کو یاد کرنے کی ضرورت ہے، یہ کتاب ایسے وقت مین شائع ہو رہی ہے، جب کہ سندھ کی تاریخ کا ایک نیا باب کھل رہا ہے، اور وہان ایک نئی حکومت کی بنیادین استوار ہو رہی ہین،

ضخامت [illegible] صفحے قیمت: چھ روپیے،

"منیجر"

دارالمصنفین کی دینی علمی و ادبی مین کتا

اقبالِ کامل

ڈاکٹر اقبال کے فلسفہ و شاعری پر اگرچہ بکثرت مضامین، رسالے اور کتابین لکھی گئین لیکن ان سے اُن کی بلند پایہ شخصیت واضح اور مکمل طور پر نمایان نہ ہو سکی، یہ کتاب اس کمی کو پورا کرنے کے لئے لکھی گئی ہے، اس مین اُن کے مفصّل سوانح حیات کے علاوہ اُن کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارنامون کے اہم پہلوون کی تفصیل کی گئی ہے، اور سوانح حیات کے بعد پہلے اُن کی اردو شاعری پھر فارسی شاعری پر ان کے بہترین اشعار کے انتخاب کے ساتھ مفصّل تبصرہ کیا گیا ہے، اور اُن کے کلام کی تمام ادبی خوبیان دکھلائی گئی ہین، پھر اُن کی شاعری کے اہم موضوعون یعنی فلسفۂ خودی، فلسفۂ بیخودی، نظریۂ ملیت تعلیم، سیاست، صنفِ لطیف (یعنی عورت) فنونِ لطیفہ اور نظام اخلاق وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے، مرتبہ مولانا عبدالسلام ندوی، ضخامت ۰۰ ہ صفحے، قیمت: ؎

بزمِ تیموریہ

بابر ایک بے مثل اہلِ قلم تھا، ہمایون نے شعرو شاعری کے علاوہ ہیئت و نجوم کی بھی انجمن آرائی کی، اکبر کا عہد علوم و فنون کی روشنی سے جگمگا اُٹھا، جہانگیر نے ادب و انشا کو چمکایا، شاہجہان نے شعراء اور فضلاء کو سیم و زر مین تلوایا، عالمگیر نے معارف پروری اور انشاپردازی کے اعلیٰ نمونے پیش کئے، تیموری دور کے آخری بادشاہون نے بھی اپنے اسلاف کی روایات کو قائم رکھنے کی کوشش کی، بہادر شاہ ظفر نے عروسِ سخن کے گیسو سنوارے، تیموری شہزادون اور شہزادیون نے بھی علم و ادب کی محفلین سجائین، دربار کے امراء، شعراء اور فضلاء نے شاہانہ سرپرستی مین گوناگون کمالات دکھائے، ان سب کی تفصیل مذکورۂ بالا کتاب مین ملاحظہ فرمائیے، مرتبہ سید صباح الدین [illegible] قیمت: معہ

"منیجر" (پرنٹر و پبلشر صدیق احمد) "منیجر"

رجسٹرڈ نمبر ا ۱۸۱ء   مارچ ۱۹۴۹ء

معارف

مجلس دار المصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت: چھ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

سلسلۂ تاریخ اسلام

دار المصنفین کے سلسلۂ تاریخ اسلام کو بڑا حسن قبول حاصل ہوا، علمی و تعلیمی اداروں نے خصوصیت سے اس کی قدر دانی کی بعض یونیورسٹیوں نے اس کو اسلامی تاریخ کے نصاب میں داخل کر لیا، اس لئے چند برسوں کے اندر تقریباً اس کے سب حصے ختم ہو گئے جن کے دوسرے اڈیشن مزید اصلاح و ترمیم اور اضافوں کے ساتھ چھپ کر تیار ہو گئے ہیں اور بعض زیر طباعت ہیں، اب یہ سلسلہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہو گیا ہے،

تاریخ اسلام حصۂ اول

(عہد رسالت و خلافت راشدہ)

یعنی آغاز اسلام سے لے کر خلافت راشدہ کے اختتام تک اسلام کی مذہبی، سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ، ضخامت ۵۹۵ صفحے، قیمت: سے ر

تاریخ اسلام حصۂ دوم

(بنو امیہ)

یعنی اموی سلطنت کی صد سالہ سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ کی تفصیل،

ضخامت ۴۶۳ صفحے،

قیمت سے ر

تاریخ اسلام حصۂ سوم

(بنی عباس اول)

یعنی ابو العباس سفاح ۱۳۲ھ/۷۵۰ء سے ابو اسحاق متقی اللہ ۳۳۳ھ/۹۴۴ء تک دو صدیوں کی سیاسی تاریخ، (زیر طبع)

تاریخ اسلام جلد چہارم

(بنی عباس دوم)

یعنی مستکفی باللہ کے عہد سے آخری خلیفہ مستعصم باللہ تک خلافت عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی سیاسی تاریخ، ضخامت:- ۴۳۲ صفحے

قیمت:- صہ ر

"منیجر"

جلد ۶۳ ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۸ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۴۹ء عدد ۳

مضامین

مقالات

باب المراسلة والمناظرہ

ادبیات

اُردو اور ہندی کے مسئلہ مین ہم بارہا اپنے خیالات ظاہر کر چکے ہین، آج اس سلسلہ مین اُردو کے حامیون سے کچھ کہنا ہے، اُن کو اردو کے ساتھ حکومت کے طرزِ عمل کی شکایت بالکل بجا ہے لیکن اگر ان سے سوال کیا جائے کہ خود ان کا طرزِ عمل اُردو کے ساتھ کیا رہا ہے، اور انھون نے اس کی کیا خدمت کی تو ان کے پاس اس کا کوئی معقول جواب نہین ہے، ہمارے ایک طبقہ کی اُردو سے بے تعلقی کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے بچون کی اُردو کی تعلیم کی جانب بھی توجہ نہین کرتا، اونچے تعلیم یافتہ گھرانون مین تو بسم اللہ ہی انگریزی سے کرائی جاتی ہے، تقریر و تحریر خط و کتابت اور گھر سے باہر اکثر و بیشتر گفتگو بھی انگریزی یا ایسی زبان مین ہوتی ہے جس مین پچاس فیصدی سے زیادہ الفاظ انگریزی کے ہوتے ہین، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُردو محض مادری زبان کی حیثیت سے تو بولنا آجاتی ہے، لیکن بہت سے تعلیم یافتہ اشخاص صاف اور سلیس اُردو نہین لکھ سکتے، اُن کو خط لکھنے مین دشواری ہوتی ہے، اور املا تک مین غلطیان کرتے ہین، اس کا مشاہدہ مغرب زدہ گھرانون مین کیا جا سکتا ہے، اور یہ پرانی داستان نہین ہے، بلکہ آج بھی یہی ہو رہا ہے،

یہ طبقہ اُردو کے اخبارات، رسالون اور کتابون کا مطالعہ کسرِ شان سمجھتا ہے، اور یہ عذر کیا جاتا ہے کہ ان کا معیار پست ہے، اخبارون اور رسالون کی حد تک تو یہ خیال صحیح ہے مگر اس مین بھی قصور کس کا ہے، ترقی اسی چیز مین ہوگی جس کی مانگ ہوگی، ہماری قدر دانی کا یہ حال ہے کہ اچھے سے اچھے اُردو اخبارات کی اشاعت دو چار ہزار سے زیادہ نہین ہے، رسالون کی اشاعت تو اس سے بھی کم ہے، ان کی آمدنی سے ان کے اخراجات بمشکل پورے ہوتے ہین، ایسی حالت مین ان کی ترقی کی کیا صورت ہے، اگر آج ان کی مانگ اور اشاعت بڑھ جائے تو اُن کا معیار بھی اونچا ہو جائے گا، لیکن اُردو کی کتابون کی نسبت معیار کی پستی کا خیال صحیح نہین، گو ان کا معیار ترقی یافتہ زبانون کی تصانیف کے برابر نہین ہے، لیکن اب اُردو مین ضروری اور لائقِ مطالعہ فنون کی کتابون کا اچھا خاصہ ذخیرہ فراہم ہو گیا ہے اور سنجیدہ لٹریچر مین ہندوستان کی کوئی زبان اُردو کا مقابلہ نہین کر سکتی، تاہم ابھی اس کو ترقی دینے کی ضرورت باقی ہے لیکن اخبارات اور رسالون کی طرح اس کا بھی حال ہے ایک طبقہ کو ذوق تو ہے مگر ادنیٰ درجہ کے لٹریچر کا، سنجیدہ علمی ذوق نہایت محدود طبقہ مین ہے، ایسی حالت مین بلند پایہ کتابین کس کے لئے لکھی جائین،

اردو کے اصحاب علم و قلم کی کمی نہیں ہے لیکن ان کے پاس سرمایہ نہیں ہے، وہی تصنیف کی دماغ سوزی اور جانکاہی بھی برداشت کریں، طبع و اشاعت کے مصارف کا بار بھی اٹھائیں، اس پر بھی خریدار نہیں ملتے اور کتابوں کے ایک اڈیشن ختم ہونے میں ایک عمر لگ جاتی ہے، ایسی حالت میں کسی صاحب قلم کا کیا حوصلہ ہو سکتا ہے، اگر اردو کتابوں کے مطالعہ اور اُن کی خریداری کا ذوق بڑھ جائے تو چند دنوں میں ان کی کمیت اور کیفیت دونوں میں نمایاں ترقی ہو جائے گی۔

آجکل اخبارات کو قوموں کے بنانے اور بگاڑنے میں بڑا دخل ہے اور اُن کی ذہنی علمی اور دماغی روشنی کے لئے صالح اور مفید لٹریچر بڑی ضروری چیز ہے، چنانچہ ترقی یافتہ ملکوں میں ان کی طرف بڑی توجہ کی جاتی ہے، ہم کو اس کا احساس تو ہے لیکن اس کے مطابق عمل نہیں، ہم اپنے فائدہ اور صنعتی ترقی کے لئے ذاتی اور مشترکہ سرمایہ سے بڑے بڑے کارخانے اور فرم کھولتے ہیں، لیکن قوم کی ذہنی و دماغی تربیت و ترقی کے لئے اعلیٰ درجہ کے اخبارات نہیں نکالتے اور بلند تالیف و تصنیف کے علمی ادارے قائم نہیں کرتے جو صنعتی کارخانوں سے زیادہ ضروری ہیں، اور ملک میں اس قسم کے جو ادارے قائم بھی ہیں اُن کی جانب پوری توجہ نہیں کرتے، حالانکہ تجارتی نقطۂ نظر سے بھی ان میں سرمایہ لگانا مفید ہے،

اس تحریر کا مقصد یہ ہے کہ اُردو محض زبانی شور و غل سے زندہ نہیں رہ سکتی اور نہ حکومت کی مخالفت سے ختم ہو سکتی ہے، اس کی بقا و ترقی اس کے حامیوں کی کوشش پر منحصر ہے، وہ کروڑوں ہندو مسلمانوں کی زبان ہے، جو سیاسی بازیگر پلیٹ فارم پر اس کی مخالفت کرتے ہیں وہ بھی روزانہ کی گفتگو میں اردو ہی بولتے ہیں اگر اردو کے حامی اس کو ترقی دینے کا تہیہ کر لیں اور اس کی عملی تدبیریں اختیار کریں تو کوئی طاقت اس کو دبا نہیں سکتی، زبانیں حکومت کے سہارے زندہ نہیں رہتیں، ترقی یافتہ ملکوں میں بڑے بڑے اخبارات رسالے اور علمی و تصنیفی ادارے حکومت نہیں بلکہ قوم چلاتی ہے، خود ہندوستان میں ہندی اخبارات، رسالوں اور کتابوں کی اشاعت میں حکومت کی مدد کو اب تک کوئی دخل نہیں رہا ہے، اس کے باوجود بہت سے ہندی اخباروں اور رسالوں کی اشاعت دس ہزار سے لے کر پچیس تیس ہزار تک ہے، بنگالی زبان کے ایک پرانے مشہور اخبار انند بازار پتر کا کی اشاعت جو صرف ایک صوبہ کی زبان ہے، پچاس ہزار تھی، یہی حال ہندی کتابوں کی کثرت اشاعت کا ہے، ایسی حالت میں اردو اخباروں، رسالوں اور کتابوں کی اشاعت جس کے بولنے اور سمجھنے والے سب سے زیادہ ہیں، کیوں نہیں بڑھ سکتی، اس کا سبب صرف ہماری بے توجہی ہے، اُردو

مین آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی قدرتی صلاحیت ہے، اگر اس کی جانب تھوڑی سی توجہ بھی کی جائے تو ہندوستان کی کوئی زبان اس کا مقابلہ نہین کر سکتی، ورنہ اردو سے محبت کا محض زبانی دعویٰ زیب نہین دیتا، اور نہ اس سے کچھ حاصل ہوگا، آیندہ کسی موقع پر ہم اس موضوع پر تفصیلی خیالات پیش کرین گے،

افسوس ہے کہ ہماری قومی عمارت کا ایک اور ستون گر گیا، اور ۲ مارچ کو مسز سروجنی نائیڈو ہم سے رخصت ہوگئین، وہ عورت تھین مگر اپنے اوصاف اور خصوصیات مین بہتیرے مردون سے بڑھ کر تھین، وہ انگریزی زبان کی نازک خیال شاعرہ، سحر طراز خطیبہ، سیاسیات کی ماہر، جنگ آزادی کی سرفروش سپاہی اور ہندو مسلم اتحاد کا عملی نمونہ تھین، انھون نے آزادی کی جنگ مین مردون کے دوش بدوش قید و بند کی مصیبتین جھیلین، وہ فرقہ وارانہ جذبات سے بلند اور متحمل تھین، ان کا دل بڑا وسیع تھا، اس مین مسلمانون کے لئے بھی جگہ تھی، مسلمانون کے ساتھ ہمیشہ ان کے دوستانہ تعلقات رہے، اور اس فرقہ وارانہ دور مین بھی ان کے خیالات اور طرز عمل مین کوئی تبدیلی نہین ہوئی تھی، ہندو مسلمانون کے بعض اختلافی مسائل مین ان کے ذاتی خیالات حکومت کی پالیسی سے مختلف تھے، جن کو وہ صاف طریقہ سے ظاہر نہ کر سکتی تھین، لیکن ان کی جھلک ان کی تقریرون مین نظر آجاتی تھی، وہ مغربی تعلیم یافتہ تھین، ان کی ساری زندگی سیاسی میدان مین گذری، اس کے باوجود ان مین نسوانی اور مشرقی خصوصیات موجود تھین، دل مین نسوانی مہر و محبت، طبیعت مین خلق و مروت، مزاج مین شگفتگی و خوش اخلاقی اور تہذیب و معاشرت مین مغربی آب و رنگ کے ساتھ مشرقی روح جھلکتی تھی، وہ اپنے طرز عمل سے ہندو مسلمان دونون مین مقبول تھین اور دونون کا اعتماد ان کو حاصل تھا، اس لئے ان کی موت دونون کا قومی حادثہ ہے، ہوا کا رخ دیکھتے ہوئے اب ایسی شخصیتون کا پیدا ہونا بظاہر مشکل معلوم ہوتا ہے،

دوسرا بڑا حادثہ مسٹر سید حسین کی وفات ہے، مرحوم ہندوستان کی تحریک آزادی کے دور اول کی یادگار، انگریزی زبان کے بہترین خطیب و انشاپرداز اور نامور صحافی تھے، عرصہ تک الٰہ آباد کے مشہور پرانے اخبار انڈیپنڈنٹ کے اڈیٹر رہے، پھر وفد خلافت مین لندن گئے اور غالبًا وہین سے امریکہ چلے گئے اور پچیس تیس سال تک وہان اپنے قلم و زبان سے ہندوستان کی خدمت کرتے رہے اور امریکہ کے سیاسی اور صحافتی حلقون مین بڑا نام پیدا کیا، ہندوستان کی آزادی کے بعد وطن واپس آئے اور نومبر ۱۹۴۸ء مین حکومت ہند کی جانب سے مصر کے سفیر بنا کر بھیجے گئے، اور وہین گذشتہ فروری مین انتقال کیا، آیندہ مسلمانون مین ایسے صاحب کمال مشکل سے پیدا ہون گے، اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے، ان کی وفات پر ہندوستان کے اکابر کی خاموشی حیرت انگیز ہے۔

مقالات

اردو زبان کی بناوٹ مین افغانون کا حصّہ

از

جناب مولانا امتیاز علی خان صاحب عرشی

نئے افغانی مورخون کا نظریہ یہ ہو کہ پرانے نوشتون کے مطابق افغانستان ارین نسل کا پرانا گھر ہے، اس ملک کو عہدِ قدیم مین آریانا "یعنی ارینون کا گہوارہ کہا جاتا تھا، اور یہین سے چل بڑھ کر یہ نسل مشرق و مغرب مین پہیلی ہے،

یہ خیال تاریخی معیار پر پورا اُترتا ہے یا نہین، اس سے سروست سروکار نہین، تاہم یہ سب کی مانی ہوئی بات ہے کہ آریا نسل کی ہندوستان مین آمد اسی راستے سے ہوتی رہی ہے، بنابرین یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ آریائی ہندوستان کا افغانستان سے رشتہ خود ہندوستان کے مقابلے مین بھی زیادہ پُرانا ہے،

افغانستان نے اپنے ان آریائی جگر گوشون کو پردیسی نیچ کران کی طرف سے کبھی غفلت نہین برتی، ہندوستان کو تاتاری اور ایرانی غارتگرون کی لوٹ کھسوٹ سے بچانے مین یہ چھوٹا سا ملک ہمیشہ سینہ سپر رہا ہے، اور جب تک اپنے خون کو پانی کی طرح نہین بہا دیا، بڑے سے بڑے بادشاہ کو بھی ادھر جھکنے نہ دیا،

لیکن ہندوستان کی اس پیہم امداد کا اُسے ہمیشہ یہ خمیازہ بھگتنا پڑا کہ کبھی ہندوستانی راجاؤن نے اُسے اپنے ملک کی بیرونی چوکی بنایا، اور جب اس پار کے بادشاہون کو موقع مل گیا، تو انھون نے ہندوستان

کے اندر بڑھنے کے لئے اس سے محفوظ و مستحکم چھاؤنی کا کام کیا،

یہ سیاسی اُدھیڑبُن ہزاروں برس تک جاری رہی تھی، اس لئے ماقبلِ اسلام تک ہندوستان اور مشرقی افغانستان میں بہت گہرا مذہبی، معاشرتی اور لسانی رابطہ قائم رہا، بُدھ مت کا تو زبردست قلعہ ہی یہ سرزمین تھی، یہین سے اس مذہب نے باہر قدم نکالا تھا، اگر افغانستان اس کا مددگار نہ ہوتا، تو ہندی برہمن کبھی کا اسے دفن کرچکے تھے،

اسلامی عہد میں بھی افغانیوں نے ہندوستان کو فراموش نہین کیا، اور جس عقیدے کو دُنیا کے لئے باعثِ نجات سمجھتے تھے، اُسے لے کر یہان آنا شروع ہوگئے، مگر اب انھین اسلامی اصول کی پرشوکت سادگی اور قوت نے ہندوستانیون پر بالادستی عطا کردی تھی جس کے باعث وہ قوتِ موثرہ کی حیثیت رکھتے تھے، اور ہندوستان اُن سے نیا مذہب، نئی تہذیب، نئے علوم اور نئی زبانین سیکھنے پر مجبور تھا،

افغانیون کی یہ نئی آمد سلطان محمود غزنوی کے والد سبکتگین کے عہدِ حکومت سے شروع ہوتی ہے، محمود کے زمانہ مین افغانون کا اثر تیزی کے ساتھ پیہم بڑھتا رہا، اور آخر کار اس خاندان نے ہندوستان کے شمال مغربی حصہ کو اپنے ممالکِ محروسہ مین شامل ہونے پر مجبور کر دیا، حاکم سات سمندر پار بیٹھکر بھی محکومون پر اپنا اثر ڈالتا رہتا ہے، لیکن دو آخری غزنوی بادشاہون نے ایرانی دباؤ سے غزنی چھوڑ کر لاہور کو مرکز بنایا، تو پنجاب میں افغانی اثر زیادہ نمایان ہوگیا،

چھٹی صدی ہجری (بارہوین صدی عیسوی) کے آخر مین غوریون نے غزنوی سلطنت پر قبضہ کیا، تو ہندوستان اور افغانستان کے رشتے مین اور استواری پیدا ہوگئی، سلطان شہاب الدین غوری نے دہلی پر قبضہ کرکے قطب الدین ایبک کو اپنا نائب السلطنت مقرر کیا،

ایبک اور اس کے جانشینون نے رفتہ رفتہ ہندوستان کے طول و عرض مین اپنی حکومت کا پرچم لہرادیا، اور دکن، مالوہ، خاندیس، گجرات، اودھ، بہار اور بنگال تک افغانی پھیل گئے،

نوین صدی ہجری (۱۵ وین عیسوی) کے وسط مین سلطان بہلول لودھی نے تخت ہندوستان پر قبضہ کیا، تو افغانیون نے اپنے مضمحل قواے سیاسی مین نئی روح پھونک لی، ملکی استحکام سے فارغ ہوکر اس خاندان نے خالص ہندیون سے مزید ارتباط اور مفاہمت سے نئی سبیل نکالی، سلطان سکندر لودھی نے جو اپنے خاندان ہی مین نہین، ہندوستان کے تمام مسلمان سلاطین مین جاہ وجلال اور عدل وداد کے لحاظ سے ممتاز درجہ رکھتا تھا، ہندوؤن کو فارسی زبان حاصل کرنے کی ترغیب دی، اور اس طرح ہزارون ہندو ملکی کاروبار مین برابر کے شریک کی حیثیت سے کام کرنے لگے،

اس خاندان کے آخری بادشاہ، سلطان ابراہیم لودھی سے تیموری مغل بابر نے تاج وتخت چھین کر سلطنتِ مغلیہ کی بنیاد رکھی، تو ہندوستان مین افغانیون کا اتنا زبردست عنصر موجود تھا کہ بابر کے جانشین ہمایون کو اُن کے سامنے ٹھہرنا محال ہوگیا، اور شیر شاہ سوری کی سرکردگی مین پھر افغانی حاکم بن بیٹھے،

شیر شاہ کے بعد ہمایون نے ایرانیون کی مدد سے دوبارہ ہندوستان پر قبضہ کرلیا، مگر انتہائی جابرانہ پالیسی کے باوجود اکبر جیسا مغل بادشاہ نہ صرف یہ کہ افغانون کے اثر سے ملک کو پاک وصاف نہ کرسکا بلکہ مجبور ہوا کہ اسی آئین اور اُنھی اصول وضوابط کے تحت حکومت کی مشین چلائے، جو پچھلے افغان بادشاہ اپنی خداداد عقل اور مدبرانہ تجربے سے مقرر کرچکے تھے، چنانچہ اکبر کا پٹھانون کے اثر کو توڑنے کے لئے راجپوتون سے رشتہ جوڑنا، سلطان سکندر لودھی کی اس پالیسی کی نقل تھی جس نے ہندوستان کے کایتھون کو یکسر اور برہمنون اور راجپوتون کو ایک حد تک اسلامی حکومت کا ہوا خواہ بنا دیا تھا، اور شیر شاہ کی نقالی تو اس حد تک کی گئی تھی کہ ملک داری کے وہ تمام آئین جو ابوالفضل نے آئینِ اکبری مین ظل اللہ کی ذات سے منسوب کئے ہین، محققین تاریخ کے نزدیک سراسر شیر شاہی فہم ودانش کا نتیجہ ہین، چنانچہ راجہ ٹوڈرمل جو دربارِ اکبری کے ایک بیش قیمت رتن ہین، شیر شاہ کی کسی دفتر کے معمولی متصدی تھے،

یون تو مغل سلطنت کے روشن عہد مین بھی افغانیون نے کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو یکسر فنا ہونے سے بچائے ہی رکھا، لیکن عالمگیر کے بعد مغلیہ سلطنت مین زوال کے آثار پیدا ہونے شروع ہوئے، تو انھون نے پھر اپنا رسوخ ملک کے اندرونی حصّون مین بڑھانا شروع کر دیا، لاکھون افغان ترک وطن کر کے ہندوستان مین آ داخل ہوئے، اور ابتداءً یہان کے ہندو مسلمان امراء کے نوکر بن کر اور آخر مین جگہ جگہ اپنی ریاستین قائم کر کے بیٹھ گئے، یہ ہجرت اتنی زبردست تھی کہ بقول کرنل راورٹی بعض افغانی قبیلے خود افغانستان مین باقی نہ رہے، اُن کا نام صرف ہندوستانی اخلاف کی بدولت زندہ ہے، [1]

ان نو واردا افغانون کا بڑا مرکز گنگا اور جمنا کا درمیانی علاقہ تھا، جو تاریخ مین دوآبہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے یہین سے ان بہادرون نے مرہٹون سکھون مغلون، اودھیون اور انگریزون کا مقابلہ شروع کیا، اور جون جون موقع ملتا گیا، مختلف سردار چھوٹی بڑی ریاستین قائم کرتے گئے، نجیب آباد، فرخ آباد اور آنولا اس عہد کی بھولی بسری داستان کے روشن نام ہین،

یہ تازہ افغانی عنصر عرصۂ دراز تک آس پاس کی اُبھرتی قوتون کے پاؤن کا کانٹا بنا رہا، اور جب تک اس مین سکت باقی تھی، کسی کو بھی من مانی کاروائی کرنے کی اجازت نہ دی لیکن بتیس دانتون مین گھری ہوئی ایک زبان کیا اور کب تک کچھ کر سکتی تھی، انگریزون نے یہ یقین کر رکھا تھا کہ ان کی راہ ترقی مین بھی مردانہ کار سب سے زیادہ خطرناک روک ہین، انھون نے دوسرون سے سازشین کر کر کے آخر ان پر قابو پا لیا، اور یہ ترقی پسند اور صالح عنصر ختم ہو گیا، مگر خود دانا دل اور دیدہ ور انگریز مدبر بھی ان کی قوت کے تباہ ہونے پر آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکے، بھوپال ٹونک، جاورہ اور ریاست عالیہ رامپور جیسی دو چار ریاستین جو آج ہندوستانی نقشے مین نظر آتی ہین، انہی افغانون کی سخت جانی کے چند نشان سمجھنا چاہئے،

افغانی تاجر | تاریخ کے مختلف دورون مین ہندوستان کے اندر افغانیون کے سیاسی مدوجزر کی مذکورۂ بالا داستان کے ساتھ ان کے تجارتی قافلون کی مسلسل آمد و رفت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے،

[1] پشتو انگریزی ڈکشنری دیباچہ

یہ جفاکش اور منچلے شتربان ہندوستان اور ایران کی تجارتی شہ رگ پر ہمیشہ سے قابض ہیں، چنانچہ ایران، تاتار، چین اور روس کا سامان تجارت لے کر یہی لوگ ہندوستان آتے رہے ہیں، بحری راستہ کھلنے سے پہلے ہندوستان کی یورپ سے تجارت بھی اسی قوم اور ملک کے ذریعہ سے ہوتی تھی، اور اگر ایرانی تاجر بھی آتے تھے، تو اُن کی پُر جرأت رہنمائی اور راہ دان بدرقے ہی کے بل بوتے پر اُن کا سفر بخیر و خوبی انجام پاتا تھا،

یہ افغانی تاجر اپنا سامان لے کر ملک کے ایک ایک گوشہ میں پہنچتے، اور مہینوں برسوں کی گشت اور رہن سہن کے بعد اپنے وطن کو واپس جاتے تھے، ان میں سے سیکڑوں مرکزی آبادیوں میں دکانیں کھول کر رہ بس بھی گئے تھے، اور دیسی اور پردیسی سوداگروں کے درمیان آڑھتی اور ایجنٹ کی خدمات انجام دیتے تھے،

افغانی درویش اور عالم | غزنوی عہد ہی سے افغانی اہل اللہ اور اہلِ علم نے بھی اس سرزمین کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے مشرف کرنا شروع کیا تھا، جیسے جیسے اسلامی حکومت کا دائرہ وسیع ہوتا گیا، ان علوم ظاہر و باطن کے معلموں نے بھی اپنی خانقاہیں اور دارالعلوم جابجا قائم کرنا شروع کر دیئے، چنانچہ آخر میں لاہور سے بنگال اور کشمیر سے دکن تک اُن کا جال پھیلتا چلا گیا تھا، ان حضرات میں سے شاید کوئی ایک بھی یہاں سے واپس اپنے وطن نہیں گیا، رحلت کے بعد بھی اسی جنت نشان خطے کو اپنی آسودگاہ بنایا،

ان افغانی درویشوں کا ہمارے ملک پر کتنا اثر پڑا، اس کا اندازہ کرنے کے لئے ہزاروں کی فہرست میں سے صرف حضرت خواجہ معین الدین چشتی، قطب الدین بختیار کاکی اور حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہم کے نام نامی زبان پر لانا کافی ہوگا، جن کے سلسلے ملک کے گوشے گوشے کو اپنی روشنی سے منور کئے ہوئے ہیں،

ان بزرگون کے حلقۂ اثر مین سلاطین، امرائے دربار اور عوام سب داخل تھے، جن مین ہندو بھی مسلمانون کے قدم بقدم نظر آتے تھے، یہ جب ہنوز دلّی دور است اپنی زبان سے کہدیتے تو دلّی دور ہی رہ جاتی تھی، اُن کے روحانی اثر ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ ہندو تصوّف مین بھی نئے نئے خاندان اور اسکول پیدا ہوگئے، اور صدیون کے جمود کے بعد یہان کے مذہبی اور روحانی فلسفے مین اسلامی قانون اور توحیدی عقیدے کی جھلک نظر آنے لگی تھی،

علمار کا دائرۂ عمل درویشون سے بھی زیادہ وسیع تھا، اسی بنا پر ان کا اثر بھی ہر کس وناکس پر زیادہ پڑا، اُس زمانہ مین علوم وفنون کی تحصیل کے لئے عربی اور حکومتی کاروبار کی خاطر فارسی زبان کا پڑھنا ضروری تھا، قاعدۂ بغدادی سے علومِ قرآن تک اور آمد نامہ سے سنائی، نظامی اور فردوسی کے کلام تک جملہ تعلیم کے یہی اہلِ علم کارپرداز تھے، اس کا ایک اہم ثبوت یہ ہو کہ جب سے ایرانی ہندوستان مین آنا شروع ہوئے ہین، یہان کی فارسی پر طنز کرتے رہے ہین، یہی نہین کہ ہندی لہجہ اُن کے لہجے سے جدا ہے، بلکہ ہندوستانی فارسی اُن کی نظر مین ایرانی محاورے کے بھی مطابق نہین ہوتی، اب آپ افغانستان کے اُس علاقے کے جہان فارسی بولی جاتی ہے، کسی شخص سے ملین اور بات چیت کرین تو بمشکل ہی لسانی مغایرت کا احساس کر سکین گے، یہ اس کا واضح ثبوت ہو، کہ ہندوستانیون نے فارسی زبان شروع مین ایرانیون سے نہین سیکھی، افغانیون سے حاصل کی ہو ورنہ لہجے اور محاورے دونون مین معاملہ برعکس ہوتا،

چونکہ یہ لہجہ ہمارے سامعہ مین رچ گیا ہے، اس لئے ہمیں بیحد عزیز ہے، اتنا عزیز کہ غالب جیسے ایران دوست نے بھی ایک شاگرد کو لہجۂ ایران کے تتبع سے روکا ہے، اور صرف محاورون کے استعمال کی اجازت دی ہے،

ہمایون کے وقت سے مغل دربار مین ایرانیون کا رسوخ بڑھا، اور دربار مین اُن کی قدر ومنزلت

اور افغانیت کی کس مپرسی سے ہندوستانیوں میں احساس کمتری پیدا ہوا، لیکن خالص ہندی عنصر
کی فارسی معدودے چند کے سوا ایرانی نہ بن سکی، اور پورے مغل عہد کے بہت سے جدت پسند ادیبوں شاعروں
ناشروں اور لغت نویسوں کی بار بار کی روک ٹوک کے باوجود ایرانیوں کی نظر میں لہجۂ ہندی اور سبک ہندی
جیسی اصطلاحیں آج بھی ہندوستانیوں کی فارسی نظم و نثر کے لئے استعمال کی جاتی ہیں، چنانچہ علامہ اقبال
مرحوم بھی فارسی میں اتنا کچھ لکھتے ہوئے سبک ہندی وارد کے الزام سے بری نہیں ہیں،

افغانی طلبہ | افغانستان کے طالبان علم بھی ہمیشہ سے ہندی مدرسوں میں علوم و فنون کی تحصیل کے لئے
آتے رہے ہیں، پہلے بدھ مت وغیرہ کی تعلیم کی خاطر آتے تھے، اسلامی دور میں علوم عربیہ سیکھنے آنے لگے اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے؛
پہلے اُن کے ہندوستان آنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ یہاں کے سلاطین کی قدردانی نے تمام دوسرے
اسلامی ملکوں سے زیادہ عالموں اور طلبہ کے لئے سہولتیں مہیا کر دی تھیں، صفوی عہد سے سنی شیعہ عصبیت
بھی کام کرنے لگی تھی، اور افغانیوں کے لئے عموماً جو کٹر سُنی ہوتے ہیں، وہاں کوئی گنجائش باقی نہ تھی، اس
کے برخلاف ہندوستان میں مغلوں کے عہد میں بھی کم از کم یہ بنیادی مغایرت کہیں پیدا نہیں ہوئی،
ان طلبہ کی جماعتیں بھی ملک کے ایک ایک کونے میں جاتیں اور نور علم سے اپنے دل و دماغ کو روشن
کرتی تھیں، فارغ ہو کر جو افراد یہاں معاشی سہولتیں مہیا کر لیتے وہ واپس جانے کا خیال دل سے نکال
ڈالتے، اور یہیں شادی بیاہ کر کے بس جاتے تھے، آج بھی ہر سال سیکڑوں افغانی ہندوستان میں پڑھنے
آتے ہیں، اور دہلی سہارنپور، دیوبند، رامپور، مرادآباد، بریلی، لکھنؤ وغیرہ میں برسوں رہ کر جاتے ہیں،
کچھ ایسے بے نیاز طبع بھی ہوتے ہیں، کہ یہاں کی موجودہ بے توجہی کی بھی پروا نہیں کرتے، اور رہ پڑتے ہیں

نتیجۂ بحث | ظاہر ہو کہ جو قوم ہندوستان میں اتنے مختلف بھیسوں کے اندر سیکڑوں ہزاروں برس سے
آ، جا، اور رہ رہی ہے، اُس کا یہاں کے تہذیب و تمدن، سیاست و معاشرت اور زبان و ادب پر
اثر انداز نہ ہونا کس طرح باور کیا جا سکتا ہے، روہیل کھنڈ افغانوں کا نسبتہً تازہ وطن ہے اور یہیں

اُن کی آبادی زیادہ ہے، آپ رامپور، مرادآباد، بریلی، شاہجہانپور، فرخ آباد وغیرہ مین سے کسی شہر مین چلے جائین، بڑی آسانی سے اور بہت جلد محسوس کر لین گے کہ وہان کے تمام باشندون کا رہن سہن، بول چال، رسم و رواج اور وضع قطع ملک کے دوسرے حصون سے کسی نہ کسی حد تک جدا ہے، اور عام طور پر لوگون مین افغانستانی سادگی، بیباکی، اور درشتی پائی جاتی ہے،

روہیل کھنڈ کی زبان | اب سے پہلے یہان کے روزمرہ مین بھی پشتو کے سیکڑون لفظ داخل تھے[1]، عام اردو زبان کی مسلسل تعلیم نے ان مقامی محاورون کو بڑی حد تک ختم کر دیا ہے، پھر بھی اس پورے علاقے مین بہت سے غیر مانوس لفظ آپ کے سننے مین آئین گے، یہ سب لفظ پشتو کے ہین، اور معمولی سے لفظی یا معنوی فرق کے ساتھ دن رات بولے جاتے ہین،

مثلاً پشتو کے کچھ لفظ پیش کرتا ہون، جو رامپور کے مردون اور عورتون کی زبان سے سُن کر مین نے جمع کئے ہین، ان مین کا بڑا حصہ بالیقین، روہیلکھنڈ کے دوسرے شہرون اور قصبون مین بھی بولا، اور سمجھا جاتا ہے،

۱۔ "آختہ" کے معنی پشتو مین مبتلا اور مصروف ہین، یعنی افغانی قبیلے "آختہ" بھی بولتے ہین، رامپور مین یہی شکل مروج ہے، کوئی شخص کسی پر فریفتہ یا کسی عادت بد یا تکلیف وہ کام مین گرفتار ہو، تو لوگ کہا کرتے ہین کہ "وہ اُس پر آختہ ہے، یا فلان بات مین آختہ ہے، یا مین اپنی مصیبت مین آختہ ہون"

---

[1] راورٹی نے الفنسٹن کی تصنیف "کابل" سے نقل کیا ہے، کہ روہیل کھنڈ اور ریاست رامپور کے علاقون مین بعض قصبے اور گانون ایسے بھی ہین، جہان پشتو زبان بولی جاتی، اور عام کاروبار کا ذریعہ ہے، ملاحظہ ہو پشتو انگریزی ڈکشنری، دیباچہ: ۵ صاحبزادہ عبد السلام خان بہادر مرحوم نے نسب افاغنہ (ص ۲، مطبوعہ مطبع سکندری ۱۹۱۳ء) مین ۴۴ لفظ پشتو کے لکھے ہین، جو اُن کے زمانہ مین رامپور کی زبان مین داخل تھے، اُن کا بیان ہے کہ یہ سرسری فہرست ہے تحقیق سے اور بہت سے الفاظ نکلین گے، میرے پیش کئے ہوئے الفاظ کے علاوہ اُن مین سے صرف چند لفظ داخل ہین،

۳۔ "اَرخ" پشتو میں پہلو کو کہتے ہیں جب افغانی اَرخ بہ اَرخ بولتے ہیں، تو اُن کی مراد "پہلو بہ پہلو" ہوتی ہے، رامپور میں "اَرخ لگنا" ایک محاورہ بن گیا ہے، جس کے معنی مراد برآنا" یا "پو بارے ہونا" لئے جاتے ہیں، اور مستورات عام طور پر اسے استعمال کرتی ہیں،

۴۔ اُتَس: پشتو میں قبیلے یا خاندان کو کہا جاتا ہے، یہ ترکی اولوس کا بگاڑ ہے، رامپور میں "اُلام" بھی منسوب ہو گیا ہے، اور عورتیں کوستے ہوئے کہا کرتی ہیں، "تیرا اُتَس سے پیالہ جدا ہو جائے" یعنی کوڑھی ہو جائے، لوگ تجھے اپنے ساتھ کھلانے پلانے سے پرہیز کریں، کسی کی بدنامی اور تشہیر کا تذکرہ کرتے ہوئے بھی کہتی ہیں، "ساری اُتَس ہا ہا بازہے" کبھی بولتی ہیں، "اُس سے اُتَس واقف ہے"،

۵۔ اَنگُوٹا، کھنگڑ: رو ہیلکھنڈ میں کاٹ کباڑ کو کہتے ہیں، یہ بھی پشتو کے لفظ ہیں، "انگڑ" افغانستان میں عمارت کو اور "کنگ خز" اس کوڑے کرکٹ کو کہتے ہیں، جو سیلاب میں بہ کر آتا، یا دریا کے کنارے پر جمع ہو جاتا ہے، رامپور وغیرہ کے لیجے نے اُسے کھنگڑ بنا کر ہندیوں کی زبان پر بھی چڑھا دیا ہے[1]،

۵۔ "اُوب" بواو مجہول رامپور میں عزت و آبرو کا مترادف ہے، لوگ کہتے ہیں "میں نے تمھارے خاندان میں اوب لگا دی، یا اُس میں ایسی کیا اوب لگی ہے جو آپے سے باہر ہے"،

"اُوبہ" پشتو میں فارسی آب اور اردو پانی کا مترادف ہے، آب سے آبرو وغیرہ مراد لینا عام بات ہے، اس اصول کے تحت "اُوبہ" کی ہائے ہوز گرا کر "اُوب" سے مجازی معنی مراد لئے جانے لگے،

۶۔ اُوُزبَلی بواو معروف و مجہول، پشتو میں بالوں کی اُن لٹوں کو کہتے ہیں، جو جوان عورتیں اپنی دونوں کنپٹیوں پر جماتی ہیں، یہ رادرٹی کا بیان ہے، نواب محبت خان بریلوی نے "ریاض المحبت"

---

[1] انگڑ کھنگڑ کو ہندی بھی کہا جا سکتا ہے، اس لئے کہ انگوٹ کے معنی بے گڑھا یا بے ڈول ہیں، اور کھنگڑ جلی اینٹ اور لوہے وغیرہ کے میل کچیل کو کہتے ہیں، لیکن عام اردو زبان میں اس مرکب کے عدم استعمال سے میں نے پشتو ہونے کا قیاس قائم کیا ہے،

مین لکھا ہے کہ "ادربل" مشاطہ کا دولھن کے سر کے بال گوندھنا کہلاتا ہے، بہرحال روہیل کھنڈ مین بھی یہ لفظ (بواو مجہول) بولا جاتا ہے،

پٹھانون مین دستور ہے کہ مانجھے (جسے رامپور مین مایون کہتے ہین) کے دن دولھن کی الٹی کنپٹی کی ایک لٹ مین کلاوہ گوندھ کر ماتھے پر سے سیدھی کنپٹی اور وہان سے کان پر لیجا کر پیچھے چوٹی مین باندھ دیتے ہین، نکاح کے بعد دولھا کو زنانے مین بلا کر اس سے کلاوہ کھلوایا جاتا ہے، اور اس رسم کو "ادربل کھولنا" کہتے ہین، روہیل کھنڈ مین اب یہ رسم مسلمانون مین عام ہے،

انشاء کے زمانہ مین "ادربل" دہلی مین بھی بولا جاتا تھا، اور اس سے "کس" مراد ہوتی تھی،[1] موجودہ لغت کی کتابون مین اس کا ذکر نہین ملتا،

۷۔ روہیل کھنڈ مین احمق نادان اور وحشی صفت انسان کو "ہُوش" بواو معروف کہتے ہین بعض مفکر اسے "وحوش" کا بگاڑ بتاتے ہین میری راے یہ ہے کہ پشتو کے "اُوش" نے یہ چولا بدلا ہے جس کے معنی اونٹ ہین، یہ جانور سیدھا سادا سا ہوتا ہے، اس صفت کو دیکھکر احمق اور نادان کے لئے استعارہ کر لیا گیا،

۸۔ "بچونگڑے": پشتو مین "بچوا" کا مترادف ہے، رامپور مین بھی ازراہ تحقیر و محبت (ہر دو) کسی کو "بچونگڑا" کہا جاتا ہے،

۹۔ "بربنڈ": پشتو مین ننگے کو کہتے ہین، رامپور اور دوسرے روہیلکھنڈی علاقون مین بیباک بے شرم کو بربنڈ کہا جاتا ہے،

۱۰۔ "بلا پیبہ" پشتو مین تیرا ناس جائے، کا ہم معنی ہے، رامپور مین "ہماری بلا سے" کی جگہ بولا جاتا ہے،

---

[1] دریائے لطافت: ۱۲۶، طبع مرشدآباد ۱۸۵۰ء

۱۱۔ "بُلند" کا پشتو تلفظ بکسرِ اوّل ہے، روہیل کھنڈ میں اب تک بے پڑھے لکھے "بُلند خان" اور
تر بُلند خان کو بِلند خان، اور اخر بِلند خان کہتے ہیں،

۱۲۔ گیہوں وغیرہ کی بال کو پشتو میں "مَنبَل" کہتے ہیں، رامپور میں صرف نرکل جیسے بڑے پودے
کی بال منبل کہلاتی ہے،

۱۳۔ "بلّا غُندہ" رامپور میں بیل کو کہتے ہیں، یہ بھی پشتو ہے، "بلا" تو غالباً وہی عام لفظ ہے، اور
"غُند" پشتو میں گول کا ہم معنی ہے، چونکہ یہ پھل سچ مچ بلا کا گولا ہے، اس لئے اہل رامپور نے بیل جیسے
ہلکے پھلکے لفظ کی جگہ "بلّا غندہ" ایسے بھاری بھرکم لفظ ہی کو برقرار رکھا ہے،

۱۴۔ رامپور میں جوان لڑکی کو "بُوتہ ہوگئی، جوان بوتہ ہے، بوتہ کا بوتہ ہے" وغیرہ جملوں سے
یاد کیا جاتا ہے، یہ بُوتہ" پشتو کے بُوتَے" سے بنا ہے، جس کے معنی اونٹ کا بچہ ہیں،

۱۵۔ "پاڑو" پشتو میں سانپ کا منتر جاننے والے کو کہا جاتا ہے، رامپور میں اپنی علمیت جتانے والے
سے طنزاً کہتے ہیں، "جی ہاں، آپ بڑے پاڑو ہیں"[1]،

۱۶۔ پَخ: فارسی زبان میں شاباش کا مترادف ہے، پشتو میں بلی کی وہ آواز "پخ" کہلاتی
ہے، جو حملے کے وقت پیدا ہوتی ہے، روہیل کھنڈ میں لوگ کہا کرتے ہیں: "میاں کس پخ میں پڑے ہو؟
یا تم نے اپنے پیچھے یہ کیا پخ لگالی ہے" اور اس پخ سے مصیبت یا جھگڑا مراد لیتے ہیں،

۱۷۔ پرزو، پیرزو، پرزدنہ، پیرزدنہ، یہ چاروں لفظ پشتو کے ہیں، پہلے دو کے معنی خواہش مند

---

[1] پاڑو کے بارے میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ اصل میں "پاڑھو" ہے، اور پڑھنا سے اس کا اشتقاق ہوا ہے،
مگر یہ بات میں نے اس لئے اختیار نہیں کی ہے، کہ اولاً تو لغاتِ اردو میں یہ لفظ ملتا نہیں، دوسرے
روہیل کھنڈ کے باہر میرے سننے میں نہیں آیا، اگر اور جگہ بھی عوام کی زبان میں پایا جاتا ہو تو مجھے اس کے
ہندی ماننے میں تامل نہ ہوگا،

مشتاق، موزوں اور مناسب اور آخوری کے اشتیاق اور موزونیت ہیں مستورات رامپور کی زبان پر "پیرزو" اور "پیرزونہ" جاری ہیں، اور ان سے محبت اور خیال مراد لیتی ہیں، کوئی تھوڑی سی چیز تحفے میں دے تو کہتا ہے کہ "تھوڑے بہت کا کیا دیکھنا ہے، ان کا ہم پر پیرزو تو ہوا" یا اندازِ شکایت کہتی ہیں، "وہ بہن ہم پر فلاں چیز کا پیرزونہ نہ ہوا"

۱۹۔ "پرکٹے" پشتو میں اُس لڑکے کو کہتے ہیں جس کا باپ مرچکا ہو، اور اس کی ماں نے دوسرے شخص سے نکاح کر لیا ہو، اب یہ لڑکا اپنی ماں کے اُس دوسرے شوہر کا پرکٹے ہوگا، اور لڑکی پرکٹی[1] کہلائیگی، اردو زبان میں اس رشتے کے اظہار کے لئے کوئی لفظ نہیں ہے، رامپور میں بھی یہی لفظ مستعمل ہیں، صرف "پرکٹے" کو "پرکٹا" بنا لیا ہے،

۲۰۔ پشتو میں "پردہ" کو "ڑدہ" بولتے ہیں، یہی لفظ رامپور میں بھی مروج تھا، مگر اب بالکل ہی اُٹھ گیا، بولتے ہیں، غالباً اس اصول کے تحت "مرد" کو "مرڈ" اور درد کو دڑد بھی کہا جاتا ہے، اب یہ بھی مرد اور درد بن چکے ہیں،

۲۱۔ افغانستان میں بلے کو پشے اور بلی کو پشی کہتے ہیں، کہتے ہیں، اور نر و مادہ دونوں کے لئے پشو مستعمل ہے، رامپور میں بلی پشو، اور پشی اور بلا پشوا کہلاتا ہے،

بلی کو بلانے کے لئے پشتو میں پش پش، اور بھگانے کے لئے پشے پشے، اور پشہ کی آوازیں نکالی جاتی ہیں، رامپور میں بھی یہی دھتکار مروج ہے، البتہ پکار کو "پش پش" بنا لیا ہے،

۲۱۔ "پکار" پشتو میں کارآمد کو کہتے ہیں، رامپوری مرد اور عورتوں سب میں یہ لفظ مروج ہے اور منفی جملوں میں استعمال ہوتا ہے، کہا جاتا ہے "فلاں چیز میرے کسی پکار کی نہیں" یا "یہ چیز ہے کس پکار

---

[1] اس لفظ میں ٹی کا تلفظ اس طرح کیا جائے گا، جیسے ہندی لفظ گٹی، گھڑا جی میں کیا جاتا ہے، پشتو زبان میں مونث اسماء کے آخر میں یہ ئی پائی جاتی ہے، جو علامات تانیث میں سے ایک علامت ہے،

کی، اسی طرح بیکار چیز کو "نا پکارہ" کہتے ہیں، یہ بھی پشتو ہے، مگر وہاں مونث تھا، یہاں علم ہے، دراصل یہ لفظ فارسی "بکار" کی افغانی شکل ہے، اس لئے افغانی اور رامپوری دونوں "نا بکار" کی جگہ "نا پکار" بولتے ہیں۔

۲۲۔ خوف اور تھکن سے سانس اکھڑ جائے، یا جی گھبرانے لگے تو رامپور میں عورتیں کہتی ہیں "جی اورے پورے ہو گیا، یا سانس اورے پورے ہو گئی"؛

یہ اورے پورے بواو مجہول بھی پشتو لفظ ہیں، مگر یہاں آکر ان کی صورت اور معنی دونوں بدل گئے ہیں، افغانستان میں "پُوره اُوره" بولتے ہیں، اور اس کے معنی ہیں بالکل پورا، ادھر سے اُدھر تک، آر پار،

۲۳۔ پُوس، پشتو میں احمق اور نادان کو کہتے ہیں، روہیل کھنڈ میں "پُوسا" یا "پوسا جی" سے بھولے بھالے اشخاص کو مخاطب کیا جاتا ہے،

۲۴۔ نحۃ یا نکیل کو پشتو میں بیزوان کہا جاتا ہے، کوئی شخص کسی بات کو بار بار دہرائے، یا کوئی چیز بار بار مانگے، تو رامپور کی عورتیں کہتی ہیں "تم نے تو اس کو میری ناک کا بیزوان بنا لیا"؛

۲۵۔ کنواری لڑکی کو پشتو میں پیغلہ کہتے ہیں، رام پوری مستورات بھی طنز کے موقع پر کہا کرتی ہیں، "ہے کیسی پیغلہ" یا "دیکھو تو اس پیغلہ کو باتیں کیسی بناتی ہے"؛

۲۶۔ "بیغور" پشتو میں طعن و تشنیع کو کہتے ہیں، رامپور میں عورتیں "طعن بیغور" اور "طعنے بیغور دے" بولتی ہیں؛

۲۷۔ رامپور میں امرد کو "پے کھا" کہتے ہیں، یہ بھی پشتو کے ایک لفظ کا بگاڑ ہے، افغانستان میں "پئی" دودھ یا عرق اور "مخ" "چہرہ" کہلاتا ہے، "پئی مخے" خوبصورت مرد اور "پئی مخہ" عورت کے لئے استعمال ہوتا ہے، بے داڑھی مونچھ کے لڑکے کو بھی افغانی "پئی مخے" کہتے ہیں، اسی لفظ نے پہلے "پے مخے" اور بعد ازاں "پے کھا" کی شکل اختیار کر لی ہے،[1]

---

[1] حاشیہ صفحہ آیندہ پر ملاحظہ ہو،

۲۸۔ تپوتس بواو مجہول، پشتو میں جستجو اور تلاش کو کہتے ہیں، کرنل راورٹی اسے عربی مصدر تفحص کا بگاڑ بتاتا ہے، بہرحال یہ لفظ بھی روہیل کھنڈ بھر میں بولا جاتا ہے،

۲۹۔ تخ مخ: افغانی "شرم شرم" کی جگہ بولتے ہیں، رامپور میں تخ مخ ہوگیا بولتے ہیں، اور اس سے تخ مخانا مصدر بنالیا ہے جو "شرمانا اور تلملانا" دونوں کے بجائے استعمال ہوتا ہے،

۳۰۔ پشتو میں چچازاد بھائی کو "تربور" کہتے ہیں، چچازادوں میں عموماً بیر ہوتا ہے، اس لئے رامپور میں اس التزامی معنی یعنی دشمن کی جگہ بولا جاتا ہے،

۳۱۔ "ترسونہ" پشتو زبان میں "ترس" کی جمع ہے، رامپور میں اسے "ترسون" بناکر رنج وغم، دکھ، پریشانی کے معنی میں استعمال کرتے ہیں، اور عورتیں کہتی ہیں "اس کا بڑا ترسون ہوا"، یا فلاں کا ترسون نہیں دیکھا جاتا،

۳۲۔ ماتھے کو پشتو میں "تندے" کہتے ہیں، روہیلکھنڈ میں کھوپڑی کو "تندی" بولتے ہیں،

۳۳۔ "تبل" پشتو میں عربی دف کا مترادف ہے، راورٹی کی رائے میں یہ طبل سے بنایا گیا ہے، بہرحال یہ پٹھانوں کا قومی ساز ہے، اور چاربیت گانے میں جوش کے ساتھ بجایا جاتا ہے، روہیل کھنڈ اور بھوپال و ٹونک وغیرہ افغانی لبستیوں میں یہ اسم پٹھانوں کے ساتھ آیا ہے، اور اسی کا مستحق چاربیت گانے میں، یہاں بھی بجایا جاتا ہے،

۳۴۔ "تل" پشتو میں نیچے کو کہتے ہیں، روہیل کھنڈ میں بچے تل بتل نام کا ایک کھیل کھیلتے ہیں، صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک بچہ دوسرے کی پیٹھ پر سوار ہوتا ہے، اور مرکب کو ادھر اُدھر پھراتا ہے، مرکب

(بقیہ حاشیہ ص ۱۶۷) پپّی سنسکرت میں بھی دودھ اور عرق کو کہتے ہیں، اور مخ ہندی "کھ" ہے، لیکن اس سے یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ "پپے لکا" بھی ہندی ساخت ہو، اس لئے کہ اردو یا ہندی کی کسی لغت میں اس کا تذکرہ نہیں اور نہ یہ لفظ روہیل کھنڈ کے باہر بولا جاتا ہے۔

ہر آئندہ و روندہ سے پوچھتا ہے، "چچا تل پہ تل، یا چڑھے چڑھائے، ؟ اگر جواب میں کہا گیا چڑھے چڑھائے تو سوار اور سواری اپنی حالت پر برقرار رہے، ورنہ جو لڑکا اب تک مرکب تھا، وہ راکب کی پیٹھ پر سوار ہو جاتا ہے، اور پھر آنے جانے والوں سے وہی سوال دہرایا جاتا ہے،

یہ تل پہ تل ٹھیٹ پشتو ہے،

۳۵- موٹے تازے اور بھاری بھر کم آدمی کو دیکھ کر، روہیل کھنڈ میں کہتے ہیں، ذرا اس کا تن توش تو دیکھو، یا فلاں بڑے تن توش کا آدمی ہے، یہ تن توش بھی پشتو ہے، فرق اتنا ہو گیا ہے، کہ اس کے معنی تاو درامے تھے، یہاں فربہی اور جسامت کی زیادتی مراد لی جانے لگی، جو اصل کے التزامی مفہوم کی حیثیت رکھتی ہے،

۳۶- ننھے بچے کو پشتو میں تنکے کہتے ہیں، رامپور میں مستورات کی زبان سے یہ لفظ بھی اکثر آتا رہتا ہے، اور طنزاً کہتی ہیں، جی ہاں تم ہو بھی تو تنکئی یا ننھی تنکئی جو اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتیں، بڑے کے لئے یہاں "تنکیا" استعمال ہوتا ہے،

۳۷- "تور" بواؤ مجہول کے معنی پشتو میں اندھیرا خوف دہشت اور بہتان ہیں، روہیل کھنڈ میں خوف اور بہتان کے مفہوم میں بولا جاتا ہے، اور لوگ کہتے ہیں، "خدا آندھی کے زور اور حاکم کے تور سے بچائے"، عورتیں خفگی میں کہا کرتی ہیں: "یا اللہ میں کس تور میں پکڑی گئی ہوں"،

پٹھانوں میں ایک قبیلہ دوسرے سے دب کر صلح کرے، تو اپنے یہاں کی ایک دو لڑکیاں بھی غالب کے خاندان میں بیاہ دیتا ہے، اسے لڑکی تور میں دینا کہتے ہیں، ساس بہو کی لڑائی میں اکثر بہو کی زبان سے یہ جملہ سننے میں آتا ہے، "کیا میں تور میں آئی ہوں" جو تم سے دن رات جوتیاں کھاؤں گی، یہ وہی تور بمعنی خوف و دہشت ہے،

۳۸- گھٹا ٹوپ اندھیرے کو پشتو میں تور تم کہتے ہیں، یہ مذکورہ بالا تور کا مرکب ہے، رامپور

مین ظلم و ستم کی جگہ بولا جاتا ہے، اور عورتین کہا کرتی ہین، "اللہ رے تیرے تور تم" یا "اُس نے وہ تور تم مچایا (یا ڈھایا) کہ خدا کی پناہ!"

۳۹۔ ٹَس ٹُس: پشتو مین بندوق کی آواز کو کہتے ہین، روہیل کھنڈ مین لوگ بولتے ہین، "بندوق ٹَس سے ہو کر رہ گئی" یا "مین نے ٹس سے گولی ماردی" یا "وہان دو چار بار ٹَس ٹُس ہو کر رہ گئی"

۴۰۔ ٹَپَر: پشتو مین ٹاٹ کہلاتا ہے، ہمارے علاقہ مین اسے مشدد بولتے ہین[۱۵] اور کوئی شخص کسی کا مال دبالے، یا ناجائز ذرائع سے بہت سا کمالے، تو لوگ کہتے ہین، "فلان نے تو ٹپرّ الٹ دیا، یا لوٹ دیا" گھوڑون کا میلا جس ٹاٹ پر کوٹا جاتا تھا، اُسے بھی ٹپر کہتے تھے، اب اصطبل کی جگہ موٹر خانے کول گئے اس لئے ٹپر بھی جل کر راکھ ہو گیا!

۴۱۔ پشتو مین سست اور کاہل کو ٹَس مَس کہتے ہین، روہیل کھنڈ ی اسے ذرا بگاڑ کر بولتے ہین، اور کوئی شخص دھمکی یا خوشامد کا اثر نہ لے، تو کہتے ہین، "ٹس سے مَس نہ ہوا"

۴۲۔ "ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کو پشتو مین "ٹخ" کہتے ہین، ہمارے یہان یہ لفظ بھی بتغیر بولا جاتا ہے، اور کسی خوف یا حیرت سے آنکھین پھٹی کی پھٹی رہ جائین، تو کہتے ہین، "دیدے ٹخ ہو کر رہ گئے، یا بیچاری ٹخ دیدہ رہ گئی"

رامپور مین عورتون نے اس سے ٹخو بنایا ہے، اور گالی کے طور پر استعمال کرتی ہین،

۴۳۔ "ٹَونگ" پشتو مین دق کرنے چھیڑنے اور ناسزا حرکت سے ناراض کرنے کو کہتے ہین، روہیل کھنڈ مین ایک مصدر ٹُنگیانا استعمال ہوتا ہے، بعضے اس کا تلفظ ٹھنگیانا بھی کرتے ہین، پہلے میرا خیال تھا کہ

---

۱۵ صاحب نوراللغات نے لکھا ہے کہ "ٹپر" ہندی مین وہ چھپر کہلاتا ہے، جو دوسرے چھپر کے اوپر ڈالا جائے، رامپوری محاورے مین جو "ٹپر" ہے، وہ معنی اس ہندی لفظ سے علاقہ نہین رکھتا، البتہ تلفظ مین اس سے ضرور اثر قبول کیا ہے،

"ٹھونگ" سے بنا ہے، مگر ہندی میں اس کا پتہ نہیں چلتا تھا، اب میں یہ یقین رکھتا ہوں، کہ اسے پشتو "ٹونگ" سے بنایا گیا ہے،

۴۵۔ روہیل کھنڈی مستورات کی بول چال ہے: "اس جلیا بھنیا کی بات کون پوچھے" یا "میں تو عمر بھر کی جلیا دکھیا ہوں" "یہ جلیا" بھی پشتو سے آیا ہے، اور اس کے معنی ہیں جلا ہوا، ہندی یا اردو میں اس لفظ کا پتہ نہیں چلتا،

۴۵۔ "چیڑ دخ" پشتو میں ایک کھیل کا نام ہے جو گول پتھروں سے کھیلا جاتا ہے، روہیل کھنڈ میں اس سے التزامی معنی شور و غل مراد ہوتے ہیں، اور بچے شور مچاتے ہیں، تو کہا جاتا ہے کہ "ارے یہ کیا چیڑ دخ مچائی ہے یا لگائی ہے"،

۴۶۔ غم کے ابھان کو پشتو میں "چپہ" یا "چپے" کہتے ہیں، ہمارے یہاں "یہ چپہ" ہو کر مستورات کے دل پر پڑتا ہے، اور کہا جاتا ہے "فلاں بات سنتے ہی دل پے چپہ پڑ گیا، یا اکیلی بیٹھے بیٹھے میرے دل پے چپے پڑتے ہیں"،

۴۷۔ "چخن" اور "چیخن" پشتو میں میلا کا مترادف ہے، روہیل کھنڈ میں بھی اس مفہوم میں "میلا چخن" یا "میلا چیخن" بترکیب استعمال ہوتا ہے،

۴۸۔ پشتو میں حال یا کیفیت کے لئے "حال احوال" بولا جاتا ہے، ہمارے علاقہ میں حال حوال بولتے ہیں،

۴۹۔ "حدزیات" افغانستان اور روہیلکھنڈ دونوں میں زیادہ سے زیادہ کی جگہ بولتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ "وہاں حدزیات پندرہ بیس آدمی ہوں گے"،

۵۰۔ حیران کو پشتو میں "حق حیران یا حق ہریان" کہا جاتا ہے، رامپور میں بھی مستورات کا محاورہ یہی ہے،

۵۱۔ "خڑا" پشتو میں قے کرنے کی آواز کو کہتے ہیں، اردو ہیلکھنڈ میں اس سے خڑ خڑا اور خڑ خڑکرا بنا لیا ہے۔

۵۲۔ خرَ نبشوَنی، پشتو میں سدھ کا مترادف ہے، رامپوری تھیٹرا مرد کو "خرَ نبشا" اور عورت کو "خرَ بشی" کہتے ہیں،

۵۳ "رامپوری مستورات "حرامی پلا" کی جگہ "حرامی خڑیڑا" بولتی ہیں، یہ خڑیڑا پشتو کے خرِ پڑے سے بنا ہے، برسات کے موسم میں جو چھتری کی طرح کے چھوٹے چھوٹے پودے اُگتے ہیں، اور اردو میں سانپ کی چھتری یا کُکُرمُتا اور عربی میں فُطر کہلاتے ہیں، پشتو میں انھیں خرِ پڑے کہا جاتا ہے، پہلے رامپور میں بھی فطر کے لئے یہی لفظ عام طور پر استعمال ہوتا تھا، اب متروک ہے، مگر اُسے ذرا بگاڑ کر حرامی کے لئے خڑیڑا برابر بولا جاتا ہے،[1]

۵۴۔ "خوار، خوار خستہ مفلس کو اور خواری افلاس کو اور "خوار و کُنی" قلاش عورت کو افغانستان اور روہیلکھنڈ دونوں جگہ کہا جاتا ہے،

۵۵ "خور" بواو مجہول، پشتو میں بہن کو کہتے ہیں، اس کی جمع ہے خورے، رامپوری مستورات اوہی خوارے بولا کرتی ہیں،

۵۶۔ "خڑوب" بواو مجہول، پشتو میں پانی سے بھیگی ہوئی چیز کو کہتے ہیں، روہیلکھنڈ میں "خڑوب ہونا" اور "خڑوب دینا" پانی میں بھگو دینے کو بولتے ہیں، رامپور کے بعض آدمیوں کی زبانی سے "غڑوب" بھی سُنا ہے،

---

[1] پشتو ہی کا ایک لفظ کریڑہ ہے، جو اُس گھاس کے لئے استعمال ہوتا ہے، جسے کُھتائی کے بعد کھیت میں اکٹھا کرکے باہر پھینک دیا جاتا ہے، بعید نہیں کہ اس میں تغیر کرکے خڑیڑا بنا لیا ہو، مگر یہ احتمال بعید معلوم ہوتا ہے،

۵۷۔ روہیل کھنڈ میں نو ن لمان کی جگہ پشتو میں خوڑیی استعمال کیا جاتا ہے، یہ بھی پشتو سے آیا ہے اور زخمی کا ہم معنی ہے،

۵۸۔ تھیلے کو پشتو میں "خلتہ" کہتے ہیں، ہمارے یہاں "خلتہ" تھیلے کو اور خلتیا تھیلی کو بولتے ہیں، پاجامے کے کپڑے کو تراشنے سے پہلے لمبائی میں سی کر پھر کاٹا جاتا ہے، اسے پاجامے کا خلتہ کہتے اس عمل کو خلتہ کرنا کہتے ہیں،

۵۹۔ افغانستان میں منہ کو "خلہ" کہا جاتا ہے، اور اس کی تصغیر "خلگے" ہے روہیل کھنڈ میں منہ یا دہن کو "خلگی" بولتے ہیں، اور کہتے ہیں "اس کی خلگی چوڑی ہے، یا چھوٹی ہے"

۶۰۔ "دم" لینا کی جگہ ہمارے یہاں "دمہ" لینا بولتے ہیں، یہ لفظ بھی پشتو ہے،

۶۱۔ "خواست" فارسی مصدر خواستن سے مشتق ہے اور پشتو میں بمعنی خواہش بولا جاتا ہے، رامپور میں بھی عورتیں کہتی ہیں، "میں نے بڑی خواستیں کیں تب وہ آئی"

۶۲۔ "دیدن" فارسی مصدر کو پشتو میں بمعنی دیدار استعمال کرتے ہیں، رامپوری مستورات مرد کا دیدن کرنا بولتی ہیں،

۶۳۔ بیہوش کا پشتو مترادف ڈب ڈوب ہے، بخار میں بیہوش پڑے ہوئے کو رامپوری عورتیں کہتی ہیں، ڈب ڈب پڑا ہے،

۶۴۔ "ڈڈا" پشتو میں پہلو اور ڈڈا لگول ایک پہلو پر لیٹ جانا ہے، رامپور میں یہ اتنا عام ہے، کہ عالم و جاہل اور مرد و عورت سب دن رات بولتے ہیں، روہیل کھنڈ کے دوسرے مقامات پر بھی حتی کہ دیہات میں لوگ ڈڈا لگا لو اور کرسی یا مسہری کا ڈڈا کہا کرتے ہیں، فرق صرف دوسری ڈال کی تشدید کا ہے، کہ یہ ہندوستانی اضافہ ہے،

۶۵۔ "ڈریی مارنا" رامپور میں شیخی بگھارنے کو کہتے ہیں، پشتو میں ڈوز سے بکل اس مفہوم میں

استعمال ہوتا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے، کہ ہمارا "ڈڑ" اور "ڈڑین" پشتو کے "ڈوزہ" اور "ڈورے" کا بگاڑ ہے،

۶۶۔ "ڈنگ ڈنگ" افغانستان اور روہیل کھنڈ دونوں جگہ باجے اور خاص کر ڈنکے کی آواز کہلاتی ہے،

۶۷۔ "ڈیوہ" "ڈیولا" "ڈبوٹ" "ڈیوہ سلائی" یہ سب لفظ پشتو ہیں، اور روہیل کھنڈ میں افغانی اثر سے پھیلے ہیں، ورنہ ان کا ہندی تلفظ حرف دال سے ہے،

۶۸۔ "راشہ درشہ" پشتو میں میل ملاقات کہلاتی ہے، رامپور میں بھی عوام اس کو عموم میں استعمال کرتے ہیں،

۶۹۔ "روغ جوڑ" ہر دو بواو مجہول بھی پشتو میں میل ملاپ کا مترادف ہے، رامپور کی مستورات میں لفظ "روغ" تین لفظوں کے ساتھ ترکیب پاکر بولا جاتا ہے، ایک تو یہی "جوڑ" چنانچہ "روغ جوڑ" اور "روغہ جوڑہ" دونوں سے میل ملاپ مراد لیتی ہیں، دوسرا مرکب "روغ راستی" ہے، جس سے مطلب نرمی اور آہستگی اور محبت ہوتا ہے، مثلاً دیکھو میں تو روغ راستی میں (یا سے) کہہ رہی ہوں، اور تم ہو کہ آپے سے باہر ہوئی جاتی ہو" اور تیسرا مرکب "روغ موٹ" ہے جس کے معنی ہٹا کٹا موٹا تازہ ہیں،

۷۰۔ ہمارے علاقے ہی میں نہیں غالباً بھوپال، ٹونک، اور جاورہ وغیرہ تمام افغانی آبادیوں میں دستور ہے کہ کسی کے گھر میں بیٹا پیدا ہو، تو زچہ اور بچے کے کام سے نبٹ کر خاندان کی عورتیں صحن میں، اگر گھر میں بالاخانہ نہو، ورنہ کوٹھے پر چڑھ کر "راے خورے" پکارتی ہیں، اور اس کے بعد خاندان اور پڑوس میں مٹھائی بانٹی جاتی ہے،

یہ رسم بھی افغانستان سے آئی ہے، اس کے آغاز کا قصہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک شخص قتل کر دیا گیا تھا، اور اس کا بدلہ لینے والا کوئی نہ تھا، ایک حاملہ بیوی اور ایک بیوہ بہن دو عورتیں

کر بیٹھی رہی تھیں، بہن دعائیں مانگتی تھی کہ بیٹا پیدا ہو، جو بڑھ کر باپ کا انتقام لے، اتفاق سے بیٹا ہی پیدا ہوا، بچے کی پھپی فرط خوشی میں مکان کی چھت پر چڑھ گئی، اور آس پاس کی عورتوں کو بلند آواز سے پکارنے لگی، "زَازَہ خورے، راغے زوی" یعنی بہنو آؤ، بیٹا آیا، اس وقت سے یہ رسم افغانستان میں جاری ہوئی ہے،

ہندوستان آکر لفظ بدل گئے، مگر روح اتنی خوش آیند تھی کہ پٹھانوں کی دیکھا دیکھی دوسری مسلمان قوموں نے بھی اس رسم کو اپنا لیا، اب روہیلکھنڈ میں یہ تمام مسلمانوں کے قومی رواسم میں شمار ہوتی ہے،

۱،۔ زَن کَدَن اور زَن قَدَن پشتو میں جان کنی یا دم اُکھڑنے کو کہتے ہیں، روہیلکھنڈ میں زَن قدن، اور "زَن قَدنی" بولتے ہیں،

۲،۔ وکہ اور رنج کو پشتو اور رامپوری بولچال دونوں میں زور بولتے ہیں،

۳،۔ "زیارت" عربی لفظ ہے، اور ملاقات کے لئے وضع ہوا ہے، پشتو میں کسی بزرگ کے مزار کو "زیارت" کہتے ہیں، یہی مفہوم روہیل کھنڈ میں بھی مراد ہوتا ہے، اور شاہ بلاقی صاحب کی زیارت مراد آباد میں اور حافظ جمال صاحب کی رامپور میں مشہور خاص و عام ہے،

۴،۔ زیرَنے پشتو میں یرقان کو کہتے ہیں، رامپور میں اسے زَرنا بنا لیا ہے،

۵،۔ سالی کے شوہر کو ہندی میں "ساڑھو" کہتے ہیں، پشتو میں "سانڈو" کہا جاتا ہے، اور یہی روہیل کھنڈ میں بھی مروج ہے،

۶،۔ افغانستان میں ایک شخص کھانا کھا رہا ہو، اور دوست احباب میں سے کوئی آپڑے تو اس سے شرکت طعام کی جو درخواست کی جاتی ہے، اس عمل کو "ست کول" کہا جاتا ہے، روہیل کھنڈ میں بھی کھانے کا "ست کرنا" ہی بولتے ہیں، اور صلاح و مشورے کے لئے "ست صلاح کرنا" مستعمل ہے،

۷۷۔ نحر کو افغانی "نحار" بولتے ہین، یہی لفظ ہمارے علاقہ مین بھی زبان زد ہے،

۷۸۔ دشمن کی تکلیف پر خوش ہونے کو پشتو مین "نخہ" کہتے ہین، مستورات رامپور کہا کرتی ہین: دل کے نخے پورے کرتی ہے، یعنی تکلیف پر خوش ہوتی ہے،

۷۹۔ دم واپسین کو پشتو مین "سلگی" کہتے ہین، روہیل کھنڈ مین بھی لوگ کہتے ہین "ہچکی سلگی اور سلگین ہو رہی ہین"

۸۰۔ "سنڈہ" پشتو مین بھینسے کو کہتے ہین، روہیلکھنڈ مین عورتین بچون کو ڈانٹتے ہوے کہتی ہین: "ٹھر تو سنڈے" جوان سنڈا یا جوان سنڈی ہوگئی، مگر شعور نہین آیا، بھی بولا جاتا ہی،

۸۱۔ نواب الہ یار خان نے عجائب اللغات مین لکھا ہے، کہ پشتو مین سادہ کو "سودہ" کہتے ہین، ہمارے یہان سادہ سودہ مرکب استعمال کرتے ہین،

۸۲۔ برابری کو پشتو مین "سیالی" کہتے ہین، ہمارے یہان بھی اس کا عام رواج ہے، (باقی)

ہندوستان کے کتب خانے

از

مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی

(۲)

شاہجہان کا کتب خانہ شاہجہان بادشاہ کے عہد ۱۰۶۲ھ میں اس کتبخانہ کے ناظم کچھ دنون کے لئے سید علی ابن سید جلال مقصود عالم بن سید محمد مقبول عالم تھے، وہ گجرات کے شہر احمد آباد مین پیدا ہوئے، اور اپنے بھائی سید جعفر بدر عالم کی سفارش سے اس عہدۂ جلیلہ پر سرفراز ہوئے، اُن کا سلسلۂ نسب احمد آباد گجرات کے مشہور بخاری خاندان کے مورث اعلیٰ حضرت شاہ عالم سے ملتا ہے، نہایت لائق اور صاحب علم لوگون مین سے تھے، اورنگ زیب عالمگیر سے لے کر محمد شاہ کے زمانہ تک شاہی کتب خانہ اپنی اصلی حالت پر قائم رہا، اس کے بعد اس کتب خانے کی جانب سے سلاطینِ مغلیہ بے پروائی برتنے لگے، جس کے سبب سے اکثر فاتح امراء نے کتب خانہ سے کتابین منتقل کرنی شروع کر دین، چنانچہ شاہ اودھ کے کتب خانہ مین بے شمار کتابین یہان کی موجود تھین[۱]،

۱۸۵۷ء کے بعد اس کتب خانے کے اجزا مختلف مقامات مین منتشر ہو گئے، اس کا کچھ حصہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے قبضہ مین آیا، اور کچھ رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف لندن کی نذر ہوا، بقیہ کتابین لندن کے شاہی کتب خانہ مین داخل کی گئین، پھر بھی ہزارون کتابین ایسی تھین، جو ہندوستان ہی مین رہ گئین، چنانچہ ہندوستان کے متعدد کتب خانون مین ایسی کتابین میری نظر سے گذرین جن پر شاہان مغلیہ

---

[۱] تحفۂ سید عالم ص ۲۰۷

اور ناظم کتب خانہ کی مہرین موجود ہین،

اسی طرح بہت سے ذاتی کتب خانون مین بھی یہ کتابین پائی جاتی ہین،

عالمگیر کا کتب خانہ سلطان اورنگ زیب عالمگیر کے عہد مین اس کتب خانہ کو اور زیادہ ترقی ہوئی، اس وقت اس کا ناظم محمد صالح تھا، جو عیسیٰ خان ترخان (سندھ) کا دوسرا لڑکا ہے، اور مہتمم عنایت خان کا پوتا محمد منصور مقرر ہوا، اس کو مکرمت خان کا خطاب بادشاہ نے عطا فرمایا تھا، ۱۰۹۹ھ مین اس کے مہتمم شیخ علی الحسینی ہوئے، جیسا کہ ایک کتاب (قرآن شریف) کی مہر سے ظاہر ہوتا ہے، جو اس وقت رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے کتب خانہ مین موجود ہے[1]

قطب الملک کا کتب خانہ امرا ءسلطنت کو کتب خانون کا شوق تھا، اور اپنا ذاتی کتب خانہ خاص اہتمام سے رکھتے تھے، قطب الملک کا کتب خانہ انہی مین سے ایک تھا، اس کتب خانہ مین نادر کتابین بھی موجود تھین جن کو خاص طور پر وہ مہیا کرتا تھا،

تزک جہانگیری اس عہد مین بہت کمیاب تھی، لیکن اس نے اپنے کتب خانہ کے لئے اس کو بہم پہنچایا، پھر اسی کتب خانہ سے شاہزادہ محمد سلطان بن عالمگیر نے اس کو حاصل کیا، یہ کتاب آج بھی خدا بخش خان لائبریری مین موجود ہے[2]

نواب ابراہیم خان بہادر ہزبر جنگ ۱۱۸۰ھ مین دہلی کے ذی اثر امرار مین شمار کئے جاتے تھے، اس زمانہ کے علمی ذوق کے مطابق ان کے پاس ایک بہت بڑا کتب خانہ تھا، جس مین کتابین خرید کر کے داخل کی جاتی تھین، چنانچہ ایک کتاب "مہندس" شاعر کا دیوان مصنفہ ۱۱۱۱ھ خرید کر کے کتب خانہ مین داخل کیا گیا، شاعر مہندس کا اصلی نام لطف اللہ ہے، جس کا باپ نادر العصر استاذ احمد معمار عہد شاہجہانی کا مشہور انجنیر ہے جس نے تاج محل آگرہ، اور لال قلعہ دہلی تعمیر کیا،

---

[1] بحوالہ معارف جلد ۲، ص ۲۲۹ [2] اورنٹیل لائبریری پٹنہ کی فہرست جلد اول ص ۲۴۹،

اس کتاب کے خاتمہ پر یہ عبارت درج ہے :-

"بتاریخ بستم رمضان المبارک ۱۲۶۱ھ دیوان اسندس خرید شد بسرکار نواب ابراہیم خان بہادر"

اور ابتدا میں ہے،

"این کتاب سرکار نواب ابراہیم خان بہادر ہزبر جنگ بکتاب خانہ داخل شد[۱]"

نواب لوہارو کا کتب خانہ | مغلیہ سلطنت کے آخری دور میں نواب لوہارو بہت باذاق اور علم دوست رئیس تھے، عموماً اُن کے دربار میں اہلِ علم جمع رہتے، دہلی کے مشہور شاعر غالب سے اُن کی بڑی دوستی تھی، نواب صاحب اُن کی بڑی قدر کرتے تھے، نواب صاحب کے پاس ایک بڑا کتب خانہ تھا جس میں مختلف فنون کی کتابیں تھیں، نوادر کا بڑا شوق تھا، اس لئے نقاشی اور مصوری کے بہترین نمونے اس میں تھے، بقول غالب کے اس میں کم از کم بیس ہزار کی مالیت کی کتابیں تھیں[۲]، افسوس ۱۸۵۷ء کی بادِ خزاں نے کتب خانہ کا ورق الٹ دیا،

گجرات کا شاہی کتب خانہ | گجرات میں ممکن ہے کہ کتب خانہ کا رواج اسلامی حکومت سے پہلے آباد شدہ مسلمانوں میں ہو، جیسا کہ مولانا یعقوب المرجود ۵۱۲ھ کے قیام جامع مسجد ٹپن سے معلوم ہوتا ہے لیکن تاریخ میں صریح طور پر اس کا کوئی ذکر نہیں ہے[۳]،

جب گجرات میں خود مختار حکومت قائم ہوئی، تو سلطان احمد متوفی ۸۴۶ھ کے دربار میں ہر قسم کے علوم و فنون کے ماہر جمع ہو گئے، اور ان لوگوں کے فیض صحبت سے اُس نے مدرسوں، مسجدوں، ہزاروں اور رفاہِ عام کے دوسرے کاموں کی بنیاد رکھی، ان میں کتب خانہ بھی تھا، اس کتب خانہ کا تذکرہ تاریخ میں اس طرح آتا ہے، کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے لڑکے محمد شاہ متوفی ۸۵۵ھ نے شاہی کتب خانہ

---

[۱] معارف نمبر ۱ جلد ۳۷ [۲] عود ہندی ص ۱۲۹، ۱۳۰

[۳] خاتمہ مرأۃ احمدی ج ۲ ص ۲۳، ۲۴

سے کتابیں نکال کر مدرسہ شیخ برہانی کے طلبہ پر پڑھنے کے لئے وقف کین[1]، یہ کتب خانہ [illegible]ھ تک قائم رہا

اکبر نے جب گجرات فتح کیا، تو اس کی کتابیں کچھ تقسیم کر دین، اس مین سے کچھ کتابیں شیخ عبدالحق محدث

اور کچھ ملا عبدالقادر بدایونی اور فیضی کے حصہ مین آئین، باقی شاہی کتب خانہ مین داخل ہوئین[2]،

عثمان پورہ کا کتب خانہ | شیخ محمد عثمان الملقب بہ شیخ برہانی، خلیفہ حضرت قطب عالم متوفی [illegible]ھ (احمد آباد)

بڑے پایہ کے بزرگ تھے، آپ نے سابرمتی ندی کے اس پار ایک گاؤن بسا کر اس کا نام عثمان پورہ

رکھا، اسی مین ایک مسجد اور ایک مدرسہ سلطان محمد شاہ گجراتی کے ذریعہ تعمیر کرایا، جس کا نام مدرسہ شیخ

برہانی تھا، اس مدرسہ کے ساتھ ایک کتب خانہ بھی تھا، جس مین دوسری کتابون کے علاوہ شاہی کتب خانہ

کی وقف شدہ کتابین بھی تھین، [illegible]ھ تک تو وہ خود نگران رہے، اس کے بعد بھی عرصۂ دراز تک یہ سب

یادگارین قائم رہین، پھر مرہٹون کی لوٹ مار مین تباہ ہوگئین، اب صرف مسجد اور مقبرہ یادگار باقی ہے،

خانقاہ سرخیز کا کتب خانہ | حضرت شیخ احمد کھٹوی متوفی ۸۴۹ھ نے سرخیز (احمد آباد) مین مسجد، تالاب

اور خانقاہ خود تعمیر کرائی، آپ کے بعد سلطان محمد شاہ گجراتی نے مقبرہ اور مدرسہ بنوایا، غالب گمان ہے کہ

اس مدرسہ کے ساتھ کتب خانہ ضرور ہوگا، لیکن ایک واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے، کہ شیخ احمد اپنی خانقاہ

مین ذاتی کتب خانہ بھی رکھتے تھے، چنانچہ ایک موقع پر حدیث کی کتاب مصابیح، کو اپنے کتب خانہ سے

نکال کر حاضرین مین سے ایک شخص کو ایک حدیث سنائی، جس نے آپ کی مدح مین ایک قصیدہ لکھا تھا[3]

شاہ عالم کا کتب خانہ | گجرات (احمد آباد) کے مشہور بزرگ حضرت سید محمد شاہ عالم متوفی [illegible]ھ ایک

باعمل عالم تھے، مطالعہ کتب کا آپ کو بڑا شوق تھا، کثرت مطالعہ کی بنا پر آپ کی دونون ہاتھون مین

ٹیک لگانے سے نشان پڑ گئے تھے، آپ کے پاس ایک بڑا کتب خانہ تھا، جس مین عام کتابون کے علاوہ

نایاب کتابین بھی تھین، چنانچہ مولانا صدر جہان جب آپ سے ملنے گئے تھے، تو آپ نے امام رازی کا

---

[1] ظفر الوالہ ص ۳۲، لندن جلد اول [2] تاریخ بدایونی جلد دوم ص ۲۰۲، کلکتہ [3] خاتمہ مرآۃ احمدی ص ۹۲

ایک ایسا نایاب نسخہ ان کو دکھایا جس کی خبر مولانا صدر جہان کو نہ تھی،[1]

آپ کے جانشین بھی اس کو برابر ترقی دیتے رہے، سید جعفر بدر عالم متوفی [illegible] کے وقت میں یہ کتب خانہ عروج پر تھا،[2] آپ نے خود بھی سیکڑوں کتابیں اپنے ہاتھ سے لکھ کر داخل کتب خانہ کیں، ایک دفعہ رات کے وقت راستہ میں ایک سائل نے قرآن کا نسخہ طلب کیا، آپ نے کہا کہ آج کتب خانہ سے دیکھ کر دینگے، اس نے کہا کہ جو آپ کے پاس اس وقت موجود ہے، وہ کیوں نہیں دیتے، آپ ہمیشہ اپنے ساتھ ایک قرآن مجید رکھتے تھے، مجبوراً وہی دیدیا، مرہٹوں کی یورش کے زمانہ میں ان کی لوٹ مار کے خوف سے آپ کی اولاد شہر پناہ کے اندر چلی آئی تھی، جسکی بنا پر کتب خانہ کی کافی حفاظت نہ ہو سکی، جس سے آہستہ آہستہ کتب خانہ تباہ ہو گیا، لیکن کچھ بچی ہوئی کتابیں آج بھی اُن کے سجادہ نشین اولاد کے قبضہ میں ہیں،

نہروالہ پٹن کے مشہور و معروف محدث علامہ محمد بن طاہر پٹنی گجرات کے پاس بڑا نایاب کتبخانہ تھا، اس میں علامہ ممدوح نے عرب و عجم سے لا کر کتابیں جمع کی تھیں، جب تک اس خاندان میں علم رہا کتابیں محفوظ رہیں پھر آہستہ آہستہ کتابیں ضائع ہو گئیں، مگر اس کا کچھ حصہ اُن کے وارثوں کے پاس آج بھی موجود ہے، راقم الحروف نے اس کتب خانہ کو ۱۹۴۲ء میں جب دیکھا، تو اُس کی حفاظت کا کوئی سامان نہ تھا، اگر یہی حال رہا تو کچھ عرصہ کے بعد یہ بھی تلف ہو جائے گا، اس میں کتاب مجمع البحار کے ایک نسخہ کے متعلق بتایا گیا کہ وہ مصنف کے قلم کا ہے، مگر اس کی کوئی شہادت اندرونی نہ ملی، جو اس کی تصدیق کرتی،

شاہ وجیہ الدین کا کتب خانہ | علامہ شاہ وجیہ الدین گجراتی متوفی ۹۹۸ھ کی احمد آباد میں بڑی مقدس ہستی تھی، ۹۳۲ھ میں آپ نے ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی، جو آپ کی وفات کے بعد ۱۲۳۶ھ تک قائم رہا، اس کے ساتھ ایک کتب خانہ بھی تھا، یہ کتب خانہ بہت بڑا تھا، اور ہر فن کی کتابیں اس میں موجود تھیں، بزرگوں کا بیان ہے کہ وہ بڑے کمروں میں بے ترتیبی سے کتابیں بھری تھیں، لیکن جب خاندان میں علم کے

---

[1] خاتمہ مرآۃ احمدی عربی ص ۳ [2] خاتمہ مرآۃ احمدی اردو ص ۶۱ لاہور،

قدردان نہ رہے، تو کتابین بھی ضائع گئین، اس صدی کی ابتدا مین مولوی عبدالمنعم صاحب باملکظ خلیب جامع مسجد بمبئی اور یوسف صاحب بی اے کھٹ کھٹے مرحوم (بمبئی) بہت سی کتابین اٹھا لے گئے، راقم الحروف نے ۱۹۲۱ء مین اس کتب خانہ کو دیکھا تو صرف چند صندوق کتابین تھین، لیکن اب وہان کچھ نہین ہے، کچھ کتابین تو احباب کے نذر ہوئین، اور کچھ دریائے سابرمتی مین بہ گئین کچھ تھوڑی سی کتابین ہمارے دوست پیر حسینی صاحب اور بڑا میان صاحب موجودہ متولی درگاہ کے پاس ہین،

مدرسہ پٹن کا کتب خانہ | ۹۰۲ھ مین بمقام نہروالہ پٹن (گجرات) مین ایک مدرسہ قائم کیا گیا تھا جس کا نام فیض صفا تھا، اس کے ساتھ مسجد بھی تعمیر کی گئی تھی، جس پر مندرجہ ذیل تاریخی شعر درج ہے،

بناشد مدرسہ و مسجد بہ فیض صفا در ہزار و نود و، دو ز عنایات خدا

اس مسجد مین ایک بڑا کتب خانہ بھی تھا، راقم الحروف نے ۱۹۳۱ء مین جب اس کو دیکھا ہے تو وہ نہایت بُرے حال مین تھا، نایاب کتابین اس مین کم رہ گئی تھین تاہم قلمی کتابون کا بڑا ذخیرہ تھا،

مخدوم ابراہیم کا کتب خانہ | کاٹھیاواڑ مین کتیانہ ایک مشہور قصبہ ہے ۹۹۰ھ مین یہان ایک بڑا مدرسہ قائم ہوا تھا، اس کے بانی مخدوم شیخ ابراہیم بن سلیمان تھے، ان کی وفات ۱۰۲۱ھ مین ہوئی، ان کا مدرسہ پچھلی صدی تک قائم تھا، اس کے ساتھ ایک کتبخانہ بھی تھا، مدرسہ بند ہو جانے کے بعد بھی یہ کتب خانہ عرصہ تک قائم رہا، راقم الحروف نے جب ۱۹۲۵ یا ۱۹۲۶ء مین اس کو دیکھا ہے تو متوسط درجہ کا کتب خانہ تھا جس مین قلمی کتابون کے علاوہ مطبوعات بھی تھین، متولی صاحب فرماتے تھے کہ اس مین سے بڑا حصہ جونا گڈھ والے اٹھا لے گئے،

مدرسہ ہدایت بخش کا کتب خانہ | احمد آباد مین مولانا شیخ نورالدین یگانۂ روزگار عالم اور متقی صوفی تھے، فلسفہ، منطق ریاضی کی تعلیم مولانا احمد بن سلیمان متوفی ۹۸۰ھ سے حاصل کی تھی، جو مخدوم شیخ ابراہیم بن سلیمان کے حقیقی بھائی تھے، ان کے بیٹے شیخ الاسلام نے ایک عمارت مدرسہ ہدایت بخش

کے نام سے تیار کرادی تھی، اس کی تعمیر میں ایک لاکھ چوبیس ہزار روپیے خرچ ہوئے تھے ۱۱۱۱ھ میں مدرسہ کی عمارت، مسجد اور دارالاقامہ کی عمارتیں بن کر تیار ہوئیں[1]، اسی کے ساتھ ایک بڑا کتب خانہ بھی تھا جس میں ہر فن کی کتابیں موجود تھیں، خواص کے سوا عوام بھی اس کتب خانہ سے فیضیاب ہوتے تھے، افسوس کہ مرہٹہ گردی میں یہ کتب خانہ تباہ ہوگیا، اس کی متعدد کتابیں کتب خانہ درگاہ حضرت پیر محمد شاہ حیدرآباد میں موجود ہیں، محلہ والوں کی دیکھ بھال سے مسجد البتہ اب تک قائم ہے،

مدرسہ ولی اللہ کا کتب خانہ

احمد آباد میں تلیا مل کے متصل جو مسجد ہے اسی کے ساتھ ایک بڑا مدرسہ تھا، ۱۱۵۵ھ میں مولانا عماد الدین اس کے ناظم تھے، اس کے متعلق ایک بڑا کتب خانہ تھا جس میں تقریباً ہر فن کی کتابیں موجود تھیں اور بہت سی فن کی منتخب کتابیں تھیں، مرہٹہ گردی میں اس مدرسہ اور کتب خانہ کا حال بھی ابتر ہوگیا، اس خاندان میں جب علمی چرچا کم ہوگیا، تو کتب خانہ کی حفاظت کا خیال بھی جاتا رہا، اہل خاندان نے شائقین کو خود بہت سی کتابیں دیدیں، کچھ کیڑوں کی تواضع میں صرف ہوئیں، غرض اس طرح تمام کتب خانہ منتشر ہوگیا، بقیہ کتابیں جو اس وقت موجود ہیں ان سے قیاس ہوتا ہے کہ کتب خانہ بہت بڑا اور گوہر نایاب کا بیش بہا خزانہ ہوگا، کیونکہ اس علمی خزانہ کے لٹ جانے کے باوجود آج بھی اس میں بہت سی نایاب اور بیش بہا کتابیں موجود ہیں، جو احمد آباد کی درگاہ حضرت پیر محمد شاہ کے کتب خانہ میں وقف کردی گئی ہیں،

شیعہ بوہروں کا کتب خانہ

احمد آباد گیارہویں صدی ہجری کے وسط تک شیعہ اسماعیلی بوہروں کا مرکز رہا ہے، ان کا والی یا داعی یہیں رہتا تھا، اور ان کے مدارس بھی زیادہ تر یہیں قائم تھے، داعی کی زیر نگرانی ایک بڑا عالیشان کتب خانہ بھی تھا جس میں ہر فن کی کتابیں تھیں، ۱۰۶۵ھ کے بعد یہ کتب خانہ [illegible] (گجرات) میں تبدیل کر دیا گیا[2]، یہ کتب خانہ آج بھی داعی وقت سیدنا طاہر سیف الدین کی

---

[1] خاتمہ مرآۃ احمدی کلکتہ ص ۵۰ [2] موسم بہار جلد سوم صفدری بمبئی بیان سیدنا داؤد،

نگرانی میں بقائم صورت اچھی حالت میں ہے، قوم کے مخصوص علما اب سے فائدہ اٹھاتے ہیں، احمد آباد میں (دسوین صدی کے آخر مین یہان ایک، ور کتب خانہ سیلانی بوہرون کی طرف سے قائم کیا گیا تھا جس مین زیادہ تر مذہبی کتابین تھین یہ کتب خانہ بھی آج تک اُن کے داعی کے پاس موجود ہے،

کھنبایت کے کتب خانے | کھنبایت ایک چھوٹی سی مسلمان ریاست ہے، اس زمانہ مین اس کی آبادی بارہ لاکھ تھی، اس لئے اس کے حکمران مومن خان اول کے وقت سے یہان ہمیشہ عربی ایرانی اور ہندوستانی علما، اور فضلار کا مجمع رہا، اور یہان متعدد کتب خانے موجود تھے لیکن جب ریاست پر زوال آیا، تو یہ علمی شیرازہ بھی بکھر گیا، اور کتب خانہ برباد گیا،

کھنبایت کے بعض خاندانون مین اس کا بقیہ حصہ موجود ہے، چنانچہ سید غلام عباس محمد علی صاحب کے یہان ۱۹۲۱ء مین راقم الحروف نے اس کتب خانہ کی بعض کتابین دیکھین اس مین ایک قرآن پاک بھی بخط نستعلیق تھا، جسے لوگ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دست مبارک کی تحریر سمجھ کر بڑی عزت کرتے تھے محکمۂ قضاۃ کا بھی ایک کتب خانہ تھا، جو ضائع گیا، اور موجودہ قاضی صاحب کے پاس چند معمولی کتابین رہ گئی ہین،

ایک دوسرا کتب خانہ عبد اللطیف دیوان صاحب کا تھا، جس کو اُن کے وارث نہ سنبھال سکے، اور آخر مین وہ برباد ہو گیا، باقی کچھ کتابین ایک بقال نے قرض مین لے لین، اس بقال نے راقم الحروف کو یہ کتابین دکھائین لیکن افسوس کہ ان مین کوئی کام کی کتاب نہ تھی، سب معمولی فارسی کی تھین،

احمد آباد کے محکمۂ قضاۃ کا کتب خانہ | اسلامی عہد مین احمد آباد کے قاضی شہر کا عہدہ جیسا بلند ہوتا تھا، وہ پورے ضلع کے محکمۂ قضاۃ کا نگران بھی ہوتا تھا، اس لئے اس کے پاس کتب خانہ بھی ضروری تھا، چنانچہ احمد آباد کے قاضی شہر کے پاس اس وقت بھی ایک کتب خانہ موجود ہے، جو اسلامی سلطنت کے زمانہ سے عہدۂ قضاۃ کے ساتھ ساتھ چلا آرہا ہے، لیکن اولاد بے علم ہونے کے سبب سے اس کا بیشتر

حصہ ضائع گیا ہے، اب سنا ہے کہ کچھ حفاظت کا خیال پیدا ہوا ہے، اور کتابیں صندوقوں سے نکال کر الماریوں میں رکھی گئی ہیں،

راقم الحروف تین بار اس کو دیکھنے کے لئے گیا لیکن نامعلوم مصالح کی بنا پر قاضی صاحب نے دیکھنے کی اجازت نہ دی، اور بہ لطائف الحیل ٹال دیا،

شیخ حضرمی کا کتب خانہ | احمد آباد میں شیخ عبد القادر حضرمی متوفی ۱۰۳۸ھ ایک مشہور بزرگ گذرے ہیں[1] ان کی تصنیفات میں سے النور السافر فی اعیان القرن العاشر بڑی مشہور کتاب ہے، خیال آتا ہے کہ سول اسپتال سے مشرق کو جو گلی گئی ہے، اس کے اختتام کے بعد محلہ جوہری باڑہ میں ان کی قبر ہے ان کے پاس ایک بڑا کتب خانہ تھا[2] لیکن اب بجز مقبرہ کچھ نہیں ہے، شیخ عبد القادر بڑے مورخ، محدث اور صوفی تھے، اس لئے غالباً تصوف، تاریخ اور حدیث کی کتابیں اس میں زیادہ رہی ہونگی،

چانپانیر (گجرات) ایک زمانہ تک پایۂ تخت رہا ہے، سلطان محمود اول کے زمانہ میں مولانا نصر اللہ یہاں کے قاضی شہر بڑے عالم اور متقی مانے جاتے، مشتبہ مال سے ہمیشہ بچتے تھے، ان کے پاس ایک بڑا کتب خانہ تھا جس کا تعلق محکمۂ قضاۃ سے تھا،

بھروچ کے محکمۂ قضاۃ کا کتب خانہ | بھروچ (گجرات) میں بڑا قدیم شہر ہے، یونانی فوجیں جب ہندوستان میں آئی تھیں، اس وقت بھی یہ شہر موجود تھا، اسلامی عہد میں اپنے ضلع کا مرکز تھا، اس لئے یہاں ہمیشہ قاضی کا محکمہ قائم رہا، آخری دور میں یہ عہدہ مولانا سید احمد شیرازی کے خاندان میں منتقل ہوا، ان کے پاس ایک بڑا کتب خانہ تھا جس کا بقیہ حصہ اب تک ان کی اولاد میں موجود ہے،

۱۹۳۲ء میں راقم الحروف نے اس کو دیکھا تھا، اب بھی اس میں بعض نایاب قلمی کتابیں موجود ہیں، قاضی نور الدین صاحب فرماتے تھے[3] کہ میں خردسال تھا کہ والد کا انتقال ہو گیا، اس لئے میری موجودگی

---

[1] خلاصۃ الاثر جلد ثانی ص ۴۴۰ [2] یاد ایام ص ۶۰ علی گڑھ [3] قاضی صاحب موصوف اسی خاندان کے

سنبھالنے تک اس کتب خانہ کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا، اس کتب خانہ کی حسب ذیل کتابیں قابل ذکر ہیں،
مثنوی مولوی روم مکتوبہ ۱۰۹۰ھ جلد پنجم بجدید طرز سے ایڈٹ کی ہوئی محیط سرخسی جلد ثانی مکتوبہ
۹۰۵ھ حدیث میں کتاب الخازن المعروف بطرز جدید جلد ثانی، کتاب الخلاصہ فی الفتادی مولفہ طاہر
ابن احمد بن عبد الرشید البخاری، مجمع البحرین، ترجمہ اُپن کھت، پرم ہنس، ازا تھرن وید وغیرہ

شیخ مہائمی کا کتب خانہ شیخ علاء الدین علی بن احمد مہائمی (ماہم) کے رہنے والے تھے، ۸۳۵ھ میں وفات پائی، اور وہیں مدفون ہوئے[۱]، اُن کا مقبرہ آج تک زیارت گاہ خلائق ہے، شیخ اپنے وقت کے بہت بڑے عالم صوفی اور بہت سی مفید کتابوں کے مصنف تھے،

آپ کے پاس بھی ایک بڑا کتب خانہ تھا، جو عرصہ تک قائم رہا، لیکن پھر متولیوں کی بے توجہی سے اصلی کتب خانہ ضائع ہو گیا، ۱۹۲۳ء میں جب راقم الحروف وہاں گیا، تو دیکھا کہ ایک جدید کتب خانہ درگاہ شریف میں قائم ہے، جس میں عربی فارسی، اردو کی کتابیں تھیں، ناظم کتب خانہ سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا، کہ قدیم کتب خانہ کی بقیہ کتابیں اسی میں، شامل کر دی گئی ہیں، یاد آتا ہے کہ شیخ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کوئی کتاب مجھے دکھائی گئی تھی، لیکن عجلت کے باعث میں اس کو نوٹ نہ کر سکا،

سورت کے نواب صاحب کا کتب خانہ سورت کے نواب صاحب کے پاس بھی ایک کتب خانہ قدیم زمانہ سے چلا آتا ہے، غالباً سورت کا سرکاری کتب خانہ ہے جو وراثت میں نواب صاحب کو ملا ہے،
راقم الحروف اس کو دیکھنے کے لئے دو بار گیا، لیکن نواب صاحب سورت سے باہر تشریف لے گئے تھے، اسلئے ناکامیاب رہا،

خاندان عیدروس کا کتب خانہ سورت کے شرفا میں عیدروس صاحب کا خاندان مشہور خاندان ہے، یہ خاندان

(بقیہ حاشیہ ص ۱۹۵) ممتاز فرد ہیں اور فی الحال اپنے آبائی عہدہ (قضاۃ) پر مامور ہیں، علمی ذوق بھی رکھتے ہیں،

نے اس کتب خانہ کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی، انھوں نے ازراہ لطف وکرم کتابیں دکھائیں، جو صندوقوں
میں ردی کاغذوں کی طرح بھری ہوئی تھیں، فی الحال اس میں کوئی نایاب نسخہ دستیاب نہ ہوا،

راجہ رام نرائن کا کتب خانہ | اسی طرح راجہ رام نرائن کے پاس بھی جو شتاب رائے سے پہلے وہاں کا دیوان
تھا، ایک کتب خانہ تھا، جس کی کتابیں اس کے اخلاف کے پاس اب تک موجود ہیں؛

صادق پور پٹنہ کے کتب خانے | اس کے علاوہ مولوی احمد اللہ صاحب بن مولوی الٰہی بخش صاحب جعفری، اور
مولوی ولایت علی صاحب بن حکیم ارادت حسین صاحب محلہ صادق پور پٹنہ میں بڑے
صاحب علم اصحاب تھے، ان کے پاس بھی اپنے ذاتی کتب خانہ تھا، غدر ۱۸۵۷ء میں حکومت نے انکی
تمام جائداد واملاک ضبط کرلی، اسی میں کتب خانہ بھی تھا، اس طرح اس کتب خانہ کا بڑا حصہ
تو لندن پہنچ گیا، اور کچھ خدا بخش خان کی لائبریری میں آج بھی موجود ہے، بعض کتابیں ان کے
اعزہ کے پاس بھی ہیں، مثلاً شمس العلوم علم لغت میں تبرکاً اس خاندان میں چلی آرہی ہے، عظیم آباد
کے محلہ دیوان، مغلپورہ، حاجی گنج، شاد منزل، تیرہی گھاٹ، دھولپورہ وغیرہ میں اکثر امرا کے پاس
ذاتی کتب خانے موجود تھے، جیسا کہ عظیم آباد کے بزرگوں سے معلوم ہوا، لیکن اسلاف کے علمی شوق کی
اخلاف نے کوئی قدر نہ کی، کتابیں ضائع ہوگئیں، یا بُرے حال میں ہیں،

خانقاہ عباسی کا کتب خانہ | صوبہ بہار میں بھاگل پور کی خانقاہ عباسی مشہور خانقاہ ہے، یہاں
بھی ایک کتب خانہ تھا، اسی طرح پھلواری شریف کی خانقاہ بھی قدیم ہے، اور ہمیشہ سے ارباب علم وفضل کا
مرکز رہی، اور اب تک یہاں رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری ہے، یہاں بھی کتب خانہ قدیم زمانہ سے چلا آرہا ہے، [illegible]

کہا جاتا ہے کہ اس کی قیمت نوّے ہزار تک آنکی گئی ہے، یہ نسخہ بھی اسی ٹیپو سلطان کے کتب خانہ کی نادر چیز تھی[۱]

مدرسہ عربیہ خانقاہ کا کتب خانہ
صوبہ بہار میں سہسرام مشہور جگہ ہے، جس کو شیر شاہ کی ولادت گاہ ہونے کا فخر حاصل ہے یہاں بارہویں صدی کی ابتدا میں ایک بزرگ شاہ کبیر درویش رہتے تھے، ۱۱۲۹ھ میں فرخ سیر بادشاہ نے ایک لاکھ درہم آمدنی کے اٹھارہ موضع شاہ صاحب کو نذر کئے جن پر اُن کے جانشین شاہ خلیل اللہ صاحب نے قبضہ کیا، اس کے بعد ۱۱۷۵ھ میں شاہ عالم ثانی نے بھی (۱۴) مواضعات التمغا کے طور پر عنایت کئے،[۲]

اس خانقاہ کے متعلق ایک مدرسہ بھی قائم ہوا تھا، جو آج تک موجود ہے، مدرسہ کا نام مدرسہ عربیہ خانقاہ ہے[۳] غالباً خانقاہ کی بنیاد ہی سے اس میں کتب خانہ قائم کیا گیا ہوگا، جیسا کہ عام طور سے دوسری خانقاہوں میں دستور تھا، لیکن مدرسہ عربیہ کے قیام کے بعد اس کا تعلق مدرسے کر دیا گیا یہ کتب خانہ بہت بڑا اور بہت بیش قیمت تھا، اس کی قیمت کا اندازہ تقریباً ایک لاکھ کیا جاتا ہے۔ غالباً مدرسہ کے ساتھ یہ کتب خانہ آج بھی موجود ہے،

راجہ شتاب رائے کا کتب خانہ
سلطنت مغلیہ کے آخر زمانہ میں پٹنہ (بہار) کا ناظم شتاب رائے تھا، جو علوم و فنون کا مربی، اور اہلِ علم کا بڑا قدر دان تھا، اس کے مرنے کے بعد اس کا لڑکا راجہ کلیان سنگھ ناظم ہوا، یہ خود کئی کتابوں کا مصنف اور شاعر تھا، اس کے پاس ایک بڑا کتب خانہ تھا جس میں زیادہ تر فارسی ادب کی اور کچھ تاریخ کی کتابیں تھیں، زمانہ کے ساتھ ساتھ جس طرح اس کی اولاد فارسی سے نابلد ہوتی گئی، اسی طرح آہستہ آہستہ کتب خانہ بھی غفلت کی نذر ہوتا گیا،

ابھی چند سال ہوئے ایک نمائش کے موقع پر چند اہلِ علم نے اس خاندان کے ایک معزز ممبر

---

[۱] تاریخ میسور ص ۲۵۵ مطبوعہ بنگلور [۲] تاریخ سہسرام ص ۹، مطبوعہ دیوبند [۳] تاریخ مذکور ص ۱۰۴،

غرض اردو زبان کی کتابیں انڈیا آفس لندن مین جو داخل کی گئین، اُن مین سے مخصوص نایاب کتابیں مندرجہ ذیل ہین،

تذکرہ شعراے ہندی	مؤلفہ فتح علی حسین خان	قصہ ماہ پیکر	....
علی نامہ	” ملا نصرتی	قصہ بہرام وگل اندام (کمرہ)	قلمی مکتوبہ ۱۰۸۱ھ
گلشن عشق	”	دیوان رفیع سودا،	مرزا سودا
کلیات قطب شاہ	” قطب شاہ	قصائد رفیع سودا	”
روح افزا (قصہ رضوان شاہ)	” فائز	سری گنیش	ترجمہ سنسکرت
قصہ ماہ پیکر	”	سندر سنگھار ہندی	”
قصہ بہرام وگل اندام	” طبعی گولکنڈوی	دھوری ہندی	شاہ درویش گجراتی قصوری
پھول بن	” ابن نشاطی	روضۃ الشہداء	سیوا گل برگوی
طوطی نامہ	”	رسالہ سرود وراگ یعنی	......
قصہ پدماوت دکھنی	”	مجموعہ قدیم دکھنی غزلیات	
قصہ لعل وگہر	” عارف الدین خان آخر	نشاط العشق شرح غوثیہ	ترجمہ
دیوان یقین	” انعام اللہ خان یقین	ترجمہ مفتاح الصلاۃ	فتح محمد برہان پوری
بھوگ بل	” مترجمہ شہاب الدین	خلاصہ سلطانی	سید امام الدین ومحمد صمد قاضی
مفرح القلوب	” حسین علی،	سرنگا پٹن،	
قصہ رضوان شاہ	مؤلفہ فائز	کلید زبان تلنگی،	....

اسی طرح ونڈسر کیسل کے کتب خانہ مین قرآن مجید کا وہ نسخہ بھی موجود ہے، جو خاص شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، بہترین خط نسخ مین اعلی النقش و نظافت سے مزین ہے، (رباقی)

لندن روانہ کردی گئیں،

۱۸۰۹ء میں میجر اسٹورٹ نے ان باقی ماندہ کتابوں کی جو فہرست شائع کی تھی، اس میں فنون کے لحاظ سے کتابوں کی تعداد مندرجہ ذیل تھی،

قرآن مجید	۴۴	ریاضی	۷	حدیث	۴۲
تصوف	۵۲	ہندی نظم	۲۳	آرٹس	۱۹
نجوم	۲۰	وظائف	۳۵	زبان	۴۵
نظم	۱۹	فقہ	۹۵	ترکی	۲۰
تفسیر	۴۱	طب	۶۲	الہیات	۴۴
اخلاق	۲۴	دکھنی	۴	فلسفہ	۵۴
قصص	۱۸	لغات	۲۹		

رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے کتب خانہ میں جتنی کتابیں داخل ہوئیں، ان میں سے مخصوص کتابیں یہ تھیں،

رسالہ بدکھا	روزنامہ وکلائے حیدرآباد
منتخب ضوابط سلطانی	اتالیق شاہزادہ
رسالہ کچہری	مجموعہ مسندات
ضابطہ اشال	حکمنامہ
راہ فتن وسوار	فرمان
فتح المجاہدین	فرامین کا مجموعہ
وقائع منازل	

ایک مکمل نسخہ احمد آباد مین دیکھا ہے، اور یہ دوسرا نسخہ ہے، یہ دیوان ابھی تک غیر مطبوعہ ہے، معتقدین اس کو آنکھون سے لگاتے ہین، مگر طبع کرنے کے خلاف ہین،

خانقاہ شاہ عبد العلیم کا کتب خانہ بھروچ سے متصل ایک قصبہ انکلیشور ہے، یہان شاہ عبد العلیم صاحب کی خانقاہ اور درگاہ و مسجد ہے، یہان بھی قدیم زمانہ مین بڑا کتب خانہ تھا، اور چونکہ سورت کے راستہ مین پڑتا تھا، اور قافلون کا پڑاؤ یہان ہوتا تھا، اس لئے یہ قصبہ بڑا آباد ہو گیا تھا، اہل علم اس کتب خانہ سے فائدہ اٹھاتے تھے، اب یادگار کے طور پر تھوڑی سی کتابین رہ گئی ہین،

میسور کا شاہی کتب خانہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے زمانہ مین جب میسور مین نواب حیدر علی نے اپنی خود مختار سلطنت قائم کی، تو یہان بھی شمع علم کے پروانے ادھر ادھر سے آکر جمع ہونے لگے، پھر ٹیپو سلطان کی قدردانی سے میسور مین اہل کمال کا بڑا گروہ جمع کر لیا، جو افسوس ہے کہ اس کے بعد پھر کبھی نظر نہ آیا، ٹیپو سلطان کے پاس جو صاحب علم خصوصاً اہل کمال پہنچتا تو وہ اپنی جوہر شناسی سے اس کو اسی کام مین لگا دیتا، جس کا وہ اہل ہوتا، چنانچہ اس نے کسی کو محکمۂ جنگ مین کسی توپ خانہ اور کسی کو بحری بیڑہ مین جگہ دی، اسی طرح علماء مین سے کسی کو تعلیم، کسی کو تصنیف اور کسی کو ترجمہ پر مقرر کیا تھا۔

اس نے ایک یونیورسٹی بھی قائم کی تھی، جس کے ماتحت مختلف علوم و فنون کے شعبے کھولے جا رہے تھے، اس سے متعلق ایک عظیم الشان کتب خانہ بھی تھا جس مین تمام علوم و فنون کی کتابین تھین ۱۲۱۳ھ (۱۷۹۹ء) مین جب سلطان شہید ہوا، اور سرنگا پٹن پر انگریزون کا قبضہ ہو گیا، تو قلعہ اور محلات شاہی کے ساتھ کتب خانہ بھی انگریزون کے قبضہ مین آگیا، اور قصر شاہی کی دوسری چیزون کی طرح کتب خانہ بھی تاراج ہو گیا، اس لوٹ کے بعد جو کتابین بچین وہ چھ سال تک کسمپرسی کی عالم مین پڑی رہین، اس کتب خانہ کی کتابین کچھ تو رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، اور باقی

سلطان محمود بن لطیف خان کے عہد ۸۵۸ھ میں حضر موت سے احمد آباد آیا، پھر ان کے لڑکے بھروچ میں آ کر ہوتے سورت میں ۸۷۵ھ میں وارد ہوئے "جاء الجواد الفیاض" اس آمد کی تاریخ ہے[1]

یہ خاندان ہمیشہ سے صاحب علم رہا ہے، اور اُس نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ برابر جاری رکھا اس کے پاس ایک بڑا کتب خانہ بھی تھا، جو سلسلہ بہ سلسلہ اس وقت تک خاندان میں چلا آرہا ہے، ۱۹۳۲ء میں راقم الحروف نے اس کتب خانہ کو دیکھا تھا، اب بھی بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے، حدیث، تصوف، ادب تاریخ کی کتابیں زیادہ ہیں

سید قمر الدین کا کتب خانہ | سورت ہی میں ایک اور کتب خانہ سید قمر الدین مرحوم کا ہے، ضائع ہوتے ہوتے جس کی اب تین الماریاں رہ گئی ہیں، راقم الحروف ۱۹۳۲ء میں اس کو دیکھنے لئے گیا، تو اس وقت گھر میں کوئی مرد نہ تھا، پردہ کرا کے اس کتب خانہ کی سیر کی،

افسوس ہے کہ اس میں کوئی نایاب کتاب نہ ملی، صرف ایک کتاب جس کا نام اللہ خدائی ہے، قابل ذکر نظر آئی، یہ خالق باری کے طرز کی تھی،

اس کے دو ابتدائی شعر یہ ہیں،

ہے حمد پاک اور احد یکہ جان اتم الغری کو تو مکہ

اب، پدر، باپ، والدہ مائی ہست اقوی برادر ابھائی

یہ کتاب ۱۲۷۰ھ میں بمقام بمبئی اسماعیل شیرازی کے ذریعہ طبع ہوئی ہے،

دوسری کتاب "کلام اقدس" ہے، اس کے مصنف حضرت پیر محمد شاہ بیجاپوری ہیں، جو چالیس برس تک احمد آباد کی جامع مسجد میں معتکف رہے، یہ شاعر بھی تھے، تخلص "اقدس" تھا، اردو کے مشہور شاعر ولی گجراتی کے ہمعصر تھے، متعدد نظمیں اردو میں لکھی ہیں، ان کا دیوان بہت نایاب ہے، راقم الحروف نے

---

[1] کتاب مزارات صورت و بھروچ مؤلفہ عبد الحکیم متوفی ۱۳۰۰ھ قلمی کتب خانہ عیدروس سورت،

وہ شعر و ادب کا بھی نہایت عمدہ مذاق رکھتے تھے، اسلام کے بعد گو شعر و شاعری کا جاہلی مذاق باقی نہیں رہا تھا، لیکن شعرائے جاہلیت کے اشعار ان بزرگون کو کثرت سے یاد تھے، اور ہر شاعر کی خصوصیات اور اس کی شاعری پر ناقدانہ نظر رکھتے تھے، حضرت عمرؓ کے متعلق تو مشہور ہے کہ وہ جب کوئی فیصلہ کرتے تھے اس کی مناسبت سے کوئی نہ کوئی شعر ضرور پڑھتے تھے[1]،

خلفائے راشدین کبھی کبھی خود بھی طبع آزمائی کرتے تھے، اہل ادب خصوصاً ابن رشیق نے کتاب العمدہ مین اُن کے بہت سے اشعار نقل کئے ہین، لیکن خلفائے اربعہ خصوصاً حضرت علیؓ کی طرف جتنے اشعار منسوب کئے گئے ہین[2]، ان کا بڑا حصہ جعلی ہے،

خلفائے راشدین کے بعد اموی دور مین دوسری قومون کے اختلاط اور بعض دوسرے اسباب کی بنا پر مسلمانون مین تصنیف و تالیف کا ذوق پیدا ہونا شروع ہوا، اور اموی خلفاء کی علم نوازی اور علمی سرپرستی نے اس ذوق کو اور زیادہ ترقی ہوئی،

اگرچہ اموی دور مین "اسلامی علوم" کی مختلف شاخین پیدا ہو چکی تھین، لیکن حکومت کی سرپرستی جس فن کو سب سے پہلے حاصل ہوئی، وہ فن تاریخ ہے، چنانچہ حضرت معاویہؓ نے عبید بن شریہ سے "تاریخ کی ایک کتاب "اخبار الماضین"[3] لکھوائی؛

حضرت معاویہؓ کے بعد یزید اور اس کے لڑکے معاویہ کے زمانہ مین کوئی خاص علمی کام انجام نہین پایا، مگر یزید کے ایک دوسرے لڑکے خالد بن یزید نے خلافت سے مایوس[4] ہونے کے بعد البتہ اپنی ساری

---

[1] البیان والتبیین اور کتاب العمدہ وغیرہ مین ان واقعات کی تفصیل موجود ہے؛ ص ۵، [2] حضرت علیؓ کے نام سے ایک مطبوعہ دیوان بازارون مین ملتا ہے، لیکن اہل نظر جانتے ہین، کہ وہ زبان اور طرز ادا کے اعتبار سے کسی طرح اس نسبت کا مستحق نہین ہے [3] نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی نے اس کتاب کے متعلق ایک تفصیلی مضمون لکھا ہے، جو ان کے مجموعۂ مضامین عماد یہ مین موجود ہے [4] معاویہ ثانی کے بعد یہ خلافت کا امیدوار تھا، لیکن مروان نے اس کی جگہ لے لی

توجہ علم و فن کی جانب مبذول کر دی اور خصوصیت سے علم نجوم اور علم کیمیا میں دسترس بہم پہنچائی اس نے اپنی سرپرستی میں فلاسفہ کی ایک جماعت قائم کی جس سے ہیئت و کیمیا کی بہت سی کتابیں عبرانی اور قبطی سے عربی میں ترجمہ کرائیں، کرہ کے ذریعہ علم ہیئت کے مسائل کو سمجھنے کی بنیاد بھی اسی نے ڈالی ابن قفطی[1] نے لکھا ہے کہ قاہرہ کے کتب خانہ میں ایک کرہ ہے جس پر یہ عبارت درج ہے،

حملت ھذہ الکرۃ من الامیر خالد بن یزید بن معاویہ (اخبار الحکما) — یہ کرہ امیر خالد بن یزید کے یہاں سے لایا گیا،

غرض اسلام میں دوسری زبان سے ترجمہ اور کرہ سازی کی ابتدا اسی کے علمی ذوق کی رہین منت ہے[2] فلاسفہ میں خالد حکیم آل مروان کے لقب سے مشہور ہے،

اس کے بعد مروان اور پھر عبد الملک خلیفہ ہوئے، مروان کو علم و فن سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا، تاہم ایک طبی کتاب[3] جس کا ترجمہ سریانی سے عربی میں ماسرجویہ یہودی نے کیا، اسی کے زمانہ کی یادگار ہے، (ابن ندیم)

عبد الملک البتہ علم و فضل کے اعتبار سے ممتاز حیثیت رکھتا تھا فن حدیث اور شاعری پر خاص طور سے اس کی وسیع نظر تھی، عربی نثر بھی اچھی لکھتا تھا، جاحظ نے البیان والتبیین میں اس کی تحریر کا نمونہ نقل کیا ہے، مشہور تابعی حضرت سعید بن جبیر سے اس نے ایک تفسیر لکھوائی[4] اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ سرکاری دفاتر کی زبان جو اب تک فارسی یا رومی تھی، اسے عربی کر دیا، جس سے عربی زبان کی بڑی ترقی اور اشاعت ہوئی[5]

---

[1] قفطی نے ۶۴۶ھ میں وفات پائی، اس کے معنی یہ ہوئے کہ ساتویں صدی ہجری تک یہ کرہ موجود تھا [2] جمال الدین قفطی نے لکھا ہے کہ قدیم زمانہ کے جس قدر فرماں روا تھے، یہ کتاب ان سب میں عمدہ تھی طبقات الاطباء ج ۱ ص ۱۱۶ [3] میزان الاعتدال ج ۲ ص ۱۹۰ [4] تاریخ الخلفاء،

عبد الملک کے بعد ولید اورنگ خلافت پر بیٹھا، وہ بہت کم پڑھا لکھا تھا، عربی تک غلط بولتا تھا، علم و فن سے اُسے کی دلچسپی ہوتی، پھر بھی اس کے عہد میں حجاج بن یوسف کے ذریعہ ایک بڑا کام یہ انجام پایا، کہ قرآن جو اب تک بے اعراب اور بے نقطے کے تھا اس پر نقطے اور اعراب لگائے گئے، ولید کے بعد سلیمان نے خلافت پائی، سلیمان بڑا متدین اور صاحب علم و فضل تھا، اس کے زمانہ میں مذہبی رنگ بہت عام ہوا، مگر کوئی خاص علمی کام انجام نہیں پایا، سلیمان کے بعد خلافت کی باگ ڈور حضرت عمر بن عبد العزیز کے ہاتھ میں آئی، آپ نے جہاں اموی حکومت کی خامیوں اور خرابیوں کی اصلاح و تجدید کی، وہاں بہت سے علمی کام بھی انجام دیے،

آپ نے تعلیم دین کی طرف خاص توجہ کی، اور ہر فن کے اساتذہ کو اس فن کی تدریس کے لئے مقرر کیا، مروان کے زمانہ کی مترجمہ قرابادین کا نسخہ شاہی کتب خانہ میں محفوظ تھا، اس کی بہت سی نقلیں کرا کے ممالک محروسہ میں بھیجیں، ان کا سب سے بڑا علمی و مذہبی کارنامہ یہ ہے کہ حدیث نبوی کے جو ذخیرے متفرق محدثین کے پاس موجود تھے، بڑی احتیاط سے ان کا ایک مجموعہ تیار کرایا، اور اس کی بہت سی نقلیں ملک کے تمام گوشوں میں بھیجیں، اس طرح حدیث کا ایک بڑا ذخیرہ ایک جگہ محفوظ ہو گیا،

عمر بن عبد العزیز کے بعد بنو امیہ کے جتنے خلفاء ہوئے، ان میں ہشام کے علاوہ کسی کو علم و فن سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اور نہ انھوں نے کوئی تعلیمی کام انجام دیا، ہشام البتہ خود صاحب علم تھا اور اُسے علمی کاموں سے دلچسپی تھی، اس نے امام زہری سے ۰۰ ۴ حدیثوں کا ایک مجموعہ مرتب کرایا، ہشام کا ایک میر منشی جس کا نام سالم تھا، اس نے ارسطو کے رسالوں کا جو سکندر کے نام تھے، عربی

۱؎ تاریخ الخلفاء ۱۵۲ ۲؎ تہذیب التہذیب ۳؎ طبقات الاطباء ج ۱ ص ۱۱۶ ۴؎ جامع بیان العلم و فضلہ ۳۸ ۵؎ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۰

مین ترجمہ کیا،[1] اس کے لڑکے جبلہ نے بہت سی فارسی کتابین عربی مین ترجمہ کین،[2]

فارسی زبان مین غیر قومون کے علوم و فنون اور ان کے فرمانرواؤن کے حالات اور سیاسی واقعات پر مشتمل ایک کتاب تھی، ہشام نے اس کے ترجمہ کا حکم دیا، چنانچہ ۱۱۳ھ مین یہ ترجمہ مکمل ہوا، یہ کتاب مفقود ہے، اور مسعودی کی نظر سے گذری تھی، تنبیہ الاشراف مین اس نے اس کا مفصل حال لکھا ہے،[3] ۱۲۵ھ مین ہشام نے وفات پائی، اور اس کی وفات کے ساتھ گویا بنو امیہ کی علمی اور سیاسی دونون حیثیتون کا خاتمہ ہو گیا،

۱۳۲ھ مین خلافت عباسیہ قائم ہوئی، عباسی عہد کو علمی اور تمدنی ترقیون کے اعتبار سے مورخین اسلام دور اسلامی کا عصر ذہبی (سنہرا دور) کہتے ہین یہ واقعہ ہے کہ اس دور مین علوم و فنون کی جو خدمت انجام پائی، وہ تاریخ مین آپ اپنی مثال ہے، اسکا بڑا سبب یہ تھا کہ بیشتر عباسی خلفا خود علم دوست اور علما نواز تھے، اور ان کی علمی سرپرستی سے اس زمانہ مین ایک عام علمی مذاق پیدا ہو گیا تھا،

دولت عباسیہ کا پہلا خلیفہ سفاح تھا، جس نے دو ڈھائی برس حکومت کی، اور وہ بھی تمامتر عباسی خلافت کے قیام و نظم مین گذرے، اس کے بعد منصور مسند آرا ہوا، اسی سے خلافت عباسیہ کا اصلی دور سمجھنا چاہیے، منصور خود صاحب علم اور علم و فن کا بڑا قدردان اور سرپرست تھا، عباسی دور کی علمی تاریخ کا آغاز اسی سے ہوتا ہے، ابن صاعد نے طبقات الامم مین لکھا ہے کہ خلفاء عباسیہ مین منصور پہلا شخص ہے، جس نے علوم و فنون کی طرف توجہ کی اور انکو کافی ترقی دی، (ص ۵،)

عبداللہ بن مقفع نے جو منصور کا کاتب تھا منطق و فلسفہ اور ادب کی بہت سی کتابیں دوسری زبانون سے عربی مین ترجمہ کین،[4] علم نجوم کی ایک مشہور کتاب السند ہند ہندوستان کے ایک عالم نے منصور کے سامنے پیش کی تھی، اس نے محمد بن ابراہیم الفزاری کو اس کے ترجمہ کا حکم دیا،[5] اسی طرح اوس نے

---

[1] ابن ندیم ص ۲۴۴ [2] ایضاً ص ۳۰۵ [3] ص ۱۰۶ [4] طبقات الامم ص ۴۹ [5] ایضاً ص ۴۹

ب کی بہت سی کتابیں اپنے دربار کے مشہور طبیب بطریق جارج بن جبرئیل سے ترجمہ کرائیں۔[1]

منصور کے بعد مہدی سریر آرائے خلافت ہوا، اس کے زمانہ میں ترجمہ و تصنیف کے اور کاموں کے علاوہ ایک خاص کام یہ انجام پایا کہ اس نے علماء کو حکم دیا کہ وہ ملحدوں کے رد میں کتابیں لکھیں اور اُن کے اعتراضات اور گمراہ کن خیالات کی تردید کریں، اس طرح اس کے عہد میں علم کلام کی بنیاد پائی، مہدی کے بعد ہارون رشید اورنگ خلافت پر بیٹھا، یہ منصور سے بھی زیادہ علم دوست اور اہل علم کا قدردان تھا، اس کا سب سے بڑا علمی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے بیت الحکمت کے نام سے ایک علمی ادارہ قائم کیا، جس کے ذریعہ تالیف و ترجمہ کے بڑے بڑے کام انجام پائے، اور علوم و معارف کے گنجہائے گراں مایہ سے عربی زبان کا دامن مالا مال ہوا،

ہارون رشید کے بعد ابراہیم بن مہدی اور مامون کا زمانہ آتا ہے، جو ہمارا اصل موضوع ہے، لیکن اصل موضوع شروع ہونے سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ اسلام کے پورے دور تصنیف میں حکومت کی سرپرستی کے علاوہ علماء کی انفرادی کوششوں کے ذریعہ بھی نہایت اہم اور قیمتی علمی خدمات انجام پائے، مگر ان کا اصلی مقصد دین رہا، اس لئے اُن کی تالیفات و تصانیف بھی زیادہ تر دینی ہی علوم و فنون سے متعلق ہیں، اس کے مقابلہ میں حکومت یا خلفاء و سلاطین کی سرپرستی میں جو کام انجام پائے، ان کا تعلق زیادہ تر علوم دخیلہ، طب، نجوم، جغرافیہ، ریاضی یا تمدنی علوم موسیقی وغیرہ یا ادب و شاعری وغیرہ سے رہا، اس لئے شاہان اسلام کی علمی تاریخ میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ وہ اسلام کے مقابلہ میں غیر اسلامی تہذیب و تمدن اور علوم و فنون سے زیادہ متاثر رہے، اس لئے ان کی بیشتر تالیفات بھی انہی علوم سے متعلق ہیں، گو ان میں استثنائی مثالیں بھی ہیں،

ابراہیم بن مہدی عباسی خاندان میں ابراہیم بن مہدی پہلا شخص ہے، جو صاحب علم ہونے کے ساتھ

---

[1] طبقات الاطباء ج ۱ ص ۲۰۵ و ابن ندیم ص ۴۲۶ و ۲۴۴

صاحب تصنیف بھی تھا،

ابراہیم خلیفہ مہدی عباسی کا لڑکا تھا، وہ سات ہی برس کا تھا کہ مہدی کا انتقال ہوگیا، اس لئے اس کی تعلیم و تربیت کا کوئی معقول انتظام نہیں ہوسکا لیکن اس کی ماں شکلہ کی تربیت اور خود اس کی فطری صلاحیت کی وجہ سے اسے علم و فن سے تعلق پیدا ہوگیا،

خلفاء کی صحبت اور منادمت ابراہیم نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے چار خلفاء ہارون، امین، مامون اور معتصم کا زمانہ دیکھا، اور ان میں سے ہر ایک کی مجلس منادمت اور محفل شعر و ادب میں شریک ہوتا رہا، خصوصاً مامون کی کوئی مجلس مشکل ہی سے ابراہیم کی شرکت سے خالی ہوتی تھی،

امارت اور معزولی مہدی کے بعد ہارون خلیفہ ہوا اُس نے ابراہیم کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی لیکن مامون جب خلیفہ ہوا، تو اُس نے ابراہیم کو بہت نوازا اور دمشق کی امارت اس کے سپرد کی، دو برس تک وہ امارت کے فرائض انجام دیتا رہا لیکن ایک غلطی کی وجہ سے اسے معزول کر دیا،[۵]

بغداد کی خلافت مامون کو اہلِ بیت نبوی سے بڑی محبت تھی، چنانچہ اُس نے ۲۰۱ھ میں حضرت علی بن موسیٰ رضا کو ولیعہد بنا کر تمام ممالکِ محروسہ میں اس کا اعلان کرادیا، اور حکم دیدیا کہ سیاہ عباسی رنگ کی وردیوں کے بجائے سبز فاطمی رنگ کی وردیاں اور لباس استعمال کئے جائیں اور علی بن موسیٰ رضا کی عام بیعت کیجائے،

بغداد میں چونکہ بنی عباس کا اثر زیادہ تھا، اس لئے اہلِ بغداد نے اس حکم کی خلاف ورزی کی، اور مامون کی بیعت فسخ کرکے ابراہیم کو خلیفہ منتخب کرلیا، اور مامون کے بجائے ابراہیم کا نام خطبہ میں پڑھا جانے لگا،

مامون کو جب اس انقلاب کی اطلاع ہوئی تو اس نے خراسان سے بغداد کا قصد کیا، مرو سے

---

۵ تاریخ ابن جریر ج ۱۰ ص ۱۰۲۳ تا ۱۰۳۰،

اطلاع بغداد پہنچی تو پولیس اور فوج نے آہستہ آہستہ ابراہیم کا ساتھ چھوڑنا شروع کر دیا، ابراہیم ت کچھ ہاتھ پیر مارے لیکن آخر کار اُسے تخت خلافت چھوڑنا پڑا، اور وہ بغداد سے باہر چلا گیا اور روپوش ہو گیا،[1]

چھ برس کے بعد مامون کے پاس معذرت نامہ لکھا، اور اپنی گذشتہ غلطیوں کی معافی چاہی مامون تھوڑی سی رد و قدح کے بعد اُسے معاف کر دیا، اور عفو و درگذر کے بعد اسے اپنا ندیم خاص بنا لیا،[2]

ابراہیم صورۃً بڑا بدہیئت اور بدوضع تھا لیکن سیرۃً نہایت نرم خو، فیاض اور کشادہ دست اس کی فیاضی کے متعدد واقعات کتابوں میں مذکور ہیں،

علم ادب ابراہیم شعر و ادب طب اور موسیقی میں اپنے پیشرو خلفاء سے ممتاز تھا، تمام اہل تذکرہ اس کے فضل و کمال پر ہم زبان ہیں، ابن ندیم نے لکھا ہے،

اوّل نابغ نبغ من بنی العباس	بنی عباس پھر خلفاء کی اولاد میں ابراہیم
ثم من اولاد الخلفاء،	پہلا شخص ہے جو علم و فن اور شعر و ادب
(فہرست ۱۶۴)	میں غیر معمولی مہارت رکھتا تھا،

خطیب بغدادی اور ابن خلکان نے لکھا ہے،

کان وافر الفضل غزیر الادب	بڑا فاضل اور ادب میں وسیع النظر
.... ولم یر فی اولاد الخلفاء	تھا، .... خلفاء
افصح منه لسانا ولا احسن	کی اولاد میں اس سے اچھا شاعر اور اس
منه شعرا،[3]	سے زیادہ فصیح دیکھنے میں نہیں آیا،

اغانی میں ہے،

---

[1] ابن اثیر ج ۶ صفحہ ۱۲۵ [2] یعقوبی ج ۲ ص ۵۴۳ [3] ابن خلکان،

کان رجلاً عاقلاً فاضلاً فہیما	ابراہیم عاقل فاضل فہیم، ادیب شاعر، اور
ادیبًا شاعرًا راویۃ الشعر	اہل عرب کے اشعار اور اُن کے تاریخی
وایام العرب خطیبًا فصیحًا (جلد ۹ صفحہ)	واقعات کا راوی خطیب اور فصیح شخص تھا،

اسحق موصلی کا قول ہو کہ عباس بن عبدالمطلب کی اولاد میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے بعد ابراہیم جیسا فاضل آدمی پیدا نہیں ہوا، (اغانی)

شعروشاعری | ابراہیم کو شعروشاعری کا خاص ذوق تھا، وہ خود شعر کہتا تھا، اور کثرت سے دوسرے شعرار کے اشعار اسے یاد تھے، اس کے جو چند مرثیے اور متفرق اشعار تاریخ و تذکرہ کی کتابوں میں ملتے ہیں، اُن سے اس کے ذوقِ شعری کا پورا اندازہ ہوتا ہے، سلاست، روانی اور جدتِ تشبیہات اس کے اشعار کی خاص خصوصیات ہیں،

عباسی دور میں شاعری نے حُسن معانی، تنوع مضامین اور جدت تشبیہ کے لحاظ سے بڑی ترقی کی؛ لیکن ان محاسن کے ساتھ ایک عیب یہ پیدا ہوگیا کہ اموی دور کی طرح الفاظ کی بندش، جملوں کی چستی اور خالص ٹکسالی زبان باقی نہیں رہی، چنانچہ اس دور کے خالص عربی نژاد شعرا کے علاوہ مشکل سے کسی شاعر کا کلام اس عیب سے پاک ہوگا،

ابراہیم گو خالص عربی نژاد نہیں تھا، اس کی ماں عجمی تھی لیکن اس کے کلام کا جو نمونہ ہمارے سامنے ہے، اس کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی شاعری دورِ عباسیہ کے محاسن شعری کی حامل، اور اس دور کے معائب سے بڑی حد تک محفوظ ہے، غالبًا اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی ابتدائی تعلیم و تربیت خالص عربی ماحول یعنی طائف میں ہوئی تھی،

اس کے مراثی اور غزل کے چند اشعار نمونۃً نقل کیے جاتے ہیں،

ابراہیم کے دو لڑکے تھے، اور دونوں کا انتقال اس کی زندگی ہی میں ہوگیا تھا، اس کے

ایک لڑکے کا نام احمد تھا، اس سے اس کو بڑا تعلق خاطر تھا، جب اس کا انتقال ہوا تو اس نے بڑے پر درد اور پرسوز مرثیے کہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں،

نائی اخرالایام عنک حبیب   فللعین سح دائم و غروب

زندگی کے آخری ایام میں تم سے حبیب دور ہو گیا، اب زندگی بھر رونا اور آنسو بہانا ہے،

دعته نوی لا یرتجی اوبة لها   فقلبك مسلوب وانت کئیب

اس کو جدائی نے بلا لیا ہے، اب اس کے لوٹنے کی امید نہیں ہے، اے ابراہیم تمھارا قلب لٹ چکا اور تمھارے حصہ میں اب غم ہی غم ہے،

یؤب الی اوطانه کل غائب   واحمد فی الغیاب لیس یؤب

ہر جانے والا اپنے وطن میں واپس آتا ہے لیکن احمد ان جانے والوں میں ہے جو واپس نہیں لوٹیگا۔

یہ مرثیہ بہت لمبا ہے، طوالت کے خیال سے ہم صرف چند اشعار اور نقل کرتے ہیں جن میں کوئی تشبیہ یا تمثیل موجود ہے،

تولی وبقی بیننا طیب ذکره   کما فی ضیاء الشمس حین تغیب

وہ چلا گیا لیکن اپنی یاد ہمارے درمیان چھوڑ گیا ہے جس طرح آفتاب کے غروب ہونے کے بعد بھی شفق باقی رہتی ہے، جو اس کی یاد تازہ کرتی رہتی ہے،

یسیراً من الایام لم یرو ناظری   بها منه حتی اعلقته شعوب

تھوڑے دن بھی میری آنکھیں اس کی دید سے آسودہ نہیں ہونے پائی تھیں کہ وہ لقمۂ اجل ہو گیا،

کظل سحاب لم یقم غیر ساعة   الی ان اطاحته فطاح جنوب

وہ بدل کے سایہ کے مانند تھا جو تھوڑی دیر بھی باقی نہیں رہا تھا کہ اسکو دکھنی ہوا اڑا لے گئی

كان رجلاً عاقلاً فاضلاً فهيماً	ابراہیم عاقل فاضل فہیم، ادیب شاعر، اور
اديبًا شاعرًا راوية الشعر	اہل عرب کے اشعار اور اُن کے تاریخی
وايام العرب خطيبًا فصيحًا (جلد ۹ ص ۲۰)	واقعات کا راوی خطیب اور فصیح شخص تھا،

اسحٰق موصلی کا قول ہے کہ عباس بن عبد المطلب کی اولاد میں عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے بعد ابراہیم جیسا فاضل آدمی پیدا نہیں ہوا، (اغانی)

شعر و شاعری ابراہیم کو شعر و شاعری کا خاص ذوق تھا، وہ خود شعر کہتا تھا، اور کثرت سے دوسرے شعراء کے اشعار اسے یاد تھے، اس کے جو چند مرثیے اور متفرق اشعار تاریخ و تذکرہ کی کتابوں میں ملتے ہیں، اُن سے اس کے ذوقِ شعری کا پورا اندازہ ہوتا ہے، سلاست، روانی اور جدت تشبیہات اس کے اشعار کی خاص خصوصیات ہیں،

عباسی دور میں شاعری نے حُسن معانی، تنوع مضامین اور جدت تشبیہ کے لحاظ سے بڑی ترقی کی، لیکن ان محاسن کے ساتھ ایک عیب یہ پیدا ہوگیا کہ اموی دور کی طرح الفاظ کی بندش، جملوں کی چستی اور خالص ٹکسالی زبان باقی نہیں رہی، چنانچہ اس دور کے خالص عربی نژاد شعراء کے علاوہ مشکل سے کسی شاعر کا کلام اس عیب سے پاک ہوگا،

ابراہیم گو خالص عربی نژاد نہیں تھا، اس کی ماں عجمی تھی، لیکن اس کے کلام کا جو نمونہ ہمارے سامنے ہے، اس کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی شاعری دورِ عباسیہ کے محاسن شعری کی حامل، اور اس دور کے معائب سے بڑی حد تک محفوظ ہے، غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی ابتدائی تعلیم و تربیت خالص عربی ماحول یعنی طائف میں ہوئی تھی،

اس کے مراثی اور غزل کے چند اشعار نمونۃً نقل کئے جاتے ہیں،

ابراہیم کے دو لڑکے تھے، اور دونوں کا انتقال اس کی زندگی ہی میں ہوگیا تھا، اس کے

معارف نمبر ۳ جلد ۶۳

ایک لڑکے کا نام احمد تھا، اس سے اس کو بڑا تعلق خاطر تھا، جب اس کا انتقال ہوا تو اس نے بڑے پر درد اور پر سوز مرثیے کہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں،

نائی آخر الایام عنک حبیب　　فللعین سح دائم وغروب

زندگی کے آخری ایام میں تم سے حبیب دور ہو گیا، اب زندگی بھر رونا اور آنسو بہانا ہے،

دعته نوی لا یرتجی اوبة لها　　فقلبک مسلوب وانت کئیب

اس کو جدائی نے بلا لیا ہے، اب اس کے لوٹنے کی امید نہیں ہے، اے ابراہیم تمہارا قلب لٹ چکا اور تمہارے حصہ میں اب غم ہی غم ہے،

یؤوب الی اوطانه کل غائب　　واحمد فی الغیاب لیس یؤوب

ہر جانے والا اپنے وطن میں واپس آتا ہے لیکن احمد ان جانے والوں میں ہے جو واپس نہیں آئیگا۔

یہ مرثیہ بہت لمبا ہے، طوالت کے خیال سے ہم صرف چند اشعار اور نقل کرتے ہیں جن میں کوئی تشبیہ یا تمثیل موجود ہے،

تولی وابقی بیننا طیب ذکره　　کما فی ضیاء الشمس حین تغیب

وہ چلا گیا لیکن اپنی یاد ہمارے درمیان چھوڑ گیا ہے جس طرح آفتاب کے غروب ہونے کے بعد بھی شفق باقی رہتی ہے، جو اس کی یاد تازہ کرتی رہتی ہے،

یسیرا من الایام لم یرو ناظری　　بها منه حتی اعلقته شعوب

تھوڑے دن بھی میری آنکھیں اس کی دید سے آسودہ نہیں ہونے پائی تھیں کہ وہ لقمۂ اجل ہو گیا،

کظل سحاب لم یقم غیر ساعة　　الی ان اطاحته فطاح جنوب

وہ بادل کے سایہ کے مانند تھا جو تھوڑی دیر بھی باقی نہیں رہتا تھا کہ اس کو دکھنی ہوا اڑا لے گئی

او الشمس لما من غمام تحدرت   مساء وقد ولت دآن غروب

یا بدلی کے آفتاب کے مانند تھا، کہ شام تک تو وہ بادل مین چھپا رہا جونہی بادل

چھٹا تو غروب ہوگیا یعنی جب وہ جوان ہوا تو موت آگئی،

احمد ہی کے ایک دوسرے مرثیے کے چند اشعار یہ ہین :-

عصتک عین دموعھا شتن   فلیس یغشی جفونھا الوسن

اے ابراہیم! آنکھین تمھارے قابو مین نہین رہین کہ اُن سے آنسو برابر جاری ہے

اور اُن کے لئے نیند بالکل حرام ہوگئی ہے، ذرا جھپکی بھی نہین آتی،

لما ثوی احمد الضریح وکان   الزاد منہ الحنوط والکفن

جب احمد کو قبر مین لٹایا گیا تو اس کا زاد سفر صرف خوشبو اور کفن تھا،

والموت یغشی بیاض سنتہ   کالشمس یغشی ضیاءھا الدجن

موت نے اس کی پیشانی کی رونق اس طرح چھپالی جس طرح سورج کی روشنی کو رات کی تاریکی[۲]

غزل کے چند اشعار:

یا غزالا لی الیہ   شافع من مقلتیہ

اے غزال رعنا تیری   آنکھین خود میری سفارش کررہی ہین

بابی وجھک ما   اکثر حسادی علیہ

مین تیرے چہرے پر قربان ہون   جس پر بہت سے حسد کرنے والے ہین

بابی من انا ما   سور بلا اسر لدیہ

مین اس کے قربان جس کا مین بغیر قید و بند کے اسیر ہون

و الذی یقتلنی   ظلما ولا یعدی علیہ

اس کے قریب ان بوظلم سے بیٹے قتل کرتا ہے، لیکن اس پرکوئی ظلم نہیں کیا جاسکتا ؛

نثر: ابراہیم کی نثر کے جو نمونے موجود ہیں، اُن سے پتہ چلتا ہے کہ نظم کی طرح نثر پر بھی اُسے پوری قدرت تھی، اور وہ مسجع مقفیٰ عبارت اور نامانوس الفاظ کے استعمال سے جو اس زمانہ کا عام طرز تھا، پرہیز کرتا تھا، اور اپنے کاتبوں کو بھی اس سے منع کرتا تھا، ایک کاتب کو لکھتا ہے،

إياك التتبع لوحشي الكلام طمعًا	حصول بلاغت کی خواہش میں نامانوس
في نيل البلاغة فان ذلك العي	الفاظ کے استعمال سے بچو، ایسا تحریر کی
الاكبر وعليك بما سهل من	خوبی نہیں، بلکہ عجز اور عدم قدرت کا ثبوت
الكلام مع التحفظ عن الفاظ	ہے، سوقیانہ الفاظ سے بچتے رہو، جہاں تک
السفل	ہو سکے آسان اور عام فہم الفاظ کا
(ابن عساکر ج ۲ ص ۲۰۵)	استعمال کرے،

موسیقی | عباسی عہد میں دوسرے تمدنی فنون کی طرح فنِ موسیقی کو بھی بڑا عروج ہوا، خصوصًا عباسی خلفاء کی قدردانی اور سرپرستی نے اس کو اوجِ کمال پر پہنچا دیا، جس کے ثبوت و تفصیل کے لئے اغانی کی اکیس جلدیں آج بھی موجود ہیں،

ابراہیم بھی اسی ماحول میں پلا تھا، اس لئے اس نے بھی اس فن میں بڑی مہارت بہم پہنچائی، مہارتِ فن کے ساتھ خوش گلوئی کی دولت بھی اسکو ملی تھی، اسلئے وہ دربار کے خاص مغنیوں میں داخل کرلیا گیا، لیکن اس کے اصلی جوہر مامون اور معتصم کے زمانہ میں پوری طرح نمایاں ہوئے، صاحبِ اغانی نے اس کے حسنِ آواز اور مہارتِ فن کا تذکرہ بہت تفصیل سے کیا ہے، اس کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ گانے اور راگ میں پرانے قواعد اور اصولوں کی پابندی نہیں کرتا تھا، بلکہ خود نئے نئے راگ اور طرز پیدا کرتا تھا، جب اہلِ فن نے اس پر اعتراض کیا، تو اس نے جواب دیا کہ میں نے اس فن کو

پیشہ نہیں بنایا ہے، بلکہ اپنے نشاطِ طبع اور تکمیلِ ذوق کے لئے اختیار کیا ہے[۱]،

ابراہیم کی اسی جدت طرازی نے مغنیوں کے دو گروہ کر دیئے تھے، کچھ قدیم طرز اور اصول سے ذرا بھی ہٹنا نہیں چاہتے تھے، اور ابراہیم کی اس جدت طرازی کو برا سمجھتے تھے، اور کچھ ابراہیم کی جدت کے حامی اور اس کو پسند کرتے تھے[۲]،

ابراہیم کی ایک بہن، علیہ تھی، اسے بھی فنِ موسیقی میں بڑا کمال حاصل تھا، اہلِ تذکرہ نے اس کی مہارت فن کا تذکرہ بھی ابراہیم کے ساتھ ساتھ کیا ہے، وہ شاعرہ بھی تھی، ابن ندیم نے لکھا ہے کہ میں نے اس کے اشعار کا ایک مختصر مجموعہ دیکھا ہے[۳]،

طب ابراہیم کو فنِ طب میں بھی درک تھا، ہارون و مامون کے دربار کے اکثر اطبا، اس کے ہم جلیس تھے، خصوصاً مشہور عیسائی طبیب جبریل بن بختیشوع کے ساتھ اس کا بہت زیادہ ربط و ضبط تھا، وہ اکثر طب اور اطبا کے متعلق جبریل سے سوالات کیا کرتا تھا، ایک مرتبہ اس نے دو شکین[۴] کے مرض کے متعلق دریافت کیا، جبریل نے اس کی پوری تفصیل بتائی، ابراہیم بہت متعجب ہوا، پھر جبریل نے اس مرض کے متعلق اسے مزید باتیں بتائیں[۵]

اپنے زمانۂ خلافت میں ابراہیم ایک مرتبہ بخار میں مبتلا ہوا، جب اچھا ہو گیا، تو ایک روز کشلہ[۶] پکوایا، جبریل بھی دستر خوان پر موجود تھا، اس نے ابراہیم کو اس کے کھانے سے منع کیا، ابراہیم نے سبب پوچھا، اس نے کہا کہ خلیفہ کو اگر ایک روز بھی بخار آ جائے تو میں ایک سال تک اسے کشلہ کھانے کی اجازت نہیں دے سکتا، ابراہیم نے اس سے پھر پوچھا کہ تم کس کشلہ سے روکتے ہو، جو دودھ سے بنا ہو یا سادہ، اس نے کہا کہ ایک سال کی قید تو اس کشلہ کے متعلق ہے جو بغیر دودھ کی آمیزش کے بنا ہو، اور جو دودھ کے ساتھ بنا ہو اسکے لئے تین سال کی قید ہے[۷]،

۱؎ اغانی ج ۹ ص ۴۹ ۲؎ ایضاً ۳؎ ابن ندیم ص ۱۴۳ ۴؎ اس مرض میں آدمی سینے کے بل جھک جاتا ہے اور سال چھ مہینے تک اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا ۵؎ عیون الانبیاء ج ۱ ص ۱۳۱ ۶؎ ایک کھانا ہے جو پانی دودھ یا گھی اور چیزیں آمیز کر کے پکایا جاتا ہے ۷؎ عیون الانبیاء،

ابراہیم کا ایک غلام یوسف تھا جس کی سند سے ابراہیم کی بہت سی روایتیں طبقات الاطبا میں مذکور ہیں صفحہ ۱۱ سے ص ۲۲۳ تک اس کی تفصیل جا بجا مل سکتی ہے، یوسف کا ذکر تفضل نے اخبار الحمقٰی میں بھی کیا ہے (ص ۱۲۵)
ابراہیم کو یوسف سے غایت تعلق کی بنا پر لوگ اس کو ابن ابراہیم یعنی ابراہیم کا بیٹا کہتے تھے،

ابراہیم کو کھانے کھلانے کا بھی بڑا ذوق تھا، اور اس میں وہ بے حد اسراف سے کام لیتا تھا، دمشق کی امارت کے زمانہ میں ہارون ایک بار اس کا مہمان ہوا، تو اس نے سو مچھلیوں کی صرف زبانیں پکوائیں۔ ہارون رشید کو یہ اسراف بہت ناپسند ہوا، اور اس نے دسترخوان سے اس کھانے کو اٹھوا دیا،[۱]

تصانیف ابراہیم کو جن فنون سے دلچسپی تھی، اس نے ان سب میں کوئی نہ کوئی تحریری یادگار ضرور چھوڑی، ابن ندیم اور ابن خلکان نے اس کی حسب ذیل کتابوں کا ذکر کیا ہے،

(۱) کتاب ادب ابراہیم (۲) کتاب الطبخ، یہ کتاب کھانے کے اقسام اور اس کے پکانے کے طریقوں پر ہے، اگر یہ کتاب دستیاب ہو جاتی تو اس وقت کی معاشرت کے بہت سے گوشوں پر اس سے روشنی پڑتی (۳) کتاب الطب (۴) کتاب الغناء (۵) عربی دیوان۔

ان میں سے کسی کتاب کے موجود ہونے کا علم نہیں ہے، اس کے دیوان کے متعلق البتہ ابن ندیم نے لکھا ہے کہ اس کے زمانہ تک سو اوراق کا ایک مجموعہ موجود تھا، اور اس کی نظر سے گذرا تھا، ابن ندیم نے اوراق کی تفصیل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہر ورق میں دو صفحے، اور ہر صفحہ میں بیس سطریں تھیں، اس کے معنی یہ ہوئے کہ چوتھی صدی ہجری تک اسکے چار ہزار اشعار موجود تھے،[۲]

---

[۱] تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۲۶۷، [۲] ابن ندیم ص ۱۶۸، ۲۲۳،

باب المراسلة والمناظرة

گکھڑون کی تاریخ

از

مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی

جنابِ مکرم، اسلم صاحب بکڑالہ جہلم کا مکتوب گرامی ملا، مضمون سے آگاہ ہوا[1]، مین جناب موصوف کا شکر گزار ہون کہ انھون نے ایک خاص مسئلہ کی طرف متوجہ ہونے کا موقع عنایت فرمایا، میری کتاب مترجمہ کے گوہر نامہ" پر تنقید کرنا چاہتے ہین، تو خوشی سے تحریر فرما سکتے ہین، یہ تو ایک علمی بحث ہے، صاحب البیت ادری بما فیھا، وہ خود اس قوم اور خاندان کے ہین، اس لئے اُن کی واقفیت یقیناً مجھ سے زیادہ ہوگی، اُن کی توضیح سے مین بھی فائدہ اٹھاؤن گا،

اب رہا اصل مسئلہ یعنی گکھڑون نے محمود غزنوی پر حملہ کیا" تو چونکہ اس کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہین تھی، اس لئے مین نے اس پر کوئی ریسرچ نہین کیا، کیونکہ یہ کوئی عجیب بات نہین تھی، محمود غزنوی کی فوج مین ہندو فوج بھی ہوتی تھی، اور وہ غزنوی فوج کے ساتھ مل کر ہندو راجاؤن پر حملہ آور ہوتی تھی،

---

[1] مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی نے گکھڑون کی تاریخ گکھڑ نامہ پر معارف مین ایک مضمون لکھا تھا، اس مین فرشتہ کے حوالہ سے تحریر کیا تھا کہ محمود غزنوی کے ہندوستان پر حملہ کے زمانہ مین گکھڑون نے پنجاب کے راجہ انند پال

اسی طرح ملتانی مسلمان غزنوی فوج پر ہندوؤن کے ساتھ حملہ آور ہوئے، خود مسلمان مسلمانون پر حملہ آور ہوتے رہے، شہاب الدین غوری نے غزنہ کے سلطان سے لاہور لیا، اور اس کو قید کرکے لے گئے، پس گکھڑ اس وقت مسلمان ہوچکے ہون یا ہندو ہی ہون اگر انھون نے راجہ پنجاب کے ساتھ ملکر اپنے وطن کی طرف سے مدافعت کی، تو یہ کونسی عجیب بات ہے، یہ نہ تو قابلِ شرم ہے، اور نہ قابلِ الزام، آخر انھی گکھڑون نے شیر شاہ سوری اور ابراہیم سے کس قدر جنگ کی، اب رہی یہ بات کہ خود فرشتہ نے یہ واقعہ صحیح لکھا ہے یا نہین، تو افسوس ہے کہ فرشتہ نے اس بیان مین اپنے کسی ماخذ کا حوالہ نہین دیا، جناب کرمی اسلم صاحب نے جن جن کتابون کا حوالہ دیا ہے، مین نے اُن کا مطالعہ کیا، تاریخ طبقات ناصری نے محمود غزنوی کا بہت مختصر سا حال لکھا ہے، زیادہ اس کے اوصاف بیان کئے ہین، اس لئے یہ واقعہ اس مین نہین ہے،

طبقاتِ اکبری جلد اول کلکتہ مین ۳۹۹ھ کی جنگ کا حال ہی نہین لکھا ہے، اور تاریخ بدایونی جلد اول کلکتہ بھی اس بیان سے خالی ہے، تاریخ کامل لابن اثیر مین ۳۹۹ھ کے تحت محمود کا کوئی ذکر نہین کیا ہے، یہی حال ابن خلکان کا ہے، بیہقی مین اس کو تلاش کرنا فضول ہے، کیونکہ اس کی تاریخ مسعود بن محمود غزنوی سے شروع ہوتی ہے،

عتبی نے تاریخ یمینی مین نہ صرف اس واقعہ کو بلکہ ۳۹۹ھ کا کوئی واقعہ ہی نہین لکھا ہے، تاریخ الفی نایاب ہے، ابھی تک میری نظر سے نہین گذری، اس کا ایک نسخہ بمبئی یونیورسٹی لائبریری کی فہرست مین ہے، مین نے اپنے ایک دوست کو خط لکھا ہے، لیکن تاریخ الفی، بدایونی، طبقاتِ اکبری

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۲) کی حمایت مین جنگ کی جس مین کئی ہزار مسلمان قتل ہوئے، اسلم خان صاحب نے جن کا خیال ہے کہ گکھڑ قوم خود محمود کے ساتھ ہندوستان آئی تھی، اس بیان پر اعتراض کیا تھا، اس مراسلہ مین انھون نے اس کا جواب دیا ہے، مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، معارف ماہ جولائی و اگست ۱۹۴۰ء،

سب تقریبًا ایک ہی زمانہ کی ہین یقین ہے کہ اس مین بھی یہ واقعہ نہ ہوگا، مآثر رحیمی وخلاصۃ التواریخ مین بھی تفصیل نہین ہے،

میرے اس بیان سے معلوم ہوگیا کہ واقعی فرشتہ اپنے بیان مین منفرد ہے، اور تاوقتیکہ اسکی تائید کسی دوسری تاریخ سے نہ ہو یقینی نہین کہہ سکتے، فرشتہ کے تین نسخے میرے پاس موجود ہین جیدرآبا کے نسخہ مین کھکھر لکھا ہے، دوسرا نولکشور کا ہے جس مین کہکر تحریر ہے، اور تیسرا ۱۸۳۲ء کا ہے جو بمبئی مین ایک انگریز کپتان ...... کی زیرنگرانی طبع ہوا ہے، اس مین بھی کہکر ہے پس ممکن ہے، یہ لفظ کھوکھر کا مفرس ہو،

میرے دوست جناب اسلم خان صاحب نے ایک فقرہ لکھا ہے، کہ

"اصولی لحاظ سے بھی محمود کے چھ سو برس کے بعد کے مورخ کی روایت کی کوئی حقیقت نہین ہے"،

" اگر اس قسم کے اصول صحیح تسلیم کرلئے جائین، تو تاریخ طبری، کامل، ابن خلدون، طبقات ناصری تاریخ الفی، بدایونی، آئین اکبری، ان مین سے کوئی معتبر نہ رہے گی، اس لئے یہ اصول صحیح نہین کہ مدت کے بعد جو تاریخ لکھی جائے، اس کی روایت صحیح نہ سمجھی جائے، بلکہ یہ دیکھنا چاہئے کہ اس کا ماخذ کیا ہے، اور وہ صحیح مستند، قریب العہد یا شاہد عینی ہے یا نہین، اور پھر اس کے معاصر یا قریب العہد مورخ اس کے مؤید ہین یا نہین،

میرے مکرم دوست نے یہ بھی لکھا ہے کہ گکھڑ محمود کی معیت مین وارد ہند ہوے،

لیکن کسی تاریخ مین میری نظر سے نہین گذرا کہ یہ قوم محمود کے ساتھ ہندوستان آئی، سوائے آئین اکبری کی ایک شاذ روایت کے جس کی کسی تاریخ سے تائید نہین ہوتی، اور بقول آپ کے چھ سو برس بعد کے مورخ کی روایت کس طرح صحیح تسلیم کی جائے،

میری کتاب "گوہرنامہ" مکمل ہو چکی ہے، تقریباً اٹھارہ بیس کتابون سے حاشیہ مین اصل کتاب کی تائید یا تردید کی ہے، اس کے پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ التمش اور بلبن کے عہد تک گکھڑ قوم مین ہندو مذہب رکھنے والے لوگ موجود تھے، جن مین سے ایک کا نام "گل چند" تھا، بدایونی مین بھی اس کے حوالے ملتے ہین،

یہ کتاب اس وقت بھوپال مین ایک کاتب کو صاف کرنے کے لئے دیدی ہے انشاء اللہ جلد طبع ہو جائے گی،

لذت غم

از

جناب شفیق صدیقی جونپوری

صحدم شادابی گل کی فراوانی بھی دیکھ — پھر چمن سے دور نکہت کی پریشانی بھی دیکھ

اے گرفتار فریب رنگ بو ہشیار باش — اپنے پھولون کا مآل پاک دامانی بھی دیکھ

چاندنی مین بحر کی لہرون کی تابانی بھی دیکھ — تو انھین موجون مین پھر کشتی کو طوفانی بھی دیکھ

کشتی و ساحل کی سیر مین جشن محفل تا کجا — آ مرے غم کا تماشا میری ویرانی بھی دیکھ

لوگ کہتے ہین مسرت ہو شباب زندگی — مین سمجھتا ہون مسرت کو حجاب زندگی

زندگی کے واسطے درکار ہے سوز و گداز — تلخی غم ہی سے ہے کیف شراب زندگی

زندگی محدود کر دون کیون خوشی کے واسطے — غم مین بھی ہوتی ہو لذت آدمی کے واسطے

جس کے احساس الم سے چاک تھا دامان صبر — آج روتا ہون اسی آشفتگی کے واسطے

وہ دعاؤن پر دعائین اشک حسرت صبح تک — وہ نیاز بندگی ناز مشیت صبح تک

چاند کی کرنون سے باتین وہ ستارون سے خطاب — اور بالین پر چراغ شام غربت صبح تک

لاکھ راتین تجھ پہ صدقے اے پریشانی کی رات — کیا ہوئی یارب مری آشفتہ سامانی کی رات

قطرہ ہاے اشک سے دامن پہ تارون کا سمان — ہاے وہ میری بہار سوز پنہانی کی رات

ہر نفس میں زندگی صبرِ دلِ ایوبؑ کی | دل کے داغوں میں سپیدی دیدۂ یعقوبؑ کی

کس قدر تھی کیف آگیں ظلمتِ شامِ الم | اک سیاہی تھی غلافِ کعبۂ محبوب کی

اب وہ تسکین آفریں باتیں وہ غمخواری کہاں | وہ مناجاتیں کہاں راتوں کی بیداری کہاں

ہو گیا خاموش کوئی ہو گئے افسانے ختم | شمع کے آنسو کہاں شبنم کی خونباری کہاں

اب چراغِ کشتۂ محفل کا عالم دیکھئے | دھوم سے ہوتا ہے پروانوں میں ماتم دیکھئے

اب نہ گرمی ہے نہ خنکی درہم و برہم ہے بزم | بجھ گیا ہے دل تو شعلہ ہے نہ شبنم دیکھئے

شب کی محفل لٹ گئی سورج اگر آیا تو کیا | خونِ انجم ہو چکا نورِ سحر آیا تو کیا

بند کیں بیمار نے آنکھیں، ہوئی بالیں تو آپ | اب زمانہ نعش پر با چشمِ تر آیا تو کیا

تو نہیں گھر میں تو فکرِ ساز و ساماں کیا کروں | کوئی مقصد بھی تو ہو جینے کا ارماں کیا کروں

دل بھی صابر ہے زباں پر شکر کے کلمات بھی | میرے مالک میں علاجِ چشمِ گریاں کیا کروں

غزل

از جناب ڈاکٹر محمد عزیز ایم اے پی ایچ ڈی علیگ

رخِ رنگین یار دیکھ لیا | اک گلِ نو بہار دیکھ لیا

صحبتیں صبح و شام کی نہ رہیں | یہ بھی لیل و نہار دیکھ لیا

اب تو دے رخصت فغاں کہ بہت | ضبط و صبر و قرار دیکھ لیا

وعدہ کرنے کی کیا ضرورت تھی | بات کا اعتبار دیکھ لیا

ہو برا بے قراری دل کا | تجھکو بھی اشکبار دیکھ لیا

شکوہ بیجا نہ کر کہ اب تو عزیز

یار کو شرمسار دیکھ لیا

مطبوعات جدیدہ

ریاض الانشاء مرتبہ مصححہ پروفیسر شیخ چاند بن حسین پی ایچ ڈی آکسن تقطیع بڑی، ضخامت تقریباً ۵۰۰ صفحے، کاغذ اعلیٰ، ٹائپ بہتر، قیمت بارہ روپیہ، پتہ:- مجلس مخطوطات فارسیہ حیدرآباد دکن،

دکن کے بہمنی سلاطین کا نامور وزیر محمود گاوان الملقب بہ خواجہ جہان گیلانی المقتول ۸۸۶ھ دوسرے اوصاف وکمالات کے ساتھ بڑا فاضل اور فارسی زبان کا بے مثل ادیب وانشا پرداز تھا، اُس نے مختلف اسلامی ملکون کی سیاحت کی، اور وہان کے علماء اور اصحاب کمال سے استفادہ کیا تھا، اور اسلامی دنیا کے بہت سے علما ومشائخ سے اس کے تعلقات تھے، حافظ سخاوی نے جو اس کے معاصر تھے، الضوء اللامع مین اس کے حالات لکھے ہین، (کتاب مذکور ج ۱۰ ص ۱۴۴) خواجہ نے سلاطین بہمنی کی جانب سے سلاطین وامراء اور ذاتی حیثیت سے اپنے اعزہ، احباب، علماء ومشائخ اور امراء وعمائد کو جو خطوط لکھے، ان مین سے بہت سے خطوط کی نقلین محفوظ رہ گئین جن کا مجموعہ ریاض الانشاء کے نام سے موسوم ہے، اس مین ۱۴۸ خطوط ہین جو فارسی انشا پردازی کا اعلیٰ نمونہ ہین، اور بقول مرتب ان مین کاتب نے "ذہن مرصع کار نے قرآن وحدیث، الٰہیات وفلسفہ نجوم وریاضیات، شعر وسخن، معانی وبیان، جغرافیہ وتاریخ، حیوانات وطبعیات، مناظر قدرت اور واقعات زندگی کے جواہر پارون کو ایک دلکش انداز مین ترتیب دیا ہے"، ان خصوصیات کے علاوہ ان مین بہمنی سلاطین کی جانب سے سلاطین روم وعراق، اور گجرات، مالوہ اور جونپور کے

مسلمان بادشاہون کے نام خطوط اور دکن کی سیاسی تاریخ کے متعلق بہت سے ایسے معلومات ہین، جو دوسری تاریخون مین نہین مل سکتے، اس لئے ان کی علمی و ادبی حیثیت سے قطع نظر تاریخی حیثیت سے بھی اُن کی بڑی قدر و قیمت ہے، اس کے قلمی نسخے مختلف کتب خانون مین پائے جاتے ہین، مجلس مخطوطات فارسیہ حیدر آباد نے پروفیسر شیخ چاند بن حسین سابق مشیر وزارت تعلیم ہندستان کی تصحیح و تحشیہ کے ساتھ اس کو شائع کیا ہے، فاضل مرتب نے بڑی محنت و قابلیت سے چھ قلمی نسخون کی مدد سے مقابلہ و تصحیح کر کے یہ نسخہ مرتب اور حاشیہ مین اختلاف نسخ کو واضح کیا ہے، اس سے بھی زیادہ مفید کام انھون نے یہ انجام دیا، کہ گو ان خطوط کی عبارت بڑی ادیبانہ اور انشا پردازانہ ہے جس کا سمجھنا ہر شخص کے لئے آسان نہین ہے، اس لئے لائق مرتب نے کتاب کے شروع مین ترتیب وار ہر خط کا اردو مین خلاصہ دے دیا ہے، اور ان مین جو نام آئے ہین یا جن واقعات کا اجمالی ذکر کیا اُن کے حالات کی تفصیل کے لئے دوسری تاریخون اور تذکرون کے حوالہ دیدیئے ہین، جن سے ان خطوط کی افادی حیثیت بڑھ گئی ہے، اور اُن سے استفادہ بھی آسان ہو گیا ہے، کتاب کے شروع مین ڈاکٹر غلام یزدانی کے قلم سے کاتب و مکتوبات کی خصوصیات کا مختصر تذکرہ اور مرتب کے قلم سے اُن کی ترتیب کے متعلق ضروری معلومات تحریر ہین، کتاب کے آخر مین اسماء و اعلام کا انڈکس ہے گو ان مکاتیب کی علمی و ادبی حیثیت کے قدر دان اب بہت کم ہین، لیکن تاریخی حیثیت سے ان کی اشاعت ایک مفید تاریخی خدمت ہے، لائق مرتب نے ان کی ترتیب و تصحیح مین جو محنت کی ہے، اس کا اندازہ کتاب کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، البتہ بعض مقامات پر خفیف سا تسامح ہو گیا ہے، مثلاً مرتب نے تمہید مین الضوء اللامع کے حوالہ سے لکھا ہے، کہ محمود گاوان نے قاہرہ مین شیخ بخاری (محمد بن محمد بن محمود الشمس الحنفی) کے علم و فضل سے استفادہ کیا تھا (ص ۶)، یہان الضوء اللامع کی عبارت سمجھنے مین تسامح ہو گیا ہے، اصل عبارت یہ ہے، و لقی شیخنا

بالقاهرة فی ثلاث وار بعین (وثمانمائة) فاخذ منه مجالس من البخاری وتناوله منه الضوء اللامع جلد (۱ص ۱۴۴) اس کا مطلب یہ ہے کہ محمود گاوان ہمارے شیخ کے درس صحیح بخاری مین شریک ہوا، بخاری شمس حنفی کی وطنی نسبت نہین ہے، بلکہ اس سے مراد صحیح بخاری ہے،

صد پارۂ دل، از جناب خواجہ دل محمد صاحب ایم اے سابق پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور تقطیع بڑی ضخامت ۲۲۶ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد سے ر، پتہ خواجہ بک ڈپو موہن لال روڈ لاہور،

مصنف کہنہ مشق شاعر ہین صد پارۂ دل اُن کی رباعیون کا مجموعہ ہے، جو موضوع کے اعتبار سے پانچ حصون مین تقسیم ہے، میخانہ عرفان، طلسم شہود، اسرار و حقائق، اعمال و اخلاق، نیرنگ جذبات، ان تمام موضوعون پر حکیمانہ رباعیان ہین، اور پورا مجموعہ خیالات کی گہرائی و پختگی زبان وبیان کی صحت وصفائی اور دوسرے محاسن شاعری کے اعتبار سے مصنف کی کہنہ مشقی کا نمونہ اور اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے،

حیات جاودان، از سیدہ حمیدہ سلطانہ صاحبہ تقطیع چھوٹی ضخامت ۸۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت معمولی، قیمت تحریر نہین، پتہ نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ،

اس دور کے شعرا مین جناب شفیق جونپوری کا کلام جدید وقدیم رنگ کی آمیزش کا نہایت دلکش نمونہ ہے، اور خیالات کی رنگینی کے ساتھ نکی لطافت و پاکیزگی، زبان کی صحت وصفائی، اصول فن کی پابندی مشق و ممارست کی پختگی ہر لحاظ سے نئے دور کے شعرا مین امتیازی حیثیت رکھتا ہے، مصنفہ نے اس کتابچہ مین ان کے مختصر حالات اور کلام کی مختلف اصناف پر مختصر تبصرہ کیا ہے، اور اسکو نمونے دیے ہین،

مؤلفہ مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی دیسنوی سابق رفیق دار المصنفین اعظم گڈھ

ہندوستان میں مسلمانوں کا پہلا قافلہ سندھ میں اترا تھا، اور اُن کی پہلی حکومت یہیں قائم ہوئی تھی اور وہ ایک ہزار سال سے اوپر یہاں حکمران رہے، آج بھی سندھ کے در و دیوار سے اُن کے آثار نمایاں ہیں، لیکن اس کے باوجود اُردو میں اسلامی سندھ کی کوئی مفصّل و محققانہ تاریخ موجود نہیں تھی، دار المصنّفین نے تاریخ ہندوستان کے سلسلہ میں یہ جامع و محققانہ تاریخ مرتب کرائی ہے، اس میں سندھ کا جغرافیہ، مسلمانوں کے حملہ سے پیشتر کے مختصر اور اسلامی فتوحات کے مفصل حالات، خلافتِ راشدہ کے زمانہ سے لے کر آٹھویں صدی ہجری تک سندھ جن جن حکومتوں کے ماتحت رہا، اُن کی پوری تاریخ اور ان تمام دوروں کے نظامِ حکومت، علمی و تمدنی حالات، اور رفاہ عام کے جو جو کام انجام پائے، ان سب کی پوری تفصیل ہے، مسلمان اس قدیم اسلامی خطّہ کی تاریخ فراموش کر چکے تھے، اب پھر اس کو یاد کرنے کی ضرورت ہے، یہ کتاب ایسے وقت میں شائع ہو رہی ہے، جب کہ سندھ کی تاریخ کا ایک نیا باب کھل رہا ہے، اور وہاں ایک نئی حکومت کی بنیادیں استوار ہو رہی ہیں،

ضخامت: ۴۰۰ صفحے قیمت: چھ روپیہ،

"منیجر"

دارالمصنفین کی دینی علمی و ادبی پیشکش

اقبالِ کامل

ڈاکٹر اقبال کے فلسفہ و شاعری پر اگرچہ بکثرت مضامین، رسالے اور کتابیں لکھی گئیں لیکن ان سے اُن کی بلند پایہ شخصیت واضح اور مکمل طور پر نمایاں نہ ہو سکی، یہ کتاب اس کمی کو پورا کرنے کے لئے لکھی گئی ہے، اس میں اُن کے مفصل سوانح حیات کے علاوہ اُن کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کے اہم پہلوؤں کی تفصیل کی گئی ہے، اور سوانح حیات کے بعد پہلے اُن کی اردو شاعری پھر فارسی شاعری پر ان کے بہترین اشعار کے انتخاب کے ساتھ مفصل تبصرہ کیا گیا ہے، اور ان کے کلام کی تمام ادبی خوبیاں دکھلائی گئی ہیں، پھر اُن کی شاعری کے اہم موضوعوں یعنی فلسفۂ خودی، فلسفۂ بیخودی، نظریۂ تعلیم، سیاست، صنفِ لطیف (یعنی عورت) فنونِ لطیفہ اور نظامِ اخلاق وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے، مرتبہ مولانا عبدالسلام ندوی، ضخامت . . ۴م صفحے قیمت: ستیے

بزمِ تیموریہ

بابر ایک بے مثل اہلِ قلم تھا، ہمایوں نے شعر و شاعری کے علاوہ ہیئت و نجوم کی بھی انجمن آرائی کی، اکبر کا عہد علوم و فنون کی روشنی سے جگمگا اُٹھا، جہانگیر نے ادب و انشاء کو چمکایا، شاہجہان نے شعراء اور فضلاء کو سیم و زر میں تلوایا، عالمگیر نے معارف پروری اور انشاپردازی کے اعلیٰ نمونے پیش کئے، تیموری دور کے آخری بادشاہوں نے بھی اپنے اسلاف کی روایات کو قائم رکھنے کی کوشش کی، بہادر شاہ ظفر نے عروسِ سخن کے گیسو سنوارے، تیموری شہزادوں اور شہزادیوں نے بھی علم و ادب کی محفلیں سجائیں، دربار کے امراء، شعراء اور فضلاء نے شاہانہ سرپرستی میں گوناگون کمالات دکھائے، ان سب کی تفصیل مذکورہ بالا کتاب میں ملاحظہ فرمائیے؛ مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے قیمت: سعہ

رجسٹرڈ نمبر ا ۱۸ اے   اپریل ۱۹۴۹ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت :- چھ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

سلسلۂ تاریخ اسلام

دارالمصنفین کے سلسلۂ تاریخ اسلام کو بڑا حسن قبول حاصل ہوا علمی و تعلیمی اداروں نے خصوصیت کے ساتھ اس کی قدردانی کی بعض یونیورسٹیوں نے اس کو اسلامی تاریخ کے نصاب میں داخل کرلیا، اس لئے چند برسوں کے اندر تقریباً اس کے سب حصے ختم ہوگئے جن کے دوسرے اڈیشن مزید اصلاح و ترمیم اور اضافوں کے ساتھ چھپ کر تیار ہوگئے ہیں اور بعض زیر طباعت ہیں، اب یہ سلسلہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہوگیا ہے،

تاریخ اسلام حصۂ اوّل

(عہد رسالت و خلافت راشدہ)

یعنی آغاز اسلام سے لے کر خلافت راشدہ کے اختتام تک اسلام کی مذہبی، سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ، ضخامت ۵۹۶ صفحے، قیمت: سے ر

تاریخ اسلام حصۂ دوم

(بنو امیہ)

یعنی اموی سلطنت کی صد سالہ سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ کی تفصیل،

ضخامت ۴۶۳ صفحے،

قیمت سے ر

تاریخ اسلام حصۂ سوم

(بنی عباس اوّل)

یعنی ابو العباس سفاح ۱۳۲ھ ۷۵۰ء سے ابو اسحاق متقی اللہ ۳۳۳ھ ۹۴۴ء تک دو صدیوں کی سیاسی تاریخ، (زیر طبع)

تاریخ اسلام جلد چہارم

(بنی عباس دوم)

یعنی مستکفی باللہ کے عہد سے آخری خلیفہ مستعصم باللہ تک خلافت عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی سیاسی تاریخ، ضخامت:- ۳۳۴ صفحے

قیمت:- صر

"منیجر"

جلد ۶۳ ماہ جمادی الثانی ۱۳۶۸ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۴۹ء عدد ۴

مضامین

مقالات

وفیات

دار المصنفین نے جو مذہبی، علمی اور ادبی خدمات انجام دی ہیں ان سے اصحاب علم پوری طرح واقف ہیں، اس نے اسلامیات کی ہر شاخ اور اردو زبان و ادب پر محققانہ لٹریچر اور معلومات کا بہترین ذخیرہ فراہم کر دیا، غیر مذہبی خالص علمی خدمات سے بھی اس کا دامن خالی نہیں ہے، اس کے کاموں کی قدر نہ صرف ہندوستان بلکہ دوسرے ملکوں کے علمی اداروں اور وہاں کے علماء و محققین تک نے کی، اسکی متعدد کتابوں کے مختلف زبانوں میں ترجمے ہوئے، اور اس نے اپنی تصانیف سے ملک میں سنجیدہ تالیف و تصنیف اور علمی تلاش و تحقیق کا ایک معیار قائم اور اس کا مذاق پیدا کر دیا،

اس کی آمدنی کا بڑا ذریعہ اس کی مطبوعات ہیں، ان کی مانگ زیادہ تر پنجاب اور دہلی میں تھی، اس لیے ہندوستان کی تقسیم اور پنجاب اور دہلی کی تباہی کا اسکی تجارت پر بڑا اثر پڑا، گو اس کی کتابوں کی مقبولیت اور طلب اب بھی قائم ہے لیکن جب تک دونوں ملکوں کے درمیان رسل و رسائل کی دشواریاں دور نہ ہو جائیں، اس وقت تک انکی پوری تکمیل نہیں ہو سکتی بعض علم دوست ریاستوں سے جو امداد ملتی ہے وہ موجودہ ریاستی انقلاب میں نہیں کہا جا سکتا کب تک قائم رہ سکے گی، کاغذ کا قحط، دوسرے سامان طباعت و اشاعت کی گرانی اور ملک کے عام اقتصادی حالات کی ناسازگاری اس پر مستزاد ہے، ان حالات میں دار المصنفین کا کاروبار چلانا مشکل ہو رہا ہے،

دوسری طرف ہندوستان کے انقلاب اور اس کے اثرات و نتائج نے دار المصنفین کے کاموں کو اور زیادہ ضروری بنا دیا ہے، اور اس پر نئی ذمہ داریاں عائد کر دی ہیں، لاہور جو اردو کا بڑا مرکز تھا ہندوستان سے نکل گیا، ہندوستان میں انجمن ترقی اردو ختم ہو گئی، ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد کا اردو کا شعبہ توڑ دیا گیا، مکتبہ جامعہ ملیہ دلی کے ہنگامہ میں تباہ ہو گیا، حیدر آباد کے اردو زبان اور اسلامیات کے ادارے چند دنوں کے مہمان ہیں، ایسی حالت میں جو ادارے باقی رہ گئے ہیں انہی پر آیندہ اردو زبان اور اسلامی علوم و فنون کی خدمت کا مدار رہ گیا ہے، اور ان کو بہر حال قائم رکھنا ہے، اس لیے دار المصنفین انشاء اللہ اپنا کام پورے استقلال سے جاری رکھے گا بلکہ نئے حالات اور ضروریات کے مطابق اس میں اور زیادہ وسعت دے گا،

ابھی اس کے بہت سے پرانے کاموں سیرۃ النبیؐ، سلسلۂ تاریخ اسلام اور تاریخ ہند کی تکمیل باقی ہے، اور نئے حالات نے بعض نئے کام پیدا کر دیے ہیں، ضرورت ہے کہ اب ہندی میں بھی اسلامیات پر لٹریچر پیش کیا جائے، اور مسلمانوں کو اندرونی اور بیرونی غیر اسلامی اثرات اور تحریکوں سے بچانے کیلئے مضامین اور کتابیں لکھی جائیں، یہ دونوں کام دار المصنفین کے پیش نظر ہیں، لیکن ان سب کا دار و مدار سرمایہ پر ہے، دار المصنفین تو انشاء اللہ اپنا کام کرتا رہے گا، لیکن دوسروں کے بھی کچھ فرائض ہیں،

دار المصنفین جب سے قائم ہوا ہے، الحمد للہ آج تک اس نے کبھی عام چندہ کی درخواست نہیں کی، اور اب بھی وہ اس وضع داری پر قائم ہے، ایک مرتبہ اس کو مالی مدد کی ضرورت پیش آئی تھی، تو اس کو بیس روپیہ سالانہ ممبری کی شکل میں قبول کیا تھا، اور اس کے معاوضہ میں رسالہ معارف اور اپنی سالانہ مطبوعات معاونین کی خدمت میں پیش کی تھیں، دار المصنفین کے بعض ہوا خواہوں کی رائے ہے کہ اس طریقہ کو پھر جاری کیا جائے، اور چونکہ بعض قدر دان بلا معاوضہ مدد کرنا چاہتے ہیں اس لیے

ممبری کی فیس بترتیب تیس اور پچاس روپے سالانہ کردی جائے، دونوں قسم کے ممبروں کی خدمت میں ممبری کی مدت تک رسالہ معارف اور سالانہ مطبوعات پیش کی جائیں گی، یا اس قیمت کی پرانی مطبوعات جن کو وہ پسند کریں گے دیجائیں گی، یہ ضروری نہیں ہے کہ ممبری مستقل اور دوامی ہو بلکہ ایک دو سال کے لیے بھی ہو سکتی ہے،

اگر تیس روپے سالانہ کے پانچ ہزار ممبر بھی ہو جائیں تو دار المصنفین کی موجودہ مشکلات بھی دور ہو جائیں گی، اور پرانے کاموں کی تکمیل اور نئے کاموں کے شروع کرنے میں بھی مدد ملے گی، دار المصنفین کے قدر دانوں کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ یہ تعداد آسانی کے ساتھ پوری ہو سکتی ہے، ہم کو یقین ہے کہ دار المصنفین کے ہمدرد و ہوا خواہ اپنے اپنے حلقہ اثر میں ممبر سازی کی پوری کوشش فرمائیں گے، اور مطلوبہ تعداد بہت جلد پوری ہو جائے گی، یہ اردو زبان کے حامیوں اور اسلامی کلچر کے محافظوں کا بھی امتحان ہے کہ ان سے انکی محبت کا دعوی محض زبانی ہے یا اس کے لیے وہ عملاً بھی کچھ کرنا چاہتے ہیں،

ادھر مہینہ ڈیڑھ مہینے سے حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ کا مزاج ناساز تھا، اب الحمد للہ رو باصلاح ہے، ناظرین سے درخواست ہے کہ وہ ممدوح کی صحت و عافیت کے لیے دعا فرماتے رہیں، کہ دار المصنفین کی زندگی اور اس کا وقار اسی ذات گرامی سے وابستہ ہے، گذشتہ مہینہ کے آخر میں بزرگ محترم مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی عرصہ کے بعد دار المصنفین تشریف لائے تھے، اور رفقا کے کاموں کو ملاحظہ اور علمی مشوروں سے مستفید فرمایا،

مقالات

ہندوستان کے کتب خانے

(۳)

از

جناب مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی

سلاطین فاروقیہ کا کتب خانہ

سلطان فیروز شاہ تغلق کے آخری عہد مین بڑے بڑے صوبون پر جن لوگون کو ناظم بنایا گیا تھا، وہ اس کی وفات کے بعد خود مختار ہوگئے، ان ہی مین سے ملک راجہ بھی تھا، جس نے اپنا نسب حضرت فاروق اعظمؓ سے ملایا تھا، اسی لیے اس سلطنت کا نام فاروقی ہے،

سلطنت فاروقی ساتوین صدی کے آخر سے شروع ہوئی، اور ۱۰۰۸ھ مین اکبر اعظم کے ہاتھون اس کا خاتمہ ہوا، یہ خاندان بھی علما، فضلا، شعرا، اور صوفیون کا قدردان تھا، اس کے پاس بھی ایک بڑا کتب خانہ تھا، فرشتہ کا بیان ہے کہ خواجہ مرزا علی اسفرائنی نے اس کتب خانہ کو دیکھا تھا، خود فرشتہ نے جب وہ ۱۰۱۳ھ مین برہان پور گیا ہے، اس کتب خانہ کی سیر کی، اس مین اس کو ایک کتاب ایسی ملی جس مین شاہان فاروقی کے سنین جلوس و وفات تحریر تھے، جس سے فرشتہ نے اپنی کتاب مین نقل کیا ہے[1]

---

[1] فرشتہ ص ۲۷۷، نولکشور ج ۲

برطانوی عجائب خانہ مین ایلیٹ صاحب کے کاغذات کے ساتھ ملک الشعرار فیضی کا ایک رقعہ بنام راجہ علی خان فاروقی والی خاندیس محفوظ ہے، اس رقعہ مین اس نے والی خاندیس سے استدعا کی ہے کہ تغلق نامہ کا جو نسخہ اس کے پاس ہے اس کے اول اور آخر کے چند اوراق ضائع ہو گئے ہین، اس لیئے وہ اپنے نسخہ سے ان کو نقل کرا کے بھیجدے، اسکے الفاظ یہ ہین:

"از کتاب تغلق نامہ کہ از انفاس مقدسۂ امیر خسرو ہست، چند ورق از اول وچندے از آخر رفتہ، التفات فرمودہ و چیزے از اول وہمین قدر از آخر بیکے از خدمت گاران امر فرمایند کہ بہر خطے مسودہ نمودہ بجہت بندہ مصحوب عاملان عریضہ فرستند"[1]

اس تحریر سے یہ تو معلوم نہین ہوتا کہ والی خاندیس کے پاس کوئی بڑا کتب خانہ تھا، لیکن باشارۃً اس قدر ضرور معلوم ہوتا ہے کہ والی خاندیس کو علمی اور ادبی ذوق ضرور تھا، اس لیئے اپنے مذاق کی منتخب پسندیدہ کتابون کا مجموعہ اپنے پاس رکھتا تھا،

شاہان اودھ کا کتب خانہ | مغلیہ سلطنت کے کمزور ہو جانے پر بارھوین صدی ہجری کے وسط مین برہان الملک سعادت علی خان کو اودھ کا صوبہ دار بنایا گیا، کچھ دنون کے بعد اس نے خود مختار ہو کر اپنی مستقل حکومت قائم کر لی، اس کی آٹھ پشتون نے ۱۸۵۶ء تک اودھ کے پایۂ تخت لکھنؤ مین حکومت کی۔

دہلی اجڑنے کے بعد لکھنؤ کا شباب تھا، نواب آصف الدولہ کی بدولت اہل علم و صاحب کمال لکھنؤ مین جمع اور مختلف علوم وفنون کے لیے مدرسے قائم ہو گئے، ان کے ساتھ ساتھ کتب خانے بھی قائم ہونے ہون گے، چنانچہ لکھنؤ مین متعدد مشہور کتب خانے تھے، ان مین شاہی کتب خانہ کا حال ایک انگریز اسپرنگر نے جو ۱۸۴۸ء مین لکھنؤ آیا تھا، لکھا ہے۔

---

[1] معارف نمبر ۵ جلد ۳۶ ص ۳۴۶

شاہی کتب خانہ قدیم دولت خانہ مین تھا، یہ دولت خانہ، رومی دروازہ کے پاس لوہے کے پل کے پیچھے گومتی کے نزدیک تھا، افسوس ہے کہ اس دولت خانہ کا اب کوئی نام ونشان بھی نہین رہا، غالباً وکٹوریہ پارک اور لوہے کے پل کے درمیان کسی جگہ رہا ہوگا، اس مین دس ہزار سے زیادہ کتابین تھین، غازی الدین حیدر نے اس کو زیادہ ترقی دی،

ایک دوسرا کتب خانہ موتی باغ کے محل مین تھا، اس مین زیادہ تر ادبی کتابین تھین، یہ محل آج بھی گومتی کے کنارے قیصر باغ سے تھوڑے فاصلہ پر موجود ہے، ۱۸۵۷ء کے بعد سلیمان قدر اس مین رہتے تھے۔ اب اس کا نام "موتی محل" ہوگیا ہے۔ اس محل مین تین ہزار سے زیادہ کتابین تھین، جو زیادہ تر چیدہ اور منتخب تھین،

ایک اور کتب خانہ فرح بخش محل مین تھا، اس مین کتابین گو ایک ہزار سے کم تھین لیکن قیمت کے لحاظ سے یہ بڑا بیش بہا کتب خانہ تھا، اس کتبخانہ کی ہر کتاب مطلا اور مذہب تھی، اور یہ کتب خانہ نقاشی اور طلاکاری کا بہترین نمونہ تھا، واجد علی شاہ کے حکم سے یہ خاص کتبخانہ عام شاہی کتب سے علحدہ جمع کیا گیا تھا۔ اس لیے اگر اس کو واجد علی شاہ کا ذاتی کتبخانہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

ان سب کتب خانون کی حفاظت کا معقول انتظام تھا، اور ایک گونہ اچھی حالت مین تھے، لیکن سلطنت کی سیاسی بدنظمی کا ان پر بھی کافی اثر پڑا، اور کتب خانہ کے ناظمون کی جلد جلد تبدیلی کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسی ناظم کو اس کے ترتیب دینے کا موقع نہ مل سکا، دیواری الماریون مین یہ کتابین بھری تھین، اور چونکہ ان مین کوئی ترتیب نہ تھی اس لیے افسران کتب خانہ جائزہ لیتے اور دیتے وقت محض جلدون کا شمار کرا دیتے تھے، اس کا سب سے بڑا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سی نایاب اور قابل قدر کتابین کتب خانہ سے نکل گئین اور جلد شماری کے لیے انکی

جگہ معمولی کتابین رکھ دی گئین، چنانچہ اسپرنگر لکھتا ہے کہ ناظم کتب خانہ نے دس ہزار قیمت کی کتابین فروخت کرکے اپنے لڑکون کی شادی کی، راقم الحروف نے بھی شاہی کتب خانہ کی مہر شدہ کتابین ہندوستان کے متعدد کتب خانون مین دیکھی ہین جس سے اس بیان کی تائید ہوتی ہے، راجہ صاحب سلیم پور کے کتب خانہ مین ایسی متعدد کتابین آج بھی موجود ہین، شاہی کتب خانہ کی بقیہ کتابین ۱۸۵۷ء کے بعد لندن بھیج دی گئین،

زبان کے لحاظ سے ان کتب خانون مین عربی، فارسی، اردو، ہندی، سنسکرت، ترکی اور پشتو کی کتابین تھین، فنون کے لحاظ سے تصوف، تذکرہ، تاریخ کے ساتھ ادب کا بڑا ذخیرہ تھا جس مین دواوین کا حصہ سب سے زیادہ تھا،[1]

اودھ کے شاہی کتب خانہ کی نسبت جو کچھ لکھا گیا، یہ اس وقت کا حال ہے جب کہ سلطنت دم توڑ چکی تھی، کتب خانہ تباہ و برباد ہو چکا تھا اور اسپرنگر صاحب نے محض بچی کھچی کتابون کی فہرست تیار کی تھی، ورنہ عبد اللطیف شوستری نے جو آصف الدولہ کے عہد مین لکھنؤ آیا تھا، اپنے سفرنامہ مین لکھا ہے کہ

"علامی تفضل حسین خان کے ساتھ مین نے کتب خانہ کا معاینہ کیا، تقریباً تین لاکھ کتابین اس کتب خانہ مین موجود ہین، اور ہر سو جلد پر ایک آدمی مقرر ہے،

زبان کے اعتبار سے یہ کتب خانہ عربی، فارسی اور انگریزی کی نظم و نثر کی کتابون پر مشتمل تھا، خوشنویسون کے قطعات کے علاوہ ایرانی، ہندی، رومی اور یورپین مصورین کے بہترین نمونے اس کثرت سے اس مین ہین کہ ان سب کو دیکھنے کے لیے عمر نوح کی ضرورت ہے، علمی کتابون کے بے شمار نسخے دیکھنے مین آئے، جیسے شرح رضی، مدارک، مسالک، مفاتیح،

---

[1] فہرست کتب خانہ شاہ اودھ مطبوعہ لندن،

کشکول، بحار الانوار وغیرہ،

اس کتب خانہ مین مصنفون کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابین بھی بہت ہین، مہتمم کتب خانہ نے بتایا کہ سات سو جلدین خود مصنفون کے ہاتھ کی لکھی ہوئی موجود ہین، دہلی کی سلطنت جب تباہ ہوئی تو وہان کے کتب خانہ کی کتابین زیادہ تر لکھنؤ کے اس شاہی کتب خانہ مین منتقل ہو گئین، حق یہ ہے کہ یہ کتب خانہ اس قدر نادر روزگار ہے، اور ایسا بیش بہا ہے کہ شاہی خزانہ کے جواہرات اس کے پاسنگ کو بھی نہین پہنچتے[1]

اس بیان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بارہوین صدی کے آخر مین شاہان اودھ کا کتب خانہ کتنا عظیم الشان اور اس کا انتظام کس قدر بہتر تھا، لکھنؤ مین ایک مشہور کتب خانہ مرزا سلیمان شکوہ کا تھا، مرزا سلیمان شکوہ دہلی کے بے بصر بادشاہ شاہ عالم کے تیسرے بیٹے تھے ۱۲۰۶ھ مین قلعہ معلی سے بھاگ کر لکھنؤ پہنچے،

لکھنؤ مین آصف الدولہ کی حکومت تھی، بڑی عزت کے ساتھ "تیر تی کوٹھی" مین قیام کا انتظام کر دیا، اور چھ ہزار ماہوار ان کے اخراجات کے لیے مقرر کر دیے، مرزا سلیمان شکوہ بڑے علم دوست تھے، دہلی کے ارباب فن ان کے دربار مین آہستہ آہستہ جمع ہو گئے، خود بھی شاعر تھے، اور شاعرون کی قدر افزائی مین ہمیشہ ساعی رہے، ان کے پاس بھی ایک کتب خانہ تھا، اسی کتب خانہ مین شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے متعدد دیوان مصنف کے زیر ہدایت لکھے گئے تھے، جن کی پانچ جلدین اس وقت بھی کتب خانہ رامپور مین موجود ہین، اور مرزا سلیمان شکوہ کے کتب خانہ کی مہر اس پر لگی ہے[2]

لکھنؤ کے ضلع مین کاکوری شرفاء کا ایک مشہور قصبہ ہے، جہان برٹش گورنمنٹ کے

---

[1] تحفۃ العالم ص ۳۴۲ و ۳۴۳، و ۳۴۴ مطبوعہ بمبئی [2] فہرست کتب خانہ رامپور

کے عہد میں بھی عرصہ تک علم کا چرچا رہا، وہاں صاحب ذوق امرا کے سبب سے بہت سے علما، شعراء اور ادیب رہتے تھے، اور ان ہی کے سبب سے مدارس، کتب خانے، اور علمی مجلسیں قائم تھیں ان ہی میں سے ایک مقام امیر محل تھا" جہاں ایک بڑا کتب خانہ قائم کیا گیا تھا، اس کتب خانہ میں ایک تذکرہ" بیاض نورازل" تھا، جس کو شیخ غلام ہمدانی مصحفی نے ۱۲۰۹ھ میں تصنیف کیا تھا، اور اس کی نقل در نقل ۱۲۳۹ھ میں ہوئی جو امیر محل کے کتب خانہ میں داخل ہوئی، اور اسوقت کاکوری کے مشہور علم دوست شبیر احمد صاحب علوی بی، اے کے پاس موجود ہے[1]۔

فرنگی محل کا کتب خانہ | صوبہ اودھ کے مشہور قصبات میں سے ایک "سہالی" بھی ہے، جہاں شیخ نظام الدین اللہ ایک مشہور عالم بزرگ سکونت پذیر تھے، اور ان کا فیض جاری تھا۔

اکبر کے زمانہ میں ان کے پوتے شیخ حافظ نے بڑی شہرت حاصل کی، ان کے علم کا غلغلہ سنکر بادشاہ نے ازراہ قدر دانی ان کے لیے جاگیر مقرر کر دی، ان کی چوتھی پشت میں ملا قطب الدین ہوئے، یہ اس پایہ کے بزرگ تھے کہ خود عالمگیر نے ان سے ملنے کی خواہش کی تھی، جب ان کو دشمنوں نے شہید کر دیا، تو ان کے لڑکے ملا نظام الدین لکھنؤ چلے آئے، بادشاہ نے ازراہ قدردانی فرنگی محل، جہاں پہلے ایک انگریز تاجر کی کوٹھیاں تھیں، ان کے قیام کے لیے مرحمت کیا، ملا نظام الدین نے اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چل کر وہ شہرت حاصل کی جو خاندان شاہ ولی اللہ کے سوا ہندوستان میں کم کسی کو نصیب ہوئی،

آپ نے جو مدرسہ فرنگی محل میں قائم کیا تھا وہ آگے چل کر عربی و دینی علوم کی ایک بڑی عظیم الشان یونیورسٹی ہو گئی، اس کیلئے ایک کتب خانہ کا ہونا ضروری تھا، خود ملا نظام الدین کے زمانہ میں یہ کتب خانہ کس حیثیت کا تھا، اس کے متعلق تفصیلی حالات نہیں معلوم لیکن اسقدر

---

[1] رسالہ نگار ص ۴۳، جنوری ۱۹۲۹ء

علم ہے کہ ملا صاحب کے بعد ان کے جانشینون نے اس کتب خانہ مین بڑا اضافہ کیا، یہانتک کہ مولانا عبدالحیٔ کے زمانہ مین مطابع کے اجراء سے اس مین کتابون کا بڑا ذخیرہ جمع ہوگیا، معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی وفات پر کتب خانہ کا نایاب حصہ تلف ہوگیا، راقم الحروف نے جب اس کتب خانہ کو دیکھا تو اس مین فقہ کی کتابین زیادہ تھین، یہ کتب خانہ فی الحال یوسفی پریس کی دو منزلہ عمارت کے مشرقی دالان مین ہے، بعض کھلی اور کچھ بند الماریون مین کتابین فن وار رکھی ہین، غالباً یہ کتب خانہ اسی وقت کھلتا ہے، جب کوئی شائق اس کا مشتاق ہو،

مولانا عبدالباری صاحب کا کتب خانہ بھی نظر سے گذرا، اس مین زیادہ تر فقہ اور تصوف کی کتابین ہین، یہ کتابین ان کے دیوان خانہ مین محراب کے طاقون اور دیواری تختون پر ہین اور کچھ مخطوطات مدرسہ نظامیہ کی دوسری منزل مین کھلی الماریون مین رکھی ہین،

لکھنؤ مین ایک اور مشہور کتب خانہ تھا، جو وہان کے مجتہد صاحب کے زیر اہتمام قائم ہوا تھا، یہ کتب خانہ ۱۸۵۷ء کے بعد بھی مجتہد صاحب کے پاس رہا، راقم الحروف نے ایام طالبعلمی مین جناب قبلہ علی صاحب مجتہد کے انتقال پر سنا تھا کہ ان کا کتب خانہ دوسرے مجتہد صاحب کو دیدیا گیا، اس کے بعد قبلہ ناصر حسین صاحب مجتہد قرار پائے، آپ کا کتب خانہ لکھنؤ مین بہت مشہور ہے، راقم الحروف نے جب اس کو دیکھا تو اس مین دو قسم کی کتابین تھین، ایک تو وہ جو اصل کتب خانہ مین پہلے سے چلی آرہی ہین ان پر قدیم کا لفظ لکھا ہوا ہے، دوسری وہ جو خود مجتہد صاحب قبلہ نے اضافہ کی ہین، ان پر جدید کا لفظ مرقوم ہے، قدیم کے لفظ سے خیال گذرتا ہے کہ شاید اس سے مراد وہ کتابین ہون جو سلسلہ بسلسلہ مجتہدون کو کتب خانہ کی شکل مین منتقل ہوتی آئی ہین،

راجہ سلیم پور کا کتب خانہ | لکھنؤ کے قریب کے قصبون مین ایک قصبہ "سلیم گڈھ" بھی ہے، جس کو آجکل سلیم پور کہتے ہین، شاہان اودھ کے عہد سے یہان کے حکمران جو "راجہ" کے لقب سے مخاطب

کیے جاتے ہیں، صاحب ذوق اور قدردان علم وفن تھے، وہ ان کو قیمون اور جواہرات کی طرح کتابون کا بھی شوق تھا، اس لیے ان کا لاجواب کتب خانہ قائم ہوگیا، اس کتب خانہ مین تقریبًا ہر فن کی کتابین تھین، مخطوطات کا بھی بڑا ذخیرہ تھا، بعض کتابین مصوری کا نمونہ تھین، فردوسی کے "شاہنامہ مصور" کی قیمت دس ہزار تک آنکی گئی تھی، منظر الاعیان کا نسخہ تمام ہندوستان مین نادر کتاب کا حکم رکھتا ہے، حیدرآباد کے دیوانی کے کتب خانہ کے علاوہ دوسرا نسخہ اسی سلیم پور کے کتب خانہ مین ہے، لیکن بہت برے حال مین ہے، راقم الحروف نے جب اس کو دیکھا تو باوجود حفاظت کے اس کی حالت ابتر تھی، جس عمارت مین یہ کتب خانہ ہے وہ اس قدر شکستہ ہے کہ "اگر ماند شبے ماند شبے دیگر نمی ماند" کی مصداق ہو رہی ہے،

کتابیں بند الماریون مین ہین، اور ابھی تک بیشتر اچھی حالت مین ہین، گو حفاظت کا کوئی سامان نہین، اردو، فارسی، عربی تینون زبانون اور ہر فن کی کتابین ہین، فقہ، حدیث، تفسیر (شیعہ و سنی) اور ان کے اصول کی کتابین زیادہ ہین، تاریخ اور ادب کا ذخیرہ بھی کافی ہے، مخطوطات کتب خانہ سے علیحدہ توشہ خانہ مین کئی صندوقون مین بھرے ہین،

بلگرام کے کتب خانے لکھنؤ کے مضافات مین ایک مردم خیز خطہ قصبۂ "بلگرام" بھی ہے، جہان قدیم عہد مین بڑے بڑے علما، ادبا، حکما، اور صوفیہ پیدا ہوتے رہے ہے، شیخ عبدالواحد، شیخ نظام، قاضی محمود، قاضی کمال، میر عبدالواحد، مفتی امیر حیدر، سید غلام علی آزاد بلگرامی، میر عبدالجلیل بلگرامی، سید ڈاکٹر علی بلگرامی، نواب سید حسین بلگرامی جیسے اکابر اسی خاک کے درخشندہ ستارے تھے،

اس سے قیاس ہو سکتا ہے کہ بلگرام مین کیسے کیسے کتب خانے رہے ہون گے، جو دستبرد زمانہ سے برباد ہوگئے، تاریخ کے مطالعہ سے چند مشہور کتب خانون کا حال معلوم ہوتا ہے،

(۱) قاضی ابو الفتح شیخ کمال فرشوری بلگرام کے اہل کمال میں تھے، ۹۱۰ھ میں پیدا
ے، اکبر اعظم کے عہد میں قاضی مقرر کیے گئے، اس دولت و وجاہت کے باوجود تمام
ر خدمت علم میں مصروف رہے، آپ کے پاس ایک بڑا کتب خانہ تھا، جس میں صرف، نحو،
نطق، حکمت، معانی، بیان، فقہ، اصول فقہ، تفسیر کا بڑا ذخیرہ تھا،

قاضی صاحب خود خوشنویس اور خطاط بھی تھے، اس لیے بڑی تعداد کتابوں کی خود ان ہی
ے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی، اکثر کتابوں پر ایسے سیر حاصل حاشیے لکھے کہ پھر شرح کی ضرورت نہ رہی
تابت میں صحت کا اتنا اہتمام رکھتے تھے کہ ایک نقطہ کی بھی غلطی نہ ہوتی تھی، آزاد بلگرامی نے ماثر الکرام
ں آپ کی تحریروں کو کمال صحت کے سبب صحف آسمانی کا خطاب دیا ہے، شیخ کمال نے
نواسی برس کی عمر میں ۱۰۰۱ھ میں وفات پائی، "شیخ کمال" تاریخ وفات ہے، انکے انتقال کے
بد کتب خانہ برباد ہو گیا، اور اکثر نادر کتابیں بلگرام سے باہر چلی گئیں [1]

(۲) بلگرام میں ایک دوسرا کتب خانہ سید عبد الواحد بلگرامی کا تھا، یہ بھی بڑے خوشنویس
تھے، مختلف فنون کی کتابیں جمع کی تھیں اس کتب خانہ میں بے شمار نسخے کلام مجید کے تھے،

(۳) سید عبد اللہ بلگرامی اپنے زمانہ کے مشہور فضلا میں تھے ان کو خوش خطی میں بھی کمال حاصل
تھا، کاغذ کے پھول اچھے تراشتے تھے، طبع موزوں رکھتے تھے، قابل تخلص تھا، ۱۱۰۳ھ میں وفات
پائی، سید صاحب نے ایک بڑا کتب خانہ قائم کیا تھا، اس میں بڑی نادر اور عمدہ کتابیں تھیں،
فسوس کہ ان کے بعد کتب خانہ نا اہلوں کے ہاتھ لگا، اس لیے کتابیں متفرق اور منتشر ہو گئیں
ور یہ گوہر نایاب برباد ہو گیا،

(۴) علامہ سید عبد الجلیل بلگرامی کی ذات علمی حیثیت سے بہت بلند تھی، شہنشاہ عالمگیر

لہ ماثر الکرام ج ۱ ص ۲۲۸

کے بعد وہ حکومت کے مختلف عہدون پر ممتاز رہے، جہان جاتے تھے علمی مشغلہ ساتھ لے جاتے، کتابون کے بے حد قدردان اور شائق تھے، سفر مین اپنے ساتھ صرف ضروری کتابین رکھتے، باقی کتب خانہ بلگرام مین تھا، کتابین زیادہ تر اس عہد کے دستور کے مطابق صندوقون مین تھین، ایک خط مین سید محمد کو لکھتے ہین کہ برخوردار، کتاب روضۃ المناظر اس صندوق مین رکھی ہے جو گجرات سے گھر بھیجے آیا تھا۔

کتابون کی حفاظت کے متعلق لکھتے ہین "کتابون کی احتیاط کے بارہ مین کیا لکھون، آپ پر ظاہر ہے کہ مین کتابون کو کس قدر عزیز رکھتا ہون، اور کتنی محنت اور تلاش سے ان کو فراہم کیا ہے، کبھی کبھی دھوپ بھی دکھا دیا کرین، اس کتب خانہ مین اردو، فارسی، عربی، ترکی، ہندی اور سنسکرت کی کتابین تھین، فنون کے اعتبار سے ادب، ادعیہ، حدیث، طب، لغت، فقہ، صرف نحو وغیرہ کی کتابین دوسرے فنون کے مقابلہ مین زیادہ تھین، میر عبد الجلیل نے تقریبا ۷۰ سال کی عمر مین بمقام دہلی ۱۱۳۸ھ مین وفات پائی،[1]

میر صاحب کے انتقال کے بعد کچھ عرصہ تک ان کی اولاد نے کتب خانہ کی حفاظت کی، لیکن پھر اس خاندان سے علمی ذوق گھٹتا گیا، تو آہستہ آہستہ کتابین فروخت کردین، اور آج اس کا ایک ورق بھی بلگرام مین نہیں ہے، لیکن یہ امر باعث مسرت ہے کہ ان کتابون کا بڑا حصہ خصوصاً میر صاحب کی تصنیفات بلگرام سے منتقل ہو کر حیدرآباد کے کتب خانہ آصفیہ مین داخل ہوگئین،

(۵) علمائے بلگرام مین شاہ طیب متوفی ۱۱۵۲ھ بھی مشہور لوگون مین تھے، وہ عرصۂ دراز تک سلسلۂ ملازمت احمد آباد گجرات مین رہے، اپنے والد کے انتقال کے بعد

---

[1] حیات جلیل ص ۱۶۲

خانہ نشین ہو گئے، ان کے پاس بھی ایک کتب خانہ تھا، خود بھی بڑے زود نویس اور اعلیٰ پایہ کے خوشنویس تھے، اس کتب خانہ میں خوشنویسی کے اعلیٰ نمونے بکثرت تھے، آزاد بلگرامی لکھتے ہیں

"وکتب خانہ عظیمے از خط خوش خط خود یادگار گذاشت[۱]"

(۶) نواب شیخ میر عالمگیری صاحب ثروت ہونے کے ساتھ صاحب دل بزرگ تھے، بلگرام کے سید واڑہ سے نکل کر شہر کے مشرقی جانب ایک محلہ آباد کیا، اور اس میں ضروریات کی تمام چیزیں مہیا کیں، کتابوں کے بھی شائق تھے، چنانچہ ایک کتب خانہ بھی ان کے پاس موجود تھا، اسی محلہ میں مسجد تعمیر کرا رہے تھے کہ خود ان کی حیات مستعار کی تکمیل ہو گئی، مرتے وقت وصیت کر گئے کہ کتابوں کو فروخت کر کے مسجد کی تکمیل کی جائے[۲]۔

والی فرخ آباد کا کتب خانہ مغلیہ سلطنت کے آخری زمانہ میں روہیلوں کی ایک ریاست فرخ آباد میں بھی قائم ہوئی تھی، یہاں کے حکمران علم کے شائق اور اہل کمال کے بڑے قدردان تھے، چنانچہ جو بڑے بڑے اصحاب کمال دہلی سے نکلتے تو ان کی پہلی منزل فرخ آباد ہوتی، سنہ ۱۲۶۳ھ میں یہاں کا حکمران بدر الدولہ شجاع الملک محمد سعادتمند خان بہادر اسد جنگ تھا، جو سخاوت، شجاعت اور علوم و فنون کی قدردانی میں اپنے بزرگوں کا خلف الصدق تھا، اس کے پاس بھی ایک بڑا کتب خانہ تھا، چنانچہ ایک کتاب پر اپنے قلم سے یہ عبارت لکھی ہے:

بتاریخ دوازدہم ذی الحجہ سنہ ۱۲۶۳ھ مقدسہ روز جمعہ نسخہ مجالس العشاق بکتب خانہ نیاز مند درگاہ بدر الدولہ شجاع الملک محمد سعادت خان بہادر اسد جنگ بن نواب امین الدولہ محمد خردمند خان بہادر ببر جنگ خلف الرشید نواب شمس الدولہ محمد خدابندہ خان بہادر غضنفر جنگ والی ملک فرخ آباد داخل گردید"۔

---

[۱] مآثر الکرام ج ۱ ص ۳۰۵ [۲] ایضاً ص ۹۸،

یہ کتاب آج کل ریاست رامپور کے کتب خانہ میں ہے[1]

نواب روہیلہ کا کتب خانہ | محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں روہیلہ پٹھانوں نے بڑی قوت پیدا کرلی، وہ آہستہ آہستہ روہیل کھنڈ پر قابض ہو گئے، اس کے حکمرانوں میں حافظ رحمت خان بڑا شجاع بہادر صاحب علم اور اہل کمال کا قدردان تھا، اس نے اپنے مختصر عہد حکومت میں بہت سے مدرسے قائم کیے، اور رفاہ عام کے دوسرے کام انجام دیے،

وہ سادات، علماء اور فضلا کا بڑا قدردان تھا، اس کے پاس بھی ایک کتب خانہ تھا، ۱۷۷۴ء میں اودھ کے نواب شجاع الدولہ نے حافظ رحمت خان کو قتل کرکے اس کی ریاست کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا، اور شاہی محل کو لوٹ کر تباہ کر دیا[2]۔

اس لوٹ میں کتب خانہ بھی ہاتھ آیا، جس کو لکھنؤ لاکر توپ خانہ کی عمارت میں رکھا گیا، لکھنؤ میں عام طور پر اسکو توپخانہ لائبریری کہتے تھے، یہ توپ خانہ برٹش رزیڈنسی کے قریب تھا، (جس کو آجکل بیلی گارد کہتے ہیں، جو دراصل بیلی گارڈن کا بگڑا ہوا نام ہے، میجر بیلی صاحب نواب سعادت علی خان کے عہد میں مشہور رزیڈنٹ تھے)، غالباً یہ وہ مقام ہے جہاں آجکل بلرام پور ہسپتال ہے، اور بیلی گارد کے سامنے جو بڑا میدان نظر آتا ہے وہ اس میں شامل تھا، اس میدان میں ایک بڑی دو منزلہ عمارت تھی، اس کے تین حصے فوجی ضروریات میں استعمال ہوتے تھے، اور چوتھے حصہ کی بالائی منزل میں یہ کتب خانہ تھا،

یہ کتابیں صندوقوں میں بڑی بے ترتیبی سے بھری ہوئی تھیں، اسپرنگر صاحب نے ان کو کس مپرسی کے عالت میں دیکھ کر بہت افسوس کیا ہے، ان صندوقوں میں مستقل طور پر چوہوں نے سکونت اختیار کرلی تھی، اور ڈنڈوں سے کھٹکھٹائے بغیر ان صندوقوں میں

[1] لکچر محقق آثار قدیمہ کلکتہ حافظ نذیر احمد صاحب بحوالہ معارف ج ۱۲ [2] گل رحمت ص ۶۳، بمبئی

ہاتھ ڈالنا بڑا خطرناک کام سمجھا جاتا تھا،

کیڑون نے بھی کافی نقصان پہنچایا تھا، اچھی اچھی کتابین کیڑون کی تم آرائی سے چھلنی ہوکر رہ گئین، ہفت قلزم اور تاج اللغات دونون جو اس عہد مین نایاب و نوادر مین شمار ہوتی تھین برباد ہوگئین، اور اس قسم کی بے شمار کتابین چوہون اور کیڑون کے نذر ہوگئین، اسکا سبب غالباً یہ ہے کہ شجاع الدولہ کو روہیلون کے ملک، ان کی دولت اور ہیرے جواہرات کی ضرورت تھی جو بعد فتح حاصل ہوگئے تھے، فوجی سردارون نے ان تمام کتابون کو بیکار سمجھکر ایک کونہ مین ڈالدیا، جو بلا حفاظت اسپرنگر صاحب کے وقت تک پڑی رہیں،

رام پور کا کتب خانہ | سلطنت مغلیہ کے اختتام پر روہیل کھنڈ مین جو ریاستین قائم ہوگئی تھین ان مین سے ایک رام پور کی ریاست بھی ہے، اس کے فرمانروا ہمیشہ سے علوم و فنون کے سرپرست رہے ہین،

دہلی اور لکھنؤ کے اجڑ جانے پر اکثر اہل کمال رام پور آگئے تھے جن کی نواب صاحب نے بھی پوری قدر دانی کی اور علمی کامون کا دروازہ کھولدیا، اور ایک بڑا عربی مدرسہ قائم کیا گیا، جس کے صدر مدرس (پرنسپل) علامۂ زمان مولانا عبد العلی بحر العلوم فرنگی محلی تھے، اسی کے ساتھ تصنیف اور ترجمے کا کام بھی شروع کیا گیا،

تاریخی تحقیقات سے جہان تک پتہ لگتا ہے، باقاعدہ طور پر کتب خانہ کی ابتدا نواب محمد فیض اللہ خان والی رامپور کے عہد مین ہوئی، اور تصنیف و تالیف و ترجمے اور نذر کے ذریعہ جتنی کتابین حاصل ہوئیں وہ سب اس کتب خانہ مین جمع ہوئین،

نواب سید محمد سعید خان صاحب کے عہد (۱۲۵۶ھ تا ۱۲۷۱ھ) مین ایک ہزار پانسو نواسی روپے آٹھ آنے کی کتابین خریدی گئین، اس وقت کتب خانہ مین ہمایون نامہ، اکبر نامہ، خزانۃ العلم

تاریخ نادری، خلاصۃ التواریخ، تاریخ جہان خانی، تاریخ مجمع محفل جیسی کتابین جو اس عہد مین نایاب تھین اس کتب خانہ مین موجود تھین،

نواب سید محمد یوسف صاحب کے زمانہ (۱۸۶۵ء) مین دو ہزار سات سو ستاون روپے ساڑھے دس آنے کی کتابین خرید کرکے داخل کتب خانہ کی گئین،

اس کے بعد نواب کلب علی خان کے عہد مین کتب خانہ کو بڑی ترقی ہوئی، اور تینتالیس ہزار چھ سو آٹھ روپے ۱۲ آنے ۹ پائی کی کتابین خریدی گئین، اس کے علاوہ دوران سال مین جو نایاب کتابین خریدی گئین ان کی قیمت اس مین شامل نہین ہے، جیسے تاریخ غازانی مصور جس کی قیمت دو ہزار تھی یا عجائب المخلوقات کا مصور نادر نسخہ وغیرہ،

نواب کلب علی خان کے بعد نواب حامد علی خان کے عہد مین چار لاکھ اٹھائیس ہزار ایک سو چھتیس روپے چودہ آنے، دس پائی کتب خانہ پر صرف ہوئے، جس مین سے چالیس ہزار کی رقم کتب خانہ کی عمارت پر خرچ ہوئی، بقیہ مین کتابون کی خریداری اور کتب خانہ کے عملہ کی سال بھر کی تنخواہ شامل ہے،

عملہ مین ناظم، مہتمم، رجسٹرار، نائب رجسٹرار، تحویل دار، خوش نویس، نقاش، وراق، جلد ساز، صحاف، پاسبان، فراش وغیرہ ہوتے تھے، یہ کتب خانہ آج بھی موجود ہے، اس مین مندرجہ ذیل فنون کی کتابین ہین،

تفسیر، حدیث، اسماء الرجال، فقہ، اصول فقہ، کلام، سلوک، اخلاق، حکمت، ہیئت، منطق، طب، لغت، نحو، بلاغت، ادب، تاریخ، سیر، مناقب، الحرب، کیمیا، اعمال متفرق،

مندرجۂ ذیل زبانون کی کتابین اس مین موجود ہین:-

عربی، فارسی، اردو، انگریزی، ترکی، پشتو، بھاشا، سنسکرت، ناگری، ا

پچانی کی کتابین ہین،

قدامت کے لحاظ سے سب سے زیادہ قدیم کتاب ابوالحسن علی بن محمد ماوردی شافعی متوفی ۴۵۰ھ کی النکت والعیون ہے، جو ۵۰۰ھ کی لکھی ہوئی ہے، کتابت کے اعتبار سے سب سے زیادہ قدیم کتاب امام ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن نیشاپوری متوفی ۴۶۵ھ کی التیسیر فی علم التفسیر ہے، جو جعفر بن عمر الصیرفی الحداوی کے ہاتھ کی ۴۷۹ھ کی لکھی ہوئی ہے،

خطاطی کی حیثیت سے دنیائے اسلام کے مشہور خطاط یاقوت مستعصمی کے لکھے ہوئے کتبے بھی اس کتب خانہ مین موجود ہین، ایک کتاب دیوان الحادرہ بھی اسی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی موجود ہے،

اس کتب خانہ کے ابتدائی دور کی کوئی ایسی شہادت دستیاب نہین ہوئی جس سے اس بات کا صحیح اندازہ لگایا جا سکے کہ اس زمانہ مین کتابون کی تعداد کیا تھی، سب سے پہلی تحریر نواب کلب علی خان کے عہد کے مشہور شاعر منشی امیر احمد صاحب مینائی کی ملتی ہے، جو غالباً اس زمانہ مین کتب خانہ کے ناظم تھے، اس وقت (۱۸۸۹ء) کل کتابون کی تعداد ۴۳۰۹ تھی، اس کے بعد حکیم محمد اجمل خان اس کے ناظم مقرر ہوئے، انھون نے عربی کتابون کی ایک مفصل فہرست (جلد اول) مرتب کرائی جس مین کتابون کی کل تعداد ۵۱۴۲ ہے، ۱۹۰۲ء مین اس کی دوسری جلد شائع ہوئی، اس زمانہ مین اسی کتب خانہ کے ناظم حافظ احمد علی خان صاحب تھے، ان کی تحریر کے بموجب کتابون کی تعداد ۵۱۱۴۲ ہے،[1] (باقی)

---

[1] رام پور کے کتب خانہ کے متعلق تمام معلومات فہرست کتب خانہ رام پور جلد اول اور جلد دوم سے ماخوذ ہیں۔

معانی القرآن للطبری

از

جناب ابو محفوظ الکریم صاحب معصومی ریسرچ اسکالر ڈھاکہ یونیورسٹی

ستمبر ۱۹۴۳ء کے معارف میں "تفسیر طبری کی اہمیت" کے عنوان سے حقیر نے جامع البیان للامام الطبری پر کام کی نوعیت کا خاکہ پیش کیا تھا، جس سے اصحاب ذوق حضرات میں خاطر خواہ تاثیر پیدا ہوا، گرامی قدر حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی و دیگر اکابر کے گرامی نامے کتاب معانی القرآن للطبری کے تقاضے اور اس ہیچمدان کی عزت افزائی میں موصول ہوئے، فحمداً للہ وشکراً لہم۔

راقم الحروف نے "معانی القرآن للطبری" پر کام شروع کیا تھا، اور اسی کی تالیف و تدوین میں ہمہ تن مصروف رہے،

معانی القرآن للطبری میں الفاظ قرآنیہ سے متعلق امام طبری کے لغوی مباحث کو جمع کردیا گیا ہے، امام طبری نے الفاظ قرآنیہ پر کوئی مستقل تالیف نہیں کی ہے، مگر اپنی تفسیر میں جہاں وہ قرآن مجید کی تفہیم و تاویل میں آثار و روایات کا ذکر کرتے ہیں، مفردات قرآنیہ کی تحقیق اور ان کے بیان میں محاورات عرب اور ائمہ لغت کے اقوال بھی بیان کرتے ہیں جن کو یکجا کر لینے کے بعد ایک خاصی ضخیم کتاب غریب القرآن کی تیاری ہوگئی ہے۔

ائمیان امت نے غریب القرآن پر الگ الگ کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں سے اکثر و بیشتر نادر و نایاب ہیں ان مصنفین میں ابو عبیدہ معمر بن المثنی[1] ابو عمر الزاہد، ابن درید (م ۳۲۱ھ) امام راغب

---

[1] [illegible]

اصفہانی، ابن الانباری، ابوبکر محمد بن عزیز سجستانی (م ۳۳۰ھ) وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں،

امام راغب کی کتاب مفردات القرآن مطبعہ میمنیہ مصر سے شائع ہو چکی ہے، اور علمی دنیا میں خاص قدر و منزلت رکھتی ہے، سجستانی کی کتاب جس کا نام نزھۃ القلوب و فرحۃ المکروب ہے، ۱۳۲۵ھ میں مطبعۃ السعادۃ مصر سے چھپ کر شائع ہوئی ہے، یہ کتاب مختصر لیکن مفید ہے، اس کتاب کو فخر الدین محمد بن علی النجفی الطریحی[۱] نے جدید طور پر مرتب کر کے نزھۃ الخاطر و سرور الناظر نام رکھا ہے، جس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ ٹونک میں موجود ہے۔ ابن الانباری اور اُن کے تمیذ عزیزی (ابن عبدالملک المعروف بشیدلہ) نے پندرہ برس تک غریب القرآن پر کام کیا تھا، ان کی کتاب کسی زمانہ میں بہت مقبول و مشہور تھی، لیکن افسوس کہ دوسری کتابوں کی طرح آج وہ بھی پردۂ خفا میں ہے، ابوحیان نے بھی غریب القرآن پر ایک مختصر رسالہ تالیف کیا تھا جسکا ذکر امام سیوطی نے کیا ہے، ابن درید کی کتاب مکمل[۲] نہیں ہو سکی تھی، ان کے علاوہ کسائی (م ۱۸۲ھ) زجاج (م ۳۱۱ھ) فراء (م ۲۰۷ھ) اخفش (م ۲۱۵ھ یا ۲۲۱ھ) وغیرہم کی کتابیں معانی القرآن میں خاص اہمیت رکھتی تھیں، لیکن اب یہ کتابیں عنقا ہیں، تاریخوں میں صرف ان کا نام یا تذکرہ مل جاتا ہے، فراء کی کتاب اب تک عالم وجود میں ہے، اور ڈھاکہ یونیورسٹی میں اس پر کام ہو رہا ہے[۳]، اس کتاب میں جستہ جستہ معانی الفاظ بھی مل جاتے ہیں، البتہ نحوی مباحث کی کمی نہیں۔ امام طبری نے جن کتابوں کو پیش نظر رکھ کر اپنی تفسیر لکھی ہے، اُن میں فراء کی کتاب بھی ضرور ہوگی، کیونکہ اُن کی تفسیر

---

[۱] معارف فروری ۱۹۴۸ء ص ۱۰۳ [۲] مقدمہ کتاب الملاحن بحوالہ معجم الادباء تذکرہ ابن درید،

[۳] برادر معظم مولانا صغیر حسن معصومی ایم اے لکچرار عربی معانی القرآن للفراء پر کام کر رہے ہیں،

ہیں اس کی عبارتیں جابجا موجود ہیں، کہیں کہیں انھوں نے فراء پر تنقید بھی کی ہے، مثلاً فَصُرْهُنَّ کی تفسیر میں فراء کا قول "وزعم بعض نحوی الکوفة[1]" کے تحت نقل کرکے اس کی تردید کی ہے، اگر فراء کی کتاب پیش نظر ہو تو واضح ہو جاتا ہے کہ بعض نحوی الکوفہ سے طبری کی مراد فراء ہوتا ہے،

امام سیوطی نے کتاب الاتقان میں نافع بن الازرق اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے سوال[2] وجواب نقل کئے ہیں جن میں تقریباً ایکسو نوّے الفاظ قرآنیہ کے معانی مع شواہد حضرت ابن عباسؓ سے ظہور میں آئے ہیں، یہ مجموعہ سوال وجواب نہایت دلچسپ ہے، سائل مختلف الفاظ کے شواہد پوچھتا ہے، اور حضرت ابن عباسؓ عرب عرباء کے اشعار بطور شواہد پیش کرتے ہیں، البتہ ایک جگہ سوال وجواب میں بظاہر مطابقت نہیں معلوم ہوتی، نافع مِنْ حَمَاٍ مَسْنُوْن کے معنی پوچھتے ہیں، تو حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں الحَمَاۗءُ، السواد. والمسنون، المصوّر اس پر بھی سائل کو تشفی نہیں ہوتی، اور کلام عرب سے شاہد کا طلبگار ہوتا ہے، حضرت ابن عباسؓ حمزہ بن عبد المطلب کا یہ شعر پیش کرتے ہیں[3]،

أَغَرُّ كأن البدر شقة وجهه جلا الغيم عنه ضوءه فتبددا

ظاہر ہے کہ اس شعر میں نہ حماء کا لفظ ہے، اور نہ مسنون کا۔

اس مضمون میں معانی القرآن طبری کے چند اقتباسات کو اردو میں پیش کیا جاتا ہے تاکہ شائقین علم کو امام طبری کی معانی القرآن کے مضامین کا اندازہ ہو جائے اس سے اس کتاب کی اہمیت اور دوسرے خصائص کی توضیح بھی ہو جائے گی، اور یہ معلوم ہو جائے گا کہ تفسیر طبری صرف احادیث وروایات ہی کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ اس میں لغات القرآن کی بے مثل تحقیقیں کثرت سے موجود ہیں،

---

[1] تفسیر طبری ج ۲ ص ۴۳ [2] ایضاً ج ۱ ص ۱۲۰، ۱۳۲ [3] اتقان جلد ۱ صفحہ ۱۲۳،

علامہ حمید الدین فراہی نظام القرآن میں فرماتے ہیں[1]

وقد أسس تفسيره بعض	بعض علماء نے احادیث پر اپنی تفسیر
العلماء على الاحاديث كابن	کی بنیاد رکھی، جیسے ابن جریر طبری جن
جرير الطبري الذي حكموا على	کی تفسیر کے متعلق لوگوں کا فیصلہ ہے کہ
تفسيره انه لم يصنف مثله الخ،	ایسی تفسیر نہیں لکھی گئی"، الخ

علامہ کی اس تحریر سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ طبری کی تفسیر میں صرف احادیث و آثار کی بھرمار ہے، اور زبان کی تحقیق برائے نام ہوگی، مگر یہ واقعہ ہے کہ جس طرح امام طبری نے روایات کثرت سے نقل کی ہیں، اسی طرح لغوی ونحوی تحقیقات اور قرأۃ و بلاغت کے مسائل کو بھی نہایت واضح طور پر بیان کیا ہے،

مقدمۂ تفسیر میں انھوں نے ایجاز، اقتصار، تصریح، کنایہ، اور دوسرے اسالیب کلام کو شمار کیا ہے، اور تفسیر میں قرآن کے اسالیب وخصائص کلامیہ کی تشریح کا وعدہ کیا ہے[2]، تفسیر کے مطالعہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ انھوں نے اپنا یہ وعدہ پورا بھی کیا ہے،

انھوں نے ابتدا میں مفردات قرآن پر تبصرہ کرتے ہوئے ان قرآنی الفاظ کے متعلق جو عرب و عجم کی زبان میں مشترک ہیں، مثلاً کِفْلَیْنِ، اَوِّبِیْ، قَسْوَرَۃ[3]، سِجِّیْلٌ وغیرہ جن کے متعلق روایتوں

---

[1] مقالہ امین احسن اصلاحی معارف ص ۸۸، فروری ۱۹۴۲ء [2] تفسیر طبری اول ص ۲ [3] حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی سے ابن ابی حاتم اور امام طبری نے تخریج کی ہے کہ کِفْلَیْنِ حبشی زبان میں ضعفین کے معنی میں آتا ہے (طبری ج ۲۷ ص ۱۴۱، اتقان جلد ۱ ص ۱۲۹، آیت یہ ہے: يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَحْمَتِهِ، (۲) عمر بن شرحبیل سے منقول ہے کہ اَوِّبِیْ حبش کی زبان میں سبحی کے معنی میں آتا ہے، اتقان جلد ۱ ص ۱۳۷، آیت یہ ہے: يَا جِبَالُ أَوِّبِي مَعَهُ الخ (۳) امام طبری نے حضرت ابن عباس رضی سے تخریج کی ہے کہ قسورۃ حبشی زبان میں اسد کو کہتے ہیں قال اللہ تعالیٰ

سے یہ ظاہر ہوتا ہے، کہ عجمی ہین لیکن یہ نہین کہا جاسکتا کہ ان کو اہل عجم سے عربون نے یا اہل عرب سے عجمیون نے اخذ کیا، اپنی یہ رائے ظاہر کی ہے [1]

بل الصواب فی ذلک عندنا	میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ (ایسے) لفظ
ان یسمیٰ عربیًا اعجمیًا او	کو عربی عجمی یا حبشی عربی کہا جائے اس لئے
حبشیًا عربیًا اذ کانت الامتان	کہ دو نون قومین (عرب وعجم) بول چال
لہ مستعملتین فی بیانہا	اور روزمرہ مین ایسے الفاظ (جو عرب و
ومنطقہا استعمال سائر	عجم مین مشترک ہیں) کو اپنی زبان کے الفاظ
منطقہا و بیانہا، الخ	کی طرح استعمال کرتی ہین، الخ۔

اس سے ظاہر ہوا کہ ان مشترک الفاظ کو امام طبری توارد اللغات پر محمول کرتے ہین، اکثر ائمہ و اعیان کا یہ مسلک ہے کہ قرآن مجید مین کوئی معرب لفظ نہین، امام شافعیؒ امام طبری، قاضی ابو بکر، ابن فارس، ابن اوس، ابو عبیدہ وغیرہم کا یہی قول ہے [3]، لیکن امام سیوطیؒ جو بیٔ از النفـ

(بقیہ حاشیہ ص ۲۶۳) وَرَدَۃٌ مِنْ قَسْوَرَۃٍ (۴) مجاہد سے فریابی نے تخریج کی ہے کہ سجیل فارسی لفظ اتقان ج ۱ ص ۱۳۰، حضرت سعیدؒ بن جبیر فرماتے ہین کہ سجیل "سنگ وگل" کی تعریب ہے، مقدمہ طبری ص ۶ آیت یہ ہے، تَرْمِیْھِمْ بِحِجَارَۃٍ مِنْ سِجِّیْلٍ الخ [1] مقدمہ تفسیر طبری صک ۵۲ متن میں بیا کی جگہ "فیہا" ہے [3] ملاحظہ ہو الاتقان، النوع الثانی والثلاثون ج ۱ ص ۱۳۵-۱۴۱ و ۱۵۴ بزرگون کی بڑی دلیل حضرت ابو میسرہ تابعی کے یہ الفاظ ہین، فی القرآن من کل لسان حضرت سعید بن جبیر اور وہب بن منبہ سے بھی ایسے اقوال منقول ہین، (الاتقان جلد ۱ ص ۱۳۶) ابو میسرہ اور سعید بن جبیر کے الفاظ امام طبری نے بیان کئے ہین (مقدمہ تفسیر ص ۶) ان اقوال کی توجیہ امام طبری اس طرح کرتے ہین،

یعنی واللہ اعلم ان فیہ من	قرآن پاک مین ہر زبان کے ہونے کا

وغیرہم کا مسلک جدا ہے، ان کے نزدیک قرآن میں بہت سے معرب الفاظ موجود ہیں، اس موضوع پر امام سیوطی کی المہذب فیما وقع فی القرآن من المعرب مستقل تصنیف ہے، قاضی تاج الدین ابن السبکی نے ستائیس معرب لفظوں کو نظم کیا ہے، اُن کی نظم پر حافظ ابن حجر نے چوبیس الفاظ نظم کرکے بڑھائے اور سیوطی نے ساٹھ سے زائد معرب الفاظ کا اضافہ کیا ہے،

اس تبصرہ کے بعد ذیل میں معانی القرآن للطبری کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیے کہ امام طبری کی تحقیق انیق کا صحیح اندازہ ہو، فٹ نوٹ میں ضروری تعلیقات درج کی جائیں گی،

(۱) وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا	اور اسی طرح ہم نے تم کو امت معتدل
لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ	بنایا ہے کہ تم لوگوں پر گواہ ہو، اور
وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا	رسول (علیہ الصلوٰۃ والسلام)
(البقرۃ، پ ۲)	تم پر گواہ ہوں،

وَاَمَّا الوسط الخ کلام عرب میں وسط، خیار کے معنی میں آتا ہے، کہا جاتا ہے: فلان واسط الحسب فی قومہ یعنی فلاں اپنی قوم میں واسط الحسب (بلند مرتبہ) ہے، یا کہتے ہیں

(بقیہ حاشیہ ص ۲۶۴) کل لسان اتفق فیہ	یہ مطلب ہے کہ اس میں ایسے الفاظ موجود
لفظ العرب ولفظ غیرہا من	ہیں، جو عرب اور غیر عرب کی زبانوں میں
الامم التی تنطق بہ (تفسیر طبری ۱)	بطور توارد کے بولے جاتے ہیں" واللہ اعلم"

ابو عبید قاسم بن سلام کا قول یہ ہے کہ بہت سے عجمی الاصل الفاظ تعریب کے بعد خالص عربی میں مخلوط ہوکر عربوں کے روزمرہ میں داخل ہو گئے، ایسے الفاظ کو قرآن نے بھی استعمال کیا ہے، ایسے الفاظ کو عربی کہنا بھی صحیح ہے، اور عجمی کہنا بھی، یہ قول نہایت ہی مناسب اور صحیح ہے، جوالیقی اور ابن الجوزی کا میلان بھی اسی طرف ہے، (اتقان جلد ۱ ص ۱۳۰)

هُوَ وَسَطٌ فِی قَومِہٖ۔ وسط اور واسط دونوں کے معنی ایک ہیں، جیسے شاۃ یابسۃ اللبن اور یبیسۃ اللبن، دونوں ہم معنی ہیں، قرآن پاک کی آیت ہے، فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا" (طٰہٰ: پ۱۶، یَبَسًا، یابسًا کے معنی میں ہے) اور زہیر بن ابی سلمٰی[۵] کا قول ہے:

هُمُ وَسَطٌ تَرضَى الانام بحکمهم اذا نزلت احدی اللیالی بمُعظم[۱]

قال[۲] وانا اری الخ میرے خیال میں یہاں وسط درمیانی حصہ کے معنی میں ہے، جیسا کہ وسط الدار گھر کے درمیانی حصہ کو کہتے ہیں، اس معنی کی تقدیر پر وسط[۳] کی سین متحرک ہوگی، اور اس کی تخفیف جائز نہ ہوگی، اب اُمَّةً وَسَطًا کے یہ معنی ہوں گے، کہ یہ امت افراط و تفریط سے پاک توسط و اعتدال پر واقع ہے،

کلام عرب میں لفظ وسط کے معنی و استعمال کی تفتیش کے بعد امام طبری احادیث و آثار میں اس کے معنی تلاش کرتے ہیں، فرماتے ہیں، وسط کی تاویل آثار و روایات میں عدل[۴] آئی ہے اور خیار کا بھی یہی مطلب ہے، اس لئے کہ اسی شخص کو خیار (بہتر، برگزیدہ) کہا جاتا ہے، جو عدول (معتدل، میانہ رو) ہو، حضرت ابو سعید خدری[۵] آنحضرت صلعم سے روایت کرتے ہیں کہ حضور نے وَسَطًا کے معنی عدولًا بیان فرمایا ہے، (اسی طرح امام طبری نے تقریبًا تیرہ (۱۳) حدیثیں مرفوع و غیر مرفوع

---

[۵] تفسیر میں زہیر بن ابی سالم ہے [۱] دیوان زہیر ص ۲۱ شعر اس طرح ہے، لحی حلال یعصم الناس امرھم اذا طلعت احدی اللیالی بمعظم، ایضاً شرح الزوزنی ص ۸۸ و فیہ طرقت بدل طلعت "هُمْ وَسَطٌ" کی روایت تفسیر کبیر میں موجود ہے (جلد ۲ ص ۹) لیکن اس میں بمعظم کی جگہ لفظ ائمہ ہے، جو طباعت کی غلطی معلوم ہوتی ہے، ایضاً تفسیر نیشاپوری بر حاشیہ طبری جلد ۲ ص ۱۰، اس میں معظم کی جگہ موجود ہے، یہ بھی طباعت کی غلطی ہے، اس کی روایت "هُمْ وَسَطٌ" الخ ہے، [۲] قائل امام طبری کے کوئی تلمیذ ہیں [۳] وَسَطًا اور وَسْطًا پر ابو محمد بن بری نے سیر حاصل بحث کی ہے ملاحظہ لسان العرب جلد ۹ ص ۳۰۶ [۴] ائمہ لغت میں سے جوہری، اخفش، خلیل، اور قطرب نے وسط کے معنی عدل کئے ہیں، تفسیر کبیر جلد ۲ ص ۹، فراء نے بھی یہی معنی بتایا ہے، ملاحظہ ہو معانی القرآن للفراء ص ۴۲،

نقل کی ہیں۔ جن کا ماحصل یہ ہے کہ وَسَط عدول کے معنی میں ہے[1])

(ب) مَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا، جو شخص (خانہ کعبہ کا حج یا عمرہ کرے اس پر کوئی گناہ نہیں کہ ان دونوں (صفا و مروہ) کا طواف کرے)

(البقرہ ۲: ۱۵۸)

وانما یعنی تعالیٰ ذکرہ الخ: اَوِ اعْتَمَرَ سے مراد اَوِ اعْتَمَرَ البیتَ ہے۔ اعتمار کے معنی "زیارۃ" ہیں۔ اس شخص کو جو کسی چیز کا قصد کرتا ہے مُعْتَمِر کہتے ہیں۔ عجاج کہتا ہے۔

لَقَدْ سَمَا ابْنُ مَعْمَرٍ حِيْنَ اعْتَمَرْ مَغْزًى بَعِيْدًا مِنْ بَعِيْدٍ وَضَبَرْ[2] (۲/۲۰۴)

اس شعر میں اِعْتَمَرَ: قَصَدَ وَ اَمَّ کے معنی میں ہے۔

(ج) وَلَا تَسْاَمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ (البقرہ ۲: ۲۸۲) اور کاہلی نہ کرو لکھنے میں چھوٹا معاملہ ہو یا بڑا اس کی میعاد تک۔

ومعنی قولہ الخ لَا تَسْاَمُوْا کے معنی یہ ہیں کہ کاہلی نہ کرو یا تنگ نہ آجاؤ۔ اسی سے کہا جاتا ہے۔ سَئِمْتُ فانا أَسْأَمُ سَآمَةً وسامةً (زہیر) کا شعر ہے۔

سَئِمْتُ تَكَالِيْفَ الْحَيَاةِ وَمَنْ يَّعِشْ ثَمَانِيْنَ عَامًا لَّا اَبَا لَكَ يَسْاَمِ (۳/۲۸۰)

اس شعر میں سَئِمْتُ کے معنی ہیں، مَلِلْتُ (میں تنگ آگیا)

---

[1] یہ روایتیں مجاہد، عطا، ابن عباس، ابو ہریرہ وغیرہم کی ہیں [2] نزہۃ القلوب للسجستانی ص ۲۰، دیوان عجاج ۱۹/۱۲، ارجاز اس طرح ہیں،

كَمَا نُمَّ لَيْلَةَ الْبَدْرِ الْقَمَرْ لَقَدْ سَمَا ابْنُ مَعْمَرٍ حِيْنَ اعْتَمَرْ

مَغْزًى بَعِيْدًا مِنْ بَعِيْدٍ وَضَبَرْ مِنْ مُحْتَدِ النَّاسِ الَّتِيْ كَانَ امْتَحَرْ

ایک روایت میں لقد غزا ابن معمر ہے تہذیب الالفاظ لابن السکیت ص ۲۲۳، لسان العرب ۶/۲۸۳

(د) قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ (آل عمران : پ۳) کہا حواریون نے ہم لوگ اللہ کے انصار ہین"

واما الحواریون الخ :- علمائے تفسیر کے اقوال اس باب مین مختلف ہین کہ "حواریون" کو حواری کہنے کی وجہ کیا ہے، بعض کہتے ہیں کہ "حواریون" سفید پوش تھے، اسی لیے "حواری" کہلائے حضرت سعید بن جبیر سے یہی روایت ہے، بعض کہتے ہین کہ "حواریون" غسال[۵] تھے، کپڑے دھویا کرتے تھے، یہ روایت ابو ارطاۃ کی ہے، ابو ایک کہتے ہین "حواریون" سے مراد انبیا علیہم السلام کے خاص مقربین ہین، روح بن القاسم کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ قتادہ نے آنحضرت صلعم کے کسی صحابی کا ذکر کیا، تو کہا وہ "حواریین" سے تھے، قتادہ سے پوچھا گیا "حواریون" کون تھے، تو انھون نے جواب دیا، "الذین تصلح لھم الخلافۃ" وہ لوگ جو نبی کی جانشینی کے لائق ہوں، ضحاک نے اس کی تفسیر کی ہے، "اصفیاء الانبیاء" یعنی انبیا کے خاص برگزیدہ اصحاب،

ان اقوال کو بیان کرنے کے بعد امام طبری فرماتے ہین : مذکورۂ بالا اقوال مین اشبہ یہ ہے کہ "حواریون" صاف کپڑے پہنتے تھے، اور کپڑے صاف کیا کرتے تھے، کلام عرب مین "حور" شدت بیاض کو کہتے ہین اور اسی سے "طعام حواری" کو حواری کہتے ہین کہ اس کا رنگ صاف ہوتا ہے، اور ایسے آدمی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۷) ابن معمر کا نام عمر بن عبید اللہ بن معمر التیمی ہے جس نے خوارج سے جنگ میں نام پیدا کیا تھا، (تعلیق خطیب تبریزی بر تہذیب الالفاظ) تفسیر میں "مغل" بالراء المهملة اور "سبو" بالصاد المهملة سے یہ طباعت کی تصحیف ہے۔

[۴] اصل نسخۂ تفسیر مین یہ شعر لبید کی طرف منسوب ہے، اور اس طرح ہے:

ولقد سئمت تکالیف الحیوۃ ومن یعش ثمانین عاماً لا أبا لک یسأم

یہان دو باتین قابل لحاظ ہین، ایک یہ کہ شعر زہیر بن ابی سلمیٰ کا ہے نہ کہ لبید کا، دیوان زہیر صفحہ ۲۹ اور اس کے مشہور معلقہ کا شعر ہے، دوسرے یہ کہ شعر نسخۂ مطبوعہ مین مصحف ہے "سئمت" کی جگہ "حولا" روایتوں مین عام ہے۔

[۵] ضحاک سے منقول ہے کہ نبطی زبان مین غسال کو "ہواری" کہتے ہین۔ (گویا حواری معرب لفظ ہے)، تفسیر نیشاپوری ۳/۱۹۶، اس قول کی تخریج ابن ابی حاتم نے کی ہے: الاتقان ۱/۱۳۸

کو جس کی آنکھیں صاف و شفاف ہوں "احور" اور عورت کو "حوراء" کہتے ہیں:

ممکن ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کا یہ لقب ابتدا میں اس لیئے ہوا ہو کہ وہ کپڑے صاف کیا کرتے تھے، بعد میں ان پر لفظ حواری کا اطلاق ہونے لگا، رفتہ رفتہ اس کا استعمال اسقدر عام ہوگیا کہ ہر شخص اپنے خالص دوست کو "حواری" کہنے لگا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ان[۵] لکل نبی حواریا وحواریّ الزبیرؓ (ہر نبی کے خاص و مقرب رفیق تھے، میرے رفیق زبیرؓ ہیں) اہل عرب شہری عورتوں کو "حواریات" کہتے ہیں، چونکہ ان کا رنگ صاف ہوتا ہے اور انکی طبیعتیں نظافت پسند ہوتی ہیں، ابو جلدۃ یشکری کہتا ہے:

فقل للحواریات یبکین غیرنا[۲]   ولا تبکنا الا الکلاب النوابح

(طبری ۳/ ۱۸-۱۰۲)

(۵) ولکن کونوا ربّانیّین (آل عمران)   بلکہ (وہ تو یہی کہے گا کہ) بن جاؤ اللہ والے

اما قولہ کونوا ربانیین:- ابو رزین، حسن، قتادہ، ضحاک، ابن عباس، سعید بن جبیر، سدی[۳] اور مجاہد کے اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ "ربانیین" سے مراد علما، فقہا و اتقیا ہیں، مجاہد کے الفاظ یہ ہیں، الربانیون الفقہاء العلماء وھم فوق الاحبار- ابن زید کہتے ہیں کہ "ربانیون"[۴] سے مراد ولاۃ الامر ہیں، لولا ینھاھم الربانیون والاحبار کی تفسیر میں وہ کہتے ہیں کہ "ربانیون" سے مراد ولاۃ اور "احبار" سے مراد علماء ہیں۔

ان اقوال کو نقل کرنے کے بعد امام ابو جعفر الطبری فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک اولیٰ الاقوال بالصواب یہ ہے کہ "ربانیون" ربانی کی جمع ہے، یا نسبت کی ہے "ربان" اس کو کہتے ہیں جو لوگوں کی تربیت اور انکے امور کی دیکھ بھال کرے، علقمہ بن عبدہ کا شعر ہے:

وکنت امرءاً[۵] افضت الیک ربابتی   وقبلک [ربّتنی] فضعت ربوب

---

[۱] متفق علیہ، حدیث ہے، مشکوۃ المصابیح ص ۵۰۰ [۲] لسان العرب ۵/ ۲۹۹، شواہد الکشاف ص ۲۳، حماسۃ ابن الشجری ص ۹۵ [۳] سدی کو مسلم نے لیکن لا باس بہ کے درجہ میں ہیں، نسائی کا قول ہے و علیہ التعویل [۵] دیوان علقمہ ص ۴۸ دیوان میں "کنت" کی جگہ "انت" ہے [۴] ایضاً تفسیر طبری ۴/ ۲۰۴ مطبوعہ تفسیر میں "ربّتنی" کی جگہ "ربتنی" ہے۔

شاعر یہ کہہ رہا ہے کہ "اے ممدوح تجھ سے پہلے خبرگیری کرنے والوں نے میری تربیت و خبرگیری کی لیکن وہ تجھے سدھار نہ سکے بلکہ میں برباد ہو گیا"

عرب کا محاورہ ہے، ربا مری فلان فھو یربہ ربًّا وھو رابّہ

اسی سے ربّانؔ[1] مبالغہ کا صیغہ ہے، جیسے "نعس ینعُسُ" سے "نعسان" آتا ہے:

(ایک قاعدہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں) اکثر وہ اسماء فعلان کے وزن پر آتے ہیں جنکا ماضی فعل (بکسر العین) کے وزن پر آتا ہے، مثلاً سکر یسکر، عطش یعطش، رَوِیَ یروی کے اسماء "سکران، عطشان، ریان" ہیں، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ افعال فعل (نصر ینصر) کے وزن پر آتے ہیں، اور ان کے اسماء فعلان کے وزن پر، مثلاً [نَعَسَ ینعُسُ][2] اور رَبَّ یَرُبُّ کے اسماء۔

بعد الدنیا والدین "ربانیون" میں وہ سب شامل ہوں گے جو صلاح و تقویٰ سے آراستہ اور علم و فقہ کے حامل اور اپنے علم و فہم سے امت کی تثقیف و تربیت میں سرگرم ہوں، والی عادل بھی ان میں شامل ہوگا، غرض ربانیون وہ لوگ ہیں جو علم و فقہ اور دینی و دنیوی امور میں امت کے مرجع و عماد ہیں، یہی وجہ ہے کہ مجاہد کہتے ہیں "ھم فوق الاحبار" (یعنی ربانیون احبار سے اونچا درجہ رکھتے ہیں) پس احبار سے مراد علماء ہیں اور "ربانی" وہ شخص ہے جو علم و فقہ کے ساتھ سیاست و تدبیر منزل، رعیت کی بہبودی اور امت کی دینی و دنیوی صلاح میں بصیرت و درک رکھتا ہو۔[3]

---

[1] سیبویہ کا قول ہے کہ "ربانی" رب کی طرف منسوب ہے، اور الف و نون کمال صفت پر دلالت کرنے کیلئے زیادہ کیے گئے ہیں جیسے لحیانی، جمانی، رقبانی وغیرہ جو نسبت ہیں، مبرد کا قول ہے کہ ربان کے الف و نون مبالغہ کے لیے ہیں جیسے عریان، عطشان، ریان وغیرہ۔ دیکھو الکبیر ۳/۲۴، نیشاپوری ۳/۲۲۲۔ ابو عبیدہ کہتے ہیں کہ ربانی اجنبی لفظ ہے، اہل عرب اسکو نہیں جانتے، جوالیقی کہتے ہیں کہ یہ عبرانی یا سریانی لفظ ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ عربی ہے، ملاحظہ ہو روح المعانی ۱/۹۱، اتقان ۱/۱۳۶، نیشاپوری ۳/۲۲۲ [2] مطبوعہ تفسیر میں ... [3] طبری ج ۳ ص ۲۱۳

(ق) يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّن نَّارٍ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنتَصِرَانِ ﴿۳۵﴾ تم پر بھیجا جائے گا آگ کا شعلہ اور دھواں پھر تم مقابلہ نہیں کر سکتے،

وھو لھبھا الخ:۔ "شواظ" آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلہ کو کہتے ہیں جس میں دھواں نہیں ہوتا، رؤبہ بن العجاج کا شعر ہے :۔

اِنَّ لَهُمْ مِنْ وَقْعِنَا [اقياظا][1] ونار حرب تسعر الشواظا

مجاہد کہتے ہیں "الشواظ ھو اللھب الاخضر المنقطع من النار یعنی شواظ اس سبز شعلے کو کہتے ہیں جو سبزی مائل ہو" سفیان اور ضحاک وغیرہ سے بھی ایسی ہی روایتیں منقول ہیں، اور بعض کہتے ہیں کہ "شواظ" شعلہ دار دھواں" ہے (طبری ج ۲۷، ص ۱۲۴)

(ز) نُحَاسٌ: حضرت ابن عباسؓ اور سعید کی روایت یہ ہے کہ "نحاس" سے مراد "دخان" ہے۔ اور بعض کہتے ہیں "نحاس" "صفر" (تانبا) کو کہتے ہیں لیکن میرے نزدیک اولیٰ یہ قول ہے کہ نحاس سے مراد دخان ہے، اسلئے کہ اس سے پہلے کی آیت میں یہ مذکور ہے کہ تم پر شواظ بھیجا جائیگا، "شواظ" دہکتی ہوئی آگ کو کہتے ہیں جس کے ساتھ دھواں نہ ہو، لیکن یہ مقام تہدید و وعید کا ہے، لہذا موقع و محل کا تقاضا یہ ہے کہ شواظ کے ساتھ "دخان" کا بھی ذکر کیا جائے کہ مزید تہدید ہو اسلئے کہ وہ آگ (شواظ) غیر عادی طور پر دخان کے ساتھ ہو گی،

اہل عرب نُحاس (بضم النون) اور نِحاس (بکسر النون) "دخان" کو کہتے ہیں[2] لیکن قراء بالاتفاق نُحاس بضم النون پڑھتے ہیں، نحاس بمعنی دخان، نابغہ بنی جعدہ[3] نے استعمال کیا ہے،

[یضیئ][4] کضوء سراج السلیط لم یجعل اللہ فیه نُحاسا

نحاسا یعنی دخانا، (طبری ۲۷/۸۳)

---

[1] لسان العرب ۹/۳۲۶ تفسیر میں "اقیاظا" کی جگہ "اقتاطا" ہے۔ شواظ بضم الشین وکسرہا، بالکسر حسن کی قرأۃ ہے، اسکی نظیر صُوار اور صِوار ہے، قالہ الفراء فی المعانی ص ۱۸۹، ایضاً اللسان ۹/۳۲۶ [2] ابن برزخ نے نُحاس بضم النون اور نِحاس بالکسر میں فرق بتایا ہے، کہ بالضم صفر کو کہتے ہیں اور بالکسر دخان الشفر کو، اللسان ۸/۱۱۲ [3] شوا ہد الکشاف، تہذیب الالفاظ ص ۲۳۳، اللسان ۸/۱۱۲، معانی الفراء ص ۱۸۹۔ وفیہ بلا عزو، وایضاً فی الاتقان ۱/۲۲۲ بلا عزو [4] طبری میں "یضیئ" کی بجائے "یضوء" ہے "ایک روایت ہے کمثل سراج السلیط" اللسان ۹/۳۲۹ یضیئ کی ضمیر دوسرے شعر کی طرف پھرتی ہے جو لسان میں مذکور ہے:

اضاءت لنا النار وجها اغر ملتبسا بالفواد التباسا (تہذیب الالفاظ)

(ح) وَبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا (واقعہ) اور پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے،

یقول تعالیٰ ذکرہ فتت الجبال فتا الخ یعنی پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے "دقیق مبسوس" کی طرح . دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ کہتا ہے "وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيبًا مَّهِيلًا" (المزمل، پ ۲۹) یعنی پہاڑ بھربھرے ریت کی طرح ہو جائیں گے)

اہل عرب گندھے ہوئے ستو یا میدہ کو بسیسة[1] کہتے ہیں اور سفر میں اسی کو زاد راہ بناتے ہیں۔ بنی غطفان[2] کے ایک راہزن کا واقعہ ہے کہ روٹیاں پکانے کی فکر میں تھا، لیکن پکڑے جانے کے خوف سے گندھے ہوئے میدہ ہی کو کھا کر چلتا ہوا، اسی کا رجز ہے :-

لا تخبزا خبزا وبُسّا بسّا ملسا [بذود الحمسي][3] ملسا (طبری ۲۷/۱۰۲)

---

[1] اصمعی کا قول ہے: ہر وہ چیز جس میں پانی یا "رُب" ملا دیا گیا ہو "بسیسة" کہی جاتی ہے، تہذیب اللغات ۱۲/۴۲۴ بعض کہتے ہیں کہ خشک روٹی کو چورا کر کے کسی رقیق چیز کے ساتھ ملاتے ہیں، اسی کو بسیسہ کہا جاتا ہے، اللسان

[2] یہ بیان ابوعبیدہ کا ہے، (اللسان، لفظ لبس) [3] تفسیر میں "بذود الحمسي" کی جگہ "مدودا محلسا" ہے، یہ تصحیف ہے، تہذیب الالفاظ میں اس کے ساتھ دو شعر اور ہیں جن سے واقعہ کی وضاحت ہوتی ہے۔

توّمت عنهن غلاما جبسا وقد تغطى فروةً وحلسا

من غدوة حتى كان الشمسا بالافق الغوري تكسى الورسا (ص ۴۲۳)

"الحمسي" حبیب بن ... کی طرف نسبت ہے، ایک روایت میں بذود الحمسي ہے، لسان العرب ۱/ ۴۴۳. بنو حمس ایک یمنی قبیلہ کا نام ہے، خطیب تبریزی نے اسی روایت کو ترجیح دی ہے (تہذیب الالفاظ) بعض روایتوں میں بذود الحلسي بھی ہے، اللسان ۸/ ۱۰۷، معانی الفراء: ص ۱۹۱ ، پہلا مصرعہ بعض روایتوں میں اس طرح ہے: لا تخبزا خبزا ونسّا نسّا۔ خَبزا اور نسّا (بفتح الخاء المعجمة والنون فیهما) اونٹ کی دو چالیں ہیں، خبز بہ نسبت "نس" کے سست چال ہے، گویا راجز یہ کہتا ہے کہ تیز بھاگو، ملاحظہ ہو، تہذیب الالفاظ و لسان العرب ۸/ ۲۲۴، دوسرے مصرع کی روایت اس طرح بھی ہے،

ولا تطيلا بمناخ حبسا (اللسان ۸/ ۲۲۴-۲۲۵)

اس قصے کے متعلق تبریزی کا یہ بیان ہے کہ بنی مرة بن عوف بن غطفان کا ایک شخص کسی لجی کے ساتھ ہو لیا، لجی نے اسیر شبہ کیا، ڈر کہا کر تم چوہ معلوم ہوتے ہو، میرا ساتھ چھوڑ دو، اسکے بعد لجی آرام کی نیند سو رہا غطفانی کو موقع ملا، تو لجی کے اونٹ ہانکتا اور یہ رجز پڑھتا ہوا بھاگا۔

(ط) اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ (الدہر: پ ۲۹) ۔ ہم نے پیدا کیا انسان کو نطفہ سے جو چند چیزوں سے ملا ہوا تھا،

اَمْشَاج، اخلاط کے معنی میں ہے۔ اس کا واحد مشج اور مشیج ہے، خلال اور خدائ کے وزن پر۔ رؤبۃ العجاج کا رجز ہے:

یطرحن کل معجل نشاج[1] [لم یکس جلدا] من دم امشاج

جب ایک چیز کو کسی دوسری چیز کے ساتھ ملاتے ہیں تو کہا جاتا ہے: مشجت ھذا بھذا، شئ مخلوط کو ممشوج اور مشیج کہتے ہیں، ابو ذویب کہتا ہے،

کأن الریش والفوقین منہ[2] خلاف النصل سیط بہ مشیج (طبری ۲۹/۱۰۹)

(ی) لابثین فیھا احقابا (النبا: پ) وہ اس میں مدتوں پڑے رہیں گے۔

احقابا:۔ احقاب حقب کی جمع ہے اور حقب، حقبۃ کی، شاعر کہتا ہے:۔

[وکنا] کندمانی جذیمۃ حقبۃ[3] من الدھر حتی قیل لن یتصدعا

ای (یعنی حقبہ) کی جمع "حقب" ہے جو "احقاب" کا واحد ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قول ہے

او امضی حقبا (الکہف: پ ۱۶) (طبری ۳۰/۷)

---

[1] دیوان رؤبہ: ۳۲/۱۳، ارجاز اس طرح ہیں:۔

حتی مسیناھن بالاخداج یقذفن کل معجل نشاج

لم یکس جلدا من دم امشاج فرج عنہ حلق الرتاج

اصل نسخہ میں "یقذفن" کی جگہ "یطرحن" اور "لم یکس جلدا" کی جگہ "لم یلث خلدا" ہے،

[2] سمط اللآلی: ص ۵۰۹، اس کی روایت میں "نیط" کی جگہ "سیط" ہے، اصمعی کا قول ہے کہ یہ شعر

[3] الدعل زہیر بن حرام کا ہے جو بنی سہم بن مرہ سے تھا، اور جمحی، ابو عمرو ابن الاعرابی سے سکری نے نقل کیا ہے

(باقی حاشیہ ص ۲۷۴ پر)

یہ چند اقتباسات اصحاب ذوق کے تفنن طبع کے لیے "معانی القرآن للطبری" کے مختلف مقامات سے چن کر ترجمہ کی صورت میں پیش کیے گئے، ساری کتاب ایسی ہی تحقیقات سے بھری ہوئی ہے، اسانید و مکررات بخوف طوالت اصل کتاب سے حذف کر دیے گئے ہیں البتہ اسانید مع تحقیق فٹ نوٹ میں ثبت کر دیے گئے ہیں تاکہ عموم فائدہ فوت نہ ہو جائے،

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۳) کہ یہ شعر عمر بن الداخل کا ہے (سمط، ؎ اصل کتاب میں "دکنا" کی جگہ "عشنا" ہے) یہ شعر متمم بن نویرہ کا ہے: الشعر والشعراء لابن قتیبہ: ۱/۲۵۴، اس شعر کے بعد ہی یہ شعر ہے:

فلما تفرقنا کانی ومالکا　　لطول اجتماع لم نبت لیلۃ معاً

عبداللہ بن ابی ملیکہ سے مروی ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضوان اللہ علیہما کی قبر پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان دونوں شعر کو پڑھا، ملاحظہ ہو ترمذی ۱/۱۲۵، ایضاً المشکوٰۃ ص ۱۴۱، متمم نے یہ اشعار اپنے بھائی مالک بن نویرہ کے قتل پر مرثیہ میں کہے تھے، تفسیر میں "لن یتصدعا" کی جگہ "لن نتصدعا" ہے،

علامہ شبلی بحیثیت فارسی شاعر کے

از جناب مرزا احسان احمد صاحب بی اے ایل ایل بی علیگ

(۳)

غزل گو شعراء میں عام طور پر مسلسل واقعہ نگاری کی صلاحیت بہت کم ہوتی ہے، چنانچہ جب وہ اس میدان میں قدم رکھتے ہیں، تو ان کی حالت اس درماندہ مسافر کی سی ہوتی ہے، جو دو چار قدم بہ کوشش تمام چلنے کے بعد طبعی ضعف کی وجہ سے دفعۃً لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے، لیکن علامہ مرحوم کا قلم کسی صنف سخن کے میدان میں عاجز و درماندہ نظر نہیں آتا، قصیدہ، مثنوی، ترکیب بند، مراثی، قطعات، وغیرہ سب کے نمونے اس کلیات میں موجود ہیں لیکن ہر جگہ شاعر کے انداز بیان کی استادانہ پختگی اور غیر معمولی قوت نظم کا یکساں عالم نظر آتا ہے،

علامہ مرحوم طبعاً نہایت غیور اور خود دار تھے، ان کو ہر حال میں اپنی عالمانہ شان و عظمت کے تحفظ کا خیال رہتا تھا، اس لیے ان کا قلم کبھی ارباب دول کی بیجا اور خوشامدانہ مدح سرائی سے آلودہ نہیں ہوا، اور یہ ان کے مذاق شاعرانہ کی بلندی اور پاکیزگی کا بہت بڑا ثبوت ہے، یہی وجہ ہے کہ علامہ نے قصائد میں زیادہ تر واقعہ نگاری اور مناظر قدرت کی مصوری سے کام لیا ہے، چند مثالیں ملاحظہ ہوں،

فصل بہار شعراء کا عام موضوع سخن ہے، جو مدت ہائے دراز سے پامال ہوتا چلا آرہا ہے، علامہ نے بھی اس موضوع پر ایک قصیدہ لکھا ہے، جو کسی وجہ سے ناتمام رہ گیا، تاہم جو چند اشعار بیساختہ قلم سے نکل گئے ہیں ان کی رنگینی کا عالم ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں:-

دوش این مژدہ بگوش گل و ریحان آمد — کہ بہار آمد و بسیار بسامان آمد
ابر گوہر ہمہ افشاند چو ان گریان بگذشت — گل ہمہ زر بپراگند چو خندان آمد
آب را سلسلہ برپائے ببستند ز موج — بسکہ دیوانہ وش از طرف بیابان آمد
لالہ چون مغبچگان چہرہ برافروخت بباغ — سنبل آشفتہ تر از طرۂ خوبان آمد
سبزہ سر بر زدہ از خواب گران بر لب جوئے — بسکہ باد سحرش مروحہ جنبان آمد
ہر حبابے کہ سر از آب برآرد، گوید — باید از سر بتماشائے گلستان آمد
می رود گرد چمن گاہ خرامد لب جوئے — باد صبح آمد و بر شیوۂ مستان آمد
بوئے گل ہست کہ بر دوش صبا تکیہ زدہ است — من غلط کردم و گفتم کہ سلیمان آمد
آتش افروخت گل و در چمن گشت خلیل — کہ بہ آتش سوزندہ گلستان آمد
زین دو سہ حرف فزون نیست مغان را سخنے — کہ بہار آمد و ابر آمد و باران آمد

غور کیجیے، عالم بہار کے جتنے خاص پر کیف پہلو تھے، ان سب پر شاعر کی نگاہ کس خوبی کے ساتھ پڑی ہے، اور تشبیہات کی لطافت نے انداز بیان کو کس قدر موثر اور دلکش بنا دیا ہے،

علامہ مرحوم تبدیل آب و ہوا کی غرض سے کشمیر تشریف لے گئے لیکن کچھ دنون کے قیام کے بعد بیمار پڑ گئے، اور وطن واپس چلے آئے، صحت یاب ہونے کے بعد علامہ نے ایک قصیدہ موسوم بہ قصیدۂ کشمیریہ لکھا جس مین علالت، علاج، تیمارداری اور صحت کے تمام حالات نہایت تفصیل کے ساتھ شاعرانہ انداز مین بیان کیے ہین، لیکن ابتدا مین کشمیر کے جلوہ گاہ حسن وجمال کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ صرف علامہ ہی کے خامۂ رنگین نگار کا کام ہو سکتا ہے، چند اشعار ملاحظہ ہون:

گرچہ شک نیست کہ آن نامیہ فردوس بہائی — گر تنزل بکنم خلد برین را ماناست
بسکہ جوشیدہ زہر سوی گل و لالہ بدشت — از کران تا بکران روئے زمین ناپیداست

جادہ را خود ز خیابان نتوان کرد تمیز	بسکہ گل صف زدہ تا سر او از چپ و راست
جام گلرنگ کہ در بزم بآئین چینند	ہم بدان گونہ گل از پہلوے گل چیدہ نشست
سبزہ بر کوہ فرو ریختہ از سر تا بن	یا قبائیست کہ بر قامت شخص آمدہ راست
راہرو ماند بہ دل کہ نہد گام براہ	بسکہ بر ہر قدمش لالہ و گل در تہ پاست
دیدہ طفل کہ بر دامن مادر غلطد	جنبش باد بدان گونہ بروے صحراست

کیا اس سے زیادہ لطیف اور نادر کوئی اور تشبیہ ذہن میں آسکتی ہے؟

گل بہ ہر شاخ ز برگ است فزون تر گوئی	ہمہ بر گل بفزود آنچہ کہ از برگ بکاست
سرو اگر پائے بدامن نکشد، خود چہ کند	زانکہ از جوش گل و لالہ چمن تنگ فضاست
بسکہ بر ہر قدم از لالہ چراغے بنہند	در شب تار کسے گم نشود از رہ راست

کشمیر میں ایک مشہور جھیل ہے جس کا نام ڈل ہے، اس کی صفائی اور لطافت کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے،

آبگیرے کہ بشہرست و بود نامش ڈل	گوئیا آئینہ در دست عروسے زیباست
سینہ صاف دلان ست بہ ماناکہ بلطف	ہر چہ در بن بود از صفحہ روئش پیداست
گرد بر گرد ڈل آن صف زدن لالہ و گل	چون طرازیست کہ بر دامن شوخے رعناست

کشمیر میں ایک خاص قسم کی گھاس ہوتی ہے، جس کو سطح آب پر بچھا کر خاک پوش کر دیتے ہیں، اور اس پر مختلف چیزوں کی کاشت کرتے ہیں، اس حیرت انگیز قوت نامیہ کی طرف اس شعر میں اشارہ کیا گیا ہے،

آب بالائے زمین باشد و اینجا بینی	کہ زمین بر سر آبست و ہمان پا بر جاست

آخر میں سلسلۂ سخن کی طوالت کا جو عذر شاعر نے پیش کیا ہے، وہ سننے کے قابل ہے، ملاحظہ ہو،

گرچہ دانم کہ سخن خود بہ درازی بکشید | چہ توان کرد سخن ہم ز سر نشو و نما ست

اس کے بعد علامہ نے اپنی علالت و علاج وغیرہ کے واقعات نہایت تفصیل سے بیان کیے ہیں یعنی کس طرح ان کو بخار آیا، اس بخار کی نوعیت کیا تھی، اس کی شدت اور تکلیف کا کیا عالم تھا، مقامی احباب نے کس طرح خلوص، اور ہمدردی کا اظہار کیا طبیب نے نبض وغیرہ دیکھکر اور تمام اسباب و علل پر غور کرکے مرض کی کیا تشخیص کی، علاج سے کیا فائدہ ہوا، فائدہ ہو کر پھر دوبارہ مرض نے کس شدت کے ساتھ عود کیا، نہایت ضعف کی وجہ سے زندگی سے مایوس ہو کر اپنی املاک و دولت کے متعلق بطور وصیت کیا ہدایتیں کین، وطن کس حالت مین واپس آئے، یہان کس قسم کا علاج ہوا، اور کبتک ہوتا رہا، صحت کیونکر ہوئی، ان تمام جزئی واقعات کو علامہ نے جس خوبی سے نظم کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے قلم کو واقعہ نگاری پر کس قدر قدرت حاصل تھی، آخر مین اپنے احباب خاص کو مژدۂ صحت دینے کے بعد اپنے متعلق فرما تے ہین اور کس قدر صحیح فرماتے ہین،

شبلی امروز بود بلبل بستان سخن | کہ از و گلکدۂ ہند پر از صوت نواست

علامہ کے کمال واقعہ نگاری کی ایک دوسری مثال وہ قصیدہ ہے جو انھون نے اپنے سفر روم کے حالات مین لکھا ہے، یہ قصیدہ دراصل ایک منظوم سفرنامہ ہے، جس کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوجاتا ہے کہ سفر کا اصلی مقصد کیا تھا، کس تاریخ کو اس کا آغاز ہوا، جہاز پر کیا کیفیت رہی، کن کن مقامات سے گذر ہوا، ان مقامات کی کیا حالت تھی، کہان کہان جہاز نے قیام کیا، اور کب منزل مقصود پہ پہنچا، افسوس ہے کہ طوالت کے لحاظ سے ہم اس پورے قصیدے کو نقل نہین کرسکتے، چند ابتدائی اشعار ملاحظہ ہون،

بہر تکمیل فن و ہم پئے تحصیل عبر | روزگاریست کہ میداشتم آہنگ سفر

فارغ از حج و زیارت چو مرا کرد قضا | خواستم تا بسوے روم شوم راہ سپر

گرچہ من گرم طلب بودم و بس مستعجل | لیک تاخیر ہمی رفت بفرمان قدر
ویرآن مایہ شد آخر کہ حسودان گفتند | کہ فلان چیز ہوس خام ندارد در سر
من درین غصہ و غم خون جگر می خوردم | ناگہان شاہد مقصود در آمد از در
اتفاقی عجبے گشت مرا عقدہ کشا | کہ از وہم و گمان نیز نمیداشت خبر
یکدو مہ پیشتر ک زانکہ زنم کوس رحیل | بودم از زحمت تپ خستہ دل و تفتہ جگر
عزم دیرینہ بیاد آمد و گفتم چہ خوشست | کہ بیک حیلہ دو تا کار برآرد داور

آغاز سفر میں جہاز پر دو تین روز جو کیفیت رہتی ہے، اس کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے،

الغرض از رمضان بست و ششم بود کہ من | گرم برخاستم از جائے و شدم راہ سپر
اوفتادم برہ کوہ و بیابان یکچند | بس بکشتی بہ نشستم من و یاران دگر
زحمتے صعب کشیدیم بکشتی دو سہ روز | بسکہ از موج بہر لحظہ شدے زیر و زبر
کس نیارست سرش باز گرفت از بالین | کس نیارست جدا کرد تنش از بستر

اس کے بعد جہاز میں مختلف مقامات سے گذرا، ان کی تفصیل بیان کی ہے اور ہر مقام کی حالت بھی مختصراً بیان کردی ہے، مثلاً عدن کے متعلق لکھتے ہیں،

کوہسار یست کہ ہرچند بلندست و فراخ | لیک از سبزہ و گل نیست در و ہیچ اثر
ہر کجا می گذری ریگ روانست و خزف | ہر طرف می نگری خاک سیاہ ست و حجر
گبر و ترسا کہ نزیل اند درین بقعہ ہمہ | بزبان عربی حرف زنندے یکسر

سوئیز میں اگرچہ جہاز نے بہت کم قیام کیا، تاہم اس کا تذکرہ قلم انداز نہیں کیا ہے، فرماتے ہیں،

این ہمان نہر عجیبست کہ زینسان کارے | جز در افسانہ پارین نہ شنیدیم دگر
بست فرسنگ درازست و بہ پہنا چندان | کہ دو دو ابر تو انند دانہ و کرد گذر

دوش این مژدہ بگوش گل و ریحان آمد ۔۔۔ کہ بہار آمد و بسیار بسامان آمد

ابر گہر ہمہ افشاند چون گریان بگذشت ۔۔۔ گل ہمہ زر بسر افگند چون خندان آمد

آب را سلسلہ برپائے ببستند ز موج ۔۔۔ بسکہ دیوانہ وش از طرف بیابان آمد

لالہ چون مغبچگان چہرہ برافروخت بباغ ۔۔۔ سنبل آشفتہ تر از طرۂ خوبان آمد

سبزہ سر بر زدہ از خواب گرفت بجو آب ۔۔۔ بسکہ باد سحرش مروحہ جنبان آمد

ہر حبابے کہ سر از آب برآرد، گوید ۔۔۔ باید از سر بتماشاے گلستان آمد

می دود گہ بچمن گاہ خرامد لب جوئے ۔۔۔ باد صبح آمد و بر شیوۂ مستان آمد

بوے گل ہست کہ بردوش صبا تکیہ زدہ ست ۔۔۔ من غلط کردم و گفتم کہ سلیمان آمد

آتش افروخت گل و مرغ چمن گشت خلیل ۔۔۔ کہ بہ آتش سوزندہ گلستان آمد

زین دو سہ حرف فزون نیست مغان را سخنے ۔۔۔ کہ بہار آمد و ابر آمد و باران آمد

غور کیجیے، عالم بہار کے جتنے خاص پرکیف پہلو تھے، ان سب پر شاعر کی نگاہ کس خوبی کے ساتھ پڑی ہے، اور تشبیہات کی لطافت نے انداز بیان کو کس قدر موثر اور دلکش بنا دیا ہے،

علامہ مرحوم تبدیل آب و ہوا کی غرض سے کشمیر تشریف لے گئے لیکن کچھ دنون کے قیام کے بعد بیمار پڑ گئے، اور وطن واپس چلے آئے، صحت یاب ہونے کے بعد علامہ نے ایک قصیدہ موسوم بہ قصیدۂ کشمیریہ لکھا جس مین علالت، علاج، تیمارداری اور صحت کے تمام حالات نہایت تفصیل کے ساتھ شاعرانہ انداز مین بیان کیے ہین، لیکن ابتدا مین کشمیر کے جلوہ گاہ حسن و جمال کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ صرف علامہ ہی کے خامۂ رنگین نگار کا کام ہو سکتا ہے، چند اشعار ملاحظہ ہون:

گرچہ شک نیست کہ آن نامیہ دہ مینائی ۔۔۔ گر تنزل بکنم خلد برین را ماناست

بسکہ جوشیدہ ز ہر سوے گل و لالہ بدشت ۔۔۔ از کران تا بکران روے زمین ناپیداست

جادہ ہا خود ز خیابان نتوان کرد تمیز — بسکہ گل صف زدہ تا سر او از چپ و راست

جام گلرنگ کہ در بزم بآئین چینند — ہم بدان گونہ گل از پہلوئے گل جادہ تماشت

سبزہ بر کوہ فرو ریختہ از سرتا بن — یا قبا ئیست کہ بر قامت شخص آیدراست

ما ہر و راند بہ دل کہ نہد گام براہ — بسکہ بر ہر قدمش لالہ و گل در تہ پاست

دیدہ طفل کہ بر دامن مادر غلطد — جنبش باد بدان گونہ بروئے صحراست

کیا اس سے زیادہ لطیف اور نادر کوئی اور تشبیہ ذہن میں آسکتی ہے ؟

گل بہر شاخ زبرگ ست فزون تر گوئی — ہمہ برگل بفزودانچہ کہ از برگ بکاست

سرو اگر پائے بدامن نکشد، خود چہ کند — زانکہ از جوش گل و لالہ چمن تنگ فضاست

بسکہ بر ہر قدم از لالہ چراغے بنہند — در شب تار کسے گم نشود از رہ راست

کشمیر میں ایک مشہور جھیل ہے جس کا نام ڈل ہے، اس کی صفائی اور لطافت کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے،

آبگیرے کہ بشہرت و بود نامش ڈل — گوئیا آئینہ در دست عروسے زیباست

سینہ صاف دلان ست ہمانا کز لطف — ہر چہ در بن بود از صفوہ رویش پیداست

گرد بر گرد ڈل آن صف زدن لالہ و گل — چوں طراز یست کہ بر دامن شو رغاست

کشمیر میں ایک خاص قسم کی گھاس ہوتی ہے جس کو سطح آب پر بچھا کر فاکیوش کر دیتے ہیں، اور اس پر مختلف چیزوں کی کاشت کرتے ہیں، اس حیرت انگیز قوت نامیہ کی طرف اس شعر میں اشارہ کیا گیا ہے،

آب بالائے زمین باشد و اینجا بینی — کہ زمین بر سر آبست و ہمان پا بر جاست

آخر میں سلسلہ سخن کی طوالت کا جو عذر شاعر نے پیش کیا ہے، وہ سننے کے قابل ہے، ملاحظہ ہو،

گرچہ دانم کہ سخن خود بہ درازی بکشید چہ توان کرد سخن ہم ز سر نشو و نماست

اس کے بعد علامہ نے اپنی علالت و علاج وغیرہ کے واقعات نہایت تفصیل سے بیان کیے ہیں یعنی کس طرح ان کو بخار آیا، اس بخار کی نوعیت کیا تھی، اس کی شدت اور تکلیف کا کیا عالم تھا، مقامی احباب نے کس طرح خلوص اور ہمدردی کا اظہار کیا طبیب نے نبض وغیرہ دیکھکر اور تمام اسباب و علل پر غور کرکے مرض کی کیا تشخیص کی، علاج سے کیا فائدہ ہوا، فائدہ ہوکر پھر دوبارہ مرض نے کس شدت کے ساتھ عود کیا، نہایت ضعف کی وجہ سے زندگی سے مایوس ہوکر اپنی املاک و دولت کے متعلق بطور وصیت کیا ہدایتیں کین، وطن کس حالت مین واپس آئے، یہان کس قسم کا علاج ہوا، اور کبتک ہوتا رہا، صحت کیونکر ہوئی، ان تمام جزئی واقعات کو علامہ نے جس خوبی سے نظم کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے قلم کو واقعہ نگاری پر کس قدر قدرت حاصل تھی، آخرین اپنے احباب خاص کو مژدۂ صحت دینے کے بعد اپنے متعلق فرماتے ہین اور کس قدر صحیح فرماتے ہین،

شبلی امروز بود بلبل بستان سخن کہ از و گلکدۂ ہند پر از صوت و نواست

علامہ کے کمال واقعہ نگاری کی ایک دوسری مثال وہ قصیدہ ہے جو انھون نے اپنے سفر روم کے حالات مین لکھا ہے، یہ قصیدہ درصل ایک منظوم سفرنامہ ہے، جس کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوجاتا ہے کہ سفر کا اصلی مقصد کیا تھا کس تاریخ کو اس کا آغاز ہوا، جہاز پر کیا کیفیت رہی، کن کن مقامات سے گذر ہوا، ان مقامات کی کیا حالت تھی، کہان کہان جہاز نے قیام کیا، اور کب منزل مقصود پر پہنچا، افسوس ہے کہ طوالت کے لحاظ سے ہم اس پورے قصیدے کو نقل نہین کرسکتے، چند ابتدائی اشعار ملاحظہ ہون،

بہر تکمیل فن و بہر پئے تحصیل عبر روزگاریست کہ میداشتم آہنگ سفر

فارغ از حج و زیارت چو مرا کرد قضا خواستم تا بسوے روم شوم راہ سپر

گرچہ من گرم طلب بودم و بس مستعجل | لیک تاخیر ہمی رفت بفرمان قدر
دیر آن مایہ شد آخر کہ حسودان گفتند | کہ فلان جز ہوس خام ندارد در سر
من درین غصہ و غم خون جگر می خوردم | ناگہان شاہد مقصود در آمد از در
اتفاقے عجبے گشت مرا عقدہ کشا | کہ از وہم و گمان نیز نمیداشت خبر
یکدو مہ پیشتر ک زانکہ زنم کوس رحیل | بودم از زحمت تپ خستہ دل و تفتہ جگر
عزم دیرینہ بیاد آمد و گفتم چہ خوش است | کہ بیک حیلہ دو تا کار بر آرد داور

آغاز سفر میں جہاز پر دو تین روز جو کیفیت رہتی ہے، اس کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے،

الغرض از رمضان بست و ششم بود کہ من | گرم بر خاستم از جائے و شدم راہ سپر
اوفتادم برہ کوہ و بیابان یکچند | پس بکشتی بنشستم من و یاران دگر
زحمتے صعب کشیدیم بکشتی دو سہ روز | بسکہ از موج بہر لحظہ شدے زیر و زبر
کس نیارست سرش باز گرفت از بالین | کس نیارست جدا کرد تنش از بستر

اس کے بعد جہاز جن مختلف مقامات سے گذرا، ان کی تفصیل بیان کی ہے اور ہر مقام کی حالت بھی مختصراً بیان کردی ہے، مثلاً عدن کے متعلق لکھتے ہیں،

کوہسار یست کہ ہر چند بلند ست و فراخ | لیک از سبزہ و گل نیست درو ہیچ اثر
ہر کجا می گذری ریگ روانست و خزف | ہر طرف می نگری خاک سیاہ ست و حجر
گیر و ترسا کہ نزیل اند درین بقعہ ہمہ | جز بان عربی حرف نزدندے یکسر

سوئیز میں اگرچہ جہاز نے بہت کم قیام کیا، تاہم اس کا تذکرہ قلم انداز نہیں کیا ہے، فرماتے ہیں،

این ہمان نہر عجیبیست کز ینسان کارے | جز در افسانۂ پارین نشنیدیم دگر
بست فرہنگ درازست و بہ پہنا چندان | کہ دو والوبر توانند از و کرد گذر

بیروت پہنچ کر جو دلکش سماں نظر آیا ہے، اس کی تصویر ان الفاظ میں پیش کی ہے:

خوب جا ست کہ تا خواستنہ در بازدِ دل | ہر کہ سوزے بدلش دارد و دردے بجگر
موضعے خرم و سیرے خوش و جائے دلکش | راہ ہموار و زمین پاک و مکان خوش منظر
گبر و مسلم ہمہ خوش جامۂ و موزون اندام | خاص و عامی ہمہ گلگون تن و زیبا پیکر
چون برون رفتم از بنجائے و ازان جا زنبو | پیش می رفتم و بازم بتقفا بود نظر

غرض اسی طرح تمام مقامات راہ کا تذکرہ کرتے ہوئے بخیر و خوبی منزل مقصود پر پہنچے ہیں لیکن سلسلۂ بیان میں کوئی انتشار یا پراگندگی پیدا ہونے نہیں پائی ہے، بلکہ شروع سے آخر تک روانی اور تسلسل کا یکسان عالم نظر آتا ہے۔

واقعہ نگاری کا اصلی کمال یہی ہے کہ جو واقعہ یا منظر پیش کیا جائے اس کی مکمل تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے، یعنی کوئی خاص پہلو یا رخ نظر انداز ہونے نہ پائے، ورنہ تصویر ناقص اور بے کیف ہو کر رہ جائے گی، اس موقع پر انداز بیان کی موزونی کا بھی لحاظ ضروری ہے، یعنی جس قسم کا واقعہ یا منظر ہو، اسی مناسبت سے پیرایۂ بیان اور الفاظ کا بھی انتخاب ہونا چاہیے، ورنہ پوری نظم نغمۂ بے آہنگ ہو کر رہ جائے گی، لیکن ان مقاصد میں حصول کامیابی کا انحصار شاعر کی قوت مشاہدہ، قدرت زبان اور بلاغت شناسی پر ہے، قوت مشاہدہ اس لیے ضروری ہے کہ واقعہ کا کوئی موثر پہلو چھوٹنے نہ پائے، قدرت زبان اس لیے درکار ہے کہ انداز بیان غیر مربوط اور پراگندہ نہ ہونے پائے، بلاغت شناسی کی اس لیے ضرورت ہے کہ جو الفاظ استعمال کئے جائیں، وہ واقعہ کی نوعیت کے لحاظ سے موزون اور مناسب ہون۔

علامہ کے قصائد میں یہ تمام خصوصیتیں کافی طور پر موجود ہیں، مثلاً قصیدۂ کشمیریہ کو دیکھو، جا بجا کشمیر کے دلفریب قدرتی مناظر کا تعلق ہے، غور کرو، انداز بیان کس قدر شاعرانہ کیف و رنگینی میں ڈوبا

ہوا ہے، لیکن جہان سے واقعات کا ذکر شروع ہوتا ہے یہ رنگینی دفعۃً سادگی سے بدل جاتی ہے کہ اب شوخی و رعنائی کا موقع نہین،

اس سلسلہ مین علامہ کا قصیدہ عیدیہ خاص لحاظ کے قابل ہے، جس مین انھون نے عید کے عیش و طرب کی ہنگامہ آرائیون کا منظر دکھلایا ہے، چند اشعار ملاحظہ ہون جن سے اندازہ ہوگا کہ بحیثیت واقعہ نگار کے علامہ کی نگاہ کس قدر باریک بین واقع ہوئی تھی، فرماتے ہین :

روز عیدست و دگرگون جہان گشت بسا — باز شد بر رخ گیتی در امید فراز
سخن از مے چہ کنی بادہ چہ خواہی امروز — نشہ عیش ندارد بمے و بادہ نیاز
مردمان بسکہ ز ہر گوشہ فراز آمدہ اند — نگہ از تنگی جا بار نمی یابد باز
آن یکے جلوہ فروش آمدہ در خانہ زین — وان دگر بر زدہ بر ہودج زربالش ناز
آن یک از تابش خور پردہ فروہشتہ بروے — وان دگر در کنف چتر شدہ جلوہ طراز
واعظ آراستہ عمامہ واز روے شرف — شملہ را کردہ چون سر رشتہ امید دراز
زاہد سادہ ہم از کلبہ تنہائی خویش — با کہن خرقہ خود رفت برون بہر نماز
با ہمہ شوکت و فر با ہمہ تمکین و شکوہ — خلق در عیدگہ آمد زرہ صدق و نیاز
نفسے چند نشستند و ز ذانو زدہ انجمن — راست چون سرو بہ ستادند پے ذکر نماز
مفتی شہر ہم از جا بامامت برخاست — با ہمہ صدق و صفا با ہمہ اخلاص و نیاز
انچہ بایست ز ترتیل و سکون در قرأت — ہمہ بر وجہ حسن کرد ادا آن ممتاز
پس دگر خطبہ بفرمود بآواز بلند — خطبۂ چون سخن قامت محبوب دراز
شور برخاست ز مردم کہ مبارکباد — عید و این گرمی ہنگامۂ این زینت و ساز
کودک از روے ادب عرض نیایش میکرد — پیر گفتے صد و سی سال ترا عمر دراز

واقعہ نگاری کے لحاظ سے ان اشعار پر غور کرو، عید کا پورا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے، کوئی معمولی شاعر لکھتا، تو غالباً صرف اتنا لکھکر رہ جاتا کہ عید گاہ میں مختلف قسم کے لوگوں کا ہجوم ہوا، نماز ادا کی، امام نے خطبہ پڑھا، اور لوگ سلام و معانقہ کرکے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے، لیکن شان و شوکت کے ساتھ عید گاہ میں ہر گوشہ سے لوگوں کا جمع ہونا، کسی کا پیدل اور کسی کا زین سواری پر آنا، کسی کا دھوپ سے بچنے کے لیے چہرے کو کپڑے سے چھپائے رکھنا، اور کسی کا چھتری لگائے رہنا، چند منٹ تک لوگوں کا دوزانو ہو کر مسجد میں مودب بیٹھنا، اور پھر نماز کے لیے کھڑا ہونا، امام کا باقاعدہ قرأت کرنا، نماز ختم ہونے پر ایک طویل خطبہ پڑھنا، لوگوں کا ایک دوسرے کو مبارکباد دینا، چھوٹوں کا بڑوں کو سلام عرض کرنا، اور بڑوں کا بزرگانہ دعائیں دینا، ان تمام جزئیات پر جن کے بغیر واقعہ کی تصویر نامکمل رہ جاتی، ایک دقیق النظر شاعر ہی کی نگاہ پڑ سکتی تھی،

اس موقع پر دفعۃً مسلمانوں کے گذشتہ جاہ و جلال کا منظر علامہ کی نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے، اور ان کا درد آشنا دل تڑپنے لگتا ہے، کہ وہ قوم جس کے کوکبۂ سطوت و جبروت کے آگے بڑے بڑے کجکلاہوں کی گردنیں خم ہو گئی تھیں، اور جس کی تیغ و قلم کے نادر المثال فتوحات کے ابدی نقوش ابتک تاریخ عالم کے صفحوں پر چمک رہے ہیں، آج وہ کس زوال و پستی کی حالت میں ہے اور اس کا افق حیات کس قدر تاریک اور غبار آلود نظر آتا ہے، ارباب ذوق پر ظلم ہوگا اگر ہم انکو علامہ کے ان احساسات سے لطف اندوز ہونے کا موقع نہ دیں، انداز بیان کا جوش و خروش ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں:

خود ہمان جمع کہ میداشت بہم تیغ و قلم	خود ہمان قوم کہ بود ست بہر پایہ فراز
آنکہ در انجمن فضل نمیداشت ہمال	آنکہ در بزمگہ دہر نبودش انباز
آنکہ جان در تن افسردہ معنی بدمید	آنکہ بر داشتہ قفل از در گنجینۂ راز

ہیئت و ہندسہ را پایہ از و گشت بلند	منطق و فلسفہ را داد ہم او زیب و طراز
یاد آن رونق بازار ہنر در بغداد	یاد آن گرمی ہنگامۂ فن در شیراز
قرطبہ آنکہ از و کسب ہنر کرد فرنگ	وان سلرنو کہ اطالیہ باو داشت نیاز
خود ہمان جمع کہ افراخت بنیوق علم	آنکہ بر اوج فلک سود کلہ گوشۂ ناز
آنکہ پامال خرامش چہ خراسان چہ پارس	آنکہ تاراج نگاہش چہ عراق و چہ حجاز
آنکہ دیلم بجبین داغ سجودش بر داشت	آنکہ سلجوق بخاک در او کرد نماز
روم را لرزہ بر اندام ز بانگ غضبش	ہند را غلغلۂ مقدم او زہرہ گداز
فتح را از پئے طاعت خم تیغش محراب	بخت را بہر پرستش در او کعبۂ راز
رمح او بود کہ تاج از سر قیصر بربود	تیغ او بود کہ شد با دل کسری ہمراز
اینک آن قوم بحالیست کہ نتوان گفتن	خود ببین تا بچہ انجام رسید آن آغاز
نالہ بیجاست بر آید ز دل خستۂ ما	شیشۂ را ہست بہنگام شکستن آواز
ہر چہ بر ماست ہم از دست سیہ کاری ماست	گلہ نیست ز بخت و فلک عربدہ ساز

غور کرو، ان چند اشعار مین شاعر نے کس خوبی اور جوش کے ساتھ مسلمانون کے عہد اقبال و کامرانی کا پورا سمان ہماری نگاہون کے سامنے کر دیا ہے! تاریخی واقعات کو انداز بیان کی شعریت قائم رکھتے ہوئے اس طرح پر جوش طریقہ پر نظم کرنا دراصل شاعری کا ایک بڑا کمال ہے۔ ان اشعار کی تاثیر کا ایک خاص سبب یہ ہے کہ یہ خود شاعر کے قلب و روح کے تاثرات ہین۔

علامہ مرحوم کی طبیعت مین اجتہاد اور جدت کا غیر معمولی مادہ تھا، اس لیے ہر فن مین ان کا قدم عام شاہراہ سے ہمیشہ الگ پڑتا تھا، شاعری مین بھی قدیم روش جس کو واقعیت اور سادگی سے بہت کم تعلق تھا، ان کی جدت پسند طبیعت کو بہت زیادہ پسند نہ تھی، چنانچہ ایک قصیدے

میں قدیم انداز تغزل اور مدح سرائی پر پُرزور الفاظ میں تعریض کی ہے، اور قدماء کی کورانہ تقلید کو ننگ ہمت قرار دیا ہے، فرماتے ہیں:

جادۂ پیشیروان رفتم و دانم کہ ہنوز	اندرین شیوہ ثنا من بہ ادا ماند
ننگ ہمت بود آنکے کہ زبان تازہ کنی	ہم ازان جرعۂ باقی کہ بہ مینا ماند
نیست چیزہ وفی فطرت کہ ببازار کمال	چشم دوزی بمتاعے کہ زیغما ماند
مرفز نبود کہ ہمان بر روش پیشروان	خامہ در راہ سخن بادیہ پیما ماند
داستان چند توان کرد زمحمود و ایاز	تا بکے خود سخن از وامق و عذرا ماند
گر نسیم از شکن زلف کشاید گرہے	فکر را با توصد آویزش بیجا ماند
سفلۂ را بستائی و بگوئی کہ بجاہ	کمترین بندۂ او با جم و دارا ماند
ہرزہ چند ہم بافی و گوئی کہ بدہر	سخنت خاتمۂ دفتر انشا ماند
شیوۂ مدح و غزل گرچہ دلآویز و خوشست	مبتذل گشت نہ چندان کہ گوارا ماند

اس میں شبہ نہیں کہ عام شعراء کی بدمذاقی کی وجہ سے غزل صرف مصنوعی اور عامیانہ جذبات کا تماشا گاہ بنکر رہ گئی، قصیدہ جو مختلف قسم کے واقعات و مناظر کی مصوری کا ایک نہایت نمایاں ذریعہ تھا، اس کا خاص موضوع مدح قرار دیا گیا، جس میں بجز مبالغہ کے اصلیت کا شائبہ بہت کم ہوتا تھا، صنائع و بدائع لفظی خراش تراش، دور از کار اور خارج از قیاس تشبیہات و استعارات وغیرہ یہ تمام چیزیں جن کو نفس شاعری سے کوئی تعلق نہ تھا، عام طور پر شاعری کے کمالات میں داخل ہوگئی تھیں، تخیلات جس قدر پادر ہوا، اور جادۂ حقیقت سے دور ہوں، اسی قدر وہ تعریف کے قابل سمجھے جاتے تھے، ظاہر ہے، کہ ایسے فرسودہ، مصنوعی اور بے کیف انداز سخن کی تقلید پر علامہ کا نکتہ سنج اور جدت آفرین دماغ کب آمادہ ہو سکتا تھا، چنانچہ اس محدود دائرۂ شاعری کی تقلید کے

خلاف انھوں نے پرجوش صدائے احتجاج بلند کی ہے، فرماتے ہیں:

ہان وہان چند توان بود بہ تقلید اسیر	وائے آنکس کہ بہ سلسلہ برپا ماند
پائے از ین دائرۂ تنگ برون نہ کہ سخن	خود محیطیست کہ ہر قطرہ بہ دریا ماند
راستی در زرو چنان پیکر گفتار آرائے	کہ فروغ اثر از ناصیہ پیدا ماند

اس کے بعد بطور مثال کے صبح کے منظر کی تصویر اپنے دلکش انداز مین پیش کی ہے،

چند اشعار ملاحظہ ہون،

مشکسِ شب جملہ بتاراج رود در دم	شوشۂ سیم پراگندہ بہ ہر جا ماند
سحر از جیب افق سر بزند خندان خند	شب بخود پیچد و از غصہ بسیر دا ماند
آید از صحن حرم بانگ موذن در گوش	دیر از نالۂ ناقوس پُر آوا ماند
رند با شیشۂ و مے راہِ چمن گیرد و شیخ	در غم سبحۂ و مسواک و مصلا ماند
چمن از غلغلۂ مرغ بہ جنبش افتد	کوہ از قہقہۂ کبک پُر آوا ماند
پاسبانان زسر کوچہ و رہ برخیزند	در میخانہ بروئے ہمہ کس وا ماند
کاروانہا بہ رہ افتند و جرس نالہ کشد	دشت و صحرا پُر از آوازہ و غوغا ماند
رندِ میخوارہ کہ از بادۂ دوشین سرمست	ہمچنان فارغ از اندیشۂ فردا ماند
گاہ سر برزند از خواب گہ رہ و باز بخواب	گاہ مخمور ز جا خیزد و واز پا ماند
دست در گردنِ معشوق چو خیزد عاشق	ہم بدستِ وگرش گردنِ مینا ماند

ایسے وقت مین خود علامہ کس عالم مین ہین، وہ بھی ملاحظہ ہو، فرماتے ہین،

در چنین وقت بہ نعمانیِ آشفتہ گذر	کہ قلم در کف و آمادۂ انشا ماند

طوالت کا لحاظ ضرور ہے تاہم ناظرین کو اس قصیدہ کی تشبیب کے چند اشعار سنائے

بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا، تغزل کی حیثیت سے بھی ان اشعار پر غور کرنے کی ضرورت ہے، ملاحظہ ہو،

دلِ پر حوصلہ آخر چہ دعوی ماند   تا کہ آرد کہ بہ درد تو شکیبا ماند

راضیم از نگہ شوق کہ گوید ہمہ باز   از زبان آنچہ دمم عرض تمنا ماند

بر سراپائے جمالِ تو نگاہم گوئی   رہروے ہست کہ از ضعف بجا ماند

ارمغانے نبود در خورِ تابِ درِ او   مگر آن سجدہ کہ آمادہ بہ سیما ماند

نو بہاران ہمہ نرگس بدماند کہ چمن   بر جمالت ہمہ تن محو تماشا ماند

مے بیاشام و لبِ لعل مے آلود ببین   کین گنہ در روشِ عشق بہ تقوی ماند

اس شوخی اور شوریدہ مزاجی کی داد دینا آسان نہیں ہے، اگر کسی میں اتنی جرأت بھی ہو تو اسکو اس بادۂ مرد افگن کے دو جام کی تمنا کرنی چاہیے،

علاوہ قصائد کے علامہ نے اکثر مسلسل نظمیں ترکیب بند کی شکل میں مختلف موقعوں پر لکھی ہیں جن میں انھوں نے خاص طور پر اپنے قومی اور مذہبی درد کا اظہار کیا ہے، اور مسلمانوں کو اسلاف کے گذشتہ کارناموں کی یاد دلا کر موجودہ خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی ہے، اور بتایا ہے کہ ان کی اصلی فلاح و ترقی کا راز یورپ کی کورانہ تقلید میں نہیں، بلکہ صرف کتاب وسنت کی پیروی میں پوشیدہ ہے، اس میں شبہ نہیں کہ علمی حیثیت سے علامہ نے مفکرین مغرب کی طرز تحقیق و تنقید سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا تھا، وہ ان تنگ نظر قدیم علماء میں نہ تھے، جو یورپ کا نام لینا بھی کفر سمجھتے تھے، لیکن اس جلوہ گاہ مادیت کے ظاہری آب و رنگ کی تہ میں جو ظلمانی اور روحانی تیرگی و پستی کا منظر پوشیدہ تھا، وہ ہمیشہ ان کی حقیقت آشنا نگاہوں کے سامنے رہا، ان کا مسلمانوں سے یہ مطالبہ نہ تھا کہ وہ دنیا کو چھوڑ دیں، اور قدرت نے ان کے نظام جسمانی کی راحت و آسایش کے لیے جو سامان پیدا کیا ہے، اس کو کام میں لانے کی کوشش نہ کریں، بلکہ ان کو ترک دین کی معصیت کا افسوس تھا، وہ دین اور دنیا دونوں کو ساتھ لیکر چلنا چاہتے

تھے کہ اسلام کی حقیقی تعلیم یہی تھی، ہاں کو جدید تعلیم یافتہ گروہ سے یہ شکایت نہ تھی کہ اس نے مغرب کے علوم و فنون سیکھنے میں غیر معمولی شغف سے کام لیا ہے، بلکہ ان کو اس کا صدمہ تھا کہ یہ گروہ یورپ کی تقلید میں اس درجہ محو ہو گیا ہے کہ اس کو اپنے بزرگوں کی کوئی داستان یاد نہیں رہی ہے اور ذہن سے یہ خیال بالکل جاتا رہا کہ اس فریب گاہ رنگ و بو سے ماورا بھی ایک اور عالم ہے جس کا تعلق انسان کے قلب و روح سے ہے، یہی وہ عالم ہے جس کو برباد کر کے دنیا حقیقی عیش و سکون کی دولت سے محروم ہو گئی ہے، چنانچہ علامہ نے ایک ترکیب بند میں دنیاوی جاہ و حشم کے تماشائیوں کو اس عالم روحانی کے سیر و تماشا کی خاص طور پر دعوت دی ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

عالمے ہست کہ آنجا سخن از جان باشد عالمے ہست کہ در دش نہ درمان باشد

عالمے ہست کہ ہر ذرۂ او دا بہ فروغ پنجہ در پنجۂ خورشید درخشان باشد

عالمے ہست کہ آنجا برہ و رسم نیاز چرخ و انجم ہمہ سر بر خط فرمان باشد

خاک او معتکف دیلم و سلجوق بود در گہش سجدہ گر قیصر و خاقان باشد

صحن آنجا رو د از منبر و محراب دعا گر حدیثے ہمہ از گنبد و ایوان باشد

سامری دم نتواند زدن آنجا کہ خود او پنجہ بر تافتۂ موسیٰ عمران باشد

داستانہاے تو افسانۂ شاہبت و وزیر حرف آن بزم ز پیغمبر و یزدان باشد

تو حدیث از جم و دارا سرائی وآنجا گفتگو از عمرؓ و صدیقؓ و عثمانؓ باشد

تو بہ فرمودۂ اسپنسر و بیکن نازی سخن آنجا ہمہ از گفتۂ یزدان باشد

کم زر آئین جہانداری سولن نبود آن اساسے کہ بر آوردۂ نعمان باشد

ہان نگوئیم کہ آن گیری و این بگذاری
حیف باشد کہ تو سر رشتۂ دین بگذاری

علامہ کو دنیاوی جاہ و حشم کے حصول پر اعتراض نہین، ان کو جو کچھ شکایت ہے وہ یہ ہے:

خوش بود اینکہ ترا جاہ و حشم ہم باشد ‏ ‏ ‏ ‏ لیک حیف است اگر حرمت دین کم باشد

ملک و دین ہر دو بپاگشتہ نیروے ہم اند ‏ ‏ ‏ ‏ اندران کوش کہ این باشد و آن ہم باشد

شرط اسلام نباشد کہ بہ دنیا طلبی ‏ ‏ ‏ ‏ التفات تو بہ دین نبوی کم باشد

نکتۂ شرع بہ افسانہ برابر بہ نہی ‏ ‏ ‏ ‏ یورپ ار گپ زند آن نیز مسلم باشد

حل ہر مسئلۂ فقہ ز یورپ طلبی ‏ ‏ ‏ ‏ شرع پیش تو ز تقویم کہن کم باشد

از ابوبکرؓ و عمرؓ ہیچ بہ یادت ناید ‏ ‏ ‏ ‏ گرمی بزم تو از سیزر اعظم باشد

در سخن بگذرد از سیرت و شان نبوی ‏ ‏ ‏ ‏ ہر چہ گوئی ہمہ از گفتۂ ولیم باشد

آنچہ حق است ترا در نظر آید باطل ‏ ‏ ‏ ‏ آنچہ شہد است بہ کام تو ہمہ سم باشد

غور کیجئے، جدید تعلیم یافتہ گروہ کی ذہنیت کی یہ کتنی صحیح تصویر ہے!

علامہ تعلیم جدید کے مخالف نہ تھے، وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ مسلمان شوق سے مغربی علوم وفنون سیکھین لیکن اسی کے ساتھ اپنے قومی اور مذہبی خصائص کو زندہ اور قائم رکھین، چنانچہ ایک دوسرے ترکیب بند مین اس گروہ کو مخاطب کرکے فرماتے ہین:

اے کہ بر مائدۂ یورپ مہمان باشی ‏ ‏ ‏ ‏ حیف باشد اگر از جملۂ ایشان باشی

حیف اگر از اثر فلسفۂ مغربیان ‏ ‏ ‏ ‏ منکر فلسفۂ سنت و قرآن باشی

گفتۂ سولن و آئین جہانبانی او ‏ ‏ ‏ ‏ بر زبان داری و بیگانہ ز نعمان باشی

از ہنیبال صد افسانہ و دستان گوئی ‏ ‏ ‏ ‏ جاہل از معرکہ ہاے شہ مردان باشی

قیصران را ہمہ یک یک بشماری ز آغاز ‏ ‏ ‏ ‏ بیخبر از عمر و حیدر و عثمانؓ باشی

از خداوند جہان یاد نیاری گاہے ‏ ‏ ‏ ‏ روز و شب خود بہ پرستاری سلطان باشی

در پیری که در دین کارے تدبیر بود　　دین و دنیا بہم آمیز کہ اکسیر بود

یہ کوئی نیا نسخہ نہیں ہے، بلکہ تیرہ سو برس پہلے ایک طبیب روحانی نے یہ نسخہ دنیا کے سامنے پیش کیا تھا، جس کا کبھی یہ اثر تھا کہ مسلمان جس میدان میں قدم رکھتے تھے فتح و کامرانی ان کے ہمرکاب رہتی تھی، لیکن یہی قیصر و کسریٰ کے تاج و تخت کو ٹھکرانے والے آج خود ذلت و نامرادی کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں، صرف اس لیے کہ ان کے ہاتھ سے دین الٰہی کا رشتہ چھوٹ گیا ہے، اور وہ اس صدائے حق کو بھول گئے ہیں، جو افواج باطل کے لیے ہمیشہ پیام شکست بن کر بلند ہوا کرتی تھی۔

اس موقع پر ہمارے جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کو شاید یہ جاننے کا اشتیاق ہو کہ علامہ کو جس جماعت سے تعلق تھا، اس کی ظاہری شان و شوکت کا کیا عالم ہے، اور وہ جس درسگاہ کے مبلغ و علمبردار تھے، اس میں داخل ہو کر ان کو وہ کونسی متاع بے بہا نصیب ہو سکتی ہے، جو مغربی مدارس کی فلک بوس عمارتوں میں نہیں مل سکتی، سب سے پہلے اس جماعت کی دنیاوی حیثیت کا حال سننا چاہیئے، فرماتے ہیں:

ما نہ آنیم کہ دیہیم سکندر طلبیم　　ما نہ آنیم کہ اورنگ سلیمان داریم

ما نہ آنیم کہ با حاجب و دربان باشیم　　ما نہ آنیم کہ بام و در و ایوان داریم

ما نہ آنیم کہ با مسند و بالین ارزیم　　ما نہ آنیم کہ سرداب و شبستان داریم

ما نہ آنیم کہ یک شیوۂ با ئین گیریم　　ما نہ آنیم کہ یک کار بہ سامان داریم

خاکساران جہانیم و ز اسباب جہان　　بوریائیست کہ در کلبۂ احزان داریم

اب اس کلبۂ احزان کے بوریا نشینوں کے پاس جو گرانمایہ دولت ہے، اور جس کے سامنے ان کی نگاہوں میں دنیاوی جاہ و جلال کوئی وقعت نہیں رکھتا، اس کی تفصیل ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں:

عجز و افتادگی و طوع و رضا خواہی ہست　　گر ز ما شیوۂ پیشینۂ ما خواہی ہست

افسر و تاج و کمر بند و کلہ جوئی نیست | جامۂ کہنہ و پارینہ ردا خواہی ہست
قصر و بام و حرم و گنبد اگر خواہی نیست | مسجد و منبر و محراب دعا خواہی ہست
آن مے کز خم فرنگ ست، نداریم بجام | بادۂ خمکدۂ صدق و صفا خواہی ہست
شرح افسانۂ روم من نتوان جست ز ما | در دلاویز حدیث خلفا خواہی ہست
ما مداوائے تپ و درد ندانیم ولے | گر ز رنجوری الحاد شفا خواہی ہست
گفتۂ بیکن و دیکارٹ نداریم بیاد | در حدیثے ز رسول دو سرا خواہی ہست

آج اسی متاع گراں از دست بے بہرہ ہونے کا نتیجہ جمعیت اسلام کی وہ پستی و زبون حالی ہے جس کا نقشہ علامہ نے اسی ترکیب بند کے ایک بند میں پیش کیا ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں،

آنکہ در معرکہ تاج از سر قیصر بربود | دست و بازوش بیکبار ز کار افتادست
آنکہ چون مہر جہانتاب بعالم تاخت | خاک رہ گشتہ و در راہ گذار افتادست
آنکہ صد قلعۂ رومین بیکے حملہ کشود | حالیا از ہمہ سو خود بحصار افتادست
دست و سرپنجۂ آن شیر ژیان رفت ز کار | تہمتن در تگ چنگال و خوار افتادست
آنکہ در پیکر صد مردہ ہمی جان بدمید | ہست بر بستر بیماری و زار افتادست
مرغ خوش زمزمہ را کار بصیاد افتاد | دامن شاہد گل در کف خار افتادست
ﻧﯽ نہ مینی کہ نژاد عرب و آل لوی | خوار و سرگشتہ بہر شہر و دیار افتادست
دست ہر سفلہ بغارتگری لشکر دل | ہمچو نقد یکہ در دست تتار افتادست

مذکورہ بالا مثالیں واقعہ نگاری کی حیثیت سے بھی قابل لحاظ ہیں، اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ علامہ مرحوم کا دائرہ سخن صرف غزل تک محدود تھا، اور انکے کلام میں واقعات، حالات اور قدرتی مناظر کی نقاشی کی قابلیت نہ تھی، بلکہ واقعہ اسکے بالکل برعکس نظر آتا ہے، ان مثالوں پر غور کرو قوت تنظیم میں کوئی سستی یا ترتیب خیال میں کوئی پراگندگی محسوس نہیں ہوتی، اور

اندازِ بیان کی شاعرانہ لطافت و رنگینی ہمیشہ قائم رہتی ہے، ہمارے نزدیک ایک باکمال شاعر کی خاص خوبی یہی ہے کہ وہ ہر قسم کے مضامین پیدا کرتا ہے، لیکن وہ کبھی نہیں بھولتا کہ وہ شاعر ہے، اور وہ جو کچھ کہتا ہے ہمیشہ شاعرانہ انداز سے کہتا ہے، خواجہ حافظ کا خاص کمال یہی ہے کہ انھون نے فلسفہ، اخلاق، تصوف، سیاست وغیرہ ہر قسم کے مضامین ادا کیے ہیں لیکن پیرایۂ بیان کی شاعرانہ لطافت و رنگینی کا رشتہ کبھی ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا، علامہ مرحوم کے انداز بیان کی بھی یہی خاص خصوصیت ہے کہ وہ معمولی باتین بھی اسطرح ادا کرتے ہین کہ ان مین ایک خاص مزہ محسوس ہونے لگتا ہے، مثال کے طور پر دیکھیے کہ یہ خیال کہ مسلمان اسقدر کمزور اور بیجان ہو گئے ہین، کہ جو چاہتا ہے انکو غارت کرنے کیلیے کھڑا ہو جاتا ہے کتنا معمولی خیال تھا لیکن غور کرو وہ ہجو بغداد کہ "در دست تتار افتاد دست" کی تاریخی تشبیہ نے اس خیال کو کسقدر پر لطف طریقہ پر ادا کر دیا ہے، یہ بات بھی کتنی معمولی تھی، کہ "مسلمان دشمنون کے دام ستم مین گرفتار ہین" لیکن اس کو کس انداز سے ادا کیا ہے،

مرغ خوش زمزمہ را کار بہ صیاد افتاد دامنِ شاہد گل در کف خار افتاد دست

اسی کا نام شاعرانہ اندازِ بیان ہے، بات کیا تھی، اور کسطرح کہا ہے کہ بے اختیار ذوق صحیح وجد کرنے لگتا ہے، ان مثالون سے یہ بھی ظاہر کرنا مقصود تھا کہ علامہ کے ذوق سلیم نے عام طور پر قصائد اور ترکیب بند سے وہی کام لیا ہے جو واقعی ان کا صحیح مصرف تھا، یعنی کہین مناظر قدرت کی مصوری کی ہے، کہین مختلف واقعات و حالات کا نقشہ پیش کیا ہے، کہین اسلام کے گذشتہ جاہ و جلال کی یاد تازہ کی ہے، کہین مسلمانون کی موجودہ روحانی اور اخلاقی پستی پر اپنے دردِ دل کا اظہار کیا ہے، کہین قدیم اور جدید تعلیم کے نقائص بیان کیے ہین، کہین رہ نمایانِ مغرب کی ضلالت اور گمراہی کا راز طشت از بام کیا ہے، اور کہین اتباع کتاب و سنت کی وہ دیرینہ دعوت دی ہے جس کو قبول کیے ہوئے بغیر بدنصیب مسلمانون کے آلام و مصائب کا خاتمہ نہیں ہو سکتا، غرض جو کچھ لکھا ہے، وہ واقعیت سے متجاوز نہیں ہے، اور جس طرح لکھا ہے اس کو ایک وسیع النظر اور قادر الکلام شاعر ہی لکھ سکتا ہے،

(باقی)

مسلمان سلاطین کی تصانیف

از

جناب حافظ مولوی مجیب اللہ صاحب ندوی رفیق دارالمصنفین

(۲)

مامون الرشید

مامون عباسی خلفاء کا گل سرسبد تھا، اور اس کا عہد علمی حیثیت سے دورِ زرین تھا، اس کے زمانہ کی علمی ترقیوں کی تفصیل کے لئے ایک کتاب کی ضرورت ہے، اور یہ حالات بڑی حد تک احمد فرید رفاعی کی "عصر المامون" اور علامہ شبلی کی المامون میں موجود ہیں جن کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے، اس لئے ہم صرف اسکے ذاتی علم و فضل کا مجمل خاکہ پیش کرنے کے بعد اس کی قلمی یادگاروں کا تذکرہ کرینگے۔

۱۷۰ھ میں مامون کی ولادت ہوئی، ۱۸۲ھ میں ولیعہد اور امین کے قتل کے بعد ۱۹۸ھ میں مستقل خلیفہ ہوا، ۴۸ برس کی عمر میں ۲۱۸ھ میں وفات پائی،

ہارون خود صاحبِ علم اور اہلِ علم کا قدردان تھا، اس کے دربار میں شعراء، ادبا، فقہاء، محدثین کا مجمع رہتا تھا، اسی گہوارۂ علم میں مامون کی نشو و نما ہوئی، اور اسی میں اس نے تعلیم و تربیت پائی، کسائی جیسا نحوی، اصمعی اور عباس بن احنف جیسے ادباء اور امام مالک جیسے امام حدیث اس کے اساتذہ میں تھے، یحییٰ برمکی جیسا فاضل روزگار اس کی تعلیم کا نگران تھا، اور ابو نواس، ابو العتاہیہ، فراء، سیبویہ اس کے ہم جلیس اور ہم نشین تھے،

مامون بچپن ہی سے نہایت ذکی، ذہین اور طباع تھا، ان فضلاء کی صحبت نے اُس کی فطری صلاحیتوں کو اور چمکا دیا، اور تھوڑے ہی دنوں میں وہ خود اہلِ علم کی صف اول میں آگیا،

وہ شروع ہی سے علم و فن، شعر و ادب پر ناقدانہ نگاہ رکھتا تھا، ایک دن اصمعی سے اُس نے پوچھا یہ شعر کس کا ہے،

ماکنت الا کلحم میّت دعا الی اکلہ اضطرار

اصمعی نے کہا ابن عیینۃ المہلبی کا، مامون نے کہا نہایت بلند خیال ہے، مگر فلاں شعر سے ماخوذ ہے، اصمعی اس کی وسعتِ نظر پر سخت متعجب ہوا[۵]

ایک مرتبہ ہارون نے فوج کو کوچ کی تیاری کا حکم دیا، لیکن کئی روز گذر گئے، اور اُس نے اپنے ارادہ کا اظہار نہیں کیا، فوج پریشان تھی، مامون کو معلوم ہوا، تو اُس نے فوج کی طرف سے فوراً یہ قطعہ لکھکر ہارون کی خدمت میں پیش کیا،

یاخیر من دبت المطی بہ ومن تعدی بسرج الفرس

اے اُن سب لوگوں سے بہتر جن کو سواریاں لے کر چلتی ہیں، اور ایسے سواروں سے بہتر جن کے گھوڑوں کی زین اپنی جگہ پر رہتی ہے، (یعنی سبک رفتار ہیں)

من غایۃ فی المسیر نعرفہا ام امرنا فی المسیر ملتبس

سفر کا کوئی وقت ہے، جسے ہم لوگ جان سکیں، یا یہ امر ہمارے لیے مبہم ہی رہے گا،

ماعلم ھذا الا الی ملک من نورہ فی الظلم یقتبس

اس بات کا علم صرف اس بادشاہ کو ہے جس کے نور سے ہم لوگ تاریکی میں روشنی حاصل کرتے ہیں،

---

[۵] مرآۃ الجنان یافعی تذکرہ اصمعی،

ہارون رشید یہ قطعہ پڑھ کر خوش تو بہت ہوا، لیکن شعر و شاعری سے اس کو منع کر دیا[۵۱]

ایک بار اس نے محمد بن زیاد اعرابی سے جو مشہور نساب تھا، پوچھا کہ ہند کے اس مصرعہ میں نحن بنات طارق (ہم طارق کی بیٹیاں ہیں) طارق سے کون مراد ہے، ابن زیاد نے بہت خیال دوڑایا، لیکن ہند کے خاندان میں طارق کسی کا نام نہیں تھا، آخر میں مامون نے کہا کہ یہاں طارق کے معنی ستارے کے ہیں، جیسا کہ قرآن میں ہے والسماء والطارق، شاعرہ نے فخریہ اپنے کو ستارے کی طرف منسوب کیا ہے، ابن زیاد نے کہا کہ اس کی سند ہونی چاہئے، مامون نے کہا میں خود حجت اللغۃ اور مجتہد یعنی ہارون الرشید کا لڑکا مامون[۵۲]

شعر و ادب کے علاوہ فقہ و حدیث پر بھی اس کی نظر وسیع تھی، اور وہ مسائل میں اہل فن کی طرح نکتہ آفرینیاں کرتا تھا،

ایک دن علماء کا مجمع تھا جس میں ہر فن کے اہل کمال موجود تھے، ایک عورت مامون کے پاس فریاد لے کر آئی کہ میرا بھائی چھ سو اشرفیاں چھوڑ کر قضا کر گیا لیکن لوگوں نے مجھے صرف ایک اشرفی دلوائی ہے، مامون نے تھوڑا سا تامل کر کے عورت سے کہا تجھکو اتنا ہی ملنا چاہئے، اس غیر متوقع جواب پر سب کو حیرت ہوئی، علما نے پوچھا یہ کیونکر؟ مامون نے کہا کہ متوفی کے دو بیٹیاں ہوں گی، دو ثلث یعنی چار سو اشرفیاں تو ان کو ملیں، ماں بھی ہو گی جس کو سدس یعنی سو اشرفیاں، زوجہ کو ثمن یعنی پچھتر اشرفیاں ملی ہوں گی۔ اب ۲۵ باقی رہیں، مامون نے عورت سے مخاطب ہو کر کہا سچ کہنا تیرے بارہ بھائی ہیں، عورت نے تسلیم کیا، تو مامون نے کہا دو دو ان کو ملیں، ایک باقی رہی وہ تیرا حق ہے[۵۳]

ایک بار ایک شخص مامون کے دربار میں آیا، اور کہا میں محدث ہوں، اور اسی فن میں

---

۵۱ المامون ص ۱۹ ۵۲ تاریخ الخلفاء سیوطی ۵۳ ایضاً

ساری زندگی گذاری ہے، مامون نے کہا تمکو فلان مسئلہ کے متعلق کتنی حدیثین یاد ہین، وہ ایک بھی نہ بتا سکا تو مامون نے اسکے متعلق بیسیون روایتین سنا دین اور سندون کا ایک تار باندھ دیا، پھر اس شخص سے ایک دوسرا مسئلہ پوچھا وہ اس کا بھی کوئی جواب نہ دے سکا تو مامون نے اس مسئلہ کے متعلق بھی متعدد حدیثین بیان کین، پھر درباریون سے مخاطب ہو کر فرمایا، کہ لوگ تین دن حدیث پڑھتے ہین، اور بھول جاتے ہین کہ ہم بھی محدث ہین،[1]

شعروشاعری ہارون نے شعروشاعری سے روک دیا تھا، شاید اسی لئے اس نے شعرگوئی سے بہت کم دلچسپی رکھی تھی، لیکن پھر بھی کبھی کبھی جب طبیعت کی روانی مجبور کرتی تو وہ دو چار شعر کہہ لیا کرتا تھا، تاریخ و تذکرہ کی کتابون مین اس کے بہت سے اشعار مذکور ہین، نمونۃً دو چار نقل کئے جاتے ہین۔

لسانی کتوم لاسرار کم ودمعی نموم لسری مذیع
فلولا دموعی کتمت الھوی ولولا الھوی لم تکن لی دموع

بعثتک مرتادا ففزت بنظرۃ واغفلتنی حتی اسأت بک الظنا
فناجیت من اھوی وکنت مباعدا فیالیت شعری عن دنوک ما اغنی
فیالیتنی کنت الرسول وکنتنی فکنت الذی یقصی وکنت الذی ادنی
اری اثرا منہ بعینیک بینا لقد اخذت عیناک من عینہ حسنا

علامہ شبلی نے ان اشعار کو المامون مین نقل کرکے لکھا ہے،

"قاصد پر رشک کرنا شعر کا ایک وسیع مضمون ہے اور بہت سے نازک خیالون نے اس کے مختلف پہلو نکالے ہین مگر ہر شخص سمجھ سکتا ہو کہ مامون نے اس مضمون کو کس طرح پلٹا ہے، اور ہر بندش مین جدت کے ساتھ بات مین بات نکالی ہے" (ص ۱۲۰)

---

[1] تاریخ الخلفاء،

نثر | مامون کے خطوط اور اس کے خطبات اس عہد کی عربی نثر کے بہترین نمونے ہیں، جن سے اس کی فصاحت و بلاغت اور ادب و لغت میں اس کی وسعت نظر کا اندازہ ہوتا ہے، ابن عبدربہ نے العقد الفرید میں اس کے خطبات اور اہل تاریخ سے اس کے بہت سے خطوط نقل کئے ہیں، مگر ان کا نقل کرنا بقول علامہ شبلی کے اس لئے بے سود ہے کہ

"ناظرین میں کتنے عربی دان ہیں، اور اگر اس کا ترجمہ کر دیا جائے، تو وہ بات باقی نہیں رہتی"

ان علوم کے علاوہ مامون ایام عرب، فلسفہ، علم کلام اور علم ریاضی سے بھی خاص دلچسپی رکھتا تھا[1]

تصانیف | ابن ندیم نے مامون کے مولفات میں تین کتابوں کا تذکرہ کیا ہے،

(۱) کتاب جواب ملک البرغز، ملک برغز نے مامون سے اسلام اور توحید کے بارے میں کچھ سوالات کئے تھے، اس نے اس کتاب میں تفصیل سے ان سوالات کے جوابات دئیے ہیں،

(۲) مناقب الخلفاء یہ اس کی دوسری تصنیف ہے، اس میں اس نے خلفاء کے مناقب اور فضائل کا تذکرہ کیا ہے،

(۳) اعلام النبوۃ، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات اور خرق عادت چیزوں کا ذکر ہے،

ان کتابوں کے کہیں موجود ہونے کا کوئی علم نہیں ہے،

عبد اللہ بن معتز عباسی

مامون (متوفی ۲۱۸ھ) سے مقتدر (متوفی ۳۲۰ھ) تک ایک صدی کے اندر ۱۰-۹ خلفاء ہوئے، مگر ان میں واثق، مستعین اور معتز کے علاوہ سب علم و فضل کے اعتبار سے معمولی حیثیت رکھتے تھے، واثق، مستعین اور معتز البتہ صاحب علم تھے، اور انھیں علم و فن اور شعر و ادب سے خاص دلچسپی تھی، لیکن انھوں نے کوئی علمی یادگار نہیں چھوڑی،

---

[1] [illegible]

خانوادۂ خلافت میں مامون کے بعد عبداللہ بن معتز دوسرا شخص ہے، جو صاحب علم و فضل ہونے کے ساتھ صاحبِ تصنیف بھی تھا،

مورخین نے عبداللہ بن معتز کو سلاطینِ اسلام کی فہرست میں داخل نہیں کیا ہے، گو اس کی خلافت کی مدت چند دنوں سے زیادہ نہیں ہے لیکن بہرحال اس کی بیعت ہوئی، اور چند دنوں تک وہ تختِ خلافت پر بھی رہا،

ولادت اور نام و نسب | اس کا نام عبداللہ اور ابوالعباس کنیت تھی، مشہور خلیفہ معتز کا لڑکا تھا، ۲۴۶ھ یا ۲۴۷ھ میں پیدا ہوا،

بیعت خلافت اور معزولی | مکتفی کی نامزدگی کے مطابق ۲۹۵ھ میں اس کے چھوٹے بھائی مقتدر کی بیعت ہوئی، یہ بہت کم سن تھا، اس لئے خاندان کے دوسرے تجربہ کار اور معمر افراد اور اکثر ارکان دولت نے مخالفت کی لیکن وزیر دولت عباس بن حسن نے اپنی خود غرضی کی بنا پر اُن کے علی الرغم مقتدر کی بیعت کی رسم ادا کر دی،

بیعت کے بعد بھی عباسی خاندان کے تجربہ کار افراد اور ارکانِ دولت اس کی مخالفت کرتے رہے اور آخر کار انھوں نے مقتدر کو معزول کر کے عبداللہ بن معتز سے اس منصب کے قبول کرنے کی درخواست کی، اس نے کہا اگر بغیر کشت و خون کے لوگ مجھے خلیفہ مان لیں تو مجھے اس کے قبول کرنے میں کوئی عذر نہ ہوگا، امراء نے جب یقین دلایا کہ خون کا ایک قطرہ بھی نہ گرے گا، تو وہ راضی ہو گیا،

۲۹۶ھ میں مقتدر کے خواص کے علاوہ تمام ارکانِ دولت نے عبداللہ بن معتز کی بیعت کی، وہ منتصف باللہ، غالب باللہ، راضی باللہ یا مرتضی باللہ ملقب ہوا[۱]،

عبداللہ کی.... خلافت کو ابھی چند دن بھی نہیں گذرے تھے کہ بغیر کسی ظاہری سبب کے

[۱] ابن خلکان میں یہ تمام القاب مذکور ہیں، ج ا ص ۲۵۰،

ایسا انقلاب ہوا کہ لاچار وہ تخت خلافت چھوڑ کر روپوش ہوگیا، اور دوایک روز کے بعد گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا[۱]

علم وادب معتز صاحب علم خطیب، اور شعر وادب کا بڑا ستھرا مذاق رکھتا تھا، اس لئے عربیہ کو یہ دولت گویا ورثہ مین ملی تھی، پھر اس کو مبرد اور ثعلب جیسے نحوی اور ادیب سے فیض اٹھانے کا موقع ملا، اس لئے تھوڑے ہی روز مین خود اس کا شمار شعراء وادباء کے زمرہ مین ہونے لگا،[۲]

ابن ندیم اس کے علم وفضل کے متعلق لکھتا ہے۔

وحد دھرہ فی الادب والشعر	شعر وادب مین وحید عصر تھا،
وکان یقصد فصحاء الاعراب	بدوی فصحاء اور علمائے نحو کے
ویاخذ عنہم ویلقی العلماء من	پاس جا کر ان سے (نحو وادب
النحویین (ص ۱۶۸)	مین) استفادہ کرتا تھا،

ابن خلکان کا بیان ہے،

کان ادیبا بلیغا، شاعراً	وہ ادیب بلیغ، اور فطری شاعر
مطبوعا مقتدراً علی الشعر	تھا، شعر کہنے پر اسے پوری قدرت
قریب الماخذ سھل اللفظ	حاصل تھی، اپنے اشعار مین مانوس
جید القریحۃ حسن الابداع	اور سہل الفاظ استعمال کرتا تھا، طبیعت
للمعانی،	نہایت تیز پائی تھی نئے نئے مضامین
(جلد ۱ ص ۲۵۰)	پیدا کرنے میں اسے کمال حاصل تھا۔

شعر وشاعری شعر وشاعری سے اُسے فطری مناسبت تھی، وہ خود شاعر تھا، اور دوسرے

---

[۱] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۵۰ [۲] البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۱۰۸

شعراء کے صدہا اشعار اسے یاد تھے، ابن ندیم نے لکھا ہے، کہ مرزبانی (متوفی ۳۸۴ھ) نے مشہور شعراء کا ایک تذکرہ لکھا تھا جس میں ابن معتز کو فحول شعراء میں شمار کیا تھا، صاحب آغانی نے اس کی شاعری کے متعلق بہت تفصیل سے لکھا ہے، ایک جگہ لکھتا ہے،

وشعرہ وان کان فیہ رقۃ	اس کے اشعار میں اگرچہ شاہانہ نزاکت
الملوکیۃ وغزل الظرفاء و	اور رندانہ تغزل، اور نئے شعراء کی
ھلھلۃ المحدثین فان	لطافت موجود تھی، لیکن ان اوصاف
فیہ اشیاء کثیرۃ تجری فی	کے باوجود اس کے اشعار میں کثرت
اسلوب المجیدین ولا تقصر	سے ایسے اوصاف بھی تھے، جو اعلیٰ درجہ
عن مدی السابقین،	کے شعراء کا اسلوب ہے، اور جس میں
(آغانی ج ۹ ص ۱۴۰)	سابقین شعراء بھی پیچھے رہ گئے ہیں،

عبدالرحمن الانباری (متوفی سنہ ۵۷۷ھ) نے طبقات الادباء میں اس کی شاعری کے متعلق لکھا ہے :-

ولہ محاسن شعرہ کثیرۃ (ص ۲۹۹)	اس کے محاسن شعری بہت ہیں،

اس کے اشعار کے جو نمونے موجود ہیں، اُن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ اس کو شاعری پر بڑی قدرت تھی، اور وہ ہر صنف شاعری میں طبع آزمائی کرتا تھا، اس کے اشعار کی اصلی خصوصیت جیسا کہ ابن خلکان نے لکھا ہے، روزمرہ اور آسان الفاظ کا استعمال اور معنوی جدت طرازی ہے، چند اشعر یہ ہیں :-

فطالما ینبھنی للصبوح بھا　　فی غرۃ الفجر والعصفور لم یطر

بسا اوقات اس نے مجھ صبوحی کے لئے علی الصباح اٹھایا، جب کہ گوریا اپنے آشیانے ہی میں تھی

وجاء نی فی قمیص اللیل مستتراً یستعجل الخطو من خوف ومن حذر

وہ میرے پاس رات کے پیراہن میں چھپ کر آیا، اور رقیبوں کے خوف سے قدم جلدی جلدی ڈال رہا تھا

فقمت افرش خدی فی الطریق لہ ذلاً واسحب اذیالی علی الاثر

تیسرے شعر میں بڑی جدت طرازی ہے، شعر کا مطلب یہ ہے کہ جب محبوب میرے پاس آیا تو میں نے اس کے راستہ میں اپنے کو بچھا دیا تاکہ زمین پر اس کے پیر کا نشان نہ پڑے اور جو نشان زمین پر پڑ جاتے تھے، میں اُن کو اپنے دامن سے مٹاتا جاتا تھا، اس لئے کہ اگر پیر کے نشان باقی رہ جائیں گے تو افشاے راز کا خطرہ ہے،

وکان ما کان لست اذکرہ فظن خیراً ولا تسأل عن الخبر

اس رات جو کچھ ہوا ہوا، میں اس کا تذکرہ کرنا نہیں چاہتا، بس حسن ظن رکھو اور اس کے متعلق کچھ دریافت نہ کرو!

وکان ما کان اور فظن خیراً نے شعر میں بڑی خوبی پیدا کردی ہے۔

طوالت کے خیال سے ہم انہی چند اشعار پر اکتفا کرتے ہیں

وہ شعراء پر تنقید بھی کیا کرتا تھا، ابو العتاہیہ کے متعلق اس کی رائے تھی کہ اس کے اشعار تمام تر زاہدانہ ہوتے ہیں لیکن وہ خود ملحد تھا، محمد بن حازم کے متعلق کہتا تھا کہ اس کے اشعار قناعت و توکل کے مضامین سے پر ہیں، مگر وہ خود کتے سے بھی زیادہ حریص تھا، (ابن خلکان جلد ۱ ص ۵۵)

موسیقی | عباسی دور میں اس فن کو جو عروج حاصل ہوا، اس کا اندازہ اغانی کی ضخیم جلدوں سے ہو سکتا ہے، اکثر عباسی خلفاء اس سے ذوق رکھتے تھے، اور بعض کو فنی کمال کا درجہ حاصل تھا، صاحب اغانی اور صاحب نہایۃ الارب نے ایک خاص باب میں ان خلفاء کا ذکر کیا ہے،

عبد اللہ بن معتز کو بھی اس فن سے خاص دلچسپی تھی، اغانی میں ہے،

وکان عبد اللہ حسن العلم	عبد اللہ بن معتز فن موسیقی سے خوب
بصناعة الموسیقی والکلام	واقف تھا، اور راگون کے حقائق اور علل
علی النغم وعللها (ج ۹ ص ۱۴۲)	کا بھی اسے پورا علم تھا،

عبد اللہ بن طاہر کے لڑکے اور بنی حمدان سے اس سلسلہ مین اس سے تحریری مناظرے بھی ہوئے تھے، آخر مین اس نے ایک لمبا خط بلکہ رسالہ عبد اللہ بن عبد اللہ کے ذریعہ بنی حمدان کے پاس لکھا جس کے جواب مین عبد اللہ بن عبد اللہ نے ایک خط لکھا، اور اس کے فضل و کمال کا اعتراف کیا، اس کے الفاظ یہ ہین :-

قرأت ایدك الله الرسالة	خدا تمھاری مدد کرے، مین نے تمھارا فاضلانہ
الفاضلة البارعة الموفقة	اور باوازانہ فصیح و بلیغ اور برجستہ رسالہ
فانا والله اقرأها، الی آخرها	پڑھا، خدا کی قسم مین نے اُسے آخر تک
ثم اعود الی اولها مبتهجا	پڑھا اور پھر لطف اندوزی کے لئے
اتأمل واعود مبتهجا ...... ولا	دوبارہ پڑھا، اسی طرح بار بار پڑھتا
والله مارأیت جدا فی هزل	ہون، اور خوش اور لطف اندوز ہوتا ہون،
ولا هزلا فی جد یشبه هذا	مین نے کلام مین جد و ہزل کی ایسی
فی بلاغته وفصاحته وابادة	آمیزش نہین دیکھی جو اپنی فصاحت
برهانه وجزالة الفاظه،	و بلاغت اور برجستگی اور شوکت الفاظ
(اغانی جلد ۹ صفحہ ۱۴۲)	مین اس کے مشابہ ہو،

علم بدیع | عبد اللہ بن معتز علم بدیع کا موجد اور امام ہے، اسی نے سب سے پہلے محاسنِ کلام کے مسائل کا استقصا کرکے اس کو فن کی حیثیت سے مدون اور مرتب کیا، اور اس فن کا نام بھی بدیع رکھا،

سید صدرالدین شیرازی اپنی کتاب انوار الربیع فی انواع البدیع میں لکھتے ہیں،

اوّل من اخترعه وسماه بهذا التسمية عبد الله معتز العباسی[1]	سب سے پہلے عبد اللہ بن معتز نے اس فن کی ایجاد کی، اور اس کا نام بدیع رکھا

علم بدیع معانی و بیان ہی کی ایک فرع ہے، لیکن تدوین کے لحاظ سے فرع کو اصل پر تقدم حاصل ہے، معانی و بیان کے متعلق صاحب طراز اور دوسرے اہل فن کی تصریح ہے، کہ فنی لحاظ سے اس کے موجد اور مدوّن عبد القاہر جرجانی (متوفی ۴۷۱ھ) ہیں لیکن علم بدیع کے متعلق یہ معلوم ہے کہ اس کا پہلا موجد اور مولف عبد اللہ بن معتز (متوفی ۲۹۶ھ) ہے، چنانچہ صاحب کشف الظنون لکھتے ہیں،

كتاب البديع لابی العباس عبد الله بن معتز العباسی متوفی سنه ۲۹۶ھ وهو اول من صنف فيه وكان جملة ما جمع منها سبعة عشر نوعا (کشف الظنون علم البدیع)۔	کتاب البدیع ابو العباس عبد اللہ ابن معتز العباسی متوفی ۲۹۶ھ کی تصنیف ہے، وہ پہلا شخص ہے جس نے اس فن میں سب سے پہلے تصنیف کی ہے، پوری کتاب میں سترہ ابواب ہیں،

اسلئے عبد اللہ بن معتز کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ اُس نے اس فن کی اصل کی تدوین سے پہلے اس کی فرع کی تدوین کا کام انجام دیا، جس کی مثال تاریخ تدوین فنون میں نہیں ملتی،

تصانیف | ابن ندیم اور ابن خلکان نے اس کی گیارہ تصانیف کے نام لکھے ہیں،

(۱) کتاب الزہر (۲) کتاب البدیع (۳) کتاب مکاتبات الاخوان بالشعر (۴) کتاب الجوارح والصید (۵) کتاب السرقات (۶) کتاب اشعار الملوک (۷) کتاب الآداب (۸) کتاب حلی الاخبار

---

[1] مقدمہ انوار الربیع ص ۲،

(۹) کتاب طبقات الشعراء (۱۰) کتاب الجامع فی الغناء (۱۱) کتاب ارجوزۃ فی ذم الصبوح،
اہلِ تذکرہ نے اس کے دیوان کا ذکر نہین کیا ہے، جو یورپ مین چھپ گیا ہے، اور متعدد قلمی نسخے بھی یورپ کے مختلف کتب خانون مین موجود ہین[۱]،
ان کتابون مین جو کتابین قلمی یا مطبوعہ موجود ہین، اُن کے متعلق کچھ تفصیلی معلومات پیش کئے جاتے ہین،

کتاب الادب اس کا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم مین موجود ہے، مشہور عربی رسالہ المجمع العلمی (۱۹۳۶) نے لکھا ہے کہ اس کے متعدد نسخے یورپ کے کتب خانون مین پائے جاتے ہین اور اب وہ چھپ بھی گئی ہے، یہ کتاب سب سے پہلے ایک روسی عالم کراچکوفسکی کے ذریعہ ظہور مین آئی، اس نے بڑی عرق ریزی سے مختلف نسخون سے مقابلہ کرکے اس کی تصحیح کی، اور فرنچ مین ایک بسیط مقدمہ کے ساتھ اسے مجلہ شرقی مین جستہ جستہ شائع کیا، اس کے بعد وہ ایسالہ سے جو سوریح کے متعلقات مین ہے، کتابی شکل مین شائع ہوگئی ہے،

کتاب کے سنہ تصنیف کے متعلق خود ابن معتز نے مقدمہ مین لکھا ہے کہ

وقد الفتہ سنۃ ۲۷۴ھ واول	مین نے اُسے ۲۷۴ھ مین تصنیف کیا اور
من نقل عنی علی بن ھارون	سب سے پہلے علی بن ہارون منجم نے مجھ سے
المنجم (المجمع العلمی ۱۹۳۶ء)	اس کو نقل کیا،

اس کی ضخامت پچاس ساٹھ صفحات سے زیادہ نہین ہے، لیکن یہ کتابچہ اپنی معنویت کے اعتبار سے بڑا وزنی اور قیمتی ہے،

اس کے نام سے دھوکا ہوتا ہے کہ یہ کتاب زبان و لغت کے متعلق ہوگی، لیکن ادب و لغت سے نہین بلکہ ادب نفس

---

[۱] تاریخ ادب جرجی زیدان ج ۲ ص ۱۶۴،

یعنی اخلاق و موعظت اور حکم و مصائح سے متعلق ہے،

اس کے دیکھنے سے عبداللہ کی انشاء پردازی، اور نثر میں اس کی قدرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے،
بعض فقرے یہاں نقل کئے جاتے ہیں،

انما اهل الدنيا كصور فى صحيفة كلما نشر بعضها طوى بعضها ما الذى
ايما امر موت الغنى او حياة الفقير؟ العتاب حياة المودة، التواضع
سلم الشرف، يستحق الانسانية من حسن خلقه، كان الحاسد خلق
ليغتاظ، كما ان جلاء السيف اهون من صنعه كذالك استصلاح
الصديق اهون من اكتساب غيره من عدد نعمه لحق كو مه، من
يعمرليق فى نفسه ما يتمناه لاعدائه، علم الانسان ولد ة المخلد
الاسخياء يعبد هم المال والبخلاء يعبد ونه،

کتاب البدیع | اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ یہ فن بدیع کی پہلی کتاب ہے، اس میں کل ۱۸ ابواب ہیں، ۲۷۴ھ
کی تصنیف ہے، خود عبداللہ بن معتز نے کتاب کے مقدمہ میں ان باتوں کی تصریح کردی ہے[۱]

وما جمع قبلى فنون البديع احد	مجھ سے پہلے کسی نے اس فن کو نہ مدون
ولا سبقنى الى تاليفه مؤلف	کیا، اور نہ کسی مؤلف نے مجھ سے پہلے
الفته فى سنة اربع وسبعين	اس فن پر کوئی تصنیف چھوڑی ہیں نے
ومائتين	اسے ۲۷۴ھ میں تصنیف کیا،

صاحب کشف الظنون نے کتاب الآداب کا سنہ تصنیف بھی ۲۷۴ھ ہی لکھا ہے، ہو سکتا
ہو کہ اسی سال ایک کتاب کا آغاز اور ایک کا اختتام ہوا ہو،

مقدمہ کتاب میں اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ میں نے محاسن کلام کے جو اقسام و انواع

[۱] مقدمہ الکتاب البدیع ص ۲،

مرتب کئے ہین، اگر کوئی شخص ان ہی پر اکتفا کرنا چاہے، تو اس کے لئے یہ کافی ہین لیکن اگر کوئی اس مین کچھ اضافہ کرے یا میری راے سے اختلاف کرے، تو اس کو اس کا اختیار ہے[۱]

اسکوریال کے کتب خانہ مین اس کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے، (تاریخ ادب ج ۲ ص ۱۹۳)

طبقات الشعراء | ابن ندیم اور ابن خلکان نے کتاب طبقات الشعراء کے نام سے اس کا ذکر کیا ہے، لیکن اسکوریال کے کتب خانہ مین اس کا قلمی نسخہ موجود ہے، اس پر کتاب کا نام کتاب مختصر طبقات الشعراء لکھا ہوا ہے[۲]

کتاب اشعار الملوک | مستشرق اہلوارٹ کے کتب خانہ مین اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے[۳]

دیوان | عبداللہ بن معتز کے دیوان کے متعدد قلمی نسخے پیرس و قاہرہ کے کتب خانون مین موجود ہین،

دیوان صنف شاعری کے اعتبار سے علحدہ علحدہ ابواب مین حروف تہجی کی ترتیب سے مرتب کیا گیا ہے، اس دیوان کا راوی محمد بن یحییٰ الصولی ہے، ۱۸۹۱ء مین مصر کے شاہی مطبع مین طبع ہوا، پھر مطبع انیسیہ بیروت نے ۱۹۱۲ عیسوی مین دوبارہ اسے اپنے مطبع سے شائع کیا،

اس دیوان کے علاوہ برلن اور غوطہ کے کتب خانون مین اس کے کچھ قصائد کا بھی سراغ ملتا ہے، لیکن وہ اب تک منظر عام پر نہین آئے ہین۔

جن کتابون کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، اُن کے علاوہ پیرس کے کتب خانہ مین کتاب الشراب کے نام سے اور برلن کے کتب خانہ مین کتاب التماثیل فی تباشیر السرور کے نام سے دو قلمی کتابین ملتی ہین، جن پر مصنف کی جگہ عبداللہ بن معتز کا نام ہے[۴] لیکن قدیم مورخین مین سے کسی نے

---

[۱] مقدمہ انوار الربیع ص ۲، [۲] تاریخ ادب جرجی زیدان ج ۲ ص ۱۹۳، [۳] ایضاً، [۴] ایضاً،

بھی عبداللہ کی تصنیفات میں ان کتابوں کا ذکر نہیں کیا ہے، اس لئے عبداللہ بن معتز کی طرف ان کتابوں کی نسبت مشتبہ ہے،

ارجوزہ | اوپر ابن خلکان وغیرہ کے حوالہ سے "ارجوزہ فی ذم الصبوح" کے نام سے ایک کتاب کا ذکر آچکا ہے، صاحب معجم المطبوعات نے اس کی ایک کتاب ارجوزۃ فی تاریخ المعتضد باللہ کا ذکر بھی کیا ہے، جو ۱۹۱۱ء میں مطبع الجمالیہ میں طبع ہوگئی ہے، نام سے قیاس ہوتا ہے کہ خلیفہ معتضد عباسی کے دورِ حکومت کے واقعات اور اس کے ذاتی حالات پر مشتمل ہوگی،

تاریخ صقلیہ اوّل

اس میں صقلیہ کے جغرافی حالات، سلی (سسلی) جزائر سسلی پر اسلامی حملوں کی ابتدا، اسلامی حکومت کا قیام عہد بعہد کے دوروں کا عروج اور مسلمانوں کے مصائب اور جلاوطنی کا مرقع دکھایا گیا ہے، قیمت صہ

تاریخ صقلیہ دوم

یہ سسلی کے اسلامی عہد کا تمدنی مرقع ہے، اس میں مختلف علوم، قرآن، حدیث، فقہ، تصوف، تاریخ، کلام، مناظرہ، شعر و شاعری، علوم عقلیات، ریاضیات و طبیعیات کا تذکرہ ایک ایک فصل میں ہے، اور انہی میں مفسرین، محدثین، فقہا، صوفیہ، متکلمین، ادبا اور شعرا کے مفصل سوانح حیات ان کی تصنیفات اور کلام نثر و نظم کا ذکر ہے، آخری باب سسلی کے اسلامی تمدن سے یورپ کے استفادہ کے متعلق ہے، قیمت صہ

اردو زبان کی بناوٹ میں افغانوں کا حصہ

از

جناب مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی

(۲)

۸۳۔ "شرمول" پشتو میں شرمندہ کرنے کو کہتے ہیں، اور "شرمولے" کے معنی ہیں شرمندہ کیا ہوا، ہمارے یہاں شرمندگی کو "شرمول" اور "شرمولی" بولتے ہیں،

۸۴۔ "شرنگ" پشتو میں جھانجن اور پازیب جیسے زیور کی آواز کو کہتے ہیں، روہیلکھنڈ میں یہ "شرنگ" ہوگیا ہے، اور اگر کوئی عورت کڑے کو کڑے سے بجاتی چلے تو کہا جاتا ہے کہ "شرنگ شرنگ کرتی آرہی ہے"

۸۵۔ ایسے کام کو جو کبھی سنا نہ گیا ہو، پشتو میں "شندہ" کہتے ہیں، یہاں بھی لوگ انوکھے کام کو کہتے ہیں "میاں عجب شندہ ہے" یا کیوں جی یہ کیا شندہ کیا؟

۸۶۔ پشتو ہی کا ایک اور لفظ "شہر" ہے جس کے معنی ناکردنی کام کے ہیں، کسی سے اگر ایسا کام سرزد ہو جائے اور لوگوں میں عام بدنامی ہو جائے تو کہا جاتا ہے کہ "فلاں بڑا شہرہ شرمندہ ہوا" اس محاورہ کا لفظ شہر اوپر پشتو شہر ہی

۸۷۔ "شیبہ" بیای مجہول، پشتو میں تیز بارش کو کہتے ہیں، رامپور میں عورتیں کہا کرتی ہیں "شبوں مینھ پڑا"

۸۸۔ تیز بخار کو پشتو میں "شبرہ" کہتے ہیں، روہیلکھنڈ میں بھی یہ لفظ عام تھا، مگر اب اس کا رواج کم ہوتا جاتا ہے،

۸۹۔ "غاؤ" پشتو میں شور کو کہتے ہیں، رامپور میں ننھا بچہ جو آوازیں نکالتا ہے اسے "غاؤ غاؤ" یا "غاؤ غاؤ" کرنا کہتے ہیں،

۹۰۔ "غٹ" اور "غٹہ" پشتو میں بڑے کو کہتے ہیں، روہیلکھنڈ میں بڑی جوں "غٹہ" کہلاتی ہے[۱]،

---

[۱] آغا حیدر حسن صاحب پروفیسر نظام کالج حیدرآباد فرماتے ہیں کہ عام اردو میں موٹی جوں کو غٹا کہتے ہیں،

۹۱۔ "غنے" پشتو میں مجموعے کا مترادف ہے، اور مجموعۂ امراض شخص کو "آزار غنے" کہتے ہیں، یہ مرکب لفظ رامپور میں بھی مروج ہے،

۹۲۔ "غرہ انگہ" پشتو میں بلند آواز کہلاتی ہے، یہ فارسی لفظ "غرنگ" کا ہمقوم ہے جس کے معنی ہیں وہ آواز جو روتے وقت گلے سے نکلتی ہے، روہیلکھنڈ میں "غرہ نگہ" بولتے ہیں،

۹۳۔ "غرنب" فارسی میں غرفے اور "غرہ نب" پشتو میں گرج اور شور کو کہتے ہیں، روہیلکھنڈ میں اس سے مراد پانی کی وہ آواز ہوتی ہے، جو کسی بھاری چیز کے کنویں تالاب یا کسی ندی میں گرنے سے پیدا ہوتی ہے،

۹۴۔ "غلبلہ" پشتو میں ملک کی بدگلی یا غدر کو کہا جاتا ہے، روہیلکھنڈ میں اس سے ایک مصدر "غلبلانا" بنالیا ہے، اور ایک یا بہت سے آدمی شور و شر مچاکر کسی کو گھبرالیں، اور وہ اس گھبراہٹ میں ان کے حسب منشا کام کرلے تو کہا جاتا ہے کہ "وہ بیچارہ کیا کرتا، سب نے مل کر اسے غلبلا لیا"[1]

۹۵۔ غدود، رسولی یا سخت ورم کو افغانستان میں "غمبہ" کہتے ہیں، ہمارے یہاں کسی کے پیٹ میں ریاح بھرے ہوں جس کے باعث انتوں میں سختی کا احساس ہو رہا ہو تو کہا جاتا ہے کہ "آج پیٹ غم سا یا غم ہے"

۹۶۔ "غنڈارے" بھی پشتو میں ایک قسم کی رسولی کہلاتی ہے، جو عموماً گردن کے پچھلے حصہ پر نکلتی اور باعث ہلاکت ہو جاتی ہے، روہیلکھنڈ میں کسی کے پھوڑے پھنسیاں نکلیں اور ان کے ساتھ ورم بھی ہو جائے تو کہتے ہیں "غنڈارے اٹک رہے ہیں" عورتیں کوستی ہیں تو کہتی ہیں "زبان میں غنڈارہ نکلے"

۹۷۔ گرہ یا عقدے کو پشتو میں "غوٹہ" (بواؤ معروف) کہتے ہیں، ہمارے یہاں افیون کی بڑی گولی کو افیون کا غوٹہ (بواؤ مجہول) کہتے ہیں،

---

[1] آغا حیدر حسن صاحب کا ارشاد ہے کہ غلبلانا قدیم دکھنی میں بھی مستعمل ہے،

۹۸۔ پشتو کا ایک اور لفظ ہے "غوٹہ" بواو مجہول، اس کے معنی ہیں بے ہوشی، پشتو زبان والوں نے اسے مخفف کرکے "غشہ" بنالیا ہے، اور مرض کی سختی سے کوئی بے ہوش ہو جائے تو "غشہ پڑ گیا" کہا جاتا ہے،

۹۹۔ "قارے دریاب، قہرے دریاب، قالی دریاب" یہ تین لفظ پشتو میں سمندر کیلئے استعمال ہوتے ہیں، روہیل کھنڈ میں "قار دریاب" سے پانی کی زیادتی کو ظاہر کیا جاتا ہے،

۱۰۰۔ "قاشوقہ" اور "قاشوغہ" چمچے کو کہتے ہیں، یہ ترکی "قاشق" سے بنا ہے، میرے بچپن تک روہیلکھنڈ کے شہروں میں بھی اور دیہات میں ابتک "قشوقہ" اس چمچے کو خاص طور پر کہا جاتا تھا جو چینی کا بنا ہوتا تھا اور آگے سے چوڑا اور ڈنڈی شاما چڑیا کی دم کی طرح اوپر کو اٹھی ہوا کرتی تھی، جب اسکا چلن نہ رہا، تو دوسری وضع کے چمچے کو بھی قشوقہ ہی کہنے لگے، اب شہروں میں عام طور پر چمچہ بولتے ہیں،

۱۰۱۔ "قچر" اور "خچر" پشتو میں خچر کو کہتے ہیں، روہیل کھنڈ میں مخلوط النسب کو "قچر خیل" اور "خچر خیل" کہا جاتا ہے،

۱۰۲۔ "قلار قلار" کے معنی پشتو میں "آہستہ آہستہ" یا سکون کے ساتھ ہیں، یہ عربی لفظ "قرار" کا بگاڑ ہے، ہمارے علاقہ میں کہا جاتا ہے "یہ بچہ بڑا قلار ہے" یعنی پرسکون ہے، اور "قلار قلار دیکھ رہا ہے" یعنی نرمی، آہستگی یا محبت طلب نظروں سے دیکھ رہا ہے،

۱۰۳۔ "قصاب" کو پشتو میں "قصاب" کہتے ہیں، ہم لوگ "بڑ قصاب" کو "بکر قصاب" اسی پشتو کے اثر کے تحت بولتے ہیں[۵]،

---

[۵] ایلیٹ کی کتاب "ہندوستان کے شمال مغربی صوبوں کی اقوام کی تاریخ کہانیوں اور پھیلاؤ پر یادداشتیں" ج ۱۹۱ ص ۳۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ الہ آباد، دہلی، بریلی اور بنارس میں گائے کا گوشت فروخت کرنیوالے بکر قصاب کہلاتے ہیں، جو اصل میں بقر یعنی گائے سے مرکب ہے، جبکہ ہمارے یہاں کا بکر قصاب بکری کے مخفف اور قصاب کی ترکیب سے بنا ہے،

۱۰۴۔ "قیزہ" پشتو میں ایک قسم کی لگام کہلاتی ہے جسے انگریزی میں Watering bridle کہتے ہیں، رامپور میں اسے قیزہ اور قیزئی بولتے ہیں،

۱۰۵۔ "کاچو" پشتو میں چاکو کی مقلوبی شکل ہے، اور چاکو خود بھی پشتو ہی میں چاقو سے بنا ہے، روہیلکھنڈ میں چاکو کو "چکو" کرلیا ہے،

۱۰۶۔ "کاواک" پشتو میں بیکار اور خالی کو کہتے ہیں، رامپور میں بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے، اور لوگ کہتے ہیں، "کاواک بیٹھا ہے" یا "کاواک پھر رہا ہے" یا "آجکل دل کاواک سا ہے" ان مواقع سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں بیکاری کے التزامی معنی، گھبراہٹ، اچاٹ پن اور پریشانی مراد لی جاتی ہے،

۱۰۷۔ "کرے" پشتو میں کتے کے بھگانے کی آواز ہے، روہیل کھنڈ میں بھی یہی دھتکار مستعمل ہے ایک لفظ اور بھی بولا جاتا ہے "کوُر کوُر" یہ کتے کے پلے کو بلانے کیلئے وضع ہوا ہے، میری رائے میں یہ بھی اسی لفظ کے پیش نظر روہیلکھنڈیوں نے بنایا ہے،

۱۰۸۔ "کرۂ وڑۂ" پشتو میں شان وشوکت، سجاوٹ اور زیبائی کہلاتی ہے، رامپور میں ننھا بچہ کھڑا ہونے کی کوشش کرتا ہے تو اس کا دل بڑھانے کیلئے ماں وغیرہ کہتی ہے "میرا بچہ کھڑا بڑا" کبھی کبھی "کھڑے سے بڑا" بھی بولا جاتا ہے، یہ بہت افراط اور کہیں سننے میں نہیں آئی، نہ کسی لغت میں اس کا مذکور ہوا ہے، اس سے میں خیال کرتا ہوں کہ "کھڑا بڑا" اسی پشتو "کرہ وڑہ" سے بنا ہے،

۱۰۹۔ جو روٹی کوئلوں پر پکائی جائے اسے پشتو میں "گگوڑے" یا او جھول کہتے ہیں، روہیل کھنڈ میں روٹی جل جائے تو کہا جاتا ہے کہ جل کے گگوڑا ہوگئی"

حاسد کو ہمارے یہاں "جل گگڑا" کہتے ہیں، یہ بھی اسی سے بنا معلوم ہوتا ہے،

۱۱۰۔ "نگلمہ" پشتو میں آنت کہلاتی ہے، رامپور میں نسائیت جس لڑکے میں پائی جاتی ہے اسے

دوسرے لڑکے "آدی" تیرے گلے میں سوئی "کہکر چھیڑتے ہیں،

(۱۱) "کنڈوئے" پشتو میں "کونڈی" کو کہتے ہیں، اس میں تغیر کرکے روہیلکھنڈ میں کنڈیلی اور کنڈیلیا

یا ہے،

(۱۲) "کوٹک" بواو مجہول افغانستان میں سر کے پچھلے حصہ کو کہتے ہیں، ہمارے یہاں کسی کا ماتھا ابھرا

دکھا جاتا ہے کہ "کوٹک نکلا ہوا ہے" غالباً پہلے "کوٹک سا نکلا ہوا ہے" کہتے ہونگے، رفتہ رفتہ "سا" گر گیا ہو،

(۱۳) رامپوری مستورات کا ایک کوسنا ہے "کوٹہ کریاب رہ جائے" کبھی از راہ تحقیر کہا کرتی ہیں،

ہے کیسی کوٹہ کریاب "کوئی لڑکی کنواری بیٹھی ہو تو اسے بھی کہتی ہیں کہ "کوٹہ کریاب بیٹھی ہے" یہ بھی پشتو

ظ ہیں،

"کوٹہ" پشتو میں بازاری کتا اور "کریاب" مردود یا راندہ کہلاتا ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ اصل لفظ

وٹ کریاب" ہو، "کوٹ" گدھیا کو کہتے ہیں، اور "کریاب" کے معنی ہیں تھکی ماندی، یا بے یار و مددگار،

(۱۴) "کوخچی" روہیلکھنڈ میں بالوں کی پتلی پتلی گندھی ہوئی لٹ کہلاتی ہے، یہ پشتو کے ایک لفظ "کوخچی"

کے حرف "خ" کو "چ" سے بدل کر بنایا ہے۔

(۱۵) "کونسہ" پشتو میں بنیاد کو کہتے ہیں، اور "کونسہ دِ دخیزہ" افغانی کوسنا ہے یعنی تیرا ستیاناس

جائے، رامپور میں "کنسہ نکل گیا" بولتے ہیں، اور مراد تباہی و بربادی ہوتی ہے،

(۱۶) ہمارے یہاں کی عورتیں اپنی مصیبت یا دکھ کی شدت ظاہر کرتے ہوئے کہا کرتی ہیں،

میرا تو اس غم میں گوگل لگ گیا" یہ "گوگل" بھی پشتو ہے اور چھاتی یا سینے کا مترادف ہے،

(۱۷) روہیلکھنڈ میں گھیر پٹھانوں کے نام زیادہ تر ہوتے ہیں، مثلاً صید خاں کا گھیر مراد آباد میں اور

سیف الدین خاں کا گھیر رامپور میں مشہور ہیں، دستور یہ تھا کہ ایک سردار اپنے عزیز اقربا اور نوکر چاکر

وغیرہ کیلئے ایک حصۂ زمین مخصوص کرکے صدر میں اپنے محلات اور آس پاس متعلقین کے مکان بنواتا تھا اور

قریب ہی بھنگی، بہشتی، تیلی، تنبولی، دھنئے اور نائی وغیرہ کو بسا تا تھا جو بروقت ان سرداروں اور دوسرے اہلِ محلہ کی خدمت کیا کرتے تھے، سردار کے مکان کے سامنے ایک قطعۂ زمین چھوڑا جاتا تھا، اس محلے کو دوسرے شہری اس سردار کا گھیر کہکر پتہ دیا کرتے تھے،

پشتو میں اس وضع کی آبادی کو "گیر" کہا جاتا ہے، جب یہ لفظ روہیلکھنڈ میں وارد ہوا، تو لوگوں نے اسے ہندی شکل "گھیر" سے بدل لیا، اگر محلے کیلئے گھیر ہندی میں بھی بولا جاتا ہوتا، تو ہندوستان میں ہر جگہ محلوں کے نام کا جزء نظر آتا، حالانکہ خود روہیلکھنڈ میں بھی کسی ہندو کا گھیر نہیں پایا جاتا،

۱۱۸۔ پشتو میں تاہم، اتبک، ورنہ، یقیناً وغیرہ کی جگہ "لا" بولتے ہیں، رامپور میں بھی جاہل کہا کرتے ہیں "لا میں نے اس سے یہ بھی کہا کہ سب تمھارے منتظر ہیں، مگر اس نے ذرا پروا نہ کی" اس "لا" میں "بلکہ" کا مفہوم زیادہ پایا جاتا ہے،

۱۱۹۔ "لاوارثہ" پشتو میں بے یار و مددگار عورت کو کہتے ہیں، روہیلکھنڈ میں بھی عورتیں کہتی ہیں "خدا مجھ سی لاوارثہ کسی کو نہ کرے"،

۱۲۰۔ "لالے" پشتو میں پیار سے بچے کو کہا جاتا ہے، رامپور اور بریلی وغیرہ میں "لالا" کہتے ہیں، میرے چچا استاد سہراب خاں کو ان کے بڑے اب تک "لالا" کہتے ہیں، حالانکہ وہ خود پوتی پوتا والے ہو چکے ہیں[۵]،

۱۲۱۔ "لر" پشتو میں نیچا اور "بر" اونچا کا ہم معنی ہے، "لر بر کتل" چاروں طرف دیکھنا یا دیدے

---

[۵] جناب اعجاز حسین صاحب ضامن فرماتے ہیں کہ بمبئی میں پشاوریوں کو لالہ کہکر پکارا جاتا ہے، ممکن ہے کہ کوئی صاحب اسے جنیوں والا لقب خیال کریں کیونکہ اکثر افغانی سود کا کام کیا کرتے ہیں، جو ہندوستان میں لالہ لوگوں ہی کا خاص پیشہ ہے، مگر میں اس خیال کو درست نہیں مانتا جو لوگ افغانیوں کے مزاج سے واقف ہیں، وہ میری اس رائے سے موافقت کریں گے کہ افغانی سے یہ کبھی برداشت نہ ہو سکے گا کہ اسے اس لقب کے ساتھ پکارا جائے جو اس کی نظر میں غیر مسلم کے ساتھ مخصوص ہو، وہ اجرا نے اگر ہنسی خوشی "لالہ" کہلوا لیتا ہے تو اسکی وجہ یہ ہے کہ "لالہ" کو ہی پشتو کا پیار کا لقب ہے، جس سے اسکے کان ہمیشہ کے آشنا ہیں،

دکا تا کہلاتا ہے، ہمارے یہاں شوخ و شنگ لڑکی کو "لربر دیدہ" کہتے ہیں، اور کوئی لڑکی یا لڑکا ڈھیٹھ پن سے آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر بڑوں سے بات کرتا ہو تو کہا جاتا ہے کہ "اس کا تو دیدہ لربر نہیں ہوتا" یا یہ لڑکی تو لربر نہیں ہوتی،

۱۴۲۔ لرزہ کو پشتو میں "لڑزہ" بھی بولتے ہیں، اسی طرح درد اور مرد کی "ر" بھی "ڑ" سے بدل جاتی ہے، رامپور میں بھی ان تینوں لفظوں کو پشتو کے لہجے کے مطابق بولا کرتے تھے، اب صرف ان پڑھوں کی زبان پر آجاتے ہیں،

۱۴۳۔ "تشماتی" پشتو میں چالاک عورت کو کہتے ہیں، یہ اردو میں پشتو کے ایک اور استعمال ہونیوالے لفظ "شتّاہ" کا مترادف ہے، رامپور میں بھی اس کا چلن ہے، مگر شتّاہ سے کم،

۱۴۴۔ رامپور کی مستورات "دربدر" کی جگہ "لوڑ بہ لوڑ" کہا کرتی ہیں، یہ بھی پشتو ترکیب ہے، "لوڑ" بواو مجہول پشتو میں طرف، جہت یا سمت کہلاتی ہے،

۱۴۵۔ "مٹاکہ" پشتو میں اس ورم کو کہتے ہیں، جو کسی زہریلے جانور کے کاٹنے سے پیدا ہو جاتا ہے، رامپور میں کسی وجہ سے بھی موٹے موٹے ددوڑے پڑ جائیں تو انھیں "مٹاکہ" کہتے ہیں،

۱۴۶۔ "مشادہ" پشتو میں بدشکل یا بدمزاج عورت کہلاتی ہے، روہیلکھنڈ میں بھی اس کا چلن ہے، اور عورتیں کہا کرتی ہیں، "ہے کیسی مشادہ" یا "جب دیکھو مشادہ سی کھڑی ہے"

۱۴۷۔ "ماس پیشین، ماز دِگر، ماسُ خفتن" ظہر، عصر اور عشا کی نماز کو پہلے بڑے بوڑھے بولا کرتے تھے، اب یہ لفظ سننے میں نہیں آتے لیکن ایک محاورہ ابھی تک مستورات کے زبان زد ہے، یعنی "وہ پہلی ماخام کی ہریان ہے" یا کسی کنواری لڑکی کو کوستے ہوئے کہتی ہیں "تو پہلی ماخام کی ہریان رہ جائے" یہ "ماخام" بھی پشتو ہے اور نمازِ شام سے بنا ہے، اس سے مغرب کا وقت اور نماز دونوں مراد ہوا کرتے ہیں، مگر ان محاوروں میں شادی کی پہلی رات مراد ہے،

۱۲۸۔ "تاہنرہ" اور "تاپڑ" پشتو میں موٹے اور بھدے اعضا والے کو کہتے ہیں، رامپور اور روہیلکھنڈ کے دوسرے حصوں میں آخری شکل مروج ہے،

۱۲۹۔ "میرات" بیائے معروف پشتو میں لاولد کو کہتے ہیں، رامپور میں "مراتی" اور "مراتن" ترحم اور خفگی دونوں حالتوں میں بولے جاتے ہیں، زنانہ بول چال ہے، "ٹھہر تو مراتی، ابھی تیری خبر لیتی ہوں" یا "وہ مراتن کیا جانتی تھی کہ ذرا دیر میں شوہر آنکھ پھیر لے گا"

اسی لفظ سے ذرا تخفیف کرکے "مرات ہونا" محاورہ بنالیا ہے، اور کہا جاتا ہے "سارا گھر مرات ہوگیا" یعنی تباہ و برباد ہوگیا، عورتوں کا ایک کوسنا بھی ہے، "تو مرات ہوجائے" یا "تجھے مرات کرکے رکھدوں" یا "کر ڈالوں"۔

۱۳۰۔ لفظ "نا" کے مرکبات "ناحقی، ناحقی کرنا، نامردہ" بھی پشتو ہی سے آئے ہیں، آخری لفظ کے متعلق اتنا اظہار ضروری ہے کہ افغانستان میں یہ مونث کیلئے بولا جاتا ہے، ہمارے یہاں ہائے مختفی پر ختم ہونیوالے پشتو کے دوسرے لفظوں کی طرح مذکر کیلئے استعمال ہونے لگا ہے،

۱۳۱۔ انوکھی یا نادر چیز کو پشتو میں "نادیات" کہا جاتا ہے، رامپوری مستورات کہا کرتی ہیں "یہ لڑکی ہے کیسی نادیات" یا "فلاں چیز ایسی نادیات تو نہیں کہ کہیں ملے گی ہی نہیں"

۱۳۲۔ "نغارہ" پشتو میں نقارے کو کہتے ہیں، روہیلکھنڈ میں بھی اس کا رواج ہے، بلکہ بعضے نغارا بھی بولتے ہیں، اب کا پتہ نہیں لیکن تیس برس ادھر تک جبکہ میں مکتب میں پڑھا کرتا تھا، بچے آپس میں کہا کرتے تھے "الف بے تے ثے نغارہ، دن چڑھتے گیدڑ مارا"

۱۳۳۔ "تنگ یالا" اور "تنگ یالی" روہیلکھنڈ میں علی الترتیب تنگ و شرم والے مرد اور عورت کو کہتے ہیں، یہ پشتو کے "تنگ یالے" اور "تنگ یالئی" کی شکلیں ہیں، (باقی)

وفیات

سید حسین کی موت

۲۵ فروری ۱۹۴۹ء کی رات کو ۹ بجے ریڈیو نے خبر سنائی کہ ہندوستانی سفیر متعین مصر سید حسین نے وفات پائی، دوسرے دن شاہانہ تزک و احتشام سے سرکاری طور سے اُن کی تدفین عمل میں آئی جنازہ میں شاہ فاروق نے شرکت کی، اور بعض علمائے ازہر نے اُن کی نماز جنازہ پڑھائی،

شاید لوگوں کو یاد ہو کہ ۱۹۲۰ء میں ہندوستان سے مجلس خلافت کا جو وفد یورپ بھیجا گیا تھا، اس کے ابتدائی ممبر تین تھے، محمد علی مرحوم سید حسین اور سید سلیمان ندوی اور اس کے بعد شیخ مشیر حسین قدوائی، اور ابو القاسم (بنگال کے نامور لیڈر) بھی شامل ہو گئے، افسوس کہ اس وقت راقم کے سوا سب ہی جنت کو سدھارے۔ اس وفد کے سکریٹری حسن محمد حیات صاحب تھے، جو بحمد اللہ اس وقت بھی بقید حیات ہیں، اور یہیں بھوپال میں اعلیٰ حضرت فرمانروائے بھوپال کے سکریٹری ہیں، سید حسین کی موت کی خبر سنتے ہی میں نے حیات صاحب کو فون کیا، وہ بھی خبر سن چکے تھے، کچھ دیر تک مرحوم کی وفات پر ہم دونوں افسوس کرتے رہے،

وہ اس وقت گو جوان نہ تھے، ۶۲ برس کی عمر تھی، مگر چہرہ مہرہ اور بالوں کی سیاہی سے اب تک جوان بنے تھے، اُن کی موت دل کی حرکت بند ہونے سے ہوئی، مصر سے تازہ آنے والوں نے کہا اُن کی صحت اخیر دنوں میں اس حد تک گر چکی تھی کہ ان کا کسی وقت بھی ہمیشہ کیلئے آنکھیں بند کر لینا تعجب خیز نہ تھا،

مرحوم بہار و بنگال کے ایک ممتاز سادات کے گھرانے میں ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے تھے، وہ اُردو کے مشہور ظریف

انشاپرداز سید محمد آزاد کے چھوٹے بیٹے تھے، سید محمد مرحوم اس زمانہ میں جب بہار و بنگال ایک تھے، اعلیٰ سرکاری عہدوں پر ممتاز تھے، ان کے ظریفانہ مضامین اودھ پنچ لکھنؤ اور پنچ پٹنہ میں چھپتے تھے، اور بعد کو ان کے مضامین الگ بھی چھپے، اپنے زمانہ کے مشہور ادیبوں میں ان کا شمار تھا،

سید حسین نے ابتدائی تعلیم کے بعد انگلستان کی راہ لی، شعر و سخن اور ادب و انشار کی گودوں میں انھوں نے پرورش پائی تھی، گو وہ انگریزی کے ادیب و انشاپرداز تھے لیکن اردو شعر و ادب میں بھی ان کو خاصہ ملکہ تھا، اور جس روانی سے انگریزی میں تقریر کرتے تھے، اردو میں بھی کرتے تھے، بڑے زندہ دل، ہنس مکھ اور باغ و بہار تھے،

انگلستان میں جاکر انھوں نے اخبار نویسی سیکھی اور ۱۹۱۴ء والی بڑی لڑائی کے بعد جب ہندوستان میں سیاسی بیداری کا طوفان اٹھا وہ ہندوستان آئے، اور پہلے مسٹر ہارنی من کی نگرانی میں بمبئی کرانیکل کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں داخل ہوئے، اور اس کے بعد ۱۹۱۸ء میں جب موتی لال جی نہرو آنجہانی نے الہ آباد سے انڈپنڈنٹ نکالا تو اس کی اڈیٹری کے لئے اسی نوجوان صاحب قلم کا انتخاب کیا، اور ان کو خود اپنے پاس رکھا، انڈپنڈنٹ کی شہرت کے ساتھ ساتھ سید حسین نے بھی شہرت حاصل کی، ان کو میں نے اسی زمانہ میں بعض قومی سیاسی جلسوں میں دیکھا، گورا رنگ، چھریرا بدن، بہترین انگریزی سوٹ میں ملبوس، اور یہی اخیر تک ان کا فیشن رہا، اسی زمانہ میں جلسوں میں ان کی طرف نگاہیں اور انگلیاں اٹھتی تھیں،

یہ وہ وقت تھا کہ کانگریس اور خلافت کے اتحاد سے ملک میں سیاسی بیداری کا سیلاب برابر بڑھتا جارہا تھا، اور آخر شکست خوردہ ترکی کے حصے بخرے کرنے کی تجویزیں فاتح اتحادیوں میں پیش تھیں کہ دسمبر ۱۹۱۹ء میں مجلس خلافت کے اس اجلاس میں جو کانگریس کے ساتھ امرتسر میں ہوا تھا اور جس میں علی برادران نظربندی سے رہا ہوکر پہلی بار شریک ہوئے تھے، یہ طے ہوا کہ محمد علی کی قیادت میں سید حسین اور سید سلیمان ندوی کا وفد انگلستان اور یورپ کے دوسرے دارالحکومتوں میں اس غرض سے بھیجا جائے تاکہ وہ مسلمانوں کا اور ہندوستان کا نقطۂ نظر پیش کرے، محمد علی مسلمانوں کے، اور سید حسین ہندوستان کے اور سید سلیمان علمائے

کے نقطۂ نظر کو پیش کریں، اس کے علاوہ گاندھی جی نے سید حسین کو اپنے نوٹ بھی لکھوا دئے تھے کہ وہ ان کو وزرائے برطانیہ کے سامنے اپنی طرف سے پیش کریں جن میں ہندوستان کے نقطۂ نظر سے مسئلہ خلافت کی توضیح تھی، چنانچہ سید حسین نے انگلستان کے جلسوں اور وزیروں کی ملاقاتوں میں اسی حیثیت سے اپنے فرض کو انجام دیا۔

۳۱ جنوری ۱۹۲۰ء پہلا دن تھا جب وفد خلافت کی یہ مختصر سی جماعت ہنگریا جہاز سے یورپ کو روانہ ہو رہی تھی، اسی تاریخ کی شام کو سید حسین سے میری پہلی ملاقات ہوئی، سفر کا پہلا یا دوسرا دن تھا کہ شام کو محمد علی اور سید حسین میں انگریزی کی ایک ضرب المثل پر جو حقیقت میں ہابیل و قابیل کے سلسلہ میں توراۃ کا ایک فقرہ ہے کہ "میں اپنے بھائی کا رکھوالا نہیں ہوں" مناظرہ چھڑ گیا، سید حسین اس کی تائید اور محمد علی اس کی مخالفت کر رہے تھے، یہ حقیقت میں ان دونوں کی زندگیوں کے اصول اور عقیدہ کا اختلاف تھا، محمد علی قومی مسلمان سے مذہبی مسلمان بن چکے تھے جن کے نزدیک ہر مسلمان کا فرض تھا کہ وہ دوسرے مسلمان کو غلطی سے روکے، اور سید حسین ابھی اس منزل سے پیچھے تھے، ان کے نزدیک شخصی آزادی اسی میں تھی کہ کسے را با کسے کارے نہ باشد، یہ مناظرہ بڑے جوش و خروش سے فریقین میں جاری رہا اور بڑی مشکل سے اس کو روکا جا سکا۔

محمد علی اور سید حسین دونوں ہی لائق اور قابل تھے، اور دونوں ہی اپنی جگہ اٹل اصول اور عمل رکھتے تھے، اس لئے ان دونوں شیروں کو تھپک تھپک رکھنا بڑا مشکل تھا، یہ کام اس کو کرنا پڑتا تھا جو دونوں کے بیچ میں واو عطف کی طرح تھا، در واقعہ یہ کہ دونوں کو غصہ جلد آجاتا تھا، تاہم کام کی اہمیت کا خیال کر کے دونوں نے جس طرح بنا آٹھ مہینے کی مدت کو خیر خوبی کے ساتھ نباہا،

وفد خلافت ستمبر ۱۹۲۰ء میں یورپ میں اپنا کام ختم کر کے امریکہ جانے کا خیال کر رہا تھا کہ ہندوستان کے حالات نے اس کو ہندوستان لوٹنے پر مجبور کیا، اور تنہا سید حسین نے امریکہ جانے کا ارادہ کیا، چنانچہ ادھر وفد ہندوستان واپس ہوا اور ادھر سید حسین نے امریکہ کی راہ لی، امریکہ پہنچ کر انھوں نے ہندوستان

کی بڑی خدمت کی، اور امریکہ میں اپنی تقریر و تحریر سے انگریزوں کے پروپگنڈے کا جواب دیتے رہتے اور ہندوستان کی بھلائی کا کام کرتے رہے، امریکہ سے "نوائے وطن" کے نام سے ایک اردو کا اخبار بھی نکالا، اور اس سلسلہ میں ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۶ء تک گویا چوتھائی صدی امریکہ میں رہکر اپنی زبان اور قلم سے ہندوستان کی خدمت میں مصروف رہے، اس درمیان میں دس بارہ برس ہوئے وہ چند ماہ کیلئے ہندوستان آئے تھے، ہندوستانی یونیورسٹیوں نے ان کی خاص طور سے قدر کی تھی اور لاہور سے لیکن تک اکثر یونیورسٹیوں کی دعوت پر انھوں نے تقریریں کیں، پھر وہ امریکہ واپس چلے گئے، اور اخیر دفعہ وہ ۱۹۴۶ء میں ہندوستان واپس آئے جب ہندوستان میں انگریزی سیاست کا آخری تماشا دکھا رہے تھے، میری ان کی ملاقات ایک چوتھائی صدی کے بعد ۲ نومبر ۱۹۴۶ء کو جامعہ ملیہ کی جوبلی میں دہلی میں ہوئی بڑی گرمجوشی سے مصافحہ ہوا، اور پچھلے گلے شکوے اور حکایات ہوئے، دوسری آخری ملاقات ۲۴ یا ۲۵ اگست ۱۹۴۷ء کو اسی دلی میں مولانا ابوالکلام صاحب کی کوٹھی میں ہوئی، جس کے بعد وہ نومبر ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی طرف سے مصر کے سفیر ہو کر مصر روانہ ہوئے، کام کیلئے صرف ایک سال کی مہلت پائی مگر سنا ہو کہ حکومت ہند نے ان کے کاموں کو پسند کیا،

مرحوم نے اپنی عمر تجرد ہی کی حالت میں گذاری، اس لئے ان کی کوئی ظاہری یادگار نہیں اور اس سے زیادہ افسوس یہ ہے کہ انھوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ انگلستان اور امریکہ میں گذارا، اسلئے ملک کو انکی قابلیت سے براہ راست فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں ملا،

مارا دیار غیر میں مجھ کو وطن سے دور رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

مرحوم کے اعزہ بنگال اور کلکتہ میں موجود ہیں، ان کے دو بھتیجوں کی شادیاں ہمارے گاؤں (دیسنہ ضلع پٹنہ) میں سادات کے گھرانے میں ہوئی ہیں،

مرحوم کے ناتمام افسانۂ زندگی کی ان چند سطروں کے لکھنے کی حاجت نہ تھی مگر میری انکی اٹھارہ دن کی رفاقت کے حق نے لکھنے کا تقاضہ کیا تاکہ اس مسافر عدم کی یاد اہل وطن میں تازہ رہے؛ ع حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

"س"

مطبوعات جدید

انک ڈوٹس فروم اسلام

، مؤلفہ جناب ابراہیم خانصاحب ایم۔ اے، بی۔ ال

صدر ثانوی تعلیمی بورڈ، مشرقی پاکستان، ڈھاکہ، لکھائی چھپائی عمدہ، کاغذ بہتر، ضخامت ۵۷۴،

قیمت عہ، پتہ: محمد اشرف، کشمیری بازار، لاہور،

جو قوم اپنے ماضی سے بے تعلق ہو جائے وہ مستقبل مین کوئی نمایان رفعت حاصل نہین کر سکتی، مگر عجیب بات ہے کہ روبہ ترقی اقوام مین عموماً اپنے ماضی سے بے نیازی کا رجحان پایا جاتا ہے، اس لیے ہر ترقی پذیر ملت کے صاحب دماغ اہل قلم کا فرض ہے کہ وہ اپنے نوجوانون کے لیے ایسا لٹریچر مہیا کرین جو انھین ماضی سے وابستہ رکھے، یہ مقصد تاریخون سے بھی حاصل ہو سکتا ہے، لیکن مسلسل اور خشک تاریخ کا مطالعہ بہتون کے لیے مشکل ہوتا ہے، اس لیے عوام کے علاوہ خواص خصوصاً طلبہ کے لیے ایسی کتابون کی سخت ضرورت ہے جس مین تاریخ اسلام کے جستہ جستہ سبق آموز واقعات دلچسپ انداز مین جمع کیے جائین تاکہ لوگ ان کو لطف و دلچسپی کے ساتھ پڑھکر ان سے سبق حاصل کرین اور اپنے ماضی سے ان کو تعلق پیدا ہو، لائق مولف نے اس کتاب مین انگریزی زبان مین عہد رسالت سے لیکر کمال اتاترک کے زمانہ تک اسلامی تاریخ کے منتخب واقعات دلچسپ انداز مین جمع کر دیئے ہین، اس کا مطالعہ نوجوانون مین ان کے ماضی سے محبت اور تاریخ اسلام کا شوق پیدا کرنے کے لیے مفید ہے، کتاب کی خوبیون کے مقابلہ مین اس کے خفیف نقائص ناقابل التفات ہین، لیکن دو باتون کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے، ایک یہ کہ آیندہ اڈیشن مین واقعات مین مستند تر ماخذون کے حوالے دیئے جائین، اور بعض نامون کے ہجے عربی کتابون کی مدد سے درست کیے جائین مثلاً Khubair (ص ۴۲) کو Khubaib،

Hamama کو Hamama ہونا چاہیے، اسی طریقے سے بعض اور ناموں کی بھی اصلاح کی ضرورت ہے، گو استناد کے اعتبار سے اس میں بعض کمتر درجہ کی کتابوں کے حوالے ہیں لیکن واقعات سب صحیح ہیں جو مستند کتابوں میں بھی موجود ہیں اور واقعات کا انتخاب بہت اچھا کیا گیا ہے۔

مناجات مقبول مرتبہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی مع ترجمہ و شرح مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی، تقطیع اوسط، ضخامت ۲۰۰ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت عہ، پتہ: دار المصنفین اعظم گڈھ، صدق بک ایجنسی گولہ گنج لکھنؤ، الفرقان بک ڈپو نظیر آباد پارک لکھنؤ۔

مناجات مقبول حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی منتخب و مرتب کردہ قرآنی و حدیثی دعاؤں کا مشہور و مقبول مجموعہ ہے، اس میں دو سو سے اوپر دعائیں ہیں، جو ورد میں سہولت کیلیے سات منزلوں میں تقسیم ہیں، متن کیساتھ پرانے طرز کا اردو ترجمہ بھی تھا، اب مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی نے اس میں ترمیم کر کے زیادہ سلیس اور موجودہ مذاق کے مطابق بنا دیا ہے، اور حاشیہ میں ہر دعا کی ضروری تشریح کر دی ہے، اور حکم و مصالح اور ان سے متعلق ضروری فوائد و نکات بھی تحریر فرما دیے ہیں جس سے ان دعاؤں کی دلنشینی اور جذب و کشش میں اور اضافہ ہو گیا ہے، یہ مجموعہ ہر مسلمان کے ورد میں رہنے کے لائق ہے۔

ریاض ہاشمی از جناب محمد شرف الدین صاحب سلیم علوی، تقطیع بڑی، ضخامت ۱۲۰ صفحے، کاغذ بہتر، کتابت و طباعت معمولی، قیمت عہ، پتہ: ادبستان مجتبا، منزل یونگس پیٹ، مدراس

مصنف جنوبی ہند کے مشہور شاعر ہیں، ریاض ہاشمی انکی نعتیہ نظموں کا مجموعہ ہے، اس میں سوسے اوپر نعتیں ہیں، چند حضرت شیخ عبد القادر جیلانی اور خواجہ معین الدین چشتی کی منقبت میں، شاعری کی حیثیت سے یہ خاصی ہیں، اور ان کے بہت سے متفرق اشعار نہایت پاکیزہ اور بلند ہیں، لیکن مذہبی حیثیت سے خیال میں بے اعتدالی پائی جاتی ہے، جس سے اس قسم کی نظمیں بہت کم خالی ہوتی ہیں، جن لوگوں کو اس قبیل کی نظموں کا ذوق ہو یہ مجموعہ ان کے مطالعہ کے لائق ہے۔

"م"

تاریخ سندھ

مؤلفہ مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی دسنوی سابق رفیق دار المصنفین اعظم گڈھ

ہندوستان مین مسلمانون کا پہلا قافلہ سندھ مین اترا تھا، اور اُن کی پہلی حکومت یہین
ئم ہوئی تھی اور وہ ایک ہزار سال سے اوپر یہان حکمران رہے، آج بھی سندھ کے
رودیوار سے اُن کے آثار نمایان ہین، لیکن اس کے باوجود اُردو مین اسلامی سندھ
کی کوئی مفصّل و محققانہ تاریخ موجود نہین تھی، دار المصنفین نے تاریخ ہندوستان کے سلسلہ
ین یہ جامع و محققانہ تاریخ مرتب کرائی ہے، اس مین سندھ کا جغرافیہ مسلمانون کے حملہ سے
پیشتر کے مختصر اور اسلامی فتوحات کے مفصل حالات، خلافتِ راشدہ کے زمانہ سے
ے کر آٹھوین صدی ہجری تک سندھ جن جن حکومتون کے ماتحت رہا، اُن کی پوری تاریخ
اور ان تمام دورون کے نظامِ حکومت، علمی و تمدنی حالات اور رفاہ عام کے جو جو کام
نجام پائے، ان سب کی پوری تفصیل ہے، مسلمان اس قدیم اسلامی خطہ کی تاریخ فراموش
کر چکے تھے، اب پھر اس کو یاد کرنے کی ضرورت ہے، یہ کتاب ایسے وقت مین شائع
ہو رہی ہے، جب کہ سندھ کی تاریخ کا ایک نیا باب کُھل رہا ہے، اور وہان ایک نئی
حکومت کی بنیادین استوار ہو رہی ہین،

ضخامت: ۴۰۰ صفحے قیمت: چھ روپیے،

"منیجر"

دارالمصنفین کی دو نئی علمی و ادبی پیشکش

اقبال کامل

ڈاکٹر اقبال کے فلسفہ و شاعری پر اگرچہ بکثرت مضامین، رسالے اور کتابیں لکھی گئیں لیکن ان سے اُن کی بلند پایہ شخصیت واضح اور مکمل طور پر نمایاں نہ ہو سکی، یہ کتاب اس کمی کو پورا کرنے کے لئے لکھی گئی ہے، اس میں اُن کے مفصّل سوانح حیات کے علاوہ اُن کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کے اہم پہلوؤں کی تفصیل کی گئی ہے، اور سوانح حیات کے بعد پہلے اُن کی اردو شاعری پھر فارسی شاعری پر ان کے بہترین اشعار کے انتخاب کے ساتھ مفصّل تبصرہ کیا گیا ہے۔ اور اُن کے کلام کی تمام ادبی خوبیاں دکھلائی گئی ہیں، پھر اُن کی شاعری کے اہم موضوعوں یعنی فلسفۂ خودی، فلسفۂ بیخودی، نظریۂ تعلیم، سیاست، صنفِ لطیف (یعنی عورت) فنونِ لطیفہ اور نظامِ اخلاق وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے، مرتبہ مولانا عبدالسلام ندوی، ضخامت ۔۔۰م صفحہ، قیمت: ؎ ـ

بزمِ تیموریہ

بابر ایک بے مثل اہلِ قلم تھا، ہمایوں نے شاعری کے علاوہ ہیئت و نجوم کی بھی انجمن آرائی کی، اکبر کا عہد علوم و فنون کی روشنی سے جگمگا اُٹھا، جہانگیر نے ادب و انشاء کو چمکایا، شاہجہان نے شعراء اور فضلاء کو سیم و زر میں تلوایا، عالمگیر نے معارف پروری اور انشاء پردازی کے اعلیٰ نمونے پیش کئے، تیموری دور کے آخری بادشاہوں نے بھی اپنے اسلاف کی روایات کو قائم رکھنے کی کوشش کی، بہادر شاہ ظفر نے عروسِ سخن کے گیسو سنوارے، تیموری شہزادوں اور شہزادیوں نے بھی علم و ادب کی محفلیں سجائیں، دربار کے امراء، شعراء اور فضلاء نے شاہانہ سرپرستی میں گوناگوں کمالات دکھائے، ان کی تفصیل مذکورۂ بالا کتاب میں ملاحظہ فرمائیے، مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم اے، قیمت: ؎ ـ

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۸۱   مئی ۱۹۴۹ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت :- چھ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

سلسلۂ تاریخ اسلام

دار المصنفین کے سلسلۂ تاریخ اسلام کو بڑا حسن قبول حاصل ہوا، علمی و تعلیمی اداروں نے خصوصیت سے
اس کی قدر دانی کی بعض یونیورسٹیوں نے اس کو اسلامی تاریخ کے نصاب میں داخل کر لیا، اس لئے چند
برسوں کے اندر تقریباً اس کے سب حصے ختم ہو گئے جن کے دوسرے اڈیشن مزید اصلاح و ترمیم اور
اضافوں کے ساتھ چھپ کر تیار ہو گئے ہیں اور بعض زیر طباعت ہیں، اب یہ سلسلہ پہلے سے زیادہ
جامع اور مکمل ہو گیا ہے،

تاریخ اسلام حصۂ اوّل

(عہد رسالت و خلافت راشدہ)

یعنی آغاز اسلام سے لے کر خلافت راشدہ کے اختتام تک اسلام کی مذہبی، سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ، ضخامت ۵۹۰ صفحے، قیمت: سے؍

تاریخ اسلام حصۂ دوم

(بنو امیہ)

یعنی اموی سلطنت کی صد سالہ سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ کی تفصیل،

ضخامت ۴۶۳ صفحے،

قیمت سے؍

تاریخ اسلام حصۂ سوم

(بنی عباس اوّل)

یعنی ابو العباس سفاح ۱۳۲ھ ۷۵۰ء سے ابو... متقی اللہ ۳۳۳ھ ۹۴۴ء تک دو صدیوں کی سیاسی تاریخ، (زیر طبع)

تاریخ اسلام جلد چہارم

(بنی عباس دوم)

یعنی مستکفی باللہ کے عہد سے آخری خلیفہ مستعصم تک خلافت عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی سیاسی تاریخ، ضخامت:- ۴۳۲ صفحے

قیمت:- صہ؍

"منیجر"

جلد ۶۳ ماہ رجب المرجب ۱۳۶۸ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۴۹ء عدد ۵

مضامین

مقالات

شذرات

جمعیۃ العلماء کا اجلاس لکھنؤ اس حیثیت سے بہت اہم تھا کہ اس مین جمعیۃ کے دستور العمل مین ایک بنیادی تبدیلی یہ کی گئی ہے کہ آیندہ اس کو سیاسیات سے کوئی تعلق نہ ہوگا اور اس کا دائرۂ عمل مسلمانون کے مذہبی، تعلیمی اور ملی کامون تک محدود رہے گا۔ موجودہ حالات مین یہ فیصلہ نہایت مناسب ہے، جمعیۃ نے جن کامون کو اپنے دائرہ مین لیا ہے اگر وہ انجام پا جائین تو یہ جمعیۃ کا بھی کارنامہ ہوگا اور اس سے انشاء اللہ مسلمانون کی سیاست بھی درست ہوجائے گی۔ اذا صلحت صلحت کلہ۔ لیکن اس کے لیے پوری تنظیم کے ساتھ عملی جدوجہد کی ضرورت ہے، گو یہ کام بھی مشکلات سے خالی نہین ہے، اسلام مین مذہب کا اور ہندوستان مین سیاست کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ بہت سے مذہبی اور تمدنی کامون کی سرحد بھی سیاست سے مل جاتی ہے، اور کانگریس کا ایک طبقہ جماعتی کلچر کے تصور کو بھی فرقہ وارانہ اور متحدہ قومیت کے خلاف سمجھتا ہے، اس لیے جمعیۃ نے جن مصالح کی بنا پر سیاست سے علٰحدگی اختیار کی ہے، وہی خطرات تمدنی کامون مین بھی درپیش ہین، اسکا تازہ ثبوت ہمارے صوبہ کے وزیر اعظم کی وہ تقریر ہے جو انھون نے جمعیۃ کے اسی اجلاس مین فرمائی ہے، اس کا وہ حصہ جو مختلف فرقون کے حقوق مین مساوات، ان کے تحفظ اور ہندو مسلم اتحاد سے متعلق ہے بہت مناسب ہے لیکن زبان اور کلچر کے متعلق ان کے خیالات نہایت متضاد اور کانگریس کے اصولون کے سراسر خلاف ہین

یہ تقریر خاصی طویل ہے اس کے جستہ جستہ فقرے یہ ہین،

"مختلف صوبون کے ہندو مسلمانون کا کلچر ایک ہے، اس ملک کے باشندون کو ایک ہی کلچر اسلاف سے ورثہ مین ملا ہے، اور ان کا طرز زندگی ایک ہی، مسلمان ہندوستان کی تہذیب کو اپنی تہذیب سمجھین کیونکہ اس کی بنیاد قدیم آریائی تہذیب پر نہین ہے، بلکہ اس مین مغلون اور دوسرے مسلمانون کے بھی گہرے اثرات ہین، اس لیے مسلمان مختلف کلچر کا خیال نہ کرین، اس سے قومی وحدت کی تعمیر مین رکاوٹین پیدا ہوتی ہین، مختلف صوبون کی زبانون اور کلچر مین اختلافات ہین لیکن ان کی بنیاد مذہب

پرنہین ہے، اگر مسلمان اپنی امتیازی باتون پر زور دینگے تو اس سے الجھنین پیدا ہونگی، ہم کو گاندھی جی کے اصولون کو یاد رکھنا چاہیے اور آپس مین محبت بڑھانی چاہیے، کسی زبان کو کسی مذہبی گروہ سے وابستہ کرنا غلط ہے، ہندی اور اردو کی تعمیر و ترقی مین ہندو مسلمان دونون نے حصہ لیا ہے، اور ہندی مین اردو بھی داخل ہے اور فارسی کے الفاظ بھی شامل ہین، ہندوستان کی سب چھوٹی چھوٹی زبانین اس مین داخل ہین لیکن نئے الفاظ سنسکرت سے لیے جائینگے عربی سے نہین، رسم الخط دیوناگری ہوگا کیونکہ وہ بہت آسان سائنٹفک اور صوبہ مین رائج ہے، (الجمعیۃ ۲۳ اپریل ۱۹۴۹ء)

درحقیقت سارے ہندوستان کا کلچر کبھی ایک نہین رہا اور نہ اب ہے، جیسا کہ خود تقریر مین بھی اعتراف کیا گیا ہے کہ مختلف صوبون کی زبانون اور کلچر مین اختلافات ہین، گو وہ مقرر کے نزدیک مذہبی بنیاد پر نہین، جنوبی ہند کی زبانین اور وہان کے ہندوؤن کا کلچر شمالی ہند کے ہندوؤن سے اتنا ہی مختلف ہے جتنا یہان کے مسلمانون سے، حتی کہ ایک دوسرے کی زبان تک نہین سمجھ سکتے، خود ایک صوبہ کے ہندوؤن کے مختلف طبقون کے کلچر مین بڑا فرق ہے، اسلیے پورے ہندوستان کو ایک کلچر اور ایک تہذیب کا وارث کہنا صحیح نہین ہے،

خالص مذہب سے قطع نظر کرنے کے بعد بھی کلچر کا وہ حصہ جو مخصوص مذہبی تصورات، ملی روایات، نیم مذہبی معاشرتی رسم و رواج سے متعلق ہے، نہ صرف مسلمانون کا ہندوؤن سے بلکہ خود ہندوؤن کے مختلف فرقون اور طبقون کا بڑی حد تک ایک دوسرے سے مختلف ہے، اور بودھ، سناتن دھرم، آریہ سماج، جینی، برہمن، چھتری، ویش اور شودر وغیرہ کے کلچر مین کچھ نہ کچھ اختلافات ہے، کلچر کا یہی وہ حصہ ہے جسکے تحفظ کا کانگریس نے وعدہ کیا ہے، ورنہ اگر ہندوستان کے تمام فرقون کا کلچر بالکل ایک ہوتا تو پھر اسکے تحفظ کے کوئی معنی نہین، اور کلچر کے اس حصہ کو نہ صرف مسلمان بلکہ ہندوستان کا کوئی فرقہ بھی نہین چھوڑ سکتا، کہ اسی پر انکی بنیاد ہے،

لیکن اس امتیازی پہلو کے باوجود عام معاشرت مین ہر صوبہ کے ہندو مسلمانون کا کلچر تقریبًا ایک ہے، اور آج بھی شہر کے تعلیم یافتہ طبقہ کی تہذیب و معاشرت مین، خواہ وہ ہندو ہون یا مسلمان اسی طریقہ سے دیہات کے باشندون کے رہن سہن مین کوئی خاص فرق نہین ہے، یہی وہ کلچر ہے جس کی بنیاد خالص آرین تہذیب پر نہین ہے، بلکہ اس مین مسلمانون کے بھی گہرے اثرات ہین، مسلمان اسی مشترک کلچر کو چاہتے ہین، اسکے علاوہ اور کسی امتیازی بات پر زور نہین دیتے، اسی کلچر نے صدیون تک ہندو مسلمانون کو شیر و شکر رکھا، اسلیے متحدہ قومیت کے دشمن درحقیقت وہ لوگ ہین جو اس مشترک کلچر کو مٹا کر ایک نئے کلچر کو جنم دینا چاہتے ہین، مسلمانون کا تو قریب قریب سارا کلچر ہندوانہ رنگ مین رنگا ہوا ہے، حتی کہ انکے مذہبی رسوم بھی ان سے خالی نہین ہین، انکے کس شعبۂ زندگی مین خالص عربی کلچر رہ گیا ہے جس سے دوئی کی بو آتی ہے، بہتر ہوتا کہ اس خیالی کلچر کی تفصیل بتا دیجاتی،

کہ مسلمانون کو اسکا علم تو ہو جاتا، ساتھ ہی ہندوؤن کو بھی اسکی دعوت دیجاتی کہ ان مین بھی اسکا کوئی وجود نہین ہے،

یہ دعوی بالکل نیا ہے کہ ہندی مین ہندوستان کی تمام چھوٹی چھوٹی زبانیں شامل ہین، اور اردو اور فارسی الفاظ بھی اس مین داخل ہین، اردو کا سوال تو بعد مین آتا ہے، پہلے ڈراویڈین اور پنجابی اور بنگالی زبانون کو تو ہندی مین شامل کر لیا جائے، جو اس سے حریفانہ ٹکر لے رہی ہین، لیکن اگر اس دعوی کو اس حیثیت سے صحیح بھی مان لیا جائے کہ اردو بھی ہندوستان ہی کی پیدا شدہ اور یہیں کی زبانون سے نکلی ہے، اور مقرر کو یہ خود تسلیم ہے کہ ہندی اور اردو کی تعمیر و ترقی مین ہندو مسلمان دونون کا حصہ ہے تو پھر اردو کیساتھ اجنبی زبان کا برتاؤ کیون ہے، اس کو بھی کم سے کم ان صوبون مین جہان وہ صدیون سے رائج ہے ہندی کے برابر جگہ دیا جائے، اور اس کے ان الفاظ کو جو زبان کا جزو ہو گئے ہین اور جنھین ہر شخص سمجھتا ہے نکال کر انکی جگہ سنسکرت کے مشکل اور نامانوس الفاظ نہ ٹھونسے جائین، اور اردو کو کم سے کم ہندوستانی رہنے دیا جائے سنسکرت نہ بنایا جائے، یہ تو بقول گووند سہائے پارلیمنٹری سکریٹری وہی پرانی برہمنی ذہنیت ہے کہ زبان بھی ایک خاص طبقہ کی ملک بنجائے، اور اس کا سمجھنا عوام کی دسترس سے باہر ہو،

دیوناگری رسم الخط اردو کے مقابلہ مین آسان ضرور ہے لیکن اسکو سائنٹفک اور صوبہ مین رائج کہنا صحیح نہین ہے، دیوناگری کی ایک سہولت کے مقابلہ مین اردو رسم الخط کو یہ ترجیحین حاصل ہین کہ وہ دیوناگری کے مقابلہ مین صوتی اور تحریری نقطۂ نظر سے زیادہ مکمل ہے، بہت زود نویس ہے اور بہت کم جگہ لیتا ہے، رائج ہونے نہ ہونے کی صورت یہ ہے کہ بہت کم تعلیم یافتہ ہندو مسلمان ایسے نکلین گے جو اردو مین نہ لکھ سکتے ہون اگر کچھ لوگ اردو نہ لکھ سکتے ہون صرف ہندی لکھ سکتے ہون تو بہتیرے اردو لکھ سکتے ہین اور ہندی نہین لکھ سکتے، پھر حکومت کی پالیسی مین کسی معمولی سہولت یا دشواری کا کیا سوال کیا وہ کسی معمولی دشواری سے بچنے کے لیے کسی انتظامی معاملہ کو چھوڑ دیتی ہے، آخر آج تک ہندو مسلمان دونون کس طرح اس رسم الخط کو سیکھتے تھے، اور اب یہ دشواری ناقابل حل کیون ہو گئی، کسی زبان کو رسم الخط سے محروم کرنا جسم کو جان سے الگ کرنا ہے، متحدہ قومیت کی تعمیر کا یہ طریقہ نہین ہے، اس کی تعمیر انہی وسائل سے ہو سکتی ہے جنھون نے صدیون تک ہندو مسلمانون کو متحد رکھا، اور وہ اسی پرانے مشترک کلچر یا عام فہم ہندوستانی زبان کا رشتہ تھے، گاندھی جی کے اصولون کی تلقین کرنے والون کو ہر چیز مین ان کے اصول پیش نظر رکھنا چاہیے اسی مین ہندوستان کی فلاح ہے،

مقالات

تدوین قرآن

از شاہ معین الدین احمد ندوی

دنیا کے کسی مذہب کا کوئی الہامی صحیفہ صحت میں قرآن مجید کا مقابلہ نہیں کرسکتا، ان سب میں کچھ نہ کچھ ردوبدل ہوگیا ہے، اور بعض میں تو اتنا تغیر ہوگیا ہے کہ یہ بتانا مشکل ہے کہ اس میں خدا کا کلام کتنا ہے اور انسانی تصرفات کس قدر ہیں، یہ امتیاز صرف کلام مجید کو حاصل ہے کہ چودہ صدیوں کے اندر اس میں ادنی تغیر بھی نہیں ہوا، وہ جس شکل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھا، بغیر کسی ترمیم کے آج بھی اسی شکل میں ہے، جس کو نہ صرف مسلمان بلکہ دوسرے مذاہب کے علماء و محققین بھی مانتے ہیں، لیکن عہد صدیقی میں قرآن کی کتابی تدوین کی روایت سے جس کی تفصیل آیندہ آئے گی، بہت سے مسلمانوں کو بھی یہ غلط فہمی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ میں کلام مجید کی ترتیب عمل میں آئی، بلکہ بعض ناواقف تو حضرت عثمانؓ کی جانب اس کو منسوب کرتے ہیں، جیسا کہ خطبوں میں آپ کے نام کے ساتھ "جامع آیات القرآن" کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے، لیکن یہ دونوں باتیں غلط فہمی پر مبنی ہیں، درحقیقت کلام مجید عہد رسالت ہی میں پورا مرتب[1] ہو چکا تھا، اور اس کی ترتیب خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی الٰہی کی ہدایت کے مطابق فرمائی تھی، لیکن کتابی شکل میں نہ تھا، بلکہ اونٹ کی ہڈیوں، پتھر کی تختیوں، کھجور کی شاخوں اور چمڑے کے

---

[1] ترتیب سے مراد سورتوں میں آیتوں کی ترتیب ہے یعنی ہر سورہ کی آیتیں مرتب اور ہر سورہ اپنی جگہ پر مکمل ہو چکی تھی۔

ٹکڑوں پر متفرق طور سے لکھا ہوا تھا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان تحریروں کو اسی ترتیب کے مطابق جو عہد نبوی میں ہو چکی تھی، ایک جگہ جمع کرکے کتابی شکل میں مدون کرادیا، اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں اس کی نقلیں کراکے مختلف اسلامی ملکوں میں بھجوائیں، ان سب کی تفصیل آئندہ آئے گی۔

عہد صدیقی میں قرآن کی تدوین کی روایت سے مخالفین کے دلوں میں یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اور بعض نے اس کا اظہار بھی کیا ہے کہ جو کتاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد یاد داشت سے مرتب کی گئی ہو اس میں تغیر و تبدل کا امکان ہو سکتا ہے، گو یہ صحیح نہیں ہے، لیکن اگر صحیح بھی مان لیا جائے تو بھی جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا کہ عہد صدیقی کی تدوین بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اس قدر جلد اور اتنے اہتمام سے ہوئی کہ اس میں کسی غلطی کا امکان ہی نہیں ہو سکتا تھا، اس مضمون کا مقصد اسی غلط فہمی کا ازالہ ہے۔

کلام مجید کی اہمیت اور اس کی خصوصیات

دنیا کے اور تمام مذاہب اور ان کے پیغمبر مخصوص قوموں اور ملکوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے بھیجے گئے، اور ان کی تعلیمات ایک خاص زمانہ تک کے لیے تھیں، اسلیے ان کا پیام بھی محدود تھا، لیکن اسلام خدا کا آخری دین ہے اور ابد تک اور سارے عالم کی ہدایت کیلیے آیا تھا، اس لیے قرآن مجید کا پیام ساری دنیا کے لیے اور ابدی ہے، اور وہ تنہا اخلاق و روحانیت کا درس نہیں بلکہ دنیا و آخرت دونوں کی زندگیوں کا پورا دستور العمل ہے، خود قرآن کہتا ہے:-

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ	اور نہیں بھیجا ہم نے تم کو مگر سارے لوگوں
بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا	کے لیے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا،
اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ	کلام مجید سارے عالم کے لیے نصیحت ہے۔
هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى	کلام مجید تمام لوگوں کیلیے ہدایت اور ہدایت اور
وَالْفُرْقَانِ	حق و باطل میں فرق کرنے والی کھلی دلیل ہے۔

ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ — اس کتاب مین کوئی شک و شبہ نہین اس مین

هُدًى لِلنَّاسِ — لوگون کے لیے ہدایت ہے،

کلام مجید کی اس اہمیت کی بنا پر خود اللہ تعالیٰ نے اسکی حفاظت کی ذمہ داری لی،

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ — بیشک ہم ہی نے اس نصیحت کو اتارا ہے اور

لَحَافِظُونَ — ہم ہی اسکے نگہبان و محافظ ہین۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے یاد کرانے اور اس کے معنی و مطالب آپ کے ذہن نشین

کرانے کا بھی ذمہ لیا،

لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ — اے پیغمبر نزول وحی کے ساتھ اپنی زبان کو اسلیے

إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ فَإِذَا — حرکت نہ دو کہ اسکو جلدی سے یاد کرلو (تمھارے

قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ثُمَّ إِنَّ — سینہ مین) اسکا جمع کرنا اور پڑھوانا ہمارے ذمہ ہے،

عَلَيْنَا بَيَانَهُ .... — پس جب ہم (بذریعہ وحی) اسکو پڑھین تو تم بھی

(قیامۃ ۲۰) — اسکی قرأت کرو پھر اسکا سمجھانا بھی ہمارے ذمہ ہے۔

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسَىٰ — ہم تمھارے لئے (قرآن) پڑھینگے پس تم (اسکو) نہ بھولوگے

لوگون کے سمجھنے اور اس سے نصیحت حاصل کرنے کے لیے قرآن کو آسان رکھا۔

فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ — ہم نے قرآن کو تمھاری زبان مین آسان کر دیا

يَتَذَكَّرُونَ (دخان ۔ ۳) — تاکہ لوگ نصیحت حاصل کرین۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ فَهَلْ — ہم نے قرآن کو آسان کر دیا ہے پس ہے کوئی نصیحت

مِنْ مُدَّكِرٍ — پکڑنے والا۔

اس کے مضامین مین کوئی کجی نہین رکھی،

قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِي عِوَجٍ	عربی زبان کا قرآن جس مین کوئی پیچیدگی
لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ	نہین تاکہ لوگ پرہیزگار بن جائین ۔

جس کتاب کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ اہتمام فرمایا ہو اس کی حفاظت اور صحت کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ نے کیا کیا کوششین نہ کی ہون گی ۔ اسی لیے نزول وحی کے ساتھ ہی آپ اس کو لکھا دیتے تھے، صحابہ کرام کو اس کی تعلیم دیتے وہ اسے پڑھکر خود بھی لکھ لیتے تھے، قرآن کی تعلیم مکہ ہی سے شروع ہو گئی تھی، مدینہ آنے کے بعد اس کی باقاعدہ درسگاہ قائم ہو گئی تھی، جہان صحابہ کرام تعلیم حاصل کرتے تھے، اور دوسرون کو تعلیم دیتے تھے، بیرونی مسلمانون کی تعلیم قرآن کے لیے معلمین بھیجے جاتے تھے، ان سب کی تفصیل آیندہ آئے گی،

خود کلام مجید کی آیات مین اس کی تصریح ہے کہ نزولِ وحی کے ساتھ ساتھ اس کی کتابت بھی ہوتی جاتی تھی،

كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ	ہرگز ایسا نہ کیجیے قرآن نصیحت کی چیز ہے
فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ مَّرْفُوْعَةٍ	جس کا دل چاہے اسکو قبول کرے وہ ایسے
مُّطَهَّرَةٍ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ كِرَامٍ	صحیفون مین ہے جو مکرم ہین بلند مرتبہ ہین مقدس ہین
بَرَرَةٍ (عبس)	جو ایسے لکھنے والون کے ہاتھون مین ہین جو

ان آیات مین کلام مجید کی کتابت کی تصریح ہے جو ظاہر ہے کہ نزول قرآن کے بعد ہی ہو سکتی ہے، صحف جمع ہے صحیفہ کی اور صحیفہ ورق کو کہتے ہین، اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اوراق مین لکھا جاتا تھا،

عہد رسالت مین قرآن کی جمع و ترتیب پر اجماع ہے

اس پر علماے اسلام کا اتفاق ہے کہ قرآن مجید کی ترتیب خود آنحضرتؐ نے وحی الٰہی کے مطابق فرمائی تھی، اور موجودہ قرآن اسی ترتیب کے مطابق ہے

اس مین کسی قسم کا تغیر و تبدل نہین ہوا ہے، سیوطی نے ان تمام اقوال کو اتقان مین جمع کر دیا ہے،
وہ لکھتے ہین:

اس پر اجماع ہے اور یہ نصوص متواترہ سے ثابت ہے کہ آیات کی ترتیب بغیر کسی شک و شبہہ کے توقیفی ہے، اس کو بہت سے علماء نے نقل کیا ہے، زرکشی نے برہان مین اور ابو جعفر بن زبیر نے مناسبات مین لکھا ہے، کہ آیات کی ترتیب سورتون مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توقیف اور حکم کے مطابق ہوئی ہے، اس مین کسی مسلمان کا اختلاف نہین ہے۔

مکی وغیرہ کا بیان ہے کہ آیتون کی ترتیب سورتون مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق ہوئی ہے، قاضی ابو بکر نے الانتصار مین لکھا ہے کہ آیات کی ترتیب امر واجب اور حکم لازم ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت جبرئیل بتاتے تھے کہ فلان آیت فلان مقام پر رکھی جائے...... پورا قرآن جس کو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا اور اس کو تحریر مین قائم رکھا (یعنی اس کا حکم اور اسکی تلاوت دونون مین سے کوئی چیز بھی منسوخ نہیں فرمائی) وہ وہی ہے جو دونون دفتیون کے درمیان اور مصحف عثمانی پر مشتمل ہے، اس مین نہ کچھ گھٹایا گیا اور نہ بڑھایا گیا، اس کی آیتون کی نظم و ترتیب بھی وہی ہے جس طرح اللہ اور اس کے رسول صلعم نے اس کو ترتیب دیا تھا، اس مین کسی قسم کی تقدیم و تاخیر نہین ہوئی ہے، امت نے جس طرح قرآن کی قرأتون اور اس کی تلاوت کو آنحضرت صلعم سے سیکھا اسی طرح ہر سورہ کی ترتیب بھی آپ ہی کی ہدایت سے کی اور ان کی جگھون کو جانا اور پہچانا، بغوی شرح السنہ مین لکھتے ہین

صحابہ کرامؓ نے قرآن کو جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر نازل فرمایا، اس خوف سے کہ اسکے حفاظ کے اٹھ جانے کے بعد اس کا کوئی حصہ ضائع نہ ہو جائے بغیر کسی کمی اور زیادتی کے دو دفتیون کے درمیان جمع کیا، اور اس کو اسی طرح لکھا جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا، اسکی

ترتیب مین اپنی جانب سے کوئی تقدیم وتاخیر نہین کی جس قدر قرآن نازل ہوتا جاتا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو اسی ترتیب کے ساتھ جس ترتیب سے وہ موجودہ قرآن مین ہے اپنے اصحاب کو اس کی تعلیم وتلقین فرماتے جاتے تھے، اور یہ ترتیب حضرت جبریلؑ کی ہدایت سے ہوتی تھی، ہر آیت کے نزول کے وقت وہ بتلاتے جاتے تھے کہ فلان آیت فلان سورہ کی فلان آیت کے بعد رکھی جائے، اس سے یہ ثابت ہوا کہ صحابہؓ نے قرآن کو ترتیب نہین دیا تھا، بلکہ (پہلی ترتیب کے مطابق) اس کو ایک جگہ جمع کر دیا تھا، اس لیے کہ قرآن اسی ترتیب کے ساتھ لوح محفوظ مین لکھا ہوا تھا، اور ضرورت کے مطابق متفرق طور سے نازل ہوتا جاتا تھا، اسی لیے نزولی ترتیب تلاوت کی ترتیب سے مختلف ہے،

ابن حصار کا قول ہے کہ سورتون اور آیتون کی ترتیب وحی کے ذریعہ انجام پائی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حکم دیتے تھے کہ فلان آیت کو فلان جگہ رکھو، اور اسی ترتیب کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت پر نقل متواتر سے یقین ہے، اور اس پر اجماع ہے کہ اسی ترتیب سے مصحف مین آیتین لکھی گئی ہین[2]،

البتہ سورتون کی ترتیب کے توقیفی یعنی منجانب اللہ ہونے مین علما کا اختلاف ہے، ایک جماعت کے نزدیک ان کی ترتیب بھی توقیفی ہے، اس لیے کہ بعض روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی ترتیب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی، لیکن حضرت علیؓ، ابی بن کعبؓ اور عبد اللہؓ بن مسعود کے مرتب کردہ مصاحف کی ترتیب عہد صدیقی کے مرتب کردہ مصحف سے مختلف تھی، اس لیے جمہور علما کا مسلک یہ ہے کہ سورتون کی ترتیب مین اجتہاد صحابہ کو دخل ہے،

لیکن عقلی وعلمی حیثیت سے تنہا یہ بیانات کافی نہین ہین، اور دیکھنا یہ ہے کہ احادیث سے کہان تک اس کا ثبوت ملتا ہے، اس لیے آیندہ سطور مین حدیثون کی روشنی مین اس مسئلہ پر نظر ڈالی جائے گی،

---

[1] قرآن عہد صدیقی مین ص ۵۳ [2] اتقان، ص ۶۳

آیتون کی ترتیب کا ثبوت احادیث سے | عہد رسالت مین آیتون کی ترتیب اور سورتون کے نام کی تعیین کے بارہ مین اتنی کثرت سے احادیث ہین کہ اس مین کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہین رہ جاتی کہ موجودہ قرآن مجید اسی ترتیب کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتب کردہ ہے، یہ روایتین بخاری، مسلم، سنن ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابن حبان، مستدرک، مسند احمد بن حنبل وغیرہ حدیث کی تمام کتابون مین ہین، ان سب کا نقل کرنا دشوار ہے، اس لیے صرف بقدر ثبوت حدیثین پیش کی جاتی ہین،

مستدرک مین کاتب وحی حضرت زید بن ثابت سے روایت ہے :۔

کنا عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس
نولف القرآن من الرقاع	مختلف ٹکڑون سے قرآن مرتب کرتے تھے،

ذہبی کی تلخیص مستدرک مین یہ روایت ان الفاظ مین ہے :۔[1]

کنا حول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے
نولف القرآن	اردگرد (بیٹھکر) قرآن مرتب کرتے تھے،

ان دونون روایتون مین تالیف سے مراد یا آیتون کی ترتیب ہے یا سورتون کی یا دونون کی اور تینون صورتون مین آیتون کی ترتیب ثابت ہوتی ہے، اگر آیتون اور سورتون دونون کی ترتیب مراد ہے تو ثبوت کھلا ہوا ہے، اور اگر سورتون کی ترتیب مراد ہے تو ان کی ترتیب اسی وقت ہو سکتی ہے جب آیتین مرتب ہون لیکن روایت کے اجمال سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونون کی ترتیب مراد ہے،

ترمذی مین اس سے زیادہ واضح روایت ہے :۔[2]

قال عثمان کان رسول اللہ صلی اللہ	حضرت عثمان نے فرمایا کہ بسا اوقات رسول اللہ
علیہ وسلم مما یاتی علیہ الزمان	صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک ساتھ مختلف سورتین

---

[1] مستدرک حاکم وتلخیص مستدرک ذہبی ج ۲ ص ۲۲۹ [2] ترمذی تفسیر سورہ توبہ ص ۵۰۲

وھو ینزل علیہ السور ذوات	کی آیتین نازل ہوتی تھین، جب ایسی صورت ہوتی
العدد فکان اذا نزل علیہ الشی	تو آپ کسی کاتب وحی کو بلاتے اور سورتون کے
دعا بعض من کان یکتب فیقول	نام بتا کر فرماتے کہ ان آیتون کو فلان فلان
ضعوا ھؤلاء الآیات فی السورۃ	سورتون مین رکھو، اور جب ایک ہی
التی یذکر فیھا کذا وکذا فاذا	سورہ کی آیت نازل ہوتی تو فرماتے
نزلت علیہ الآیۃ فیقول ضعوا	اس کو فلان سورہ مین رکھو،
ھذہ الآیۃ فی السورۃ التی یذکر فیھا	

اس روایت سے نہایت واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نزول قرآن کے ساتھ ساتھ اس کی ترتیب فرماتے جاتے تھے،

مسند ابن حنبل مین عثمان بن ابی العاص سے روایت ہے کہ[1]

قال کنت جالسا عند رسول اللہ	مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس
صلی اللہ علیہ وسلم اذ شخص ببصرہ	بیٹھا تھا کہ آپ نے اوپر نگاہ اٹھائی پھر اسکو
ثم صوبہ حتی کاد ان یلزقہ	نیچے کیا یہاں تک کہ قریب تھا کہ زمین سے
بالارض ثم شخص ببصرہ فقال	مل جائے پھر نگاہ اٹھا کر فرمایا کہ جبریل نے
اتانی جبریل فامرنی ان اضع	آ کر مجھکو ہدایت کی ہے ان اللہ یامر بالعدل
ھذہ الآیۃ بھذا الموضع من ھذہ	والاحسان الخ کی آیتہ کو اس سورہ کی اس
السورۃ ان اللہ یامر بالعدل	جگہ پر رکھون،
والاحسان الخ	

---

[1] مسند احمد بن حنبل ج ۴ ص ۲۱۸

اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی ترتیب وحی کے مطابق فرماتے تھے،

یہ تو قرآن مجید کی ترتیب کی اجمالی روایات ہیں، حدیثوں میں مختلف سورتوں کی آیات کی ترتیب کی بھی بکثرت روایتیں ہیں، بخاری میں سورۂ بقرہ کے فضائل میں ہے[1]:-

عن ابی مسعود قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم	ابی مسعود روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے
من قرأ بالآیتین من آخر سورۃ	فرمایا کہ جو شخص سورہ بقرہ کی آخری دو آیتیں
البقرۃ فی لیلۃ کفتاہ	رات کو پڑھ لیا کرے تو اس کیلئے کافی ہیں،

دوسری روایت میں ہے[2]:-

عن ابی ھریرۃ قال النبی صلی اللہ	ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ
علیہ وسلم اذا اویت الی فراشك	وسلم نے فرمایا کہ جب رات کو سونے کے لیے
فاقرأ آیۃ الکرسی لن یزال	اپنے بستر پر جاؤ تو آیۃ الکرسی پڑھ لیا کرو،
من اللہ حافظا ولا یقربك	تو ہمیشہ خدا کی حفاظت میں رہوگے اور صبح تک
شیطان حتی الصبح	شیطان تمہارے قریب نہ آسکے گا،

ان روایتوں میں سورہ بقرہ کی آخری دو آیتوں اور آیۃ الکرسی کی تلاوت کے لیے فرمایا گیا ہے جو سورہ بقرہ کے آخر میں ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پوری سورہ مرتب تھی،

سورہ نساء کی ترتیب کی روایت بخاری و مسلم دونوں میں ہے[3]:

عن عمر قال ما راجعت رسول اللہ	عمر سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم فی شیء ما راجعتہ	علیہ وسلم سے کلالہ کے متعلق اتنی مرتبہ پوچھا کہ

---

[1] بخاری ج ۲ ص ۷۵۰ باب فضائل قرآن [2] ایضاً [3] مسلم ج اول باب قرأۃ القرآن وسورۃ البقرہ

فی الکلالۃ وما اغلظ لی فی شیٔ	کسی چیز کے متعلق اتنی مرتبہ سوال نہ کیا تھا،
ما اغلظ لی فیہ حتی طعن باصبعہ	اور آپ نے اسکا ایسا سخت جواب دیا کسی چیز
فی صدری وقال تکفیک اٰیۃ	میں مجھسے ایسی سختی نہ کی تھی یہانتک کہ آپ نے میرے
السیف التی فی اٰخر سورۃ النساء	سینہ میں انگلی مارکر فرمایا کہ اس بارہ میں آیۃ الصیف
....	جو سورۂ نسا کے آخر میں ہے تمھارے لیے کافی ہے

اس روایت سے پوری سورہ نسار کی ترتیب ظاہر ہوتی ہے اس لئے آخری آیت کی تعیین اسی وقت ہوسکتی ہے جب پوری سورہ مرتب ہو،

مسلم میں سورہ بقرہ اور آل عمران کے فضائل میں ہے [1]:-

عن ابو امامۃ باھلی قال سمعت رسول	ابو امامہ باہلی روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول
اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول اقرؤا	اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرماتے تھے
القرآن فانہ یاتی یوم القیامۃ	کہ قرآن مجید پڑھا کرو کیونکہ وہ قیامت کے
شفیعا لاصحابہ اقرؤا الزھر اوین	دن اپنے پڑھنے والوں کا سفارشی بنکر آئیگا اور
البقرۃ وسورۃ اٰل عمران فانھما	دو خوبصورت سورتوں بقرہ اور آل عمران
غمامتان او کانھما غیایتان	کی تلاوت کیا کرو، وہ دونوں قیامت کے دن
او کانھما فرقان من طیر صواف	بدلی یا چڑیوں کے دو جھنڈوں کی شکل میں آئینگی،
یحاجان عن اصحابھما	اور اپنے پڑھنے والوں کی جانب سے وکالت کرینگی،

مسلم میں سورہ کہف کے فضائل میں ہے [2]:-

عن ابی الدرداء ان النبی صلی اللّٰہ	ابو درداؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] مسلم باب فضل قرأۃ القرآن و سورۃ البقرہ [2] ایضاً باب فضل سورۃ الکہف وآیۃ الکرسی ج ۱ ص ۳۰۰

علیہ وسلم قال من حفظ عشر آیات	نے فرمایا کہ جس نے سورہ کہف کی
من اول سورۃ الکہف عصم من	ابتدائی دس آیتیں یاد کرلیں وہ دجال
فتنۃ الدجال	کے فتنہ سے محفوظ ہوگیا،

اس سے ظاہر ہوا کہ سورہ کہف بھی مرتب تھی،

حدیث کی کتابوں میں سورتوں کے فضائل اور نمازوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان کی تلاوت کے سلسلہ میں قرآن مجید کی تقریباً تمام سورتوں کا ذکر آتا ہے، ان سب کی روایات نقل کرنا دشوار ہے، اس لیے نمونہ ان کے نام لکھدیے جاتے ہیں، بخاری اور مسلم میں حسب ذیل سورتوں کی تلاوت نبوی کا ذکر ہے[1]

بقرہ، آل عمران، انشقاق، مومنون، تین، لیل، قاف، مرسلت، تکویر، اور بقرہ

اور آل عمران، کہف اور اخلاص و معوذتین کے فضائل آپ کی زبان مبارک سے منقول ہیں،[2]

ابوداؤد میں حسب ذیل سورتوں کی تلاوت نبوی کا ذکر ہے[3]

رحمٰن، نجم، اقتربت الساعۃ، الحاقہ، طور، ذاریات، واقعہ، نون، نازعات، تطفیف، عبس،

مزمل، قیامۃ، دہر، عم یتساءلون (نبا) مرسلت، دخان اور شمس،

ترمذی میں آل عمران، کہف، یٰس، حم دخان، ملک، زلزال، اخلاص اور معوذتین کے فضائل ہیں[4]

نسائی میں بقرہ، کافرون، اخلاص، روم، قاف، تکویر، معوذتین، سجدہ، دہر کی تلاوت کا تذکرہ ہے[5]

دارمی میں حسب ذیل سورتوں کے فضائل ہیں، آل عمران، انعام، ہود، کہف، سجدہ، ملک، تنزیل، یٰس، حوامیم اور مسبحات[6]

---

[1] بخاری و مسلم کتاب الصلوٰۃ [2] ایضاً فضائل مذکورہ [3] ابوداؤد ج ۱ باب تحزیب القرآن [4] ترمذی ابواب فضائل القرآن [5] نسائی کتاب افتتاح الصلوٰۃ کے مختلف ابواب [6] مسند دارمی کتاب فضائل القرآن۔

حوامیم میں، مومن، سجدہ، شوریٰ، زخرف، دخان، جاثیہ اور احقاف اور مسبحات میں حدید، مجادلہ، حشر، ممتحنہ، صف، جمعہ، منافقون، تغابن، طلاق اور تحریم کی سورتیں ہیں،

آیات سجدہ کے سلسلہ میں اعراف، رعد، بنی اسرائیل، مریم، حج، فرقان، نمل، سجدہ، صاد، حم سجدہ، نجم، انشقاق اور اقرأ کا نام آتا ہے،

ان کے علاوہ اور مختلف سلسلوں میں بہت سی سورتوں کے نام ملتے ہیں، لیکن ان سب کا استقصا مقصود نہیں ہے، کنز العمال باب فضائل السور میں قرآن مجید کی تمام سورتوں کے فضائل کی روایتیں ہیں،[1] گو مذکورہ بالا سورتوں کی روایات میں ان کی ترتیب کا ذکر نہیں ہے لیکن اوپر ترمذی کی روایت سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ آپ نزول قرآن کے ساتھ سورتوں میں آیتوں کی ترتیب قرار دیتے جاتے تھے، اور بعض سورتوں کی ترتیب کی تصریح بھی اوپر گذر چکی ہے، اس سے یہ ظاہر ہے کہ جن سورتوں کے نام حدیثوں میں آئے ہیں، ان سب کی آیات مرتب ہوں گی،

اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ بعض روایتوں میں آیات کی مختلف تعداد کی تلاوت پر اجر کی مقدار بتائی گئی ہے، دارمی میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے ایک رات میں قرآن کی سو آیتیں تلاوت کیں تو اس کے عمل میں ایک رات کا قنوت لکھا جائے گا، اور جس نے ایک ہزار آیتیں تلاوت کیں تو اس کو ایک قنطار کے برابر ثواب ملے گا،[2]

یہ ظاہر ہے کہ جب تک آیتیں مرتب نہ ہوں گی اس وقت تک ان کی کسی مقررہ تعداد کی تلاوت کس طرح ممکن ہے، اور ہزار آیات کی تلاوت کے یہ معنی ہیں کہ بہت سی بڑی سورتیں مرتب تھیں،

عہد رسالت میں پورے قرآن کی تلاوت

مذکورہ بالا مباحث کا تعلق آیات کی ترتیب اور سورتوں کی تکمیل سے تھا، حدیثوں میں بکثرت ایسی روایتیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں قرآن

---

[1] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو کنز العمال ج ۱ ابواب فضائل قرآن [2] مسند دارمی باب من قرأ مائة آیة الی الالف۔

[مرت]ب ہو چکا تھا[1] اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام اس کا دورہ کرتے تھے، حضرت عبد اللہ رض بن عمرو بن العاص کے پورے قرآن کی تلاوت کی روایت بخاری، مسلم، سنن بیہقی، مستدرک اور حدیث کی متعدد کتابوں میں ہے، آپ بڑے عابد و زاہد بزرگ تھے، رات دن عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے تھے، اس مشغولیت کی وجہ سے بیوی کی جانب بھی متوجہ ہونے کا موقع نہ ملتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے عبد اللہ کو بلا کر ان سے پوچھا، روزے کس طرح رکھتے ہو، انھوں نے جواب دیا روزانہ، پوچھا قرآن کس طرح ختم کرتے ہو، کہا ہر شب میں، فرمایا ہر مہینہ میں صرف تین روزے رکھا کرو، اور ایک مہینہ میں قرآن ختم کیا کرو، انھوں نے عرض کیا میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں، فرمایا اچھا ہفتہ میں تین روزے رکھا کرو، اور دو دن افطار کیا کرو، عبد اللہ نے پھر وہی جواب دہرایا، آپ نے فرمایا تو صوم داؤد رکھا کرو جو سب سے افضل ہے، یعنی ایک دن روزہ اور ایک دن افطار اور سات دن میں قرآن ختم کیا کرو،[2]

---

[1] اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ سورتوں کی ترتیب کے توقیفی ہونے میں علماء کا اختلاف ہے، ایک جماعت کی رائے ہے کہ سورتوں کی ترتیب توقیفی نہیں ہے بلکہ اس میں اجتہاد صحابہ کو دخل ہے، اور یہی رائے صحیح ہے، اسلیے کہ متعدد صحابہ کے مرتب کردہ مصاحف کی ترتیب جو انھوں نے اپنے طور پر مرتب کیے تھے موجودہ مصحف یا مصحف صدیقی و عثمانی سے مختلف ہے، اسلیے عہد نبوت یا آنحضرت صلعم کی سورتوں اور قرآن کی ترتیب سے یہ مراد ہے کہ آپ نے تلاوت کے لیے سورتوں کی ترتیب فرما دی تھی، مگر اسکی پابندی دوسروں کیلیے ضروری نہیں تھی، یا صحیح یہ ہے کہ ہر جگہ ترتیب قرآن کے لفظ سے پورے قرآن کی ترتیب مراد نہیں ہے بلکہ جسقدر نازل ہوتا جاتا تھا اس کی ترتیب ہوتی جاتی تھی، البتہ آپ کی وفات سے پہلے پورے قرآن کی ترتیب ہو گئی تھی، اور یہ ترتیب وہی تھی جس کے مطابق حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ کو قرآن سنا اور آپکو سنایا تھا،

[2] بخاری ابواب فضائل القرآن باب فی کم یقرء القرآن

اس روایت میں ختم قرآن کی تصریح ہے، اور ایک مہینہ پھر بروایت قبل ایک ہفتہ کی مدت کی تعیین سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ پورے قرآن کا دورہ کرتے تھے، اور نہ ایک مہینہ یا ایک ہفتہ میں اس کے کسی جز کی تلاوت تو کوئی بار نہیں ہے،

بعض روایتوں میں ختم قرآن کی کم سے کم مدت تین دن مقرر فرمائی ہے[۱]

عن عبد الله بن عمرو بن العاص	عبد اللہ بن عمرو بن العاص کا بیان ہے
قال امرنی رسول الله صلعم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو حکم
ان لا اقرأ القرآن اقل	دیا کہ تین دن سے کم میں قرآن کا
من ثلث	دورہ نہ کروں،

اور اس کا سبب یہ بیان فرمایا ہے[۲]

لم یفقہ القرآن من قرأ	جو شخص تین دن سے کم میں قرآن پڑھے گا
القرآن فی اقل من ثلاث	وہ اس کو سمجھ نہیں سکتا،

خود آپ بھی تین دن سے کم میں قرآن ختم نہیں کرتے تھے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں[۳]:

کان لا یختم القرآن فی اقل	آپ تین دن سے کم میں قرآن ختم
من ثلاث	نہیں کرتے تھے،

کنز العمال میں بروایت مصنف ابن ابی شیبہ یہ روایت ہے، کان ممن ختم القرآن ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حیٌّ عثمان بن عفان وعلی بن ابی طالب وعبد اللہ ابن مسعود (کنز العمال ج ۲) اس روایت سے خواہ ختم قرآن سے پورے قرآن کی تلاوت مراد لی جائے یا اس کا حفظ دونوں سے مقصود حاصل ہے،

---

[۱] سنن دارمی فضائل القرآن باب فی ختم القرآن [۲] ترمذی ابواب القراءت [۳] فتح الباری ج ۹ ص ۸۳،

ان تمام روایات سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں پورا قرآن پڑھا جاتا تھا، ورنہ اسکے کسی حصہ اور ٹکڑے کی تلاوت کے لیے مدت کی تعیین کی ضرورت ہی نہ تھی،

اس سلسلہ میں سب سے اہم بخاری کی یہ روایت ہے:[۱]

عن فاطمة قالت اسر الی	حضرت فاطمہ زہرا بیان فرماتی ہیں کہ
النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان جبریل	نبی صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے خفیہ طریقہ سے
یعارضنی بالقرآن کل سنة مرة	فرمایا کہ جبریل ہر سال ایک مرتبہ مجھ سے
وانه عارضنی العام مرتین ولا اراه	قرآن سنتے اور سناتے تھے، اور اس
الا حضور اجلی	سال دو مرتبہ سنا اور سنایا جو میری موت کے

اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ جسقدر قرآن مجید ہر سال نازل ہوتا جاتا تھا اسکی صحت کے لیے یا اور کسی مصلحت سے حضرت جبریل اسکو آنحضرت صلعم کو سناتے اور آپ سے سنتے جاتے تھے اور آپ کے سال وفات میں دو مرتبہ یہ عمل کیا جس سے مقصود آخری مرتبہ اس کی صحت رہی ہوگی، "حضور اجلی" سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آپ کے سنہ وفات کا واقعہ ہے، جس وقت تقریباً پورا قرآن نازل ہو چکا تھا اور وہ مرتب بھی تھا، ورنہ پورے قرآن کی تلاوت کس طرح ہو سکتی،

ختم قرآن کے فضائل | ترتیب قرآن کا ایک ثبوت ختم قرآن کے فضائل کی حدیثیں بھی ہیں:

اس سلسلہ میں سب سے مفصل روایت مستدرک حاکم کی ہے:[۲]

عن ابی هریرة رضی الله عنه	ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص
قال قام رجل الی النبی صلعم	نے کھڑے ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[۱] بخاری ج ۲ باب کان جبریل یعرض القرآن علی النبی صلعم [۲] مستدرک کتاب فضائل القرآن باب فضیلة الحال والمرتحل ج اول ص ۵۶۹

فقال یا رسول اللہ ای العمل	سے پوچھا یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ کے
افضل او ای العمل احب الی	نزدیک سب سے افضل عمل یا سب سے پسندیدہ
اللہ تعالیٰ قال الحال والمرتحل	عمل کون ہے، آپ نے فرمایا منزل کرنے والا
الذی یفتح القرآن ویختمہ	اور کوچ کرنے والا جو قرآن کو شروع کر کے
صاحب القرآن یضرب من	اسکو ختم کرتا ہے اور اسکے اول کو اس کے
اولہ الی آخرہ ومن آخرہ الی	آخر تک پہنچاتا ہے اور ختم کر کے پھر شروع
اولہ کلما حل ارتحل[1]	کرتا ہے اور جب منزل کرتا ہے تو کوچ کر جاتا ہے

اس روایت سے بھی ظاہر ہوتا ہے قرآن مجید عہد نبوی میں مرتب ہو چکا تھا، ورنہ پھر اسکے دورے کے کیا معنی،

سورتوں کے لحاظ سے قرآن کی تقسیم عہد رسالت میں

اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے قرآن کو سورتوں کے اعتبار سے چار حصوں میں تقسیم فرمایا تھا، حدیث کی بہت سی کتابوں میں یہ روایت ہے "اللہ تعالیٰ نے مجھکو توراۃ کی جگہ سبع طوال عطا فرمائیں، انجیل کی جگہ مثانی اور زبور کی جگہ مائین اور مفصل مزید مرحمت فرمائیں،[2]

سبع طوال میں بقرہ، آل عمران، نساء، مائدہ، انعام، اعراف اور یونس ہیں۔

مائین میں یونس کے بعد کی وہ سورتیں جن میں سو یا اس سے کچھ کم و بیش آیتیں ہیں،

مثانی مائین کے بعد کی سورتیں سورہ قاف تک

مفصل قاف کے بعد سے آخر قرآن تک کی سورتیں،

پھر مفصل کی تین قسمیں ہیں طوال، اوساط اور قصار

---

[1] مستدرک حاکم ج اول ص ۵۶۹ [2] ابن جریر نے اسکے تمام طرق کی روایتیں جمع کر دی ہیں، ملاحظہ ہو ج ۱ ص ۳۴

اسی طریقہ سے تلاوت میں سہولت کے خیال سے قرآن مجید متعدد حزبوں میں تقسیم تھا اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام اس کے مطابق تلاوت کرتے تھے، اوس بن حذیفہ ثقفی کا بیان ہے کہ جب ثقیف کا وفد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ حاضر ہوا تو آپ روزانہ عشاء کے بعد ہمارے پاس تشریف لاکر باتیں فرماتے، ایک دن معمول سے دیر میں آئے، ہم لوگوں نے تاخیر کا سبب پوچھا، آپ نے فرمایا[1]

طرأ علی حزبی من القرآن فاجببت	قرآن کا جتنا حصہ میں روزانہ تلاوت کرتا تھا
ان لا اخرج حتی اقرأہ او قال	دفعتاً یاد آیا، اسلیے میں نے چاہا کہ اسکو پڑھکر
اقضیہ فلما اصبحنا سألنا	یا پورا کرکے نکلوں، اوس بن حذیفہ کا بیان ہے
اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	کہ دوسرے دن صبح کو ہم لوگوں نے رسول اللہ
من احزاب القرآن کیف	صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب سے پوچھا کہ آپ لوگ
تحزبونہ فقالو ثلاث وخمس	قرآن کو کس طرح حزبوں میں تقسیم کرتے ہیں،
وسبع وتسع واحدی عشرۃ	انھوں نے کہا تین یا پانچ یا سات یا نو یا
وحزب المفصل	گیارہ حصوں میں اور حزب مفصل میں،

حزب کے لغوی معنی گروہ یا کسی چیز کی باری کے ہیں، اور اصطلاح میں ٹکڑے یا حصہ کو حزب کہتے ہیں، حزب قرآن سے مراد اسکی وہ تقسیم ہے جو تلاوت اور ورد میں سہولت کے لیے کی جائے[2]، دعا اور اذکار کی کتابیں بھی حزب کہلاتی ہیں کہ تلاوت کے لیے انکو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، جیسے حزب البحر وغیرہ،

ان روایتوں سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ پورا قرآن عہد رسالت میں مرتب تھا، اور صحابہ کرام مختلف حزبوں میں تقسیم کرکے اس کی تلاوت کرتے تھے،

(باقی)

---

[1] مسند ابو داؤد طیالسی احادیث اوس بن حذیفہ ثقفی ص ۱۵۱ مطبوعہ دائرۃ المعارف، وسنن ابی داؤد ج اول باب تحزیب القرآن میں بتغیر الفاظ یہ روایت موجود ہے [2] مجمع بحار الانوار ج اول ص ۲۵۹

عہد اسلامی کا ہندوستان

مملوک سلاطین دہلی

از

مولانا سید ریاست علی ندوی

راقم سطور کے ایسے مضامین کا مجموعہ جن کا تعلق کسی نہ کسی حیثیت سے ہندوستان کے اسلامی دور کی تاریخ سے وابستہ ہے "عہد اسلامی کا ہندوستان" کے نام سے ترتیب پایا ہے، اور پریس میں جا چکا ہے، اس مجموعہ کی ترتیب میں زمانہ اور مباحث کے اعتبار سے کہیں کہیں خلا محسوس ہوا تو اس کمی کو چند نئے ابواب یا مضامین کو قلمبند کرکے پورا کیا گیا ہے، تاکہ مضامین میں ایک دوسرے سے ایک قسم کا ذہنی ربط قائم ہو جائے، اور مطالعہ کے وقت ایک مضمون کے بعد دوسرے کو پڑھنے میں ذہن کو اجنبیت محسوس نہ ہو، اسی سلسلہ میں "سلطنت مملوک سلاطین دہلی" کے عنوان سے ایک مستقل مقالہ تحریر پایا ہے جو اس مجموعہ میں مقالہ "سلطان شہاب الدین غوری اور ان کے قاتل، مقتل و مرقد" کے بعد رکھا گیا ہے، یہ نئے لکھے ہوئے حصے اپنی جگہ علحدہ علحدہ مضامین ہیں، مناسب معلوم ہوا کہ ان میں سے "مملوک سلاطین دہلی" کے دور کو ناظرین معارف کے سامنے بھی پیش کیا جائے،

"ر"

شہاب الدین غوری کی اچانک شہادت سے ہندوستان میں اس کے فوجی افسر ایک نازک صورت حال سے دوچار ہوئے، قطب الدین ایبک اس کا نائب السلطنت تھا، اور یہ ملک تین حصوں یعنی پنجاب،

شمالی ہند اور سندھ میں بٹ کر غزنی کے ماتحت تھا، اور ملک کی مختلف سمتوں میں یہاں کی قدیم سلطنتوں کے حکمراں اپنے مورچے سنبھالے ہوئے تھے، جیسا کہ اوپر گذرا شہاب الدین کے اولاد نرینہ نہ تھی، اس کا بھتیجا سلطان غیاث الدین محمود غور کا مالک تھا، مگر اس میں رہنمائی کی طاقت نہ تھی، اور خوارزمیوں کے اٹھتے ہوئے طوفان سے وہ غور و غزنی کو بھی بچانے کی صلاحیت نہ رکھتا تھا، اس کے تین ترک غلام فوجی گورنروں میں تاج الدین یلدز کرمان و سنکران کا جو افغانستان سے بالائی سندھ کی راہ پر واقع ہیں، مالک تھا، غزنی کا مالک بنا، اور اس لحاظ سے اس نے اپنے آپ کو ہندوستانی صوبوں کو اپنے ماتحت تصور کرنے کا مستحق سمجھا، مگر اس کے داماد ناصر الدین قباچہ تک نے اس کے اس استحقاق کو تسلیم نہیں کیا، اور قطب الدین ایبک کیلئے اس کا قبول کرنا زیادہ بعید از تصور تھا، اس لئے شہاب الدین غوری کی شہادت کے بعد ہی غزنی سے ہندوستان کا رشتہ ٹوٹ گیا، اور یہاں اس کے نام لیوا غلاموں کی آزاد سلطنت قائم ہوگئی،

سلطان قطب الدین ایبک ۶۰۲ھ - ۶۰۶ھ

سلطان قطب الدین ایبک شہاب الدین غوری کا نامور ترک سپہ سالار تھا، وہ ہندوستان میں اسلامی مساوات و اخوت کا روشن منارہ تھا، وہ غلاموں کی صف سے نکل کر سلاطین کے تخت پر بیٹھا اور اس کے بعد غلام در غلام سلاطین دلی کے تخت پر بیٹھتے گئے، قطب الدین پہلی مرتبہ ترکستان سے نیشاپور میں لایا گیا تھا، یہاں امام اعظم ابو حنیفہ کے اخلاف میں سے ایک صاحب علم بزرگ فخر الدین عبد العزیز کوفی قاضی القضاۃ کے منصب پر سرفراز تھے، انھوں نے اس بچہ کو خرید کر اپنی اولاد کے ساتھ مکتب میں بٹھایا جس میں اس نے علوم کی تحصیل کی اور شہسواری اور تیراندازی کے فنون سیکھے، قاضی صاحب کی وفات کے بعد ان کے بیٹوں میں سے کسی نے اس کو فروخت کیا، اور ایک سوداگر نے اس کو سلطان شہاب الدین غوری کے دربار میں گرانقدر قیمت لیکر فروخت کیا، اور یہیں وہ اپنی ٹوٹی ہوئی کن انگلی کی وجہ سے ایبک سے مخاطب کیا گیا، وہ اپنے آقا کا جان نثار تھا اور غوری کو بھی اس پر غیر معمولی اعتماد تھا، ترائن کی لڑائی کے بعد کھانڈو رائے کی لڑائی میں اتنا وہ کے

قریب قنوج کے راجہ جے چند کی آنکھ میں جب تیر لگا، اور وہ کام آیا تو پھر ایبک کی راہ روکنے والا کوئی موجود نہ تھا، بنارس تک اس نے قبضہ کرلیا، اور بیشمار دولت ہاتھ آئی، اسی موقع پر شہاب الدین نے "ہندوستان کی حکومت کی باگ اس کے ہاتھ میں دی، کالنجر کی فتح کے بعد چندیلی راجاؤں کے پایہ تخت مہوبا پر قبضہ کیا، پھر میرٹھ ہوتا ہوا راجہ گوبند رائے کی راجدھانی دلی میں پہنچا، جو غوری کی اطاعت قبول کرنے کے بعد منحرف ہوچکا تھا، اس کو شکست فاش دیا، پھر اس نے راجہ بھروچ سے اجمیر، راجہ بھیم دیو سے نہروالہ لے لیا، اور راجپوتوں کی آخری جتھہ بندی کو توڑا، اور پھر ملکی انتظام میں مصروف ہوگیا، سلطان شہاب الدین غوری نے آخری سفر ہند کے موقع پر ۶۰۲ھ/۱۲۰۶ء میں اس کو "ملک" کے خطاب سے سرفراز کیا،

سلطان شہاب الدین غوری کے دور تک یہ اس کا غلام تھا، اس کو رسمی آزادی اس وقت ملی جبکہ شہاب الدین غوری کے شرعی وارث اور شاہ غور سلطان غیاث الدین محمود نے اس کو بہ روایت یوم سہ شنبہ ۱۸ ذیقعدہ ۶۰۲ھ اور بہ روایت ۶۰۵ھ/۱۲۰۸ء میں "چتر و امارت بادشاہی و خطاب سلطانی و خط آزادی" عطا کیا، اور سلطان ایبک کے لقب سے لاہور میں اس کی تخت نشینی کی رسم انجام پائی، اس کے بعد اپنا پایہ تخت لاہور سے ہندوستان کے قلب اور اس کی پرانی راجدھانی دہلی میں لے آیا، اور وہی سلاطین دہلی میں سے پہلا سلطان قرار پایا،

دہلی کی سلطنت بھٹنڈے سے لکھنوتی تک تقریباً ایک ہزار میل طویل اور تقریباً پانسو میل عریض یعنی ۴½ لاکھ مربع میل کے رقبہ میں تھی، بنگال و بہار کو اگرچہ اختیار الدین محمد بن بختیار خلجی نے فتح کیا تھا، اور وہ اس پورے علاقہ کا صوبہ دار اعلیٰ تھا، لیکن اس نے نظم قائم رکھنے کیلئے دلی سلطنت کی سیادت قبول کرلی تھی، اور خود قطب الدین سے ملنے دلی آیا تھا، ایبک کا دوسرا حریف بہاء الدین طغرل جو بیانہ اور گوالیار کا فاتح تھا، اس کی موت سے وہ علاقہ بھی اس سلطنت کا حصہ بن چکا تھا، اگرچہ اس کی زندگی کے آخری دور میں بختیار خلجی کا حادثہ قتل پیش آیا، اور لکھنوتی کو نئی سیاسی صورت حال سے سابقہ کرنا پڑا،

بن کو بھلانے کا ایک کو نہ مل سکا تھا، قطب الدین ایبک نے ۶۰۷ھ؁ ۱۲۱۰ء میں لاہور میں چوگان کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر کر وفات پائی، اور وہیں اس کا مزار ہے،

قطب الدین ایبک وہ پہلا سلطان ہے جس نے ہندوستان کو اپنا دیس سمجھا، اس کیلئے ردے زمین پر کوئی ایسا دوسرا ملک نہ تھا جس سے اس کا وطنی رشتہ قائم رہ گیا ہو، وہی پہلا سلطان ہے جو ہندوستان کا پایہ تخت کو وسط ایشیا سے اٹھا کر دلی میں لایا، اس نے پنجاب کو جو ہندوستان سے مستقل طور پر علیحدہ ہو کر غزنی سلطنت کا حصہ بن چکا تھا، دوبارہ ہندوستان میں ملایا، اسی لئے اس نے اپنی تاجپوشی کی رسم لاہور میں منائی اور وہیں فرماں روا تھا، جو راجہ ہرش کے بعد پشاور سے بنگال تک کی سرزمین کو ایک چتر کے سایہ میں لے آیا، وہ اب ترکستانی اور غوری نہ تھا، ہندوستانی تھا، ترکستان اور غور اس کیلئے اسی طرح غیر تھے، جیسے راجہ ہرش اور اس کے اجداد کیلئے روس کے گھاس کے میدان، وہ راجہ ہرش ہی کے نقش قدم پر چلا، اور اس نے اس ملک سے طوائف الملوکی کا خاتمہ کیا، اور نہروالہ سے لکھنوتی تک کے باشندے ایک ملک اور ایک سلطنت کے شہری کہلائے،

ایبک کا عہد حکومت سلطان ایبک فطرۃً نیک سرشت، سخی اور عدل پرور تھا، اور بے دریغ انعام و اکرام سے لوگوں کو مالا مال کرتا، اس کی سخاوت ضرب المثل تھی، "لک بخش" (لاکھ کا بخشنے والا) اس کا لقب مشہور ہو گیا تھا، اس نے نہ صرف ہندوستان میں شہاب الدین غوری کی نیابت کی، بلکہ اپنے خسر تاج الدین یلدز کو غزنی کے تخت سے برطرف کر کے چالیس روز وہاں حکمرانی کی اور اپنی داد و دہش سے وہاں بھی نام آوری حاصل کی، اس نے دہلی کی تسخیر کے بعد ۲۰ سال تک حکمرانی کی جن میں آخر کے چار سال چند مہینوں میں صاحب چتر و تاج و تخت رہا، اس کی قلمرو میں اس کے نام کا سکہ و خطبہ جاری رہا، اس نے رعایا کے درمیان عام ہر دلعزیزی حاصل کی اور لوگوں کے دلوں میں اس کے عہد حکومت کی خوشگوار یاد مدت دراز تک باقی رہی،

ایبک کے دور کے ممتاز اکابر قطب الدین نیشاپور کی درسگاہ میں علوم کی تحصیل کر چکا تھا، اس کا دربار

علم و ادب کا مرکز تھا، مشہور ادیب و شاعر بہاء الدین محمد اوشی؛ اور جمال الدین محمد نصیر کے قصیدے اور بعض اشعار تذکروں اور سیاسی تاریخوں میں موجود ہیں، جن میں ایبک کے جود و سخا، شجاعت، فیاضی اور عدل پروری کو والہانہ انداز میں قلم بند کیا گیا ہے، شیخ صدر الدین محمد بن حسن نظامی نیشاپوری جو اپنے زمانہ میں انشاء، تاریخ و سیر کا امام سمجھا جاتا تھا، ایبک کے دامن دولت سے وابستہ تھا، اس نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب تاج المآثر جو مملوک سلاطین دہلی پر سب سے پہلی کتاب ہے، ایبک ہی کے حکم سے ۶۰۲ھ میں لکھنی شروع کی جس میں ۵۸۷ھ سے ۶۱۴ھ یا ۶۱۶ھ تک کے وقائع قلم بند کیے ہیں، اسی طرح اس عہد کے دوسرے ممتاز اعیان و علما میں شیخ احمد بن علی ترمذی متوفی ۶۰۲ھ، قاضی حمید الدین علی بن عمر محمودی اور قاضی وجیہ الدین کاشانی وغیرہ تھے، بعض اہل علم صاحب سیف بھی تھے، چنانچہ شیخ محمد بن احمد مدنی (مولود ۵۸۱ھ متوفی ۶۷۷ھ) جنھیں التمش کے دور میں غیر معمولی عزت و اکرام حاصل ہوا ایبک کے دور کے صاحب سیف فاتح تھے، کڑہ مانک پور اور ہنسوا وغیرہ کے قلعے انھی نے فتح کیے تھے، اسی طرح شیخ قدوۃ الدین بن میرک شاہ اسمٰعیلی معروف بہ قاضی قدوہ متوفی ۶۵۸ھ کے فوجی خدمات کے افسانے اودھ کے ۵۲ گانوؤں میں آج بھی شہرت رکھتے ہیں، ان کے صاحبزادے عزّ الدین عہدۂ قضا پر سرفراز تھے،

شمالی ہند میں مسلمانوں کے اس ابتدائی دور میں اسلامی علوم و فنون کا ایسا عام چرچا ہو گیا تھا، کہ یہاں کے ایک نو مسلم صاحب علم نے روایت حدیث میں ایک خاص قسم کی شہرت حاصل کی، ان کا ذکر فن رجال (جس میں حدیث کے راویوں کی سوانح عمری اور جرح و تعدیل ہوتی ہے) کی بیشتر اہم کتابوں میں آیا ہے، سرباتک ہندی متوفی ۶۳۳ھ کی طرح اس زمانہ میں شیخ ابو الرضا رتن بن کربال بن رتن ہندی کو شہرت حاصل ہوئی، ان کا ذکر صاحب المغنی، امام ذہبی، علامہ ابن حجر عسقلانی صاحب تبصیر المنتبہ، امام صفدی اور صاحب بحر زخار نے تفصیل سے کیا ہے، رتن بھٹنڈہ میں پیدا ہوئے، اور قبول اسلام کے بعد ارباب خیر و صلاح میں شمار کیے گئے، عمر طبعی سے بہت زیادہ سن پایا، اور ان کی اس روایت کا

نام چہار پھیلا کہ وہ عہد رسالت میں موجود تھے، ایک مرتبہ وہ تجارت کے سلسلہ میں حجاز گئے ہوئے تھے، ایک موقع پر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کے منصب رسالت پر فائز ہونے سے پہلے ملے، دوسری مرتبہ نبوت کے بعد انھیں زیارت کا موقع ملا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں عمر کی درازی کی دعا دی، اور بعض باتیں ارشاد فرمائیں، جب ان روایتوں کی شہرت عالم اسلام میں پہنچی تو بڑے بڑے ائمۂ فن ان سے ملنے، روایتیں لینے اور تحقیق حال کرنے کیلئے ہندوستان آئے، اور ان کی تصدیق یا تکذیب کی اور یہ فن رجال کا ایک مستقل موضوع بن گیا، اور رجال کی مشہور کتابوں میں یہ جرح و تعدیل منضبط ہیں، اور ائمۂ فن نے اپنے محاکمے لکھے ہیں، انھوں نے سنہ ۶۰۰ھ کے بعد وفات پائی اور بھٹنڈہ میں مدفون ہوئے،

علامہ نظام الدین فرغانی فقہ و اصول کے ماہرین میں سے تھے، ہندوستان میں تشریف آئے قسمت نے انھیں بنگال سے وابستہ کیا، محمد بن بختیار خلجی نے ان کی قدردانی کی اور بنگال میں ان کے وجود سے علم کا چراغ روشن رہا،

صلحائے امت ایبک کے عہد حکومت کو صلحائے امت میں سے ہندوستان کے سرتاج مشائخ حضرت خواجہ سید معین الدین حسن بن حسن چشتی سجزی اجمیری قدس سرہٗ کی ذات بابرکات کے وجود گرامی کا شرف حاصل ہے، حضرت خواجہ سجستان میں ۵۳۱ھ میں پیدا ہوئے[۱۲]، ۱۵ سال کی عمر میں سایۂ پدری سر سے اٹھ گیا، انگور کا باغ اور ایک پن چکی وراثت میں پائی، کسی مجذوب حال کا باغ سے گذر ہوا اور حضرت خواجہ پر جذب ربانی طاری ہو گیا، ترک علائق کرکے حق کی طلب و جستجو میں اٹھ کھڑے ہوئے، سجستان سے سمرقند تشریف لے گئے، قرآن پاک حفظ کیا، علوم کی تحصیل فرمائی، پھر مختلف مقامات کی سیر کرتے ہوئے قریۂ ہارون میں حضرت خواجہ عثمان ہارونی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے، اور شیخ کی خدمت میں اپنی زندگی کے بیس سال گذار دیئے، انہی کی معیت میں دیار اسلامی کی سیاحت

کی، اور شیخ نے خرقۂ خلافت سے سرفراز فرمایا، پھر مختلف مقامات پر اس دور کے ممتاز صالحین امت شیخ نجم الدین کبریٰ، حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ، حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ وغیرہ اکابر وقت کی صحبت سے فیضیاب ہوئے، آخر میں مدینہ منورہ میں حاضری دینے کے بعد ہندوستان کا رخ فرمایا، اور لاہور میں آکر حضرت شیخ ہجویری اور حضرت حسین زنجانی کے مزار پر چلہ کش ہوئے، پھر ملتان میں تشریف لائے، اور یہاں پانچ برس قیام فرماکر ہندوستان کی زبان سنسکرت یا پراکرت سیکھی اور پھر وہاں سے دہلی تشریف لائے اور یہاں سے اجمیر کا قصد فرمایا، اور ۵۶۱ھ یا ۵۶۲ھ سے وہاں مستقل توطن اختیار فرمایا، اس وقت تک یہ مقامات پرتھوی راج کے قبضہ میں تھے، مسلمان کشور کشاؤں کے زیر نگیں نہیں آئے تھے، مگر ان مرکزی شہروں میں حضرت خواجہ کے فیض صحبت سے اسلام کی روشنی پھیلی اور توحید اسلام کا نام لینے والوں کی ایک جماعت تیار ہو گئی، خصوصاً اجمیر میں ایک خلق کثیر حلقہ بگوش اسلام ہو گئی جن میں پرتھوی راج کے چند خاص شاہی عمال بھی تھے، جس کی وجہ سے اجمیر کے ارباب حکومت میں سراسیمگی پھیلی، اور عمال حکومت حضرت خواجہ کے درپے آزار ہوئے، اور اجمیر سے انھیں جلاوطن کرنا چاہا، دوسری طرف دھرم شاستر کے جوگیوں نے اپنی تپسیا سے جو طاقت حاصل کی تھی، اس کو حضرت اجمیریؒ کے خلاف استعمال کرتے رہے، اور ریاضت و مجاہدہ اور تپسیا سے حاصل کی ہوئی قوتوں میں جو معرکہ آرائی ہوئی، اس میں حضرت خواجہ اجمیریؒ کو کامرانی حاصل ہوئی، اور جوگیوں کے زیر ہونے کے بعد ایک کثیر خلقت اسلام کے آغوش میں گئی

اسی اثنا میں سلطان شہاب الدین غوری نے ۵۸۸ھ میں پرتھوی راج کو شکست دے کر دہلی کی سلطنت تو قطب الدین ایبک کے سپرد کیا، اور اجمیر کی ولایت پر سید وجیہہ الدین مشہدی مامور کئے گئے، جن کی صاحبزادی سے حضرت خواجہ کا عقد نکاح انجام پایا، اور یہ مسلم حکمراں خاندان بھی حضرت خواجہ کے عقیدت مندوں میں داخل ہو گیا، اور حضرت خواجہ کے روحانی فیوض و برکات کے ساتھ سیاسی اقتدار سے اسلام کو اس دیار میں مزید تقویت حاصل ہوئی،

حضرت خواجہ کا وجود گرامی ہندوستان میں روحانی فیوض و برکات کا ایسا منارہ ثابت ہوا جس سے ہند کے گوشہ گوشہ میں روشنی پہنچی اور لاکھوں بندگان خدا نے ہدایت حاصل کی، سلسلۂ چشتیہ کا فیض حضرت والا ہی کے توسط سے پہلی مرتبہ ہندوستان میں عام ہوا، اور آج بھی اس کے انوار قدس سے ہندوستان میں روحانیت کا نظام قائم ہے اور ارباب بصیرت کیلئے اس کے چپہ چپہ میں درخشانی موجود ہے، حضرت خواجہ ۶۲۷ھ یا بہ روایت ۶۳۲ھ یا ۶۳۳ھ میں واصل بحق ہوئے، اور اجمیر کی درگاہ آج بھی زیارت گاہ خلائق ہے،

حضرت خواجہ اجمیری کی طرف تین کتابیں انیس الارواح، رسالہ درکسب نفس، اور دلیل العارفین منسوب ہیں، اول الذکر میں حضرت خواجہ عثمان ہارونی کے ملفوظات ہیں، جن کو غالباً حضرت خواجہ اجمیری کے کسی مرید نے ان سے سن کر یکجا کیا ہے، اور دلیل العارفین میں خود حضرت خواجہ اجمیری کے ملفوظات ان کے ارشد خلیفہ حضرت بختیار کاکیؒ نے یکجا کئے ہیں، اور یہ کتاب اہل صلاح میں متداول ہے، حضرت خواجہ اجمیری کی طرف امام حسین علیہ السلام کی شان میں وہ مشہور رباعی بھی منسوب ہے، جس کا آخر مصرع "حقا کہ بنائے لا الہ ہست حسین" ہے،

حضرت خواجہ اجمیری کے خلفاء و مریدین میں حضرت سید حسین خنگ سوار کا اسم گرامی بھی ہے، وہ حضرت سید وجیہ الدین مشہدی کے بھتیجے تھے، اور ان کے بعد ایبک کی طرف سے اجمیر کی ولایت پر مامور کئے گئے، مگر حضرت خواجہ کی نظر توجہ سے ان کی حالت میں انقلاب آیا، وہ حکومت کے فرائض کے ساتھ دین کی اشاعت کی بھی خدمت انجام دیتے رہے، یہاں تک کہ ۶۰۷ھ میں جام شہادت نوش فرمایا،

حضرت خواجہ اجمیریؒ نے اپنے خلیفہ ارشد حضرت مخدوم سید قطب الدین بختیار کاکیؒ کو دلی میں قیام کرنے پر مامور فرمایا، سلطان ایبک کو ان سے استفادہ کا شرف حاصل تھا، دلی کی جامع مسجد قوۃ الاسلام

کی بنا و تعمیر اس نے ۵۹۲ھ میں کی، یہ اس عہد کی مشہور یادگار ہے، مسجد قطب صاحب ہی کی طرف منسوب ہوکر مشہور ہوئی،

شیخ یعقوب بن علی لاہوری اس عہد کے ممتاز ارباب فضل وصلاح میں سے تھے ۵۳۵ھ میں لاہور تشریف لائے، ان سے ایک خلق کثیر نے رشد و ہدایت پائی ۶۰۲ھ میں وصال فرمایا،

سلطان ایبک کے عہد حکومت کے یہی ممتاز علما و صلحاء امت تھے، اور انہی بزرگوں کے سایۂ شفقت کا یہ اثر تھا کہ ایبک خود بھی دینداری و پارسائی اور زہد و ورع سے مالامال ہوا،[۱]

آرام شاہ ۶۰۷ھ آرام شاہ ایبک کا لے پالک بیٹا تھا، لاہور کے فوجی افسروں نے ایبک کی وفات کے بعد اس کی بادشاہی کا اعلان لاہور میں کیا، مگر قسمت اس منصب کیلئے ایک دوسرے ترک نوجوان شمس الدین التمش (التتمش) کو منتخب کر چکی تھی، وہ قطب الدین کا عزیز خادم اور داماد اور اقطاع بدایوں کا گورنر تھا، دلی کے فوجی افسروں نے اس کو مدعو کرکے تخت پر بٹھا دیا، آرام شاہ نے ۶۰۷ھ میں دلی پر فوج کشی کی مگر وہ لڑائی میں مارا گیا اور آٹھ مہینے کے اندر اس کی حکمرانی کا خاتمہ ہوگیا،

شمس الدین التمش ۶۰۷ھ تا ۶۳۳ھ شمس الدین التمش ترکی قبیلہ البری کا خان زادہ تھا، اس کا باپ ولیم اس قبیلہ کا ایک بڑا سردار تھا اور التمش سے غیر معمولی محبت رکھتا تھا، کہا جاتا ہے کہ اس کے

---

[۱] طبقات ناصری ص ۱۳۵ تا ۱۴۱، ۱۵۰، ۸۹، ۹۶، ۵۹، ۱۳۴، ظفر الوالہ ج ۲ ص ۳۸۶ تا ۶۸۸ و تاج المآثر ص ۸۳، ۲۰۲، ۲۰، فخر الدین ص ۲۸، ۳۰، ۳۲، ۲۰۲، ۲، فرشتہ ج ۱ ص ۶۲، مرآۃ جہاں نما ص ۵۲، لب اللباب ج ۲ ص ۸۸، ۸۹، ۱۰۶، ۱۱۱ تا ۱۱۹۔ نزہۃ الخواطر ص ۹۹ (سوانح ایبک) ۲۰۰ (حسن نیشاپوری) ۱۲۱ (ترمذی) ۱۰۳ (محمودی) ۲۳۹ (کاشانی) ۱۹۶ (قاضی قدوہ) ۱۴۴ (رتن) ۲۳۴ (فرغانی) ۱۳۶ (حضرت خواجہ) ۱۴۲ (حضرت بختیار سوار) ۲۴۰ (لاہوری) مونس الارواح و تذکرۃ الصالحین وغیرہ، فونڈیشن آف مسلم رول ان انڈیا ص ۸۲ تا ص ۰۰، و تاریخ ہند سید ہاشمی، و تاریخ ہندوستان ذکاء اللہ،

بھائیوں نے رشک و حسد سے اس کو ایک پردیسی کے ہاتھ فروخت کر دیا جس سے بخارا کے جمال الدین چست قبا نے اس کو خریدا اور بیچنے کیلئے غزنی کے بازار میں لایا، وہ خوش رو ترک بچہ تھا، جمال الدین نے گراں قیمت چاہی شہاب الدین غوری نے اس کی خریداری کی ممانعت کر دی، پھر تیسرے سال ایبک کو اجازت دی کہ وہ غزنین کے حدود سے باہر جا کر اس کو خرید سکتا ہے۔ چنانچہ جمال الدین اس کو دلی میں لایا یہیں وہ خریدا گیا غزنی میں اس کے خریدے جانے کی ممانعت اور دلی میں اسکی خریداری کے واقعہ کا پیش آنا گویا قدرت کو یہ اشارہ کرنا تھا کہ مستقبل میں وہ غزنی سے بے تعلق رہیگا، اور دلی ہی سے اس کو شرف توطن کا فخر حاصل ہوگا، چنانچہ اس نے ہندوستان ہی میں اسلام کی تعلیم مساوات کے ہاتھوں ترقی کی، اور مسند حکومت پر بیٹھا۔

اس نے غیر معمولی مشکلات کے ساتھ زمام حکومت ہاتھ میں لی تھی، آرام شاہ کے خاتمہ سے اس کی مشکلات کا خاتمہ نہیں ہوا، ایبک کا حریف ناصر الدین قباچہ ابھی زندہ تھا، اور خصوصاً ایبک کی وفات کے بعد ہندوستان کے تاج و تخت کیلئے جو سلطان شہاب الدین غوری کا ترکہ تھا، اپنے کو مستحق سمجھتا تھا، اس نے اپنی مملکت کو ملتان، بھٹنڈا، کہرام اور سرستی تک وسیع کر لیا تھا، اور آرام شاہ کے بعد اس نے لاہور پر بھی قبضہ جما لیا تھا، اسی طرح ایبک کے دوسرے حریف تاج الدین یلدز نے بھی اس موقع کو غنیمت سمجھا، اور ایبک کے بعد دلی کے تخت کا دعویدار بنا، اور آگے بڑھ کر پنجاب کے کچھ حصہ پر قبضہ کر لیا، دوسری طرف بنگال میں علی مردان خان نے بختیار خلجی کے قتل کے بعد سلطان علاء الدین کے لقب سے اپنی بادشاہی کا اعلان اور اپنا سکہ اور خطبہ جاری کر دیا تھا، اسی طرح راجپوتوں نے بھی اس موقع سے فائدہ اٹھایا، اور جالور اور رنتھمبور وغیرہ اہم قلعوں کو قبضہ میں لے لیا تھا، اور خود پایہ تخت دلی بھی التمش کے مخالفوں سے خالی نہ تھا، آرام شاہ کے حامی افسروں کی سازشوں کا جال یہاں پھیلا ہوا تھا،

التمش نے اپنے حریفوں اور مخالفین پر اجمالی نگاہ ڈالی اور بڑی دانشمندی اور حکمت عملی سے راہ عمل طے کی، اس نے سب سے پہلے مغربی سرحد سے یکسوئی حاصل کرنے کیلئے تاج الدین یلدز کی طرف دست مصالحت بڑھایا، اور یلدز کو مطمئن کر کے قباچہ پر فوج کشی کی، اور ۱۲۱۶ء میں لاہور اس سے چھین لیا، اس طرح اپنے

حدود حکومت مغرب میں شوالک پہاڑی اور مشرق میں بنارس تک سدکھے اور ان کے انتظام میں مصروف ہوگیا، اس کے بعد جب مغربی سرحد پر خوارزمیوں نے اس کے حریف ملیدز کو پسپا کیا، اور وہ لاہور میں آکر پناہ گزیں ہوگیا، اور ملتان بھٹنڈہ اور کہرام تک اس کے اثرات پھیلے تو اس موقع پر اس نے تاج الدین کے قصہ کو پاک کرلینا چاہا، چنانچہ اس پر فوج کشی کی اور اس کو گرفتار کرکے بدایوں کے قلعہ میں قید کر دیا، جہاں اس نے وفات پائی، اس کے بعد قباچہ نے پھر لاہور پر قبضہ کرلیا، اور التمش کی فوج نے اس کو بھی زیر کرکے اس سے پنجاب کو خالی کرالیا، اور ۶۱۴ھ میں پہلی مرتبہ التمش کا گورنر پنجاب میں مقرر ہوسکا،

اس کے بعد ملک کے گوشہ گوشہ میں اس کی فتوحات اور اثر و نفوذ کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا گیا، چنانچہ اس نے مشرق میں بنارس سے آگے بڑھ کر اڑیسہ کے راجہ جاج سنگہ پر فوج کشی کی اور اس کو باجگذار بنایا، پھر ۶۲۲ھ ۱۲۲۵ء میں بنگال کی سمت گیا جہاں علی مردان خاں کے بعد حسام الدین عوض ملقب بہ سلطان غیاث الدین اپنا سکہ و خطبہ جاری کئے تھا، وہ مقابلہ کی تاب نہ لاسکا، نذر پیش کرکے اطاعت کی، التمش نے اپنے چھوٹے بیٹے ناصر الدین محمود کو بنگال کا گورنر بنایا، اور صوبہ بہار کو علیحدہ کرکے ملک عز الدین کے سپرد کیا، غیاث الدین نے التمش کی واپسی کے بعد سر اٹھایا تو ملک عز الدین نے ۶۲۳ھ میں فوج کشی کرکے اس کا خاتمہ کیا، ناصر الدین محمود نے ۶۲۶ھ میں وفات پائی تو التمش ۶۲۶ھ میں تعزیت کے نام سے دوبارہ مشرقی بنگال گیا، اور ۶۲۷ھ میں علاء الدین خاں کو وہاں کی حکومت تفویض کی، مشرقی صوبوں سے یکسوئی حاصل کرکے وہ مشرقی راجپوتانہ کی طرف متوجہ ہوا، چنانچہ ۶۲۳ھ ۱۲۲۶ء میں قلعہ رنتھمبور اور چتور سر ہوئے، پھر مغربی راجپوتانہ میں قلعہ منڈور ۶۲۴ھ ۱۲۲۶ء میں فتح ہوا، اس کے بعد ۶۲۵ھ ۱۲۲۸ء میں سندھ پر حملہ آور ہوا، اور نہ صرف اوچھ قبضہ میں آیا بلکہ ناصر الدین قباچہ نے پسپا ہوکر دریا میں کود کر جان دیدی، اور پورا علاقہ سندھ پہلی مرتبہ دلی سلطنت کے ماتحت آگیا، اس طرح کوہستان سلیمان سے کوہستان کھاسی (آسام) تک اور ہمالہ سے بندھیاچل تک کا وسیع رقبہ مرکزی سلطنت دہلی کی عملداری میں آگیا، اسی طرح اس نے ۶۲۹ھ میں گوالیار اور ۶۳۱ھ میں مالوہ اور قلعہ بھیلسا پر اور ۶۳۲ھ میں اجین پر اقتدار حاصل کیا، اس طرح سلطنت دہلی کے جنوبی حدود دریائے نربدا تک وسیع ہوگئے،

غرض التمش ہندوستان میں ایک عظیم تر سلطنت کا بانی بنا، اس زمانہ کی رسم کے مطابق اس کے نام ہندوستان کی شہنشاہی کا پروانہ دربار خلافت بغداد سے بھی آگیا، اس رسمی حیثیت سے ضابطہ کے ساتھ سلطنت غزنی سے اس کے جداگانہ وجود کی مزید تصدیق ہوگئی۔

التمش نے ۶۳۳ھ/۱۲۳۶ء میں وفات پائی اور قطب صاحب کی مسجد کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

اخلاق وعادات | التمش نیک خو اور عدل پرور تھا، انصاف کیلئے خاص دربار میں مظلوموں کی فریاد سنتا، فریادیوں کو رنگین کپڑے پہن کر دربار میں آنے کی ہدایت تھی، رات کے ناگہانی حادثوں کیلئے زنجیر لٹکائی گئی تھی کہ اس کو اطلاع دی جاسکے، وہ صاحب علم وفضل اور علماء و ماہرین فن کا قدردان، اور دیندار، تہجد گزار اور صاحب زہد وورع تھا، اور صلحائے امت کی خدمت میں حاضر رہنے کو سعادت کونین سمجھتا تھا۔

التمش کا عہد حکومت "خوانین شمسیہ" | التمش کے طویل دور حکمرانی میں ہندوستان کی سلطنت کے استحکام کیلئے جو کوششیں ہوئیں [illegible] اور جب ان سے اس کا اور اس کے خاندان کا [illegible] یہی وقار قائم ہوگیا [illegible] ملک و خوانین [illegible] بن گئے، یہاں تک کہ ۶۳۳ھ میں "خوانین شمسیہ" کے نام سے ایک جماعت کی تاسیس [illegible] جس کو زمانہ حال کی اصطلاح میں دارالامراء کہا جاسکتا ہے، لیکن اس کے اختیارات دارالامراء سے زیادہ [illegible] موجودہ [illegible] کی مجلس کے ایوان عام کے اختیارات کے مانند تھے، اقتدار اعلیٰ جو التمش کے ہاتھوں میں [illegible] استعمال کا حق رفتہ رفتہ اسی مجلس "خوانین شمسیہ" کے ہاتھوں میں آگیا تھا۔ التمش کے بعد یہی خوانین سلاطین کے [illegible] نصب کے مختار بن گئے، وہ سلاطین کے انتخاب میں التمش کے خاندان یا اس کے موالی (آزاد کردہ غلام) کے انتساب کا لحاظ رکھتے تھے، اور اسی مناسبت سے بعض مورخین نے ان "خوانین شمسیہ" کے قائم کئے ہوئے سلاطین کو "سلاطین شمسیہ" کے نام سے موسوم کیا ہے۔

وزراء | اس عہد کے ممتاز اہل علم منصب وزارت پر مامور کئے گئے تھے، وزارت عظمیٰ کے منصب پر نظام الملک قوام الدین محمد بن ابوسعد جنیدی سرفراز تھے، جن کے سامنے خلیفہ بغداد کا قلمدان وزارت بھی رہ چکا تھا، وہ ۶۰۷ھ

مین منصب وزارت پر سرفراز اور التمش کے پورے دورِ حکومت مین اس منصب پر مامور رہا۔ اس کے بعد اُس نے رکن الدین فیروز شاہ کی حمایت کی، اور اس کے خاتمہ کے بعد وہ بھی سیاست سے کنارہ کش ہوگیا۔ اسی طرح مولانا تاج الدین دہلوی صاحب دیوان رسائل (انچارج سکریٹریٹ) تھے، بعض موقعون پر قصائد بھی لکھے ہین۔ بہاء الملک تاج الدین حسن بن احمد اشعری المقتول ۶۲۳ھ جو سلطان ناصر الدین قباچہ کے وزرا مین تھا، اس کے زوال کے بعد التمش کے دامنِ دولت سے وابستہ ہوا، وہ اپنے دور کے ممتاز اہلِ علم مین شمار کیا جاتا تھا، رکن الدین فیروز شاہ کے دور مین وزارت کے منصب پر مامور کیا گیا، اسی طرح عین الملک فخر الدین حسین بن احمد اشعری سلطان ناصر الدین قباچہ کے دربار مین ۶۱۲ھ سے ۶۲۵ھ تک منصبِ وزارت پر فائز رہا، اس کی موت کے بعد وہ بھی التمش کے دامنِ دولت سے وابستہ ہوا، اس لئے اس کو رکن الدین فیروز شاہ کا اتالیق مقرر کیا اور اس کے عہد مین وزارت کے منصب پر مامور رہا،

شیخ الاسلام | اس عہد مین شیخ الاسلامی کے منصب پر مولانا جلال الدین سرفراز تھے۔ اُن کی وفات کے بعد مولانا نجم الدین صغریٰ سرفراز کئے گئے۔ پھر آگے چل کر اپنے بعض اعمال کی بنا پر سلطان کے عتاب مین آئے۔ اور حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کو یہ منصب پیش کیا گیا،

قضاۃ | التمش کے عہد کے ممتاز قضاۃ مین قاضی سعد الدین کروری، قاضی حمید الدین ناگوری، قاضی نصیر الدین معروف بہ کاسہ لیس، قاضی جلال الدین، قاضی کبیر الدین، اور قاضی قطب الدین کاشانی متوفی ۶۳۳ھ وغیرہ تھے۔

علماء و فضلاء | اس دور کے ممتاز علماء و فضلاء میں ارباب مسند درس و کمال اساتذہ میں مولانا شرف الدین ابو توامہ حنفی دہلوی جو ہاکے حلقہ درس میں شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری بھی رہ چکے تھے، شیخ علی بن حامد کوفی، شیخ فخر الدین عمید تولکی جن کے بیشتر قصائد بھی التمش کی شان میں ہیں، اور ملا جلال الدین وغیرہ تھے، اسی طرح اس عہد کے ممتاز اہل قلم میں نور الدین محمد عوفی کا نام شہرت رکھتا ہے، اس نے اپنی مشہور کتاب لب الالباب، ناصر الدین قباچہ کے عہد میں وزیر عین الملک کے لئے تصنیف کی، جو گب میموریل کی طرف سے عبد الوہاب قزوینی کی تصحیح و تحشیہ کے ساتھ چھپ چکی ہے

پھر اس نے التمش کے دربار میں پہنچ کر وزیر نظام الملک جنیدی کے نام اپنی دوسری کتاب جوامع الحکایات ولوامع الروایات معنون کی اس کے دیباچہ میں التمش اور نظام الملک کے نام سے انتساب کرنے کا ذکر آیا ہے[1] اسی طرح عوفی نے قاضی تنوخی متوفی ۳۸۴ھ کی الفرج بعد الشدۃ کو عربی سے فارسی میں منتقل کیا ہے۔

شعراء | التمش کے عہد کے ممتاز شعراء میں بہاء الدین علی بن احمد جاجی کو امتیاز حاصل تھا، وہ صاحب سیف امراء میں سے تھا، جاج نگر کا قلعہ فتح کیا تھا، آگے چل کر التمش نے اس کو بدایوں کا امیر داد (مجسٹریٹ) مقرر کر دیا تھا۔

مشائخ | اس عہد کے اکابر مشائخ طریقت میں سے حضرت مخدوم خواجہ سید قطب الدین بختیار کاکیؒ متوفی ۶۳۳ھ سے التمش کو غیر معمولی عقیدت تھی، التمش کے پورے دور میں حضرت کے وجود گرامی سے روحانی فیوض و برکات کا سرچشمہ جاری رہا، اور چشتیت کی سرمستی سے پورا ہندوستان سرشار رہا۔

حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ ماوراء النہر کے قصبہ اوش میں پیدا ہوئے، ڈیڑھ سال کی عمر میں سایہ پدری سر سے اٹھ گیا، والدہ کے دامن تربیت میں پرورش پائی، پانچ سال کی عمر میں مدرسہ میں داخل کئے گئے، شیخ ابو حفص اوشی سے علوم کی تحصیل کی، اور ۱۸ سال کی عمر میں حضرت خواجہ سید معین الدین چشتیؒ سے دست بیعت ہوئے، اور اس عہد کے اکابر مشائخ حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ، شیخ اوحد الدین کرمانی، شیخ برہان الدین چشتیؒ، اور شیخ محمود اصفہانی کے روبرو حضرت خواجہ معین الدینؒ نے انھیں اپنا خرقہ خلافت عطا فرمایا، کچھ دنوں کے بعد جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ہندوستان تشریف لائے، تو انھوں نے بھی شوق دیدار میں ہندوستان کا سفر اختیار کیا، بھی

---

[1] اگرچہ اس کا اصل فارسی نسخہ ابھی تک چھپا نہیں ہے، مگر کثرت سے نسخے موجود ہیں ڈاکٹر نظام الدین نے اس پر اپنی محققانہ کتاب لکھی ہے، جو گب میموریل کی طرف سے چھپ چکی ہے، اور فارسی متن کی چیدہ حکایتوں کا اردو ترجمہ دو جلدوں میں انجمن ترقی اردو کی طرف سے اختر شیرانی کے قلم سے منتقل ہو کر چھپ چکا ہے، فارسی متن کا ایک نسخہ دار المصنفین کے کتب خانہ میں بھی موجود ہے، سلطان مراد کے حکم سے جیسا کہ کشف الظنون میں ذکر آیا ہے ابن عرب شاہ متوفی ۸۵۴ھ نے اس کو ترکی زبان میں منتقل کیا، پھر بخاری متوفی ۹۱۴ھ سلطان محمد خاں کیلئے اور اسماعیل بن جلال الدین متوفی ۹۷۲ھ سلطان بایزید کیلئے ترجمہ کرتے گئے، پھر محمد بن اسعد قیصری نے اس کا انتخاب تیار کیا۔

منزل ملتان میں قرار پائی، یہاں حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کا حلقۂ صحبت قائم تھا، حضرت جلال الدین تبریزی بھی ان دنوں یہیں تشریف فرما تھے، حضرت قطب الدین بھی کچھ دنوں یہاں قیام فرما رہے، پھر دہلی تشریف لائے، حضرت خواجہ اجمیری نے انھیں دہلی ہی میں قیام رکھنے کا حکم عطا فرمایا، اور یہاں ان کے فیوض و برکات کا سرچشمہ جاری ہوگیا، خود سلطان التمش کو ان سے غیر معمولی عقیدت پیدا ہوگئی اس نے ہفتہ میں دو مرتبہ حضرت کی خدمت میں حاضری دینا اپنا معمول بنالیا اور ان کے فیض صحبت سے بہرہ اندوز ہوتا رہا، حضرت کی طرف سلطان التمش کے غیر معمولی رجحان کو دیکھ کر اس عہد کے شیخ الاسلام نجم الدین صغری کو ان سے شکوہ پیدا ہوا، حضرت خواجہ اجمیری دو مرتبہ اجمیر سے اس عہد میں دہلی تشریف لائے، اور جب مولانا نجم الدین صغری نے حضرت خواجہ اجمیری سے حضرت قطب الدین کا شکوہ کیا، اور حضرت نے انھیں دہلی سے روانہ ہونے کا حکم فرمایا تو سارا دلی فرط عقیدت سے حضرت کے نقش قدم کی خاک پاک کو اٹھا اٹھا کر سر دل پر رکھنے لگا، حضرت خواجہ نے اہل دلی کی یہ عقیدت دیکھ کر یہیں قیام رکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی، کہ ایک دل یعنی شیخ الاسلام نجم الدین صغری کو خوش کرنے کیلئے اتنے دلوں کو دکھایا نہیں جاسکتا، حضرت خواجہ اجمیری کے اس فیصلہ سے سلطان التمش کو بھی سکون خاطر حاصل ہوا، دہلی میں خلق خدا جس طرح پروانہ وار ان کے گرد اکٹھا ہوئی اس کی مثال اس سے پہلے نہیں گذری تھی،

حضرت پر وجد و سرمستی کا کیف طاری ہوتا تھا، وفات کا سانحہ بھی اسی سلسلہ میں پیش آیا، قوال حضرت جامی کی غزل گا رہا تھا جب اس شعر پر پہنچے:

کشتگان خنجر تسلیم را ہر زماں از غیب جانے دیگر است

تو حضرت پر وجد طاری ہوا، تین دن تک یہ کیفیت طاری رہی، قوال بھی شعر کو دہراتا رہا یہاں تک کہ واصل بحق ہوئے۔

حضرت کی طرف دو کتابیں منسوب ہیں ایک تو ان کا فارسی دیوان ہے، دوسری فوائد السالکین کے نام سے ان کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جس کو ان کے خلیفہ حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ نے جمع کیا ہے،

شیخ نور الدین مبارک بن عبداللہ حسینی غزنوی سلطان شہاب الدین غوری کے وقت سے صاحب منزلت مشائخ میں سے تھے، غزنی میں پیدا ہوئے، اور اپنے ماموں شیخ عبدالواحد بن شہاب احمد غزنوی سے تحصیل کی، پھر بغداد کا سفر کیا، حضرت شہاب الدین سہروردی سے فیض حاصل کیا، سلطان شہاب الدین غوری اپنی لڑائیوں میں جانے سے پہلے ان سے دعا کا طالب ہوتا تھا، اس نے شیخ الاسلامی کے منصب پر انھیں سرفراز کیا، یہ غزنی میں مقیم تھے، پھر ہندوستان تشریف لے آئے، سلطان التمش ان کی غیر معمولی تعظیم کرتا، صدر مجلس میں بٹھاتا، دست بوسی کرتا، اور اپنی مہموں میں ان سے دعاؤں کا طالب ہوتا تھا، ۶۳۲ھ میں انھوں نے وفات پائی، اور حوض شمسی سے مشرق میں قدیم دہلی میں مدفون ہوئے۔ (ص ۲۰۲)

اس دور کے ممتاز مشائخ میں حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کا درجہ بہت بلند ہے، وہ حضرت قطب الدین بختیار کاکی کے ہمعصر تھے، ۵۶۵ھ میں ملتان کے نواح میں پیدا ہوئے، عالم اسلامی میں علوم دین اور تصوف کے جو اہم مرکز تھے، وہاں کسب و تحصیل فرمایا، اور ملتان میں اقامت اختیار فرمائی، حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کے خلیفہ اور ہندوستان میں سہروردی سلسلہ کے بانیوں میں سے تھے، ان کے فیض سے علم حدیث و علم طریقت کی روشنی پھیلی، خصوصاً سندھ و ملتان کا علاقہ ان کے فیوض و برکات سے مالا مال تھا، اگرچہ ان کا قیام ناصر الدین قباچہ کے حدود حکومت میں تھا، اور قباچہ و التمش میں دیرینہ اختلاف قائم تھا، یہ التمش کو حق پر تصور کرتے تھے، اور ایک موقع پر جب قباچہ نے ایک سازش کا جال پھیلایا، اور التمش کو نقصان پہنچنے کا خطرہ پیدا ہوا تو حضرت بہاء الدین اور قاضی شرف الدین اصفہانی نے التمش کو خط لکھ کر آگاہ کر دینا دینی فرض تصور کیا، مگر وہ مکتوب پکڑ لیا گیا اور قباچہ نے احتساب کیلئے دربار میں انھیں اور قاضی شرف الدین اصفہانی کو بلوایا، اور مکتوب کو قاضی اصفہانی کے ہاتھ میں دیکر جواب طلب کیا، وہ خاموش رہے، قباچہ نے اسی لمحہ جلاد سے انھیں تہ تیغ کرا دیا، پھر وہ حضرت بہاء الدین زکریا کی طرف متوجہ ہوا، اور آپ کے ہاتھ میں مکتوب کو رکھ دیا، حضرت نے فرمایا "میں نے اس کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے لکھا ہے اور صحیح لکھا ہے، یہ جواب سنتے ہی قباچہ پر لرزہ طاری ہو گیا، اور عزت و احترام

سے انہیں رخصت کر دیا، اس کے بعد جب شیخ الاسلام نجم الدین صغری نے حضرت جلال الدین تبریزی پر ہشماز کرکے زنا کی تہمت لگائی تو سلطان التمش نے ملک کے علما و صلحا کی ایک مجلس منعقد کی، حضرت بہاء الدین ذکریا بھی اس میں تشریف لائے، اور وہی اس مقدمہ کی سماعت کیلئے حکم بنائے گئے، جب حضرت تبریزی مجلس میں تشریف لائے، تو حضرت ذکریا ملتانی نے اٹھ کر ان کا استقبال کیا، اور ان کی جوتیاں ہاتھ میں اٹھالیں، یہ کیفیت دیکھ کر مطربہ پر ایک عالم طاری ہوا، اور اس نے سازش کا پورا واقعہ مجلس میں بیان کر دیا، مولانا نجم الدین صغری ندامت سے بیہوش ہو گئے، سلطان نے ان کو شیخ الاسلامی کے منصب سے برطرف کر دیا، اور حضرت بہاء الدین زکریا سے اس منصب کو قبول کرنے کی استدعا کی، جس کو انھوں نے قبول فرمالیا، ۶۶۶ھ میں واصل بحق ہوئے،

حضرت سید محمد بن علی حسینی بلگرامی اودھ کے مردم خیز قصبہ بلگرام کے ذی علم خاندان کے مورث اعلیٰ بھی اسی دور میں گذرے ہیں، وہ صاحب سیف مشائخ میں سے تھے۔ اور حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مرید تھے، ۶۱۴ھ میں بلگرام آئے اور اس علاقہ کو فتح کیا، ۶۲۷ھ میں ایک قلعہ یہاں تعمیر کیا، سلطان التمش نے جاگیر عطا کی، ۶۴۴ھ میں وصال فرمایا:

شیخ محمد بن محمد ترکی نی خواجہ عثمان ہارونی کے خلفاء میں سے تھے، ہندوستان میں تشریف لاکر نارنول میں اقامت اختیار فرمائی، ایک خلق کثیر ان کے ہاتھ پر اسلام لائی، ۶۴۲ھ میں وصال فرمایا،

اسی طرح حضرت قاضی حمید الدین محمد بن عطا ناگوری کا شمار بھی باکمال مشائخ طریقت میں ہے، ان کے والد حضرت عطا سلطان شہاب الدین کی معیت میں دہلی تشریف لائے حضرت قاضی حمید الدین ناگوری المتوفی ۶۴۳ھ پہلے ناگور کی قضارت پر سرفراز ہوئے، پھر بغداد جاکر حضرت سہروردی سے بیعت کی، اور واپس آکر حضرت خواجہ اجمیریؒ کی بارگاہ سے فیض اٹھایا، اور التمش کے دور میں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کی معیت میں دہلی میں مستقل سکونت اختیار کی، اور خلق خدا

کو فیضیاب فرمایا، کتاب اللوائح اور کتاب طوالع الشموس ان کی یادگار ہیں،

اسی طرح اس عہد کے باکمال مشائخ طریقت میں شیخ علی بن احمد بن مودود چشتی ہیں، جن کے ذریعہ حضرت خواجہ اجمیریؒ کے واسطہ کے بغیر وہ اکیلا دوسرا سلسلۂ چشتیہ ہے جو ہندوستان میں جاری ہوا، اسی طرح شیخ سلیمان بن عبداللہ عباسی متوفی ۶۳۹ھ جو حضرت شہاب الدین سہروردی اور شیخ فریدالدین عطارؒ کے صحبت یافتہ تھے، اور شیخ عزیز الدین لاہوری متوفی ۶۱۲ھ اور شیخ صلاح الدین حسن کیتھلی متوفی ۶۲۰ھ اس دور کے ممتاز اکابر مشائخ تھے،

ان بزرگوں کا یہ فیض کرم تھا کہ یہ دور تقویٰ، خدا ترسی، اور عبادت و ریاضت کیلئے ایسا موزوں قرار پا گیا تھا کہ سلطان وقت التتمش بھی اس ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور یہ شاید عام نگاہوں میں نہ ہو کہ حسب مراتب سلاطین کی صف میں وہ امتیاز رکھتا ہے، اور اس کے عہد کے سیاسی حالات سیاسی تاریخوں میں قلمبند کئے گئے ہیں، اسی طرح اولیاء کرام کے تذکروں میں بھی ان کے پہلو بہ پہلو اس کا نام حسن عقیدت کے ساتھ لکھا گیا ہے کہ وہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کا مرید اور ان کا صحبت یافتہ تھا، اور اس کی اس جامعیت کا تذکرہ مورخین نے اس انداز میں کیا ہے :-

"ظاہر میں گو بادشاہ تھے، مگر دل فقیر تھا، ان کا قاعدہ تھا کہ کم کھاتے، کم سوتے، تمام شب بیدار رہتے، اپنے کسی کام کے واسطے غلام اور نوکروں کو تکلیف نہ دیتے، رات کو ڈول رسی پلنگ کے نیچے رکھتے کہ نماز تہجد کے ادا کرنے کے لئے جب اٹھیں تو خود پانی بھر لیا کریں کہ دوسرا بے آرام نہ ہو، اور آخر شب گدڑی اوڑھ کر شہر میں گشت کرتے، جس کو تکلیف ہوتی اس کو

رفع کرتے، علما، و صلحا، کو بہت کچھ دیتے اور تھیلیوں
میں بھر کر پوشیدہ ان کے گھروں میں پھینک دیتے تھے[۱]

(باقی)

۱؎ طبقات ناصری ص ۱۶۵ تا ۱۷۹، ۱۶۳، ۱۳۵، ۲۳۰، ۱۵۹ تا ۱۶۱، ۱۳۱، ۱۴۳، ظفرالوالہ
ج ۲ ص ۶۸۶ تا ۶۸۸، منتخب التواریخ ص ۶۷، تحفۃ الکرام ورق ۲۶۲، تاریخ فرشتہ
ج ۱ ص ۱۵۳، الیٹ ج ۱ ص ۴۸۵، فونڈیشن آف مسلم رول ان انڈیا، ص ۸۷ تا
۱۰۵، تاریخ ہند ہاشمی ج ۲ ص ۸، تاریخ ذکاء اللہ ج ۱ ص ۲۶۶ تا ۲۷۲، تذکرہ
اولیاے ہند ج ۱ ص ۴۶، نزہۃ الخواطر ص ۶۴ (ذکر التمش) ۱۳۳ (تاج الدین دہلوی)
۱۳۵ (اشرف) ۱۴۲ (عین الملک) ۱۶۲ (کردری) ۱۶۳ (ابو قوامہ) ۱۸۲
(کوفی) ۱۸۷ (نونکی) ۲۳۶ (کاسہ لیس) ۱۹۸ (کاشانی) ۲۳۵ (صغری)
۲۲۴ (عوفی) ۲۰۳ (نظام الملک) ۱۳۶ (کیتھلی) ۱۶۲ (عباسی) ۱۷۹
(چشتی) ۱۹۶ (کاکی) ۲۱۷ (ناگوری) ۱۵۷ (زکریا ملتانی) ۲۰۲ (نورالدین
چشتی) ۲۲۷ (ترکمانی)

اردو زبان کی بناوٹ میں افغانوں کا حصہ

از جناب مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی

(۳)

۱۳۴۔ افغانستان میں دستور ہے کہ کسی شخص کو دوسرے سے کوئی بات منوانا ہوتی ہے تو اس کے گھر میں دھرنا دے کر بیٹھ جاتا ہے، اور اس وقت تک نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے جب تک گھر والا درخواست قبول کرنے کی ہامی نہ بھر لے، یہ گویا آج کل کی ستیاگرہ ہے، موافق دستور اس قسم کی درخواست کا قبول کرنا فخر و مباہات ہی کا سبب نہیں ہوتا بلکہ ضروری بھی ہے، یہ ستیاگرہی وہاں "ننواتے" کہلاتا ہے،

رامپوری مستورات بھی کسی طرح نہ ماننے والی یا والے سے کہا کرتی ہیں کہ "کیا ننواتے (یا ننواتی) بھیجوں تب منوگی"؟

۱۳۵۔ قول قرار اور وعدے کو پشتو میں "ژمنہ" کہتے ہیں، روہیلکھنڈ میں بھی اس کا رواج ہے،

۱۳۶۔ "نیغ" پشتو میں سخت یا اکڑے ہوئے کو کہتے ہیں، یہی معنی ہینغ کے بھی ہیں، جب بیماری سے پٹھے سخت ہو جائیں اور انسان بمشکل حرکت کر سکے تو اسے "ہینغ نیغ" کہتے ہیں، رامپور میں بھی کسی کی گردن اکڑ جائے تو کہا جاتا ہے "گردن ہینغ نیغ ہے" اور حرکت نہ کر سکنے والا بھی اپنے آپ کو "ہینغ نیغ" کہتا ہے،

۱۳۷۔ "وار پہ وار" پشتو میں بمعنی بار بار بولا جاتا ہے، رامپور میں بھی لوگ "وار پے وار" یا "وار بے وار" بولتے ہیں،

رامپور کا ایک مخصوص محاورہ ہے، جب کسی سے کہنا ہوتا ہے "ٹھیرو" یا "انتظار کرو" تو یہاں کے مرد عورت، عالم و جاہل، ہندو مسلمان سب کہتے ہیں "وارلو" یہ بھی غالباً پشتو اثر ہی سے بنا ہے، افغانی

اس موقع پر "وار کرہ" بولتے ہیں،

۱۳۸۔ "واز" پشتو میں کھلے ہوئے کو کہتے ہیں، یہ فارسی "باز" کی ایک شکل ہے، رامپوری مستورات کہا کرتی ہیں، "سارا گھر دروازہ پڑا ہے" یہ محاورہ بھی افغانستان ہی سے آیا ہے،

۱۳۹۔ قوت، زور، لیاقت، مرضی، پسند، حکم، اثر وغیرہ بہت سے معنی کیلئے پشتو میں "واک" استعمال کیا جاتا ہے، روہیل کھنڈ میں بولتے ہیں "فلاں اپنے واک میں نہیں ہے" یعنی آپے سے باہر ہے،

۱۴۰۔ "وانے" کسی اسم صفت کے آگے بڑھا دینے سے پشتو میں حاصل مصدر بن جاتا ہے، افغانی عزیز کو معنی رشتہ دار بھی بولتے اور رشتہ داری کیلئے "عزیز وانے" استعمال کرتے ہیں، رامپور میں "عزیز دلی" اور "پیارے ولی" یعنی مذکور استعمال کرتے ہیں،

۱۴۱۔ "وخت" پشتو میں وقت کو کہتے ہیں اور "وخت بہ وخت" "وخت نا وخت" اور بے وخت وغیرہ صورتوں میں بولا جاتا ہے، رامپور کے عوام وخت بولتے اور ان سب ترکیبوں کو استعمال کرتے

۱۴۲۔ پشتو میں "ویر" بیای مجہول رونے پیٹنے اور سینہ کوٹنے کو کہتے ہیں، روہیلکھنڈ کی عورتیں استعمال کرتے ہیں، اور کہتے ہیں "ارے یہ کیسا ویر ڈالا ہے" یا "وہاں تو ایسا ویر پڑا تھا کہ خدا کی پناہ"

۱۴۳۔ "ہائے ہبتہ" یا "ہائی ہبتہ" رامپور میں تباہ و برباد کو کہا جاتا ہے، عورتیں بولتی ہیں: "چیز ہائے ہبتہ ہوگئی" یہ بھی پشتو کا ایک مرکب لفظ ہے، اس کا "ہائے" تو مشہور کلمۂ افسوس ہے "ہبتہ" پشتو میں ہیچ و پوچ، بیکار اور بے فائدہ کے لئے بولا جاتا ہے۔

۱۴۴۔ "ہشک" رامپور میں قرعہ یا لاٹری کو کہتے ہیں، یہ پشتو "ہشک" سے بنا ہے، اور "ڈالنا" کے ساتھ بولا جاتا ہے،

۱۴۵۔ "یار" بمعنی دوست فارسی لفظ ہے، شاعر اس سے معشوق مراد لیتے ہیں، پشتو میں عاشق کو یار کہا جاتا ہے، رامپور میں مرد کا یار اس کا دوست اور عورت کا یار اس کا عاشق کہلاتا ہے، یہ عا

کا مفہوم ظاہر ہے کہ پشتو سے آیا ہے،

۲۴۶۔ "ایک ہماں" پشتو میں ایک سا یا یکساں کا مترادف ہے، رامپور میں عورتیں کہا کرتی ہیں "ایک ہماں کیے جاتی ہے کہ میں نے فلاں چیز نہیں لی"۔

۲۴۷۔ پشتو کی ایک کہاوت ہے "جان پہ ضرور، نہ زُوئی نہ لُوُر" یعنی اپنی جان پر مصیبت آ رہے تو بیٹا بیٹی کوئی نہیں سوجھتا، یہ کہاوت بھی رامپور کی مستورات کی زبان پر آتی رہتی ہے، اتنا فرق ضرور ہے کہ "لور" (بمعنی بیٹی) کو نور بولتی ہیں،

یہ روہیلکھنڈ میں مستعمل پشتو الفاظ کی مکمل فہرست نہیں ہے، مزید تلاش انھیں دو چند بنا دے سکتی ہے،

جب ڈیڑھ دو سو برس کے قیام میں پٹھانوں نے روہیلکھنڈ کی زبان پر اتنا اثر ڈالا ہے، تو دوسرے صوبوں پنجاب، سندھ، گجرات، دکن اور بنگال میں ان کے سیکڑوں برس کے رہن سہن اور میل جول کے اثرات کیوں نہ موجود ہوں گے،

میں مذکورۂ بالا صوبوں کی بولیوں سے ناواقف ہوں، اس لئے نہیں کہہ سکتا کہ ان میں افغانی اثر کتنا ہے، اور نہ بتا سکتا ہوں کہ ان زبانوں کے محقق نے مذکورہ اثرات کا کھوج لگایا ہے یا نہیں لیکن جہاں تک اردو کا تعلق ہے نہایت افسوس سے یہ ظاہر کرنا پڑتا ہے کہ ابھی تک ہمارے مورخین زبان اور لغت نویس اس حقیقت سے بیخبر نظر آتے ہیں،

آپ تاریخ ادب اٹھا کر دیکھیں تو اردو کی پیدائش کا سبب یا تو مطلق مسلمانوں کی آمد کو قرار دیا گیا ہوگا اور یا اس لفظِ مسلمان کی تشریح عرب، ایران، ترک اور مغل سے کی گئی ہوگی، گویا کہ افغانی ہندوستان میں کبھی وارد ہی نہیں ہوئے، یا آئے تو مگر اتنے کم آئے کہ کسی شمار قطار میں نہیں ہیں، اور یا پھر یہ لوگ مسلمان ہی نہ تھے،

پہلی شق تو کسی طرح قابل قبول ہی نہیں، اس لئے کہ غزنوی، غوری، لودی اور سوری خاندانوں کی یہاں سیکڑوں برس حکومت رہی ہے، اور ان ادبی تاریخوں میں تاریخی پس منظر کے طور پر یہ نام بھی مندرج نظر آتے ہیں، ظاہر ہے کہ کسی مورخ کو بھی ان خاندانوں کے افغانی ہونے سے انکار نہیں ہے تغلق اور خلجی خاندانوں کے مورخین ضرور ترک بتاتے ہیں، بیشک یہ خاندان ترک غلاموں کی نسل سے ہیں، لیکن بہ نظر غائر دیکھا جائے تو بادشاہ یا دس پانچ امیروں کے ماسوا حکومت کی ساری مشین وہی غوری ساخت کی ہے اور عملہ و فعلہ میں افغانی یا افغانی النسل ہندی ہی عنصر غالب کی حیثیت رکھتے ہیں، اس صورت حال کا مقتضی یہ ہے کہ افغانی نو واردوں کی تعداد کو ناقابل التفات بھی قرار نہ دیا جائے، آگے آخری شق، تو اگر ہماری سب ادبی تاریخیں مغل بادشاہوں کے عہد عروج میں لکھی گئی ہوتیں تو میں باور کر لیتا کہ جس قوم کو مغلوں کے سیاسی مورخ "افاغنۂ ملاعنہ" اور "کفاران یوسف زی" لکھ رہے ہیں اسے ادبی تاریخ نگاروں نے بھی "نا مسلم" مان کر نظر انداز کر دیا ہے، مگر یہ کتابیں تو مغل سلطنت کے کمزور ہونے یا چھن جانے کے بعد انگریزوں کے "عہد معدلت مہد" میں تصنیف ہوئی ہیں، اس روشنی میں یہ اندھیرا!

بے توجہی کا سبب میری نظر میں اردو اور افغانیوں کے علاقے کو نظر انداز کر دینے کی وجہ ایک تو اس زبان کا "اردو" نام ہے اور دوسرے ہمارے ادیبوں کی پشتو زبان سے قطعی ناواقفیت

"اردو" ترکی زبان کا لفظ اور چھاؤنی کا مترادف ہے، "اردوی معلیٰ" شاہی فرودگاہ کہلاتی ہے، شاہجہاں نے نئی دلی آباد کی تو لال قلعہ اور اس کے حوالی اس ممتاز لقب سے پکارے جانے لگے، ہندہی میں نہیں دنیا کے ہر حصہ میں بادشاہ کی ذات مرکز ہوا کرتی تھی، لوگ رہنے سہنے، کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، پہننے اوڑھنے ہر چیز میں "ان داتا" کی نقالی کو فخر جانتے تھے، عوام کی رسائی "ظل اللہ" تک آج بھی نہیں ہوتی، یہ لوگ شاہی متوسلوں اور مقربوں کو جو کچھ کرتے دیکھتے اسے اختیار کرتے بدیسی لفظوں کے دیسی زبان میں داخلے سے اور بدیسی لہجے کی دیسی بولی میں تراش خراش

سے جو نئی بولی بنتی تھی، شاہ جہاں اور عالمگیر کے اردوی معلی میں بھی نوازی جانے لگی، ولی دکنی کا دیوان دیکھ کر دلی والوں نے بھی سنجیدگی سے اپنی بولی میں طبع آزمائی شروع کی، خود اردوی معلی کے ناخداؤں شاہزادوں اور سلاطین نے بھی اس زبان میں کہنا شروع کیا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دلی کے اس شاہی علاقے کو ادبی مرکزیت بھی حاصل ہوگئی، جب کسی لفظ یا محاورے کو "محاورۂ اردوی معلی، اصطلاح اہل اردو، متعارف اردوی بادشاہی، اصطلاح شاہجہان آباد" یا "عرف اردوی بادشاہی" کہدیا جاتا بحث کرنیوالا گردن جھکا دیتا، خان آرزو اکبرآبادی نے ۱۱۵۶ھ (۱۷۴۳ء) کے قریب اردو لغت پر ایک کتاب "نوادر الالفاظ" لکھی تو اس میں عبدالواسع ہانسوی کی اردو لغت "غرائب اللغات" کے مقابلہ میں حجت قاطع کے طور پر یہی مذکورۂ بالا الفاظ استعمال کئے تھے[۱]

جب اردو شاعری نے عوام میں زیادہ مقبولیت حاصل کی تو جو لوگ محاورۂ اردوی معلی سے ناواقف تھے مجبور ہوئے کہ اس کے ماہروں کو اپنا کلام دکھالیں اور اس طرح مشاعرے میں گنوار یا قصباتی کے دلخراش اعتراض کا نشانہ بننے سے اپنے آپ کو بچا سکیں[۲]

---

[۱] ملاحظہ ہو نوادر الالفاظ، قلمی، ۱۴۴ ب ۲۰۳، اب وتحت لفظ بودلی، میر تقی میر اور گردیزی نے اپنے تذکروں کے دیباچہ میں "زبان اردوی معلی" سے اور قائم نے "مخزن نکات" میں "محاورۂ اردوی معلی" کہکر یہی اردو زبان مراد لی ہے، بادشاہ کی ذات کے مرکز زبان ہونے کے متعلق، انشانے دریائے لطافت ص ۱۰۵ میں لکھا ہے کہ

"منبع فصاحت ومعدن بلاغت کہ زبان شان مشہور بہ اردو ست، سواری
بادشاہ ہندوستان کہ تاج فصاحت بر سر او می زیبد، چند امیر ومصاحبان
و چند کس دیگر و چند زن قابل از قسم بیگم و خانم وکسبی ہستند ہر لفظی کہ درینہا استعمال یافت زبان اردو شد"

[۲] خان آرزو دہلی کے اردو شاعروں کے پہلے استاد تھے، یہ جس لفظ کو کہدیتے کہ ہم اردوی معلی کے باشندے یوں ہی کہتے ہیں تو سننے والے اسے تسلیم کرنے پر مجبور تھے، نوادر الالفاظ میں بھی ایک جگہ انھوں نے لفظ "چھینل" کے تحت لکھا ہے کہ

"ما مردم کہ از اہل ہندیم و در اردوی معلی می باشیم نشنیدہ"

دلی کے بہت سے استاد لکھنؤ گئے تو وہاں بھی اس خاص محاورہ کی قدر کی گئی، پورب والے خود آپنے حاکم نہ تھے، ان پر جو لوگ مسلط ہوئے تھے وہ سب دلی کے دربار کے متوسل اور مغلی طور طریق کے دلدادہ تھے، یہ دلی دیار کے رہنے والے شاعر بھی ان ہی کے حضور میں تقرب حاصل کرتے اور انھیں کی ادبی مجالس کو گرمانے کی خدمت انجام دیتے تھے، اہل پورب بالکل اسی طرح جس طرح ہم انگریزی نظر میں اپنی وقعت بڑھانے کیلئے بالکل انگریز بن جانا چاہتے تھے، ان دیسی مغربی حاکموں کی نقل کو ذریعہ قدر و منزلت جانتے تھے، زبان کے معاملہ میں بھی انھوں نے "محاورۂ اردوئے معلّیٰ" ہی کے اتباع کو اپنا شیوہ بنایا، اور شاعری شروع کی تو اس میں بھی دلی والوں ہی کو استاد بنایا، ورنہ ڈر تھا کہ مجلس مشاعرہ میں اہل مغرب اہل مشرق کو "پوربیا" جان کر ہنسی اڑائیں گے، اس طور پر زبانِ اردوئے معلّیٰ کا لقب لکھنؤ میں بھی زبان زد ہو گیا، مگر کچھ تو لفظی طوالت کے باعث اور کسی قدر دلی کی سیاسی قوت کے انحطاط سے "معلّیٰ" کا لقب بول چال میں کم آنے لگا،

لکھنؤ اور دہلی دونوں اب دو مختلف دبستان ادب بن چکے تھے، اور ان مرکزوں سے دور رہنے والے ڈاک کی بڑھتی ہوئی سہولتوں کے باعث گھر بیٹھے یہاں کے اساتذہ سے اصلاح لینے لگے تھے، اس شکل سے زبان اردو کا پرچار تقریباً تمام ہندوستان میں ہو گیا، اب اس نام میں کچھ اور تخفیف ہو گئی، اور لوگ صرف "اردو" کہکر اس سے زبانِ اردوئے معلّیٰ مراد لینے لگے۔[۱]

جب انگریزوں نے ملکی مصلحت سے اس زبان میں کام شروع کیا تو حسب دستور اس زبان کے پیدا ہونے کے اسباب پر بھی غور کیا گیا، اس سلسلہ کا غالباً سب سے پرانا کسی ہندی کا بیان میر امن دہلوی کا ہے، وہ باغ و بہار کے دیباچہ میں جو ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۲ء) میں ختم ہوئی تھی لکھتے ہیں :-

---

۱ انشا نے بھی دریائے لطافت میں بادشاہ دہلی کو منبع فصاحت قرار دیتے ہوئے انکی زبان کا نام صرف "اردو" بتایا ہے ملاحظہ ہو ص ۲، مگر عام طور پر "اردو" کا زبان پر اطلاق انگریزی دور کی بات ہے گو خود انگریز اسے ہندوستانی کہتے اور کہلوانا چاہتے تھے،

"حقیقت اردو کی زبان کی بزرگوں کے منہ سے یوں سنی ہے کہ دلی شہر ہندوستان کے
کے نزدیک جوگنی ہے، وہاں کے راجہ پرجا قدیم سے رہتے تھے اور اپنی بھاکھا بولتے تھے،
ہزار برس سے مسلمانوں کا عمل ہوا، سلطان محمود غزنوی آیا، پھر غوری اور لودی
بادشاہ ہوئے۔ اس آمد و رفت کے باعث کچھ زبانوں نے ہندو مسلمان کی آمیزش پائی،
آخر امیر تیمور نے جن کے گھرانے میں اب تلک نام نہاد سلطنت کا چلا آتا ہے ہندوستان
کو لیا، ان کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا، اس واسطے شہر کا
بازار اردو کہلایا،

پھر ہمایوں بادشاہ پٹھانوں کے ہاتھ سے حیران ہو کر ولایت گئے۔ آخر وہاں سے
آن کر پسماندوں کو گوشمالی دی کوئی مفسد باقی نہ رہا کہ فتنہ و فساد برپا کرے۔
جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدردانی اور
فیض رسانی اس خاندان لاثانی کی سن کر حضور میں آکر جمع ہوئی لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی
جدی جدی تھی، اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین، سودا سلف، سوال جواب کرتے ایک زبان اردو
کی مقرر ہوئی،

جب حضرت شاہجہان صاحبقران نے قلعہ مبارک اور جامع مسجد اور شہر پناہ تعمیر کروایا، اور
تخت طاؤس میں جواہر جڑوایا، اور دل بادل سا خیمہ چوبوں پر استاد کر طنابوں سے کھنچوایا اور نواب علی
مردان خاں نہر کو لیکر آیا تب بادشاہ نے خوش ہو کر جشن فرمایا اور شہر کو اپنا دار الخلافت بنایا، تب سے شاہجہان آباد
مشہور ہوا، اگرچہ دلی جدی ہے وہ پرانا شہر اور یہ نیا شہر کہلاتا ہے، اور وہاں کے بازار کو اردوئے معلّیٰ خطاب دیا،
امیر تیمور کے وقت سے محمد شاہ کی بادشاہت بلکہ احمد شاہ اور عالمگیر ثانی کے وقت تک پیڑھی بہ پیڑھی
سلطنت یکساں چلی آئی، ندان زبان اردو کی منجھتے منجھتے ایسی منجھی کہ کسو شہر کی بولی اس سے ٹکر نہیں کھاتی ہے"

میرامن کا یہ بیان حقیقت سے بہت قریب تھا مگر اس کا یہ جملہ کہ "تیمور کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا، اس واسطے شہر کا بازار اردو کہلایا" غمازی کرتا ہے کہ خود ان کا عقیدہ یہی تھا کہ اردو مغلوں کی خانہ زاد ہے یہی باعث ہے کہ اس کی تالیف سے ۵ سال بعد انشا نے "دریاے لطافت" مرتب کی تو اردو کی پیدائش کے اسباب بتاتے ہوئے میرامن کے اس عقیدے کو دہرایا، فرماتے ہیں:[۱]

"در ہر مملکت قاعدہ این است کہ صاحب کمالاں و خوش بیانان آنجا در شہری کہ قرار گاہ ارکان دولت بادشاہی باشد جمع شوند و از کثرت ورود مردم ہر دیار برائے تحصیل قوت در آن بلدہ باشندگانش در تحریر و تقریر بہ از سکنان بلاد دیگر آن ولایت باشند ......

چوں بیشتر جای عیش سلاطین تیموریہ دار الخلافہ شاہجہان آباد بودہ است و فصیحان و بلیغان و علماے عالی قدر فریقین و دیگر ارباب فنون لطیفہ و اصحاب علوم شریعہ در آں شہر دلنواز آرامگاہے براے خود ساختہ بودند.. خوش بیانان آنجا متفق شدہ از زبانہاے متعدد الفاظ دلچسپ جدا نمودند و در بعضی عبارات و الفاظ تصرف بکار بردہ زبانی تازہ سواے زبانہاے دیگر بہم رسانیدند و بہ "اردو" موسوم کردند۔

بالجملہ زبان اردو مشتمل است بر چند زبان یعنی، عربی و فارسی و ترکی و پنجابی و پوربی و برجی وغیر آں۔"

اسی زمانے میں سید احمد علی خاں یکتا نے قواعد اردو پر ایک کتاب "دستور الفصاحت" نام سے لکھی تھی، اس کے مقدمے میں اردو کی تعریف اور سبب حدوث حسب ذیل لکھا ہے:۔

---

[۱] دریاے لطافت: ۱۴

دریں رسالہ کہ صرف و نحو زبان ہندی دراں بیان نمودہ می شود، نہ مراد مولف تحقیق زبانہائے کثیرۂ مذکورہ است، بلکہ مقصود و مطلوب ازاں دریافتن صحت الفاظ خاص و معلومات ترکیب معینۂ کلامی است کہ مخصص و موضوع بہ محاورۂ اردوی معلی باشد و بس زیرا کہ بنائے تقریر و تحریر تمام اعزۂ عالی مقدار و مدار تکلم و کلام جمیع شرفا و نجبائے نامدار و شعرائے ذوی الاقتدار کہ فی زماننا بر مسند اعتبار جا دارند، برہمیں محاورہ موقوف است،

"اردو" عبارت است از زبانے کہ بعد اختلاط و ارتباط الفاظ پنجابی و میواتی و برج کہ زبان اضلاع قرب و جوار دار الخلافۂ شاہجہان آباد است، با کلمات فارسی و عربی و دیگر زبانہا از کسر و انکسار ثقالت و سخافت اصلی ہر لغت باصلاح صحبت ہمدگر مثل کیفیت متوسط کہ باعتقاد اطبا در مرکبات از معاجین وغیرہ حادث می گردد، پیدا شدہ ساتر عیوب جمیع زبانہائے مزوجہ گردیدہ است، و بمرتبہ حسن و لطافت دراں یافتہ میشود کہ از روے متانت و جہت لطافت و فصاحت پہلو بعربی می زند و بکمال صفا و عذوبت بر فارسی تفوق می جوید،

و سبب حدوث ایں زبان نفیس این است کہ چوں سواد اعظم ہندوستان و منافع ایں زمین منفعت بنیان بنسبت با اقالیم دیگر او فر و زرریزی ایں ملک باکناف جہاں ہویدا و اشہر، و نیز پایۂ سلاطین و امرای ایں کشور از شوکت و ثروت و ہمت و سخاوت رفیع و منیع تر از عمائد دولت و ارکان سلطنت اقالیم دیگر است بالضرورہ دانایان ذکی و عاقلان عصر و کاملان ہر فن و ہنر از فضلا، و علما و شعرا و نجبا ہر جا کہ بودند از اطراف عالم و اکناف جہاں رو بایں سواد اعظم مراد توأم آوردہ، بمقاصد و مرادات دلخواہ رسیدند و اکثری از آنہا ہمیں زمین ارم تزئین توطن ورزیدند، پس از سبب

آمد و شد در بار و پیش آمدن معاملات با مردم این دیار از حرف زدن باین لغت چارہ ندیدند'
ناگزیر درین صحبت اینها از آنها و آنها از اینها در حین مکالمہ بقدر کفایت از الفاظ ہمدگر اندوختند
و کار بہ می آوردند،

چون مدتے برین نحو گذشت و عمرے صرف شد، از امتزاج الفاظ و ارتباط کلمات
در یک دیگر حالے بہم رسید کہ آں را زبان تازہ تواں گفت، چہ نہ عربی عربی ماند و نہ
فارسی فارسی و ہمیں قیاس ہر زبانہا از زبانہائے مروجہ ہندی نیز بر اصل خود نماند،
عقلا و دانایان چنیں قرار دادند کہ کلمات سنجیدہ و الفاظ پسندیدہ از ہر زبان و
ہر محاورہ کہ باشد بصحت و درستی از آں برچیدہ و بوضعے کہ مفید مطالب بآسانی و دور
از شناخت و ثقالت زبانی بود، در کلام می آمدہ باشد ۔۔۔ و موافق ہمیں قاعدہ کہ منضبط گردید
بہ دربار سلاطین و امرا و بارگاہ خواقین و وزرا ہمہ بجیا و شرفا بیک دیگر حرف
میزدہ باشند،

چوں صورت شاہد ایں مطلوب بر غرفۂ استحسان جلوہ گری نمود، نام ہمیں محاورۂ
خاص بہ "اردوی معلیٰ" شہرت گرفت[1]"

اس بیان میں بھی کہیں کہیں حقیقت کی جھلک ہوتے ہوئے وہی بنیادی خیال دہرایا گیا ہے کہ یہ نئی
زبان دہلی کے اندر مغلوں کے عہد سلطنت میں پیدا ہوئی ہے،

مرزا نثار علی بیگ (مدرس اول آگرہ کالج) نے اپنی کتاب "رسالہ قواعد اردو" حصۂ سوم
میں ماہیت اردو زبان کے تحت ۱۸۶۹ء کے قریب لکھا ہے،

"اردو کے معنی بادشاہی لشکر کے ہیں، چنانچہ تواریخ کی کتابوں میں بادشاہی فوج کو

---

[1] دستور الفصاحت ص ۳، ۵ طبع رام پور

اردوئے معلی لکھا ہے جب سلاطین تیموریہ نے ہندوستان میں قیام کیا، اور دہلی کو اپنا دار الخلافہ بنایا تو لشکر کے آدمی اور بادشاہی متوسل جو ایران اور توران اور مختلف ملکوں کے رہنے والے تھے، سودا سلف خریدنے میں دہلی کے بازاریوں کے ساتھ جن کی زبان ہندی بھاشا تھی، فارسی، ہندی آمیز بولنے لگے، رفتہ رفتہ شاہجہاں کے عہد تک ہر ایک بولی خلط ملط ہو کر ایک نئی زبان پیدا ہو گئی، اور اس کا نام اردوئے معلی سے منسوب ہو کر "زبان اردو" ہو گیا، اور کثرت استعمال سے لفظ زبان دور ہو کر صرف اس زبان کا نام "اردو" رہ گیا۔

اردو زبان لغات ہندی فارسی اور عربی، ترکی، سنسکرت وغیرہ سے مرکب ہوا اور جب سے شاہی سرکار دولت مدار کمپنی انگریز بہادر کی ہندوستان میں آئی، تب سے صاحبان عالیشان حکام زمان کے التفات سے اس نے ایک عجیب رونق پائی، بلکہ اکثر کچہریوں میں ہر طرح کے کاغذات مقدمات دیوانی اور کلکٹری اور فوجداری وغیرہ اردو ہی زبان میں لکھے جاتے ہیں، اور اردو میں [illegible] اب لغات انگریزی بھی مثل لغات فارسی اور عربی کے شامل ہوتے جاتے ہیں۔[1]

اس بیان میں بھی وہی میرامن کی رائے کا اعادہ ہے اور بس یہی صورت حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ آب حیات اور اس کے بعد کی تمام تصنیفات میں یہی نقطۂ نظر مرکزی نظر آتا ہے، اور خود ان سب محققین کے یہ نفی ہر گز دینے کے باوجود کہ اردو دراصل ایک مقامی زبان یا محاورے کا نام ہے، جس نے دہلی کے لال قلعے اور اس کے آس پاس کے چند محلوں میں پرورش پائی، اور شعر و شاعری کے پروں سے اڑ کر ہندوستان کے تمام حصوں کی ادبی بولی بنی، مورخین زبان کے دماغ سے مغل کسی طرح

---

[1] رسالہ قواعد اردو حصہ سوم ص ۱۰۳ مطبوعہ مطبع نولکشور لکھنؤ ۱۸۷۹ء

نہ نکل سکے[1]

حکیم شمس اللہ صاحب قادری حیدرآبادی نے میر امن دہلوی کے بیان کے ابتدائی حصے کو اپنی تحقیق کا موضوع بنا کر یہ ثابت کیا کہ جس کو میر قائم اور گردیزی وغیرہ دکھنی زبان کہا کرتے تھے وہ دراصل یہی مسلمانوں کے ورود ہندوستان کی پیدا شدہ زبان ہے، صرف مقامی لفظوں اور محاوروں کے دخل سے اسے اردوی معلیٰ شاہجہاں آباد کے محاورے سے ممتاز کر دیا ہے،

حکیم صاحب کے بعد سید نصیر الدین ہاشمی صاحب نے "دکن میں اردو" لکھ کر اس موضوع کی تکمیل کر دی، مگر ان کے طرز بیان سے اس مسئلے نے صوبہ واری سوال پیدا کر دیا، اور مرحوم محمود خاں شیرانی نے "پنجاب میں اردو" لکھ کر یہ ثابت کیا کہ اردو کی جنم بھومی دکن نہیں پنجاب کا علاقہ ہے،

اس چھان بین ہی کا غالباً یہ مبارک نتیجہ ہے کہ بعد کی دو تین کتابوں میں مسلمانوں کی تشریف آوری کے اند

---

[1] انشار نے دریائے لطافت (ص ۴۷) میں اس بولی کے مستند محلوں اور ان کے حدود اربع کا اسطرح ذکر کیا ہے،

"مکانی کہ دران مجمع فصحاست قلعۂ مبارک بادشاہی است و دو محلۂ دیگر، یکی بنگلۂ سید فیروز کہ از خانۂ میرزا اسم مرثیہ خوان متوفی تا حویلی اسماعیل خان صفدر جنگی و از آنجا تا حویلی ملکۂ آفاق حضرت ملکۂ زمانیہ بنت فرخ سیر بادشاہ یک ضلع محسوب است بلکہ نزد بعضی کابلی دروازہ و بیرون آن نیز تا تکیۂ شاہ خدایا واین طرف از حویلی نواب شیر جنگ مرحوم و چوک نواب سعادت خاں بہادر برہان الملک جنت آرامگاہ تا پھاٹک حبش خاں داخل آن باشد، لیکن درین مقام تامل است، آنچہ شک را دران گنجایش نیست، این است کہ تا حویلی ملکۂ آفاق فصاحت از در و دیوار می بارد، و از چتلی قبر تا ترکمان دروازہ یک طرف و تا دہلی دروازہ کہ بدہلی دروازہ شہرت دارد یک طرف و تا چوک سعد اللہ خاں طرف دیگر و حویلی و بازار نواب امیر خاں مرحوم و سہ راہہ بیرم خاں کہ بہ تراہہ مشہور است و محلۂ فولاد خاں و کوچۂ چیلیا جز و دہلی دروازہ است"

سب سے آخر میں یہی مگر "افغان" بھی نظر آجاتا ہے،[۱] مگر سچ پوچھئے تو یہ بھی کسی تحقیق کے نتیجہ کا اثر نہیں معلوم ہوتا بلکہ حقیقت اپنے ظہور کے لئے بیتاب سی نظر آتی ہے، جس کے باعث از خود ان حضرات کے قلم سے تابع مہمل کے طور پر یہ لفظ نکل گیا ہے،

اس بے توجہی کا دوسرا سبب پشتو زبان سے ناواقفیت ہے، یہ مرض بہت پرانا اور عام ہے، عبدالواسع ہانسوی سے لے کر آج تک کسی ایک لغت نویس، ایک قواعد نگار یا ایک مورخ زبان نے بھی اردو اور پشتو کے علاقے پر روشنی نہیں ڈالی، یہ سب نہیں تو ان میں سے بیشتر حضرات ہندوستان کی اسلامی تاریخ سے کم و بیش آگاہ ہیں، اس لئے کم از کم مسلمان افغانوں کی آمد ہند اور اس کے ہر قسم کے اثرات کو جانتے ہوئے اردو زبان پر افغانی بولی کے اثر سے کلی بے توجہی کی توجیہ، چھوٹا منہ بڑی بات ہے، مگر کہے بغیر نہیں بنتی کہ سوائے عدم واقفیت کے اور کیا کی جاسکتی ہے،

ہندوستانیوں میں انشاء اللہ خاں اور انگریزوں میں گریرسن پشتو سے کما حقہ واقف تھے، ان دونوں نے اردو زبان پر کام بھی کیا ہے، مگر تعجب ہے کہ یہ بھی اس مسئلہ پر مطلق روشنی نہیں ڈالتے،[۲]

راورٹی کی رائے | غالباً سب سے پہلے جس شخص نے اس طرف واضح اشارہ کیا ہے وہ پشتو کا انگریز عالم کرنل راورٹی ہے، "پشتو انگریزی لغت" کے دیباچہ میں اس نے لکھا ہے،

> "یہ حقیقت ہے کہ پشتو زبان میں بہت سے لفظ ایسے ملتے ہیں جو اردو میں بھی نظر آتے ہیں، مگر جبکہ ان سب کا واضح طور پر سنسکرت میں سراغ نہیں ملتا ہیں

---

[۱] ملاحظہ ہو دھریندر ناتھ ورما کی تاریخ ادب ہندی ۔۔۔۔ اور قادری صاحب کی داستان تاریخ اردو ص ۔۔

[۲] گریرسن کی کتاب "ہندوستان کی لسانی پیمائش" ہندوستانی لسانیات پر انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے، مجھے اس کتاب کے خود دیکھنے کا موقع نہیں مل سکا ہے، اس لئے جو کچھ اس کے متعلق اوپر لکھ چکا ہوں اس میں ترمیم کر دوں گا، اگر گریرسن پشتو اور اردو کے تعلق پر رائے زنی کر چکا ہو،

کم از کم اس وقت تک کہ انھیں کسی اور اصلی زبان کا ثابت کیا جائے، خالص پشتو اصطلاحیں سمجھنے کی طرف مائل ہوں، جو بالکل اسی طرح ریختہ میں شامل ہو کر گھل مل گئی ہیں، جیسے سنسکرت، عربی، فارسی وغیرہ، بلکہ پرتگالی اور ملیالم کے لفظ،

یہ صورت واقعہ ذرا بھی تعجب انگیز نہ ہوگی، جب ہم یہ پیش نظر رکھیں گے کہ بارہویں صدی عیسوی میں محمود غزنوی کے حملے سے افغانوں نے ہندوستانی جزیرہ نما کے تھیٹر میں کیا نمایاں پارٹ ادا کیا ہے، یعنی ان کی پیہم اور مسلسل در آمد ان کی فتوحات اور یہاں مستقل آبادیاں اور یہ حقیقت کہ دیسیوں میں شادی بیاہ کرکے انھوں نے اپنی اولاد چھوڑی ہے جو "ہندوستانی پٹھان" کہلاتے، ابھی تک ہندوستانی مسلمانوں کا ایک بڑا حصہ شمار ہوتے، اور تقریباً سب کے سب اردو بولتے ہیں، ان کی مہاجرت اس حد کو پہنچ گئی تھی کہ کچھ قبیلے اور خاندان افغانستان سے بالکل غائب ہو چکے ہیں، اور ان کے خلاف صرف ہندوستان ہی میں پائے جاتے ہیں"[۱]

یہاں سوال پیدا ہو سکتا تھا کہ اردو اور پشتو میں جو لفظ مشترک نظر آتے ہیں انھیں پشتو ماننے کے بجائے اردو اور خود پشتو میں ان کا داخلہ اردو کے ذریعہ کیوں نہ تسلیم کیا جائے، راورٹی نے اس کا جواب حسب ذیل دیا ہے،

" یہ امر بھی لوگوں کے پیش نظر نہیں معلوم ہوتا کہ اردو مقابلۃً بہت نئی زبان ہے، اور دہلی کی سلطنت کی بنیاد پڑنے پر جہاں یہ ہمیشہ بالکل خالص اور

---

[۱] پشتو انگریزی لغت (دیباچہ ص ۱۴ و ۱۵)

ترقی یافتہ رہ چکی اور اب تک بھی ہے۔ شہنشاہ اکبر کے عہد حکومت میں بنی ہو'
کیونکہ اسی کے وقت سے ہندوستانی ادب کی طرف توجہ شروع ہوئی،
اور اسی کے برسر حکومت آنے کے بعد سے ان خالص اسلامی علوم کا زوال
شروع ہوا، جو پچھلی حکومتوں میں نشوونما پا چکے تھے، میرے قبضہ میں پشتو کی بہت
سی کتابیں ہیں، جو اکبر سے بہت برسوں پہلے اور خود اس کے عہد حکومت (۱۵۵۶ء
سے ۱۶۰۵ء تک) کے دوران میں تالیف ہوئی تھیں، حالانکہ اردو کا سب سے پہلا
مصنف جس نے اردو بولی میں لکھا ہے، ولی شاعر ہے، جو سترہویں صدی کے
کے وسط میں گزرا ہے، اور شیخ مالی یوسف زئی سے ۲۳۲ برس متاخر ہے،
جس نے ۱۴۱۷ء میں یوسف زیوں کی فتح وادی پشاور وغیرہ کی تاریخ
لکھی تھی،

یہ سب سے پرانی کتاب ہے جس کا مجھے کھوج ملا ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ ہرگز
نہیں نکلنا چاہئے کہ اس سے پہلے پشتو ادب کا وجود نہ تھا، اس کے برخلاف
اخون درویزہ اپنی فارسی کتاب "تذکرۃ الابرار" میں لکھتے ہیں کہ ان کے
زمانہ میں "صراح" نام کی ایک مشہور کتاب یوسف زئی قبیلے کے پاس تھی، جو
صدیوں سے ان کے قبضہ میں چلی آتی تھی اور یہ لوگ اسے ہمیشہ سے بڑی
وقعت و عظمت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، پشتو زبان میں ایک اور تاریخ خان
کا جبراق زئی نے ۱۴۹۴ء میں لکھی تھی، خود اخون درویزہ نے اردو کی سب سے
پہلی تصنیف سے سو برس قبل اپنی "مخزن پشتو" لکھی تھی... اس کتاب میں
انھوں نے پشتو کے ان مصنفوں کے بھی حوالے دیئے ہیں جو ان سے پہلے گزرے

چکے تھے، بنابریں یہ واضح ہے کہ پشتو تحریری زبان کی حیثیت سے اردو کے پنپنے سے سیکڑوں برس پہلے وجود میں آچکی تھی، باقی یہ حقیقت کہ پشتو بہت پرانی بولی ہے، اس سے تو کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا،

دوسری بولیاں، گجراتی اور دکھنی زبانیں تقریباً اردو ہی کے ساتھ پھوٹی ہیں، ان کا زیادہ تر مدار عربی اور فارسی پر ہے، مگر یہ نیمی زبان نہیں بن سکیں[1]،

میری رائے | چونکہ یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ تیموری مغلوں کی آمد ہندوستان سے صدیوں پہلے اس زبان میں جو آگے چل کر اردو کہلائی، نثر اور نظم ہر قسم کی تالیفات معرض وجود میں آچکی تھیں، اس لئے راورٹی کے اردو کی عمر کے تخمینے کو میں بھی نہیں مانتا، لیکن میری نظر میں اس کا بنیادی خیال نہ صرف ناقابل تردید ہے بلکہ جیسا کہ میں اس مقالہ کی تمہید میں از روئے حقایق تاریخی بیان کر چکا ہوں، متقاضی ہے کہ اس سے ایک قدم اور آگے بڑھا جائے، چنانچہ میں یہ کہتا ہوں کہ اردو زبان کی پیدایش کا سب سے بڑا سبب ہندوستان میں افغانوں کی آمد تھی، اور اس نئی زبان میں عربی، فارسی، ترکی اور مغلی الفاظ کا سب نہیں تو بہت بڑا حصہ بھی افغانوں ہی کی زبان اور ان ہی کی وساطت سے داخل ہوا ہے، خود ان زبانوں کے بولنے والوں کے ذریعہ سے بہت کم لفظ یہاں آئے تھے،

اس خیال کی تائید میں دو باتیں پیش کرتا ہوں، پہلی یہ کہ افغانستان کی جائے وقوع کا تقاضا یہ تھا کہ اس پر قبضے کیلئے ہندی، ایرانی اور تورانی سب کوشش کریں اور یہ ناممکن تھا کہ اتنا چھوٹا سا ملک برابر اپنی حفاظت کر سکے، اس لئے اس کے مشرقی علاقے ہندیوں کے اور مغربی ایرانیوں اور ترکوں کے زیر اثر رہ چکے تھے، اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ اس ملک کا وہ حصہ جو ایران سے ملحق تھا، فارسی بولتا

[1] پشتو انگریزی لغت ص ۱۶۰۱۵

تھا، اور جو لوگ ہندوستان سے قریب تھے وہ سنسکرت اور پراکرت سے متاثر تھے، صرف درمیانی علاقہ کے باشندے اپنی پرانی اور اصلی زبان پشتو میں بات چیت کرتے تھے، چونکہ مرکز حکومت وہی علاقہ رہا، جہاں کی زبان فارسی تھی، اس لئے پشتو بھی بہت سے فارسی الفاظ کے اپنانے پر مجبور ہوئی، ہندوستان میں جن بادشاہوں نے حکومت قائم کی وہ بھی فارسی بولنے والے تھے، اور یہاں کا دفتر بھی فارسی ہی میں تھا، اس لئے قدرتی طور پر ان بدیسی حاکموں کے ذریعہ فارسی کا پرچار زیادہ ہوا،

یہ لوگ ہندوستان میں آنے سے صدیوں پہلے اسلام لا چکے تھے اور نسلوں سے عربی زبان ان کی مذہبی مقدس زبان قرار پا گئی تھی، اس لئے ان کے ساتھ عربی الفاظ بھی آئے، کچھ عربی لفظ ان کی فارسی بولی میں داخل تھے، اور پشتو میں بھی، اس بنا پر عوام و خواص اور مغربی و مشرقی دونوں قسم کے افغانوں کے ذریعے سے اردو میں داخل ہوئے،

ترکی زبان افغانستان کے کچھ علاقے کی زبان بھی تھی، اور بہت سے لفظ ان ترکی قبائل کے توسط سے بھی یہاں کی بول چال میں گھر کر گئے تھے، جو ابتداءً یہاں حکومت کرنے آئے اور رفتہ رفتہ ان میں جذب ہو گئے تھے، غزنوی دور میں ماوراء النہر کے سیکڑوں اہل علم افغانستان کی قدردانی کی بدولت آبسے تھے، کچھ لفظ یہ بھی تحفۃً لائے ہوں گے،

جب افغانی ہندوستان میں وارد ہوئے تو ان کے ساتھ سب زبانیں بھی آئیں، اور رفتہ رفتہ یہاں کی دیسی زبانوں میں ان کے الفاظ داخل ہو گئے، چونکہ افغانوں نے اپنا ہندوستانی دفتر بھی فارسی ہی میں رکھا تھا، اس لئے قدرتی طور پر فارسی اور وہ عربی لفظ زیادہ اختیار کئے گئے، جو فارسی میں آزادانہ استعمال کئے جاتے تھے، لیکن اس کے ساتھ بہت سے خالص پشتو لفظ بھی داخل ہوئے، ان پشتو الفاظ کی فہرست میں وہ سب لفظ داخل ہیں جو اصلاً سنسکرت سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ان کی مروجہ شکل ہندی میں نہیں پائی جاتی، اور اس لئے یہ کہا جانا چاہیے کہ وہ افغانستان میں ڈھل کر یہاں آئی ہے، اسی طرح وہ پشتو اور

اردو کے مشترک لفظ بھی جن کی سنسکرتی یا پراکرتی اصل نامعلوم یا مشتبہ ہے، اس وقت تک پشتو ہی کے تسلیم کئے جائیں گے جب تک ان کی سنسکرتی یا پراکرتی اصل کا قرار واقعی پتہ نہ چل جائے،

عربی فارسی لفظوں کے پشتو سے آنے کا ثبوت

میرے اس دعوے کا ایک اہم ثبوت یہ ہے کہ ہماری زبان میں بہت سے عربی، فارسی اور ترکی لفظ اپنے اصلی تلفظ سے ہٹ گئے ہیں، ہو سکتا ہے کہ یہ سب تغیرات ہندی لہجہ کا نتیجہ ہوں لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ افغانی بھی ان لفظوں کو بالکل ہمارے مطابق بولتے ہیں تو فوراً یہ سوال دماغ میں پیدا ہو جاتا ہے کہ کیا ہم نے پہلے ان سکوں کو ڈھالا اور یہاں سے افغانستان بھیجا، یا وہاں سے ڈھلے ڈھلائے ہم تک پہنچے، یا دونوں ملکوں میں بیک وقت ایک ہی قسم کے حالات کے تحت یہ سب تغیرات واقع ہوئے،

جہاں تک امکان عقلی کا تعلق ہے، ان میں سے ہر شق ممکن ہے، لیکن گزشتہ تاریخی پس منظر کے پیش نظر قرین قیاس یہی معلوم ہوتا ہے، کہ انھیں افغانی لباس میں ملبوس قرار دیا جائے، اس لئے کہ اسلامی عہد میں ہندوستانی اس تعداد میں افغانستان جا کر آباد نہیں ہوئے کہ ان کی زبان وہاں کے عوام میں بار پا سکتی نہ خود افغانی یہاں سے ہماری زبان سیکھ کر اس کثرت سے اپنے وطن واپس گئے کہ ان کے واسطے سے یہ تبدل افغانستان میں سرایت کرتا رہا، دونوں جگہ ایک ہی قسم کے حالات میں یکساں تغیر ہونا تو، مانا جا سکتا تھا، اگر یہ حقیقت پیش نظر نہ ہوتی کہ افغانی ایک ہزار برس سے یہاں کے ایک ایک گوشے میں آ آ کر رہ رہے ہیں، اور ہم ان سے سیکڑوں برس تک حاکم اور استاد کی حیثیت سے بہت کچھ سیکھتے رہتے ہیں،

چونکہ یہ بگڑے تلفظ ہمارے عوام کی زبان پر زیادہ تر چڑھے ہوئے ہیں، اس لئے اور بھی یقین ہوتا ہے کہ افغانوں ہی کی وساطت سے ان تک یہ لفظ پہنچے، جو ہمیشہ سے ہندی عوام کے دوش بدوش یہاں آباد رہے ہیں، یہی باعث ہے کہ جہاں افغانوں کی آبادی زیادہ ہے وہاں ان بگڑے ہوئے لفظوں کا استعمال بھی

خواص میں بھی کچھ نہ کچھ ضرور پایا جاتا ہے،

مثلاً ہم اردو بولنے والے عوام کو اکثر سنتے ہیں کہ وہ آزردہ کو آزردہ، آسمان کو آسمان، آسمان [illegible] آسمانی کو آسمانی اور [illegible] تک[1] [illegible] تجربہ، وتر، احتیاط کو احتیاط، تجربات، تجربہ کو تجربہ، الائچی کو الاچی، باغبان کو [illegible] برقع کو برقا، بندوق اور مرزا کو مرزا، ادر مزاج، بزاز کو بجاز یا بجاج، آدمزاد، اردو [illegible] بیدا، پیدا، اور جلاد کو آدمزات، امروت، بیت، بلیت اور جلات، پتیلہ کو پلیت، تالاب کو تلاؤ، تراویح کو تراوی، تمباکو کو تماکو، تمغا کو تغما، تندر کو تندر، توبہ کو توبہ، طوطی کو توتا، جرمانہ کو جریانہ، جمعہ عربی اور جمعہ فارسی کو جمعہ یا جما، جانور کو جناور، حبیب کو جیب، حکن کو حکن، حلم کو حلم، حجّیہ کو حجی، حباب کو حباب، درجہ کو درجہ، دیوار کو دوال، رفع دفع کو رفا دفا، رکعت کو رکات، رحل کو رحیل، سقایہ کو سقاوہ، صحیح کو سہی، سیر کو سیل، شبہہ کو شبہ، شرکت کو شراکت، صلح، ضلع، طبع، ورفع کو صلا، ضلا، طبا، ورفا، صدقہ کو صدقہ، طاق کو طاخ، طمانچہ کو تمانچہ، فراش خانہ کو فراش خانہ، قالب کو قالب، قفل کو قلف، قلعی اور قلعی گر کو قلئی اور قلئی گر، قندیل کو قندیل، کالبد کو کالبوت، کرشمہ کو کرشمہ، گریبان کو گریوان، محبت کو محبت، مشعل کو مشال یا مشل، معصوم کو ماشوم، مرہم کو ملم، نشاستہ کو نشاستہ، نیت کو نیت، واسطہ کو واسطہ، وتر کو وتر، ورم کو ورم، ویران کو وران، ہاتھی کو ہاتی بولتے ہیں،[2]

ہماری لغت کی کتابوں میں مذکورہ بالا الفاظ کو عربی فارسی یا ترکی بتایا جاتا

---

[1] پشتو میں اکا بولتے ہیں، تشدید ہندیوں کی کارستانی ہے [2] اس طرح ہمارے یہاں کے عوام و خواص دونوں عربی کے حروف حلقی اور طوے طوے کو صحیح ادا نہیں کر سکتے ہیں مگر اسے میں بھی افغانی اثر نہیں مانتا، کیونکہ جس طرح وہاں کے لوگ ان کا اصلی تلفظ کرنے سے قاصر ہیں، اسی طرح ہمارے گلے بھی اس کے لئے تیار نہیں، یہ تغیر بالیقین ایک قسم کے حالات کا قدرتی نتیجہ ہے،

ہے، اور ان کے بگاڑ کو ہندی اثر کے ماتحت رکھا جاتا ہے، میری نظر میں یہ طریق کار مناسب نہیں، انھیں افغانی بتانا چاہئے، اور ساتھ ہی یہ بھی لکھ دینا چاہئے کہ فلاں زبان کے فلاں لفظ سے پشتو میں بن کر ہماری زبان میں آیا ہے، آپ خود غور فرمائے کہ انگریزی لفظ "لینٹرن" ہمارے یہاں لالٹین ہو گیا ہے، اب اگر کوئی افغانی اسے ہم سے مانگ کر لے جائے اور یہ لفظ وہاں عام ہو کر لغت میں داخل کر لیا جائے، تو کیا پشتو لغت نویس کا یہ لکھ دینا کافی ہو گا کہ یہ انگریزی لینٹرن سے بنا ہے، یقیناً اگر وہ یہ لکھے گا تو علم اللسان کے ماہر اسے غلط کار کہیں گے، ان کا مطالبہ بجا طور پر یہ ہو گا کہ اسے اردو سے مستعار بتایا جائے، ہاں یہ بھی مزید تحقیق کے طور پر لکھ دینا چاہئے کہ اردو میں انگریزی کے فلاں لفظ سے بنا ہے،

سلسلۂ سیر الصحابہؓ

سیرۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد مسلمانوں کے لئے جن مقدس ہستیوں کے کارنامے اور سوانح حیات مشعل راہ ہو سکتے ہیں، وہ حضرات صحابۂ کرام ہیں جن کے حالات ۱۰ ضخیم جلدوں میں دار المصنفین نے شائع کئے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

جلد اول خلفائے راشدین طبع سوم	صہ	جلد ششم سیر الصحابہ	سے
جلد دوم (مہاجرین اول) زیر طبع		جلد ہفتم سیر الصحابہ	ہے
جلد سوم ،، دوم	للعہ	جلد ہشتم سیر الصحابیات طبع سوم	
جلد چہارم سیر الانصار اول (طبع دوم)	سے	جلد نہم اسوۂ صحابہ اول	ہے
جلد پنجم ،، دوم	سے	جلد دہم ،، دوم	للعہ

"منیجر"

علامہ شبلی بحیثیت فارسی شاعر کے

از جناب مرزا احسان احمد صاحب بی اے ال ایل بی علیگ،

اگر ناظرین علامہ کی مدح سرائی کا بھی انداز دیکھنا چاہتے ہوں تو اس کی بھی مثالیں اس کلیات میں موجود ہیں لیکن بہت کم ہیں، اس لئے کہ یہ چیز ان کے مذاق کی نہ تھی، ہمارے نزدیک مداحی شاعری کا کوئی کمال نہیں ہے، خصوصاً وہ مداحی جو عام طور پر ایرانی شعراء نے سلاطین و امراء کی کی ہے اس سے تو کسی بلند خیال اور شریف النفس شاعر کا قلم کبھی آلودہ نہیں ہو سکتا، البتہ اگر ممدوح کی صحیح تعریف کی جائے، اور بیجا مبالغہ اور غلو سے کام نہ لیا جائے تو چنداں مضائقہ نہیں، مثال کے طور پر علامہ کے ایک مدحیہ قصیدہ کے چند اشعار ہم اس موقع پر نقل کرتے ہیں، یہ قصیدہ سابق بیگم صاحبہ بھوپال کی تعریف میں ہے، اور اس موقع پر لکھا گیا ہے، جب بیگم صاحبہ نے ایک متعین ماہانہ رقم سے دار العلوم ندوہ کی امداد فرمائی تھی، اس قصیدے سے دراصل مصنف کو اپنے سپاس مندانہ جذبات کا اظہار مقصود تھا، اور اسی سلسلہ میں کچھ تعریفی اشعار بے اختیار قلم سے نکل گئے ہیں، ملاحظہ ہو،

آنچہ با دشت و چمن ابر بہاراں کردہ است | خسرو کشور بھوپال بما آں کردہ است
ندوہ را گر سر و سامان رسد از وے عجب | زانکہ ہر کار کہ او کرد بہ ساماں کردہ است
چوں نگہ کرد کہ دین نبوی در خطر است | لاجرم یاوری سنت و قرآں کردہ است
رایت علم نگوں بود و وا فراشتہ است | چہرۂ شرع حزیں بود و خنداں کردہ است
بہر مرداں ہمہ آئین عمل خواہد بود | آنچہ در تربیت عالم نسواں کردہ است

دانش آموختن پردہ نشیناں عفاف مشکلے بود کہ از فکر تو د آساں کردہ ست
کار آموزش و تعلیم زناں گرچہ خوش ہست نہ بآں شیوہ تواں کرد کہ ناداں کردہ ست
ہرچہ او گفت بآئین شریعت گفت ست ہرچہ او کرد بہ فرمودۂ یزداں کردہ ست
معدلت را بہ سیاست نتواں کرد بہم وقت او خوش کہ ہم ایں کردہ و ہم آں کردہ ست

اس مدح غائب کے بعد بیگم صاحبہ کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں:

بے کساں را نگہ مہر تو نوا ختہ است خستگاں را نظر لطف تو درماں کردہ ست
ہر کرا دامن دولت تو افتاد بکف صد ہزاراں گل امید بداماں کردہ ست
چرخ از چشم جہاں رابعہ را گر بہ نہفت باز دیگر پاک تو نمایاں کردہ است

اگرچہ پورا قصیدہ خوشامدانہ مداحی اور بیجا مبالغہ سے بالکل پاک ہے، اور جو صفات بیان کی گئی ہیں ان میں سچائی اور واقعیت ہے، تاہم اتنی مدح بھی علامہ کی طبع غیور پر گراں ہے، چنانچہ آخر میں ضبط نہیں ہوتا، اور صاف کہدیتے ہیں،

شبلی عمر زدہ را مدح شہاں شیوہ نبود لیک لطف ہمہ را بندۂ احساں کردہ ست

علامہ کو ریاست حیدرآباد سے خاص تعلق تھا لیکن یہاں بھی عزت نفس اور خودداری کا سررشتہ ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پایا، ناظرین کو تعجب ہوگا لیکن ایک اقلیم علم و دانش کے فرمانروا کی شان کجکلاہی کا یہی تقاضہ تھا، غرض علامہ کی شاعری بیجا مدح سرائی کے داغ سے پاک ہے، جو کچھ مدح و تعریف کی ہے وہ کسی خاص موقع یا واقعہ سے متاثر ہوکر کی ہے، اس لئے اس میں عام قصیدہ گویوں کی طرح منافقانہ تصنع کی آلائش نہیں پائی جاتی، بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ خلوص و محبت کی تحریک سے بے اختیار قلم اٹھ گیا ہے،

علامہ مرحوم نے ایک نعتیہ قصیدہ بھی لکھا ہے، یہ آغاز شباب کے زور قلم کا نتیجہ ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ کو زبان پر کتنی غیر معمولی قدرت حاصل ہے، اور ہم قافیہ الفاظ کا کتنا وسیع ذخیرہ ان کے

پاس موجود ہے، چند آخری نعتیہ اشعار ملاحظہ ہوں،

آں خسرو عرش آستاں، آں داور گیتی ستاں — آں قبلہ گاہ انس و جاں، آں خاتم پیغمبراں

دانائے اسرار نہاں، روح الامینش پاسباں — گردوں برنگ چاکراں خاک درش را بوسہ زن

پیش از ہمہ شاہاں نگر، عیسیٰ اشتا خوانش نگر — چرخ از غلامانش نگر، واں قدر ایوانش نگر

برتر ز کیوانش نگر، جبریل دربانش نگر — در بند احسانش نگر آبائے علوی ہفت تن

عالم ہمہ خاک تہش، قصر فلک عشرت گہش — ویں بارگاہ نہ تہش، گشتہ کمینہ خرگہش

گیتی و ایں ہفت بہش، [illegible] — وز جلوہ نور رخش روشن شدہ ایں نہ انجمن،

آں تاجدار ملک دیں، دارائے اقلیم یقیں — دانائے علم اولیں، فرماں برش روح الامیں

عالم شدش زیر نگیں، چرخش ہمی بوسد زمیں — آدم [illegible] دربار وطیں، او گشتہ میر انجمن

باوجود ایک خاص صنعت کے التزام کے طرز ادا، انداز بیان کی روانی اور الفاظ کی فصاحت و موزونی میں کہیں سے کوئی خاص نقص نظر آتا ہے، پورے قصیدہ کا شروع سے آخر تک یہی رنگ ہے،

ناظرین کو علامہ مرحوم کا یہ دعویٰ "زہد را من آشنائی دادہ ام با عاشقی" غالباً یاد ہوگا، مذکورۂ بالا مثالوں میں علامہ نے اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے جس والہانہ شیفتگی اور عقیدت کا اظہار کیا ہے، کیا وہ اس دعویٰ کے ثبوت کیلئے کافی نہیں ہے، یہ وہی دل ہے جس کے رندانہ جوش و مستی کا عالم تغزل کے میدان میں ناظرین دیکھ چکے ہیں، لیکن اب اسی رند مینا بدوش کی ادائوں میں دین و ایمان کے ذوق محبت کی سرشاریاں نظر آرہی ہیں، اور اب اسی زبان سے جو خدا کا نام بھی بے ذوقی سے لے رہی تھی، اتباع کتاب و سنت کی مقدس صدائے دعوت بلند ہو رہی ہے،

ایں سعادت بزور بازو نیست — تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اصناف سخن میں سے علاوہ قصائد کے مثنوی کی صنف بھی شاعرانہ کمال کا ایک خاص تماشاگاہ

ہے، جہاں شاعر کی قوت نظم کی سحر کاریوں کا اصلی سماں نظر آتا ہے، اگرچہ علامہ نے کسی خاص موضوع پر کوئی مستقل مثنوی نہیں لکھی ہے، تاہم اس کلیات میں کچھ ایسے نمونے موجود ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ کی سعی قلم اس میدان میں بھی ناکامیاب نہیں رہ سکتی تھی، مثال کے طور پر ہم علامہ کی ایک خاص نظم کے چند اشعار نقل کرتے ہیں جس میں ان کے خامۂ سحر کار نے عید اضحیٰ کے موقع پر سلطان ٹرکی کی ادائے نازکا منظر پیش کیا ہے،

مہر چو از جیب افق سر کشید	خاست ز ہر ناحیہ گلبانگ عید
دیدہ ز از خواب چو برخاستند	پیر و جواں جملہ تن آراستند
شیوہ و آئین طرب تازہ گشت	کوچہ و بازار پر آوازہ گشت
مژدہ رسید اینکہ شہ چارہ ساز	زود برآید با دائے نماز
تا بود از خوانِ کرم توشۂ	خلق بروں ریخت ز ہر گوشۂ
ہیچ یک نظر راہ تماشا نیافت	نقش قدم ہم بہ زمیں جانیافت
از دو سوئے راہ بکسب شرف	خلق بآئین ادب بست صف
مہر چو در ہر جہت افشاند زر	کوکبۂ شاہ عیاں شد زدور
گشت رواں از پے ہم خیل و فوج	موج تو گوئی کہ شکستی بہ موج
بود شعار ہمہ اندر ہم جدا	ہر ہمہ را رایت و پرچم جدا
پرتو آں اسلحۂ تابناک	نور ہمی ریخت بداماں خاک
با ہمہ تمکین چو گذشت ایں گروہ	گشت بیکبار زمین پر شکوہ
غلغلہ برخاست کہ بادا نوید	مرحبا نائب خلافت دمید

اس کے بعد سلطان المعظم عبد الحمید خاں کی شان میں کچھ مدحیہ اشعار لکھے ہیں اور آخر میں سلطان

کو مخاطب کرکے اپنے جذبۂ اخلاص و عقیدت کو اس طرح ظاہر کیا ہے،

آں توئی امروز کہ در روزگار | ہست بر دولت و دیں اقتدار
تازگیِ گلشنِ چمن از تو ہست | زیب و طرازِ حرمین از تو ہست
فرۂ دینِ نبوی از تو ہست | بازوے اسلام قوی از تو ہست
شوع بجاہِ تو چو شد ارجمند | باد بفرمانِ تو چرخ بلند

سکۂ اقبال بنامِ تو باد
ہر چہ بگیتی ست بکامِ تو باد

قسطنطنیہ سے عزیزانِ وطن کو مخاطب کرکے ایک ناتمام مثنوی کی صورت میں اپنے حالات و کیفیات کو بیان کیا ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں،

از کرمِ داورِ بالا و پست | حالِ من آنگونہ کہ بایست ہست
ہم بہمال طرز و روش میرزیم | زندہ ام و فارغ و خوش می زیم
نیست مرا انجمن آرائی | ایں ہمہ در گوشۂ تنہائی
ریشہ نہ پیر سید کہ زاں جلوہ گاہ | تا چہ بود حاصلِ چشم و نگاہ
ہے چہ تواں گفت کہ ذوقِ سخن | ہر نفسم می برد از خویشتن
گرچہ بخواہم کہ نشینم خموش | فرصت آں کو کہ بیایم بہوش
گرچہ بعرضِ سخن آمادہ ام | مست ز کیفیتِ ایں بادہ ام
بگذر ازیں حرف و مکرر مپرس | خواب خوشی دیدم و دیگر مپرس
تشنہ بود خوابم ہنوز | دیدۂ من باز و بخوابم ہنوز
با تو چگویم کہ چہا دیدہ ام | شعبدہ ہا پیش نظر چیدہ ام

بزمم چو از جلوۂ زیبا پر است
دامن چشمم ز تماشا پر است

علاوہ واقعہ طرازی اور تسلسل خیال کے مذکورۂ بالا مثالوں کی لطافت زبان پر غور کرو، معلوم ہوتا ہے کہ ایک صاف، شیریں قدرتی چشمہ پہاڑ کے دامن پر نکل کر بلا کسی رکاوٹ کے مستانہ وار بہتا چلا جاتا ہے،

ابتک جو کچھ لکھا گیا، اس سے ناظرین کو علامہ کی پرجوش اور ولولہ انگیز طبیعت کی سرمستیوں اور رعنائیوں کا کافی طور پر اندازہ ہو گیا ہوگا، اب دیکھنا یہ ہے کہ علامہ نے درد و غم کے جذبات کس طرح ادا کئے ہیں کہ یہ بھی شاعری کا ایک خاص میدان ہے،

اس کلیات میں متعدد مراثی ہیں، اور یہ ان بزرگوں کی وفات پر لکھے گئے ہیں جن کی علامہ کے دل میں خاص وقعت اور محبت تھی، لیکن باوجود اس کے ان مرثیوں میں درد و غم اور سوز و گداز کی وہ خاص کیفیت محسوس نہیں ہوتی جو اصولاً مرثیہ کیلئے نہایت ضروری ہے، مثلاً نواب ضیاء الدین خاں متخلص بہ نیّر کا مرثیہ لکھتے ہیں، تو اس کی ابتدا یوں کرتے ہیں،

گرم ہنگامہ شو اے نالۂ دل ہاں برخیز　　　از پئے برہمیِ عالمِ امکاں برخیز
تو ہم اے آہِ جہاں سوز بساماں برخیز　　　اے جنوں باز بتاراجِ گریباں برخیز
چشم خونابہ فشاں خواست چو طوفاں کردن
خوں شو اے دل کہ تو انم سر و ساماں کردن

غور کرو، یہ کسی غمزدہ دل کی ندائے درد ہے، یا کسی بلند حوصلہ جوان کا نعرۂ جنگ ہے!

دوسرے بند کا انداز ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں،

تو جہاں این ہمہ درہم شدہ چون ست و چہ ہست   آسماں حلقۂ ماتم شدہ چون ست و چہ ہست

مہر داغ دل عالم شدہ چون ست و چہ ہست   اختراں دیدۂ پرنم شدہ چون ست و چہ ہست

شاہد روز بمرگ کہ بماتم بنشست

از چہ لیلائے شب آشفتہ و درہم بنشست

یہاں بھی انداز بیان کے جوش و خروش کا وہی عالم ہے، حالانکہ یہ جوش و خروش کا وقت نہیں ہے، اور نہ قلم سے شاہد روز لیلائے شب وغیرہ کی سی رنگین ترکیبوں کے نکلنے کا موقع ہے، غور کرو یہ صرف ایک باکمال اور نکتہ سنج شاعر کی وفات کا واقعہ ہے، اس کا اثر صرف بزم سخن کو ملول اور افسردہ کر سکتا تھا، لیکن دیکھو، زور قلم نے اس اثر کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا، یعنی تمام کائنات ارضی و سماوی پر ایک غبار غم کی تاریکی چھا گئی، حالانکہ یہ حادثہ ایسا نہ تھا کہ نظام کونین درہم برہم ہو جاتا، آسمان حلقۂ ماتم بن جاتا، ستارے اشکباری کرنے لگتے، اس سے میری یہ مراد نہیں ہے کہ علامہ کا دل اس واقعہ سے متاثر نہ تھا، یا انھوں نے محض تصنع سے کام لیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ علامہ اپنے ولولہ انگیز دل و دماغ اور سحر کار قلم کی رعنائیوں سے مجبور تھے، اس لئے جذبات غم کی مصوری ان کے بس کی چیز نہ تھی، قدرت نے ان کو ایک رنگین اور شگفتہ طبیعت عطا کی تھی جس کیلئے نوحہ خوانی نہایت دشوار کام تھا، چنانچہ اپنے والد مرحوم کے مرثیہ میں صاف طور پر اپنی اس مجبوری کی معذرت کر دی ہے،

دستاں سرائے بزم طرب بودہ ام بدہر   ما را بنوحہ زمزمہ سنج فغاں مکن

علامہ نے اس شعر میں اپنی فطرت کا اصلی مذاق ظاہر کر دیا ہے، اب اس کے بعد انکے زبان و قلم سے کیا شکایت کی جا سکتی ہے،

خونی تعلق کے جوش و اثر کی بناء پر خیال تھا کہ والد کے مرثیہ میں کم از کم انداز بیان کچھ ایسا پر سوز اور درد انگیز ہوگا کہ پڑھنے والے کی بھی آنکھیں پرنم ہو جائینگی، لیکن اس موقع پر بھی دل میں درد و غم کی جدوجہد فرما

تڑپ تھی اسکی کوئی موثر تصویر آنکھوں کے سامنے آنہ سکی، البتہ علامہ نے اپنے محترم استاد مولانا فیض الحسن مرحوم سہارنپوری کا جو مرثیہ لکھا ہے اس کے انداز بیان میں کچھ سوز و گداز کی کیفیت ضرور محسوس ہوتی ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں،

درین آشوب غم عذرم بنہ گر نالہ زن گریم — جہانے را جگر خوں شد ہمیں تنہا نہ من گریم

بہ تحسین صبوری چند بفریبی مرا ناصح — دمے بگذار تا در ماتم فیض الحسن گریم

بہ رگش علم و فن در نالہ با من ہم نوا باشد — ہنر بر خویشتن گرید چو من بے خویشتن گریم

خود ایں آشوب این ہنگامہ از یادم نخواہد شد — ہماں خوں باشد ایں غم تا دریں دیر کہن گریم

بہ یکبار انجمن برہم زدی تا از میاں رفتی — سزد من گرد ریں ماتم چو شمع انجمن گریم

چہ درد دل تا از کہ رنجیدی چرا رفتی

زمانگسستہ اے مولاے ما آخر کجا رفتی

علمی و ادبی فضائل و کمال کے لحاظ سے مولانا فیض الحسن مرحوم کی ہستی عدیم المثال تھی، علامہ مرحوم نے انکے مکتب درس سے خاص طور پر کسب فیض کیا تھا، اس لئے ان کی وفات سے علامہ مرحوم کو غیر معمولی صدمہ پہنچا تھا، جس کا اندازہ آخری بند کے چند اشعار سے ہو سکتا ہے،

زہیں در کار غم دل بودہ است و دیدۂ تو ام — بخاک تربت او لعل افشاندیم و گوہر ہم

سخن را ایں چنیں شیرازہ بستن تا کہ تواند — پس از وے دفتر معنی پریشاں گشت و ابتر ہم

صبا گر بگذری بر تربت پاکش بگو از من — کہ اے در شیوۂ دانش مرا استاد و رہبر ہم

درود بے بنیش آوردہ ام باشد کہ بپذیری — کہ شبلی خاکبوس درگہت بود دست بوس ہم

ازیں خواب گراں آخر چو روز حشر برخیزی

چو صور حشر من در نالہ ام وقت است گر خیزی

لیکن اس انتہائی غم کی حالت میں بھی طبیعت کی شوخی و رعنائی نہیں گئی چنانچہ دوسرے بند میں مولانا مرحوم کے فضل و کمال کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ شعر بھی قلم سے نکل گیا،

نکیرین از کجا سہنجد لطف طبع رنگینت ۔۔۔ بنا فہماں ندانم چوں پسندی ہمزباں بودن

بہر حال واقعہ یہ ہے کہ علامہ کا ادیبانہ قلم کسی موقع پر رنگینی سے باز نہیں آسکتا تھا۔ یہ انکی فطرت تھی اور فطرت کا بدلنا بہت دشوار بلکہ تقریباً ناممکن ہے

لکھنے کو تو اتنا بہت کچھ لکھ گیا، لیکن معلوم نہیں کہ ارباب نظر کے نزدیک میری یہ ناچیز سعی کس حد تک علامہ مرحوم کے کلام پر نقد و تبصرہ کرنے میں کامیاب ہوئی ہے، لیکن اتنی توقع ضرور ہے کہ باوجود اپنی محدود قابلیت کے جو کچھ عرض کر سکا ہوں اس سے اہل ذوق کو علامہ مرحوم کی شاعری کے نمایاں محاسن و خصوصیات کا کافی طور پر اندازہ ہو گیا ہوگا،

علامہ کے خیالات و جذبات کی شوخی، رعنائی احساسات، ملبندی اور لطافت کچھ کم قابل قدر نہیں ہے لیکن ہمارے نزدیک بحیثیت فارسی شاعر کے انکا اصلی کمال ان کی خالص ایرانی طرز ادا ہے جو بہت کم ہندوستانی فارسی شعرا کے کلام میں نظر آتی ہے، علامہ نے تقریباً ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی ہے، لیکن ہر جگہ زبان کے لحاظ سے اپنے صحیح ذوق فارسیت کا ثبوت دیا ہے یعنی ہندوستان میں بیٹھکر انھوں نے وہ زبان استعمال کی ہے جس پر اہل زبان کو بھی حرف گیری کی جرأت نہیں ہو سکتی، علامہ اگرچہ الفاظ و محاورات کی صحت کا خاص خیال رکھتے تھے یعنی کوئی لفظ یا محاورہ ان کے قلم سے ایسا نہیں نکلتا تھا جس سے ہندوستانیت کی بو آتی ہو، تاہم سفر روم کے قصیدے میں ایک جگہ لفظ "عرصہ" بمعنی مدت و زمانہ استعمال کر گئے ہیں، حالانکہ فارسی میں یہ بمعنی میدان وغیرہ مستعمل ہے، مثلاً عرصہ عالم، عرصہ محشر عرصہ خیال وغیرہ، مدت و زمانہ کے مفہوم میں اس کا استعمال صحیح نہیں ہے وہ شعر یہ ہے،

آرزو آنکہ رفیق است و ہم استاد مرا ۔۔۔ ہم دراں عرصہ بانگلینڈ ہمی خواست سفر

لیکن ہمارے نزدیک یہ قلم کی محض اتفاقی لغزش معلوم ہوتی ہے ورنہ یہ کیونکر تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ علامہ کو عرصہ کا صحیح فارسی تلفظ معلوم نہیں تھا، خیالات کی رو میں نادانستہ اس قسم کا سہوا ساتذہ فن سے بھی ہو جاتا ہے،

غرض علامہ مرحوم نے باوجود اپنی علمی مصروفیتوں کے فارسی شاعری کا جو نمونہ پیش کیا ہے اس کی ندرت اور بلند پایگی سے انکار نہیں ہوسکتا اور نہ مجموعی حیثیت سے ہندوستان کے دوسرے فارسی گو شعرا کے کلام میں اس کی مثال مل سکتی ہے،

اکثر باکمال شعرا نے اپنے کمال فن پر اظہار فخر کیا ہے، فیضی، عرفی وغیرہ کے فخریہ اشعار تمہاری نظر سے گذرے ہوں گے، علامہ نے بھی متعدد مواقع پر اپنے اس احساس کا اظہار کیا ہے، زبان کی لطافت روانی اور برجستگی کے لحاظ سے بھی یہ اشعار سننے کے قابل ہیں، سیرۃ النعمان کے دیباچہ میں فرماتے ہیں،

باز برآنم کہ دریں داوری	دل برم از خلق با فسونگری
خواستہ ام طرح دگر ریختن	شعبدۂ تازہ برانگیختن
بزم دگر ہست وتماشا دگر	بادہ دگر آرم ومینا دگر
زمزمۂ تازہ بساز افگنم	غلغلہ در حلقۂ راز افگنم
بادہ فرستم بحریفان دگر	از مے دوشین قدرے تند تر
زخمہ کہ بر تار سخن می زنم	ہاں بنگر تا بچہ فن می زنم
قاعدۂ سحر طراز یست ایں	نیک نگہ کن کہ چہ بازیست ایں
حرمت ایں کار نگہداشتن	نامہ بہ لعل و گہر انباشتن
کار من ست ایں حد ہر خام نیست	ایں بود آں مے کہ بہ ہر جام نیست
کان معانی ہمہ کاویدہ ام	کیں گہرے چند فراچیدہ ام
غارت گنجینۂ چیں کردہ ام	تا صنمے چند گزیں کردہ ام

خاک درِ میکدہ می بیختم | کیں مے صافی بقدح ریختم
گرچہ متاع از دگر آوردہ ام | قطرہ ربودم گہر آوردہ ام
گرچہ مرا شیوۂ فن ایں نبود | حرف بہ اردو زدن آئیں نبود
پیشتر ارگرم طلب بودہ ام | بادیہ پیمائے عرب بودہ ام
بزم چو آں فرۂ وآں ساز داشت | ساغر من بادۂ شیراز داشت
لیک چو آں مطرب وساقی نماند | بوے ازاں میکدہ باقی نماند

ایک دوسری نظم کے سلسلہ میں علامہ کی جدت آفریں طبیعت کی شان اوعا ملاحظہ ہو۔

خواہم اکنوں عناں بگردانم | رسم پیشینیاں بگردانم
زیں بساطِ کہن چو برخیزم | پیکرے تازۂ برانگیزم
رسم دیرینہ را بہ اندازم | درسخن طرح دیگر اندازم
بدمم خلق را فسون دگر | کردہ ام ساز ارغنون دگر
تا بسنجی کہ با کمال سخن | تنگیٔ نیست در مجال سخن

بطور دیباچۂ الفاروق علامہ مرحوم نے جو قطعہ لکھا ہے، اس کو اس موقع پر نظر انداز کر دینا ارباب ذوق پر بہت بڑا ظلم ہوگا اور اب ہم اسی قطعہ پر اس ریویو کو ختم کرنا چاہتے ہیں عجب پر جوش اور کیف انگیز قطعہ ہے، فرماتے ہیں،

منکہ یکچند زدم مہر خموشی برلب | کس چہ داند کہ دریں پردہ چہ سودا کردم
پیکر تازہ کہ خواہم بہ عزیزاں بنود | لختے از ذوق خودش نیز تماشا کردم
محفل از بادۂ دوشینہ پیاسود ہنوز | بادۂ تند تر از دوش بہ مینا کردم
باز خواہم کہ دمم در تن اندیشہ رواں | منکہ دریوزۂ فیض از دم عیسی کردم

ہمنشیں نکتۂ حکمت ز شریعت می جست — نکتے از نسخۂ روح القدس املا کردم

شاہد راز کہ کس پردہ ز رویش نگرفت — گرہ از بند قبایش بہ فسوں وا کردم

بسکہ ہر بار گہر پاش گذشتم زیں راہ — دشت معنی ہمہ پر لولوے لالا کردم

افسوس کہ اس خامہ سحر کار کی گہر پاشیوں سے چمنستان ادب ہمیشہ کیلئے محروم ہو گیا، معلوم نہیں کہ علامہ کے ان لطیف نازک اور پر کیف نغموں نے اہل ذوق کے شاعرانہ احساس پر کیا اثر ڈالا ہے، لیکن ہم تو علامہ مرحوم کی بارگاہ سے یہ کہکر رخصت ہوتے ہیں،

"بانگ قلت درین شب تار — بس معنیٔ خفتہ کرد بیدار"

کلیاتِ فارسی

مولانا شبلی مرحوم کے تمام فارسی قصائد، غزلیات، مثنویات، اور قطعات کا مجموعہ جو اب تک متفرق طور سے دیوان شبلی، دستہ گل، بوئے گل، برگ گل کے ناموں سے چھپے تھے، اس میں سب یکجا کر دیئے گئے ہیں، قیمت عہ/

کلیاتِ اُردُو

مولانا کی تمام اردو نظموں کا مجموعہ، جس میں مثنوی صبح امید، قصائد جو مختلف مجلسوں میں پڑھے گئے، اور وہ تمام اخلاقی، سیاسی، مذہبی، اور تاریخی نظمیں جو کانپور، ٹرکی، طرابلس، بلقان، مسلم لیگ، مسلم یونیورسٹی وغیرہ کے متعلق لکھی گئی ہیں، یہ نظمیں درحقیقت مسلمانوں کی بیس سالہ جد و جہد کی ایک مکمل تاریخ ہے، قیمت عہ/

ہندستان کے کتب خانے

از مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی

(۴)

جونپور کے کتبخانے خاندان تغلق کے زوال کے زمانہ میں جب ہندوستان کا ہر صوبہ دار خود مختار ہوگیا تو جونپور کے نائب حکومت خواجہ جہاں نے بھی ملک الشرق کا لقب اختیار کر کے شرقی خاندان کی بنیاد ڈالی، اس کے جانشینوں نے قنوج سے لیکر بنگال تک کا خراج وصول کیا

یہ بڑا زرخیز خطہ تھا اس لئے بہت جلد یہاں کے حکمراں طاقتور ہوگئے اور بہت جلد ترقی کر کے تمدن کے تمام لوازم جونپور میں جمع کر دئے، بڑی بڑی مسجدیں، خانقاہیں، سرائیں، مدرسے حمام اور عالیشان محلات تعمیر کرائے،

گو اس سلطنت کی عمر بہت تھوڑی یعنی صرف اسی برس رہی، مگر شاہان شرق کی قدر دانی اور جوہر شناسی سے ہر قسم کے اہل کمال جونپور میں جمع ہوگئے تھے، علماء کی قدر دانی کا یہ حال تھا کہ خود بادشاہ بنفس نفیس ان سے ملنے جایا کرتے تھے، مدارس اور خانقاہوں کیلئے لاکھوں روپئے کی جائدادیں وقف کیں اور علماء کیلئے بڑے بڑے وظائف مقرر کئے،

سلطنت کے انقلاب کے بعد جب مغلوں کا دور آیا تو ان کی قدر افزائی کی وجہ سے پرانی سرگرمی میں کوئی فرق نہیں آنے پایا، شاہجہان فخریہ طور پر کہا کرتا تھا کہ "شرق ما شیراز ماست" برہان الملک جب اودھ کا صوبہ دار ہوکر آیا تو اس نے اصحاب کمال کی تمام جاگیریں چھین لیں اور وہ لوگ پریشان حال ہوکر منتشر ہوگئے، اور یہ علمی بزم درہم برہم ہوگئی،

سلاطین شرقی نے اپنے عہد میں بے شمار مدرسے قائم کئے، اور یہ سلسلہ عہد مغلیہ تک قائم رہا، تاریخ سے مندرجۂ ذیل مدارس کا خاص طور پر پتہ چلتا ہے،

(۱) مدرسہ قاضی شہاب الدین دولت آبادی (۲) مدرسہ عادل (۳) مدرسہ استاد الملک (۴) مدرسہ ملا محمود (۵) مدرسہ شیخ رکن الدین (۶) مدرسہ ملا خضری (۷) مدرسہ حیدریہ (۸) مدرسہ ملا شمس نور (۹) مدرسہ صادقیہ (۱۰) مدرسہ خلیلیہ (۱۱) مدرسہ جمیلیہ (۱۲) مدرسہ ملا باب اللہ (۱۳) مدرسہ صدر جہاں (۱۴) مدرسہ شمس الدین

یہ وہ مدارس ہیں جن کا درجہ آجکل کے کالجوں کے برابر تھا، ان میں بڑے بڑے مشہور ماہر فن تعلیم دیتے ان مدارس کی اپنی عمارت ہوتی تھی، طلبہ کیلئے دار الاقامے اور ان کے ساتھ مسجدیں اور کتبخانے تھے غرض تعلیم کی تمام ضروریات ان میں مہیا تھیں،

ان کے علاوہ بے شمار ذاتی کتبخانے بھی تھے، مولوی معشوق علی مرحوم ۱۲۶۲ھ کا کتبخانہ جونپور میں خاص شہرت رکھتا تھا، اس کتبخانہ میں پانچ ہزار کتابیں تھیں[1]، وہ خود درس و تدریس کا ذوق رکھتے تھے اور ان کے درس میں ہر فن کے طلبہ رہتے، اس سے قیاس ہوتا ہو کہ اس کتب خانہ میں ہر قسم کی کتابیں رہی ہوں گی، آپنے ایک کتاب تحفۂ لطیفہ کے نام سے اخلاق میں، اور دوسری فرائض میں تالیف کی، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو اخلاق اور فقہ سے خاص دلچسپی تھی،

ایک اور کتبخانہ مفتی سید ابو البقا متوفی ۱۰۴۰ھ کا تھا، وہ شاہجہاں بادشاہ کے عہد میں جونپور کے مفتی تھے، آپ کی ذہانت اور حافظہ کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ کتاب پڑھ لینے کے بعد زبانی یاد ہوجاتی تھی، ایک مرتبہ شاہجہاں نے ایک ایسی کتاب اصلاح کیلئے بھیجی جو متعدد جگہ سے خراب ہو گئی تھی، انھوں نے اس کو ایک مرتبہ پڑھکر کتب خانہ میں رکھدیا، اور بھول گئے، چھ مہینے کے بعد جب بادشاہ کی طرف سے تقاضا شروع ہوا تو آپ کو خیال آیا، اتفاق سے کتب خانہ میں ہرچند تلاش کیا مگر نہ ملا، مجبوراً اپنے قلم سے مکمل کتاب لکھکر بادشاہ کے پاس بھیجدی، بادشاہ بہت خوش ہوا اور انعام و جاگیر سے سرفراز فرمایا،[52]

[1] تجلی نور ج ۲
[2] تذکرہ علما (اردو) ص ۹۴

عادل شاہی کتبخانے | سلطنت بہمنی کے خاتمہ کے بعد دکن میں پانچ نئی سلطنتیں قائم ہوئیں، بریدشاہی قطب شاہی، نظام شاہی، عماد شاہی اور عادل شاہی، ان میں سے عادل شاہی سلطنت سب سے زیادہ طاقتور تھی، اس کے تعلقات ہندوستان کے علاوہ دوسرے ممالک سے بھی بہت دوستانہ تھے، ایران اور روم کے سفیر ایک دوسرے کے یہاں اکثر آتے رہتے تھے، اور نادر تحائف کے ذریعہ محبت کے رشتہ کو مضبوط کرتے تھے،

عادل شاہی سلاطین جس طرح سیاسی معاملات میں بہت ذی ہوش تھے اسیطرح علوم وفنون کی سرپرستی میں بھی ممتاز تھے، ان کا دربار شعراء، فضلاء، حکماء سے بھرا رہتا تھا، ملاظہوری، ملا ملک قمی، ملا فتح اللہ شیرازی، خواجہ عنایت اللہ شیرازی، قاسم فرشتہ سب اسی دربار سے متعلق تھے، اس قدردانی کے سبب فارس، عراق، آذربیجان اور عرب سے اہل کمال کھنچ کھنچ کر یہاں آگئے تھے، رفیع الدین شیرازی جو خان سالار اور خزانچی تھا اس کا بیان ہے کہ شیراز میرا وطن ہے اس لئے میں صحیح طور پر جانتا ہوں کہ دس ہزار اشخاص بادشاہ کی قدردانی سے فیضیاب ہوئے[1]

تصنیف، تالیف و ترجمہ کا جس قدر کام اس سلطنت کے زیر سایہ ہوا، اتنا اس کی حریف سلطنتوں میں سے کسی نے انجام نہیں دیا، اس عہد میں بکثرت مساجد، مدارس، سرائیں، پل اور خانقاہیں بنوائی گئیں، کتابوں کا بھی اس خاندان کو خاص ذوق تھا، اور ایک بڑا شاہی کتبخانہ بیجاپور میں قائم تھا، خود علی عادل شاہ متوفی ۹۸۸ھ کتابوں کا بڑا دلدادہ تھا، اکثر اس کے مطالعہ میں کتابیں رہتی تھیں، شاہی کتبخانہ کے علاوہ اس کا ذاتی کتب خانہ بھی تھا جو سفر اور حضر میں ہمیشہ اسکے ساتھ رہتا تھا، تاریخوں میں عادل شاہ کی نسبت لکھا ہے کہ

کتابوں کی طرف اس کو بڑی رغبت تھی، ہر قسم کی کتابیں مہیا کرکے کتب خانہ میں داخل کیا تھا، اس کتب خانہ میں ساٹھ آدمی کام کرتے تھے جس میں کاتب، خوشنویس، مذہب، طلاکار،

[1] بساتین السلاطین ص ۲۴۳،

جدول بنانے والے، مجلد ساز، نقاش ہر وقت اپنے کام میں مصروف رہتے،

چار صندوق منتخب کتابیں ہمیشہ اس کے ساتھ سفر و حضر میں رہتی تھیں، ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ سفر کا آخری دن تھا، بارش بہت سخت ہوئی لشکر منتشر ہو گیا، بادشاہ بھی ایک جگہ خیمہ زن ہوا، اور مطالعہ کیلئے کتابیں مانگیں، معلوم ہوا کہ اس پریشانی میں کتابیں کسی دوسرے گاؤں میں لشکر کے ساتھ چلی گئی ہیں، علی عادل شاہ بہت برہم ہوا، اور کہا بارہا میں نے تاکید کی کہ کتابیں ہمیشہ میرے ساتھ ہی رہا کریں لیکن تم لوگ خیال نہیں کرتے، اور اسی وقت ایک امیر خاص کتابیں لانے کیلئے مقرر متعین کیا گیا اور جب تک کتابیں نہ آگئیں وہ بے قرار رہا،[1]

کتب خانوں کا انتظام | موجودہ زمانہ کی طرح قدیم زمانہ میں بھی کتب خانہ کے انتظام کیلئے ایک خاص محکمہ ہوتا تھا، جس کے ماتحت بہت سے چھوٹے بڑے عہدہ دار ہوتے، خانقاہ، مدارس مساجد اور ذاتی کتب خانوں کو چھوڑ کر جو کتب خانے سلاطین یا امرائے ملک قائم کرتے اس کے لئے ایک خاص عمارت علیحدہ بنواتے، اس میں ہوا اور روشنی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا اور اس کا لحاظ بھی رکھا جاتا تھا کہ زمین ایسی ہو جہاں دیمک یا اس قسم کے دوسرے کیڑے نہ پیدا ہوں، فرش ایسا ہو کہ جس پر نمی کا اثر نہ ہو سکے کہ اس سے کتابیں جلد خراب ہو جاتی ہیں، جیسا کہ ہمایوں اور اکبر کے کتب خانوں کی عمارت سے ظاہر ہوتا ہے،

ناظم | کتب خانہ کا سب سے بڑا عہدہ دار ناظم ہوتا تھا جس کو معتمد بھی کہتے تھے[2]، اس کو آمد و خرچ تقرری اور برطرفی ہر قسم کے اختیارات حاصل ہوتے تھے، شاہی کتب خانہ کا یہ عہدہ عموماً ارکین دولت کیلئے مخصوص تھا جیسا کہ عموماً شاہی کتابوں کے مہروں سے معلوم ہوتا ہے،

داروغہ یا مہتمم | اس کے بعد دوسرا درجہ مہتمم کتب خانہ کا تھا جو ناظم کے زیر ہدایت کتب خانہ کا انتظام کرتا تھا[3]، اس کیلئے اعلیٰ قابلیت اور علوم و فنون میں کافی دستگاہ ضروری تھی، اس کا

---

[1] تذکرۃ السلاطین ص ۱۴۸ [2] شاہجہان نامہ ج ۲ ص ۵۰۵ [3] معارف جلد ۱۵ ص ۲۲۳ - ۲۲۴

ایک نائب بھی ہوتا، انتظامی امور کے علاوہ کتابوں کا انتخاب، ان کی خریداری، اور فنون کے اعتبار سے ان کی تقسیم، اس کا کام ہوتا تھا، اس کے زیر نگرانی متعدد منشی (کلرک) ہوتے تھے، جن کا کام رجسٹروں میں کتابوں کا اندراج، ہر فن کا رجسٹر الگ الگ رکھنا، کتابوں پر نمبر لگانا وغیرہ ہوتا[1] جیسا کہ شاہان اودھ کے کتب خانہ میں دستور تھا،

صحاف و وراق ان کے ماتحت متعدد ملازم ہوتے جو کتابوں کو صندوقوں یا الماریوں میں ترتیب کے ساتھ رکھتے اور نکالتے تھے، انھیں کے زیر نظر صحاف اور وراق بھی ہوتے،[2] جو ایک ایک کتاب کو نکالکر جھاڑتے اور ایک ایک ورق کھولکر صاف کرتے جو اوراق چپک جاتے ان کو علحدہ کرکے گرد و غبار سے پاک و صاف کرتے،

جلد ساز کتب خانہ کیلئے جلد سازوں کا ہونا بھی ضروری تھا جن کی تعداد ضرورت کے مطابق کم و بیش ہوتی رہتی، یہ جلد ساز اپنے فن کے ماہر اور جس زمانہ میں جس قسم کی جلدوں کا رواج ہوتا اس سے بخوبی واقف ہوتے[3] اور بحمد اللہ کہ آج بھی حیدرآباد دکن میں ایسے جلد ساز موجود ہیں جو سلف کے یادگار اور ان کے صحیح جانشین ہیں

مصور ہر کتب خانہ میں متعدد مصور ہوتے تھے، جو کتابوں میں بہترین قسم کی تصویریں بناتے تھے ان کو مصوری میں اتنا کمال حاصل ہوتا تھا کہ ان کی تصویروں میں صرف مصور حقیقی کی روح ڈالنے کی کسر رہ جاتی تھی، اور یہی حال نقاشوں کا تھا جن کی رنگ برنگ کی نقاشی سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پھولوں کا چمن کھلا ہوا ہے، یہ رنگ سازی اور رنگ آمیزی دونوں کے ماہر ہوتے تھے، رنگ کی پختگی کا یہ حال تھا کہ آج سے دو دو سو اور تین تین سو برس پہلے کی بنائی ہوئی تصویروں اور نقش و نگار کے رنگوں کی شوخی آب و تاب اور چمک دمک میں کوئی فرق نظر نہیں آیا اور معلوم ہوتا ہے کہ مصور یا نقاش بھی اپنا کام ختم کرکے اٹھا ہے،

[1] فہرست کتبخانہ رامپور جلد اول ص ، [2] ماثر رحیمی جلد ۳ ص ۱۶۸۰ [3] ایضاً ۵۴ [4] ایضاً ص ۱۶۸۱

خوشنویس | متعدد خوشنویس (یا خطاط) کا ہونا بھی ضروری تھا جو خط کوفی نسخ نستعلیق اور شکست وغیرہ مختلف قسم کے خطوط کے ماہر ہوتے تھے، ان سے یا تو مکمل کتاب لکھائی جاتی یا ان کتابوں کی تکمیل کرائی جاتی جو کسی صورت سے ناقص رہ گئی ہوتی۔[۱]

کاتب | متعدد کاتب ہوتے تھے جو نایاب کتابوں کی نقل کرتے رہتے[۲] انھیں کیساتھ نقل نویس بھی کام کرتے جو ضرورت کے وقت کتابوں کے خاص خاص حصوں کو جلدی سے نقل کر دیتے،

مقابلہ نویس | ان دونوں کی لکھی ہوئی کتابیں مقابلہ نویس کے پاس جاتیں انکا کام اصل کتاب سے منقول شے کا مقابلہ اور اغلاط کی تصحیح تھی،[۳]

مصحح | اسکے علاوہ کتب خانہ میں لائق اور ذی علم مصحح بھی ہوتے تھے جنکا کام کرم خوردہ یا مٹے ہوئے الفاظ کی جگہ صحیح لفظ لکھنا اور خاص خاص قسم کی دوسری غلطیوں کی اصلاح تھا،

جدول ساز | جدول ساز کا بھی ایک عہدہ ہوتا تھا، جو سادہ، رنگین، سنہری، روپہلی بیل بوٹے وغیرہ ہر قسم کی جدولیں بناتے تھے۔[۵]

فراش | ادنیٰ درجہ کے ملازموں میں ایک فراش ہوتا جسکا کام کتب خانہ کی صفائی تھی وہ کتبخانہ کے اوقات سے پہلے آکر فرش کو جھاڑ کر صاف کر دیتا

کتبخانہ کے متعلق اعلیٰ حکام سے اکثر خط وکتابت بھی ہوتی رہتی تھی اور مالی معاملات یا اختلاف رائے کے سبب سے مکاتبات کی تعداد زیادہ ہو جاتی تھی اس لئے خطوط اور کتابیں کتبخانہ سے باہر لیجانے اور لانے کیلئے علحدہ ایک خادم ہوتا تھا، اس خادم کے ہم پلہ چند اور ملازم بھی ہوتے تھے جنکو دربان یا محافظ کہتے تھے، جو باری باری کو شب و روز کتبخانہ کی عمارت کی حفاظت کرتے تھے اور آنے جانیوالوں کو بھی نگاہ میں رکھتے تھے،

تنخواہوں کے اعتبار سے ناظم کے علاوہ سب سے بڑی تنخواہ مہتمم کی ہوتی تھی، پھر نائب مہتمم کی اس کے بعد مصوروں کے نقاشوں، جدول سازوں، خوشنویسوں، کی تنخواہیں زیادہ ہوتی تھیں، کاتب، منشی، مقابلہ نویس اور مصحح کی تنخواہیں ان سے کم اور نقل نویس کی ان سے کمتر، صحاف اور وراق کی اور بھی کم اور خادم، فراش اور دربانوں کی تنخواہیں عام طور سے بہت معمولی ہوتی تھیں۔

---

[۱] مآثر رحیمی ج ۳ ص ۱۶۸۱ کلکتہ [۲] ایضاً ص ۱۶۸۳، ۱۶۸۰ [۳] فہرست کتبخانہ رامپور جلد اول [۴] مآثر رحیمی [۵] ایضاً ص ۱۶۸۰ [۶] فہرست کتبخانہ رامپور جلد اول ص ۷

مطبوعات جدیدہ

اسلامی تعلیمات۔ از جناب مولوی میر ولایت علی صاحب، تقطیع بڑی، ضخامت ۲۳۲ صفحے کاغذ معمولی، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد للعہ، پتے: میر ولایت علی اعظم پورہ شرقی زد مدرسہ اعزہ مکان ۲۲/۳ حیدرآباد دکن و نفیس اکیڈمی ذیلدار روڈ اچھرہ لاہور، وبلاسس روڈ کراچی ۔ عہ

یہ کتاب مصنف کے مذہبی و اصلاحی مضامین کا مجموعہ ہے، اس میں حسب ذیل مضامین ہیں: مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا، محکمات و متشابہات کی حقیقت، حقیقت جہاد، نعرہ اتحاد، تفسیر سورہ والعصر، انسان اور اس کا تنزل، تلاوت قرآن پاک، توبہ کی حقیقت، اصلاح عمل، نعرہ اتحاد، تاثرات حج، جنت کی کنجی، خلافت و بادشاہت، تفسیر سورہ فاتحہ، تقدیر الٰہی و تدبیر انسانی، حقائق معراج، ان مضامین کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف ایک درد مند مسلمان ہیں، ان کا دل مسلمانوں کی بے عملی، مذہب سے بیگانگی اور ان کے دنیاوی تنزل و ادبار پر دکھتا ہے، اس کی اصلاح کے لیے انھوں نے یہ مضامین لکھے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ مختلف اوقات میں مختلف تحریکوں اور اثرات سے متاثر ہوتے رہے جن کے تحت ان کے خیالات بدلتے رہے، کبھی ان میں مسلمانوں کی صحیح مذہبی اصلاح اور ان کی وحدت و تنظیم کا جذبہ پیدا ہوا، کبھی وحدت انسانی اور وحدت ادیان کا، و کبھی عنایت اللہ مشرقی کے خیالات اور تحریک خاکسار سے متاثر ہوئے، اس لیے ان کے خیالات میں وحدت و یکسانی کے بجائے ایک طرح کا انتشار بلکہ تضاد پایا جاتا ہے، اس لیے اس مجموعہ کے خالص مذہبی مضامین تو مفید ہیں لیکن بعض خیالات اور ان سے متعلق آیات و احادیث کی تاویلات بحث و نظر کے قابل ہیں جن کی تفصیل کا اس ریویو

مین گنجائش نہین، مصنف کے حسن نیت مین شبہ نہین لیکن اگر وہ مخمل مین ٹاٹ کا پیوند نہ لگاتے تو یہ مجموعہ زیادہ مفید ہوتا، تاہم اس کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہین ہے۔

نظامی بدایونی۔ مرتبہ جناب محمد احمد صاحب کاظمی، ایڈوکیٹ الہ آباد، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۰۵ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد ۶؍، پتہ:۔ محمد احمید الدین احمد صاحب نظامی پریس، بدایون،

مولوی نظام الدین حسین مرحوم نظامی بدایونی سابق اڈیٹر ذوالقرنین ہماری پرانی تہذیب کے ان یادگارون مین تھے جن کے نمونے اب نہ پیدا ہون گے، ان کی ساری زندگی مسلمانون کی خاموش خدمت مین گذری، تعلیم سے ان کو خاص دلچسپی تھی، وہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ممتاز رکن اور پراونشل کانفرنس کے سکریٹری تھے، اور اس کے ذریعہ انھون نے نہ صرف تعلیمی بلکہ دوسری مفید خدمات بھی انجام دین، ان کا اخبار ذوالقرنین تقریباً نصف صدی سے جاری ہے، ان کے نظامی پریس نے اردو زبان وادب کی بہت سی قابل قدر کتابین اور دیوان غالب، مراثی میرانیس اور مثنویات میر کے نہایت نفیس اڈیشن شائع کیے، مرحوم خود متعدد کتابون کے مصنف تھے، ان میں قاموس المشاہیر زیادہ اہم اور اپنے موضوع پر اردو مین پہلی کتاب ہو، اس مین ہر طبقہ کے نامور اور ممتاز اصحاب کمال اور نامور مشاہیر کے حالات ہین، غرض مرحوم نے زندگی کے ہر شعبہ مین قابل تقلید نمونہ چھوڑا ہے اور ان کی زندگی نوجوانون کے لیے شمع راہ کا کام دے سکتی ہے، اس لیے جناب محمد احمد صاحب کاظمی نے ان کے سوانح لکھ ایک مفید خدمت انجام دی ہے، اس مین مرحوم کے خاندانی حالات انکی قومی ذاتی اور علمی وتعلیمی خدمات اور ان کے اخلاق وسیرت کی تفصیل ہے، امید ہے قومی کارکنون کے حلقہ مین خصوصیت کے ساتھ اس کتاب کی قدردانی کی جائے گی۔

"م"

تاریخ سندھ

مؤلفہ مولٰنا سید ابوظفر صاحب ندوی دیسنوی سابق رفیق دارالمصنفین اعظم گڈھ

ہندوستان مین مسلمانون کا پہلا قافلہ سندھ مین اترا تھا، اور اُن کی پہلی حکومت یہین قائم ہوئی تھی اور وہ ایک ہزار سال سے اوپر یہان حکمران رہے، آج بھی سندھ کے در و دیوار سے اُن کے آثار نمایان ہین، لیکن اس کے باوجود اُردو مین اسلامی سندھ کی کوئی مفصّل و محققانہ تاریخ موجود نہین تھی، دارالمصنفین نے تاریخ ہندوستان کے سلسلہ مین یہ جامع و محققانہ تاریخ مرتب کرائی ہے، اس مین سندھ کا جغرافیہ، مسلمانون کے حملہ سے پیشتر کے مختصر اور اسلامی فتوحات کے مفصل حالات، خلافتِ راشدہ کے زمانہ سے لے کر آٹھوین صدی ہجری تک سندھ جن جن حکومتون کے ماتحت رہا، اُن کی پوری تاریخ اور ان تمام دورون کے نظامِ حکومت، علمی و تمدنی حالات، اور رفاہ عام کے جو جو کام انجام پائے، ان سب کی پوری تفصیل ہے، مسلمان اس قدیم اسلامی خطہ کی تاریخ فراموش کر چکے تھے، اب پھر اس کو یاد کرنے کی ضرورت ہے، یہ کتاب ایسے وقت مین شائع ہو رہی ہے، جب کہ سندھ کی تاریخ کا ایک نیا باب کھل رہا ہے، اور وہان ایک نئی حکومت کی بنیادین استوار ہو رہی ہین،

ضخامت: ۴۰۰ صفحے   قیمت: چھ روپیے،

"منیجر"

دارالمصنفین کی چند نئی علمی و ادبی کتابیں

اقبالِ کامل

ڈاکٹر اقبال کے فلسفہ و شاعری پر اگرچہ بکثرت مضامین، رسالے اور کتابیں لکھی گئیں لیکن ان سے اُن کی بلند پایہ شخصیت واضح اور مکمل طور پر نمایاں نہ ہو سکی، یہ کتاب اس کمی کو پورا کرنے کے لئے لکھی گئی ہے، اس میں اُن کے مفصّل سوانح حیات کے علاوہ اُن کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کے اہم پہلوؤں کی تفصیل کی گئی ہے، اور سوانح حیات کے بعد پہلے اُن کی اردو شاعری پھر فارسی شاعری پر اُن کے بہترین اشعار کے انتخاب کے ساتھ مفصّل تبصرہ کیا گیا ہے، اور اُن کے کلام کی تمام ادبی خوبیاں دکھلائی گئی ہیں، پھر اُن کی شاعری کے اہم موضوعوں یعنی فلسفہ خودی، فلسفہ بیخودی، نظریۂ تعلیم، سیاست، صنفِ لطیف (یعنی عورت) فنونِ لطیفہ اور نظام اخلاق وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے، مرتبہ مولانا عبدالسلام ندوی، ضخامت ۔۔م صفحے، قیمت: للعہ

بزمِ تیموریہ

بابر ایک بے مثل اہل قلم تھا، ہمایون نے شعر و شاعری کے علاوہ ہیئت و نجوم کی بھی انجمن آرائی کی، اکبر کا عہد علوم و فنون کی روشنی سے جگمگا اٹھا، جہانگیر نے ادب و انشاء کو چمکایا، شاہجہان نے شعراء اور فضلاء کو سیم و زر میں تلوایا، عالمگیر نے معارف پروری اور انشاء پردازی کے اعلیٰ نمونے پیش کئے، تیموری دور کے آخری بادشاہون نے بھی اپنے اسلاف کی روایات کو قائم رکھنے کی کوشش کی، بہادر شاہ ظفر نے عروس سخن کے گیسو سنوارے، تیموری شہزادون اور شہزادیون نے بھی علم و ادب کی محفلیں سجائیں، دربار کے امراء، شعراء اور فضلاء نے شاہانہ سرپرستی میں گوناگون کمالات دکھائے، ان سب کی تفصیل مذکورۂ بالا کتاب میں ملاحظہ فرمایئے، مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے۔ قیمت: معہ

"منیجر"

(پرنٹر و پبلشر صدیق احمد)

"منیجر"

رجسٹرڈ نمبر ۱۸ اے   جون سنہ ۱۹۴۹ء

معارف

مجلسِ دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت : چھ روپیے سالانہ

دفتر دارالمصنفین اعظم گڈھ

سلسلۂ تاریخ اسلام

دار المصنفین کے سلسلۂ تاریخ اسلام کو بڑا حسن قبول حاصل ہوا، علمی و تعلیمی اداروں نے خصوصیت سے
اس کی قدر دانی کی، بعض یونیورسٹیوں نے اس کو اسلامی تاریخ کے نصاب میں داخل کر لیا، اس لئے
برسوں کے اندر تقریباً اس کے سب حصے ختم ہوگئے جن کے دوسرے اڈیشن مزید اصلاح و ترمیم او
اضافوں کے ساتھ چھپ کر تیار ہوگئے ہیں اور بعض زیر طباعت ہیں، اب یہ سلسلہ پہلے سے زیاد
جامع اور مکمل ہوگیا ہے،

تاریخ اسلام حصۂ اوّل

(عہد رسالت و خلافت راشدہ)

یعنی آغاز اسلام سے لے کر خلافت راشدہ کے اختتام تک اسلام کی مذہبی، سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ، ضخامت ۵۹۰ صفحے، قیمت: سے ر

تاریخ اسلام حصۂ دوم

(بنو امیہ)

یعنی اموی سلطنت کی صد سالہ سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ کی تفصیل،

ضخامت ۳۶۳ صفحے،

قیمت سے ر

تاریخ اسلام حصۂ سوم

(بنی عباس اوّل)

یعنی ابو العباس سفاح ۱۳۲ھ ۷۵۰ء سے ابو[illegible] متقی اللہ ۳۳۳ھ ۹۴۴ء تک دو صدیوں کی سیا[سی] تاریخ،

(زیر طبع)

تاریخ اسلام جلد چہارم

(بنی عباس دوم)

یعنی مستکفی باللہ کے عہد سے آخری خلیفہ مست[عصم] تک خلافت عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی [پوری] تاریخ، ضخامت:- ۳۳۲ صفحے

قیمت:- صہ ر

"منیجر"

جلد ۶۳ ماہ شعبان المعظم ۱۳۶۸ھ مطابق ماہ جون ۱۹۴۹ء عدد ۶

مضامین

مقالات

وفیات

سرکاری تعلیم گاہوں میں اردو کی تعلیم کے مسئلہ پر معارف میں اس سے پہلے بھی لکھا جا چکا ہے، ا

بالکل سر پر آگیا ہے، اور نئے تعلیمی سال یعنی اگلے مہینہ سے ہائی اسکولوں میں جو نصاب جاری ہونے و

اس کی شکل ایسی رکھی گئی ہے کہ اردو بغیر کسی کوشش کے از خود نصاب تعلیم سے خارج ہو جائیگی، مرکزی شعبہ تعلیم

طے کیا تھا کہ جن اسکولوں میں طلبہ کی ایک معقول تعداد اپنی کسی مادری زبان کی تعلیم حاصل کرنا چاہے گی تو

کیا جائیگا، یو، پی گورنمنٹ نے ابتدائی تعلیم کے لیے بھی اسی قسم کا حکم جاری کیا تھا لیکن ہو یہ رہا ہے کہ ابتدا

تو اردو کا کہیں گذر ہی نہیں ہے، بلکہ بعض مقاموں پر تو اسلامی مکاتیب کے طلبہ کو بھی ہندی پڑھنے

ہے، ثانوی تعلیم یعنی ہائی اسکولوں میں تو ہندی کو تو لازمی رکھا ہے، اور اردو کو انگریزی کے ساتھ محض

زبان کی حیثیت دی گئی ہے، انگریزی کی علمی تعلیمی اور کاروباری اہمیت ایسی ہے کہ ہندوستان ابھی مدتوں ا

بے نیاز نہیں ہو سکتا، اس کے بغیر تعلیم ہی ناقص رہے گی، اس لیے مسلمان طلبہ ہندی کے ساتھ ا

انگریزی لینے پر مجبور ہوں گے، اس کے علاوہ ابتدائی تعلیم میں یعنی پانچویں درجہ تک اردو کا وجود

اسلیے جو طالب علم پانچویں تک اس سے ناواقف رہے گا، چھٹے میں اس کو اردو لینے میں دشواری ہو

اس لیے مسلمان طلبہ ہر حیثیت سے اردو چھوڑنے پر مجبور ہوں گے، اس طرح خود بخود اس کا قصہ

آخر کہاں تک حسن ظن کو راہ دی جائے، اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی ہو

کیا جا رہا ہے کہ کہنے کو تو اردو کی تعلیم قائم رکھی جائے لیکن شکل ایسی اختیار کی جائے کہ طلبہ خود اس کے چھوڑنے

مسلمانون کے لیے اردو کی تعلیم کا مسئلہ محض تعلیمی اور لسانی نہین، بلکہ کلچرل بھی ہے، ہندی خالص ہندو کلچر کی نمایندہ ہے، اردو مین دونون کلچرون کے اثرات ہین، کلچر پر زبان کا بڑا اثر پڑتا ہے، اس لیے اگر مسلمان اردو سے ناواقف اور تنہا ہندی کے سہارے پر رہ گئے تو ان کا کلچر بھی رفتہ رفتہ بدل جائے گا۔ اور دو تین پشتون کے بعد وہ صرف نام کے مسلمان رہ جائین گے، اس طرح بغیر کسی تشدد کے وحدت کلچر کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا، لیکن اگر حکومت کا یہ منشا نہین ہے تو اسے اردو کو بھی لازمی زبان کا درجہ دے کر اپنے حسن نیت کا ثبوت دینا چاہیے، اس کے علاوہ اور کوئی دوسری شکل ہی نہین ہے، اس وقت تعلیم گاہون مین اس کے ساتھ بے اعتنائی برتی جا رہی ہے گی، لیکن اگر حکومت ایسا نہین کرتی تو اس کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اردو زبان اور اس کے ساتھ مسلمانون کے کلچر کو بھی ختم کر دیا جائے،

یہ عجیب تضاد ہے کہ دعویٰ تو متحدہ قومیت، اور حکومت کے غیر مذہبی ہونے کا کیا جاتا ہے، لیکن اعمال سب اس کے سراسر خلاف ہین، اردو دشمنی سے بڑھ کر فرقہ پروری اور کیا ہو سکتی ہے، یہ تو دو قومی نظریہ کی عملی تصدیق ہے، اگر اردو ہندو مسلمان دونون کی زبان ہے تو پھر اس کو ختم کرنے کے کیا معنی، اور اگر تنہا مسلمانون کی ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ دونون دو قوم ہین، یہ مسئلہ اتنا اہم ہے کہ محتاط نیشنلسٹ اخبارات بھی اپنی روش کے خلاف اس پر لکھنے کے لیے مجبور ہو گئے، ایسے مسائل پر دب کر نہیں بلکہ واشگاف لکھنے کی ضرورت ہے، ع نوا را تلخ ترمی زن چو ذوق نغمہ کم یابی،

جمعیۃ العلماء نے مسلمانون کے مذہبی تعلیمی اور تمدنی کامون کو اپنے ذمہ لیا ہے، اردو مین یہ تینون حیثیتین جمع ہین، اس کی تعلیمی اہمیت یہ ہے کہ وہ ہندوستان کی عام مشترک اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ زبان ہے، مذہبی اور کلچرل حیثیت یہ ہے کہ ہندوستان کی تمام زبانون مین اسلامی علوم و فنون کا سب سے بڑا ذخیرہ اور اسلامی کلچر کے سب سے زیادہ اثرات اسی مین ہین، اور ہندوستان کے مسلمانون کا بڑا طبقہ جو عربی سے ناواقف ہے وہ اردو ہی کے

ذریعہ نہیں معلومات حاصل کرتا ہے، اس لیے جمعیۃ کا فرض ہے کہ وہ پوری قوت کے ساتھ اس کو حکومت سے منوانے کی کوشش کرے، وہ تو بیرونی اور جابر حکومت کے مقابلہ میں بڑے بڑے معرکے سر کر چکی ہے، اردو کا مسئلہ تو ان کے مقابلہ میں بہت معمولی اور پھر حکومت اپنی ہے، حکومت کی غلط روی پر ٹوکنا اور ضرورت ہو تو قوت کے ساتھ روکنے کی کوشش کرنا اس کی مخالفت نہیں بلکہ اصلاح اور عین خدمت ہے، اسی کے ساتھ اسلامی مکاتیب کے کام کو بھی ہاتھ میں لینا چاہیے، لیکن اس کے لیے عملی جدوجہد کی ضرورت ہے، جمعیۃ کے کارکن جس جوش و انہماک سے الیکشن لڑتے تھے اگر اس کی عشر عشیر کوشش بھی مکاتیب کے لیے وہ کریں تو انشاء اللہ اس میں ضرور کامیابی ہوگی،

دار المصنفین کی اپیل جن معاصرین نے شائع کی، اور اس پر نوٹ لکھے، ہم ان سب کے شکر گذار ہیں، لیکن افسوس ہے کہ اردو زبان اور اسلامی علوم و فنون کی محبت کے دعویداروں نے اس کی جانب بہت کم توجہ کی، زبانی تو ان کے زوال کا بڑا ماتم ہے، لیکن عمل یہ ہے کہ ان اداروں کی جانب بھی جو برسوں سے اردو زبان اور اسلامی علوم و فنون کی خدمت کرتے چلے آئے ہیں، اور انشاء اللہ آیندہ بھی کرتے رہیں گے، کوئی توجہ نہیں، اور ان کی معمولی ممبری قبول کرنا بھی جس کے معاوضہ میں ان کو کتابیں مل جائیں گی، ان کے لیے بار ہے، کیا اسی طرز عمل پر اردو زبان اور اسلامی کلچر سے محبت کا دعویٰ ہے؟ اور کیا اسی پر وہ زندہ رہیں گے؟ تاہم دار المصنفین کے کچھ پرانے مخلصین اس کے لیے پوری کوشش کر رہے ہیں، اور توقع ہے کہ انشاء اللہ یہ تحریک بے اثر نہ رہے گی،

مقالات

تدوین قرآن

از شاہ معین الدین احمد ندوی

(۲)

صحابہ کا حفظ و جمع قرآن | صحابہ کرام میں بہت سے بزرگ ایسے تھے جنھوں نے پورا کلام مجید جمع اور حفظ کیا تھا، بخاری میں ہے :-

عن قتادۃ سالت انس بن مالک	قتادہ کا بیان ہے کہ میں نے انس بن مالک سے
من جمع القرآن علی عھد النبی	پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں
صلی اللہ علیہ وسلم قال اربعۃ	کن کن لوگوں نے قرآن جمع کیا تھا، انھوں نے
کلھم من الانصار، ابی بن کعب	کہا چار آدمیوں نے اور چاروں انصاری تھے،
ومعاذ بن جبل وزید بن ثابت	ابی بن کعب، معاذ بن جبل، زید بن ثابت
وابو زید[1]	اور ابو زید،

بخاری کے اسی باب کی دوسری روایت میں ابی بن کعب کے بجائے حضرت ابو درداءؓ کا نام ہے[2] کنز العمال میں طبرانی اور مستدرک کے حوالہ سے جامعین قرآن میں ایک نام سعید بن عبید کا بھی ہے[3]، یہاں جمع قرآن سے

---

[1] بخاری ج ۲ ابواب فضائل القرآن باب القراء من اصحاب النبی صلعم [2] ایضاً [3] کنز العمال ج اول ص ۲۸۴

مراد پورے قرآن کا جمع کرنا ہے، ورنہ چار آدمیوں کی تخصیص کے کوئی معنی نہیں، کیونکہ قرآن مجید کا کچھ نہ کچھ حصہ تو ہر صحابی نے جمع کیا تھا، اس لیے باتفاق علما جمع سے مراد پورے قرآن کا جمع کرنا ہے،

ان میں حضرت علی اور حضرت عبد اللہ بن مسعود و ابی بن کعب کی پورے قرآن کی جمع و تدوین تو تاریخی مسلمات میں ہے، ان بزرگوں کے مرتب کردہ مصاحف مدتوں موجود رہے، ممکن ہے اب بھی انکا کوئی نسخہ کہیں پایا جاتا ہو،[۱] ابن ندیم اور سیوطی نے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ اور ابی بن کعب کے مصاحف خود دیکھے تھے، اور فہرست و اتقان میں ان کی سورتوں کے نام اور ان کی ترتیب نقل کی ہے۔[۲] ان میں اور موجودہ مصحف میں صرف یہ فرق ہے کہ ان دونوں مصحفوں کی سورتوں کے بعض نام اور ان کی ترتیب مصحف عثمانی سے مختلف ہے جو کوئی ایسا فرق نہیں ہے، اس لیے کہ خود موجودہ مصحف کی بعض سورتوں کے ایک سے زیادہ نام ہیں، اور سورتوں کی ترتیب توقیفی نہیں ہے، اس لیے یہ فرق کوئی اہمیت نہیں رکھتا، البتہ ایک خاص فرق یہ ہے کہ موجودہ کلام مجید میں ۱۱۴ سورتیں ہیں، اور حضرت عبد اللہ بن مسعود کے مصحف میں ۱۱۱ اور حضرت ابی بن کعبؓ کے مصحف میں ۱۱۶ ہیں،[۳] یعنی ایک مصحف میں چار کم اور ایک میں دو زیادہ ہیں، اس کا سبب یہ ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود سورہ فاتحہ اور معوذتین یعنی قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس کو کلام مجید کی سورہ اور اس کا جز نہیں سمجھتے تھے، بلکہ محض دعا سمجھتے تھے، اس لیے ان کو اپنے مصحف میں شامل نہیں کیا، لیکن اس خیال میں وہ منفرد تھے دیگر صحابہ ان تینوں کو کلام مجید کی سورہ اور اس کا جز تصور کرتے تھے،[۴]

---

[۱] حضرت عثمانؓ کے مرتب کردہ مصحف کے نسخے تو متعدد پائے جاتے ہیں لیکن آپ کی جانب انکی نسبت مشکوک ہے۔

[۲] ملاحظہ ہو فہرست ابن ندیم ص ۳۹، ۴۰ و اتقان ج ۱ ص ۶۴، ۶۵ ابن ندیم نے جتنی سورتیں نقل کی ہیں انکی تعداد کم ہے لیکن میزان میں پوری تعداد یعنی ۱۱۰، ۱۱۶ لکھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً کچھ نام چھوٹ گئے ہیں [۳] تفسیر درمنثور ج ۱ ص ۱ و ج ۶ ص ۴۱۶

لیکن چوتھی سورہ کی کمی کا سبب نظر سے نہیں گذرا اس لیے ان کے مصحف مین سورتون کی تعداد ۱۱۲ ہے،

اور حضرت ابی بن کعب دعاے قنوت کو قرآن کی دو سورتین قرار دیتے تھے، اس لیے ان کے مصحف مین خلع اور حفد کے نام سے دو سورتین زیادہ ہین[1] لیکن اس کو کلام مجید مین تغیر قرار نہین دیا جا سکتا، اسلیے کہ یہ ان بزرگون کی رائے تھی جو معلوم و مشہور ہے، اور جس کی تصریح کتابون مین موجود ہے۔

حضرت علیؓ کے مرتب کردہ قرآن کی ترتیب نزولی تھی اور نزولی ترتیب اہل علم کو پوری طرح معلوم ہے، اس مین سورتون کی ترتیب کے علاوہ اور کوئی فرق نہین،

عہد صدیقی مین جمع قرآن کی نوعیت

مذکورہ بالا مباحث سے یہ پوری طرح ثابت ہو گیا کہ آیتون اور سورتون کی ترتیب عہد نبوی ہی مین ہو چکی تھی، اور متعدد صحابہ نے اپنے طور پر بھی علٰحدہ علٰحدہ کلام مجید مرتب کیے تھے، مگر اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ مین کیا کام انجام پایا، اور ان کی جمع و ترتیب قرآن سے کیا مراد ہے، در حقیقت اس سے مراد آیتون اور سورتون کی ترتیب نہین بلکہ ان کی کتابی تدوین ہے، یعنی تمام آیتین مرتب اور ہر سورہ اپنی جگہ پر مکمل تھی، اور اس حیثیت سے سورتون کی ترتیب بھی معلوم تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی جگہین متعین فرما دی تھین، لیکن یہ ترتیب توقیفی نہین تھی، اور سورتین کتابی شکل مین مدون نہ تھین بلکہ ان کے مختلف اجزا علٰحدہ علٰحدہ اونٹ کی ہڈیون، کھجور کی شاخون، پتھر کی پتلی تختیون اور چمڑے کے ٹکڑون پر لکھے ہوئے تھے، حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے زمانہ مین انکو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ترتیب کے مطابق مرتب کر کے کتابی شکل مین ایک جگہ جمع کر دیا، اور یہ حقیقت خود عہد صدیقی مین جمع و ترتیب قرآن کی روایت کے الفاظ پر غور کرنے سے ظاہر ہو جاتی ہے،

یہ کام نہایت مہتم بالشان تھا اس لیے حضرت ابوبکر صدیق نے اس کے لیے ان بزرگون کا انتخاب فرمایا جو جماعت صحابہ مین حفظ قرآن مین ممتاز اور جامع قرآن تھے، اور جنھون نے کتابت وحی کی خدمت بھی انجام دی تھی،

---

[1] تفسیر در منثور ج ۱ ص ۲۰

حضرت ابی بن کعبؓ اور زید بن ثابتؓ کا نام تصریح کے ساتھ روایتوں میں آتا ہے، اور ان کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے علاوہ اور صحابہ بھی شریک تھے، جمع قرآن کی پوری تفصیل کسی ایک روایت میں نہیں ہے بلکہ اس کے مختلف اجزاء مختلف روایتوں میں ملتے ہیں، سب سے مشہور اور مستند بخاری کی حسب ذیل روایت ہے:-[1]

عن عبید بن السباق ان زید ابن ثابت قال ارسل الی ابوبکر مقتل اهل الیمامة فاذا عمر بن الخطاب عندہ قال ابوبکر ان عمر اتانی فقال ان القتل قد استحر یوم الیمامة بقراء القرآن وانی اخشی ان استحر القتل بالقراء بالمواطن فیذهب کثیر من القرآن وانی اری ان تامر بجمع القرآن قلت لعمر کیف تفعل شیئا لم یفعله رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قال عمر هذا واللّٰه خیر فلم یزل عمر یراجعنی حتی شرح اللّٰه صدری لذلک ورایت فی

عبید بن سباق بیان کرتے ہیں کہ زید بن ثابت نے کہا کہ ابوبکر نے یمامہ کی جنگ کے بعد جس میں بہت سے صحابہ شہید ہوئے تھے، مجھے بلا بھیجا، میں گیا تو ان کے پاس عمر بن الخطاب موجود تھے، ابوبکرؓ نے کہا کہ عمرؓ نے آکر مجھ سے کہا کہ یمامہ کی جنگ میں قرآن کے بہت سے قاری قتل ہوگئے ہیں اگر اسی طرح دوسری لڑائیوں میں بھی انکے قتل کا سلسلہ جاری رہا تو مجھے خوف ہے کہ قرآن کا بڑا حصہ ضائع ہو جائیگا۔ اس لیے میری رائے ہے کہ آپ قرآن مجید کو جمع کرنے کا حکم دیجئے، میں نے عمرؓ کو جواب دیا کہ جس کام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا اسکو تم کس طرح کر سکتے ہو، عمرؓ نے کہا خدا کی قسم یہ اچھا کام ہے، اور مجھ سے بار بار کہتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس کام کیلئے میرا شرح صدر بھی کر دیا

---

[1] بخاری ج ۲ کتاب فضائل القرآن باب جمع القرآن۔

ذالك الذي رأى عمر قال زيد
قال ابوبكر انك رجل شاب
عاقل لا نتهمك وقد كنت تكتب
الوحي لرسول الله صلى الله عليه وسلم
فتتبع القرآن فاجمعه فوالله
لو كلفوني نقل جبل من الجبال
ما كان اثقل علي مما امرني من
جمع القرآن قلت كيف تفعلون
شيئاً لم يفعله رسول الله صلى الله
عليه وسلم قال هو خير فلم يزل
ابوبكر يراجعني حتى شرح الله صدري
للذي شرح له صدر ابوبكر وعمر
فتتبعت القرآن اجمعه من
العسب واللخاف وصدور الرجال
حتى وجدت آخر سورة التوبة
مع ابي خزيمة الانصاري لم اجدها
مع احد غيره لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُوْلٌ
مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ
حتى خاتمة براءة فكانت الصحف

اور مجھکو بھی عمر کی رائے سے اتفاق ہوگیا، زید کا
بیان ہے کہ اسکے بعد ابوبکر نے مجھ سے کہا کہ تم
جوان اور عقلمند آدمی ہو اور کسی جرم میں متہم بھی
نہیں ہو، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی
لکھتے تھے اس لیے قرآن کو تلاش کرکے اس کو
ایک جگہ جمع کرو، زید کہتے ہیں کہ خدا کی قسم اگر مجھے
پہاڑ اٹھانے کو بھی کہتے تو وہ مجھ پر جمع قرآن کے
حکم سے زیادہ گراں نہ گذرتا، میں نے کہا آپ لوگ
وہ کام کس طرح کرسکتے ہیں جس کو رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے نہیں کیا، ابوبکر نے کہا یہ اچھا کام ہے،
اور مجھ سے بار بار کہتے رہے تا آنکہ ابوبکر و عمر کی
کی طرح اس بارہ میں اللہ تعالی نے میرا سینہ بھی
کھول دیا، اس وقت میں نے کھجور کی بے پتی کی
شاخوں، پتھر کی تختیوں اور لوگوں کے سینوں
سے تلاش کرکے قرآن کو جمع کرنا شروع کیا،
سورہ براۃ کی آخری آیتیں لقد جاءکم رسول من
انفسکم عزیز علیہ ما عنتم سے لیکر براۃ کے خاتمہ تک
صرف ابوخزیمہ انصاری کے پاس تھیں، یہ صحیفہ
ابوبکر کے پاس رہا پھر ان کی وفات کے بعد

عند ابی بکر حتی توفاہ اللہ ثم عند عمر حیاتہ ثم عند حفصۃ بنت عمرؓ

عمرؓ کے پاس اور ان کے بعد ان کی لڑکی حفصہ کے پاس ۔

دوسری روایت مسند احمد بن حنبل میں ہے :-

عن ابی العالیۃ عن ابی بن کعب
انھم جمعوا القرآن فی مصاحف
فی خلافۃ ابی بکر رضی اللہ عنہ
فکان رجال یکتبون ویملی علیھم
ابی بن کعب فلما انتھوا الی ھذہ
الآیۃ من سورۃ براءۃ ثُمَّ انْصَرَفُوْا
صَرَفَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ بِاَنَّھُمْ قَوْمٌ
لَّا یَفْقَھُوْنَ، فظنوا ان ھذا اٰخر
ما نزل من القرآن فقال لھم
ابی بن کعب ان رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم اقرأنی بعدھا آیتین
لَقَدْ جَاءَکُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ
عَزِیْزٌ عَلَیْہِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ
عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ
الی وَھُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ
ثم قال ھذا اٰخر ما نزل من القرآن الخ

ابو العالیہ ابی بن کعب سے روایت کرتے ہیں
جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے
زمانۂ خلافت میں لوگوں (صحابہ) نے قرآن کو
کتابی شکل میں جمع کیا تو کچھ لوگ اس کو لکھتے
تھے اور ابی بن کعب لکھاتے تھے جب یہ لوگ
سورہ براۃ کی اس آیت "ثم انصرفوا صرف اللہ
قلوبہم بانہم قوم لا یفقہون" پر پہنچے تو کچھ لوگوں
نے خیال ظاہر کیا کہ یہ قرآن کی آخری آیت ہے
جو نازل ہوئی۔ حضرت ابیؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد دو آیتیں
اور مجھ کو پڑھائی تھیں "لقد جاءکم رسول من
انفسکم عزیز علیہ ما عنتم حریص علیکم بالمومنین
رؤف رحیم" کی آیات "رب العرش
العظیم" تک ۔ پھر کہا یہ قرآن کا وہ آخری
حصہ ہے جو نازل ہوا ....
....

ان دونون روایتون سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتابت کی خدمت حضرت زید بن ثابتؓ کے متعلق تھی،

اور لکھوانے کی حضرت ابی بن کعب کے متعلق، اور ان دونون کامون کے لیے اس سے بہتر اور موزون

انتخاب نہین ہوسکتا تھا، کیونکہ حضرت ابی بن کعب جماعت صحابہ مین سب سے بڑے حافظ قرآن تھے،

اور حضرت زید بن ثابت عہد نبوی مین کتابت وحی کی خدمت انجام دیتے تھے، اور قرآن بھی جمع کیا تھا، حضرت ابی بن کعب

خود اپنا مصحف مرتب کر چکے تھے جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، اس سے مصحف صدیقی کی تدوین مین بڑی مدد ملی ہوگی، اور یہ پورا مصحف

اس مین شامل ہوگیا ہوگا،

اوپر کی دونون روایتون مین سب سے زیادہ اہم "جمع" اور "صحیفہ" و "مصحف" کے الفاظ

ہین، انہی سے جمع کی نوعیت واضح ہوتی ہے، جمع کی تین ہی شکلین ہوسکتی ہین:

(۱) ایک یہ کہ آیتین اور سورتین دونون غیر مرتب تھین، ان دونون کی جمع و ترتیب عمل

مین آئی،

(۲) دوسری یہ کہ آیتین مرتب سورتین کی اور اس حیثیت سے مرتب بھی تھین کہ آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم نے ان کی جگہون کی تعیین فرما دی تھی کہ فلان سورہ کے بعد فلان سورہ رہے گی، لیکن وہ کتابی

شکل مین مدون نہ تھین،

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ آیتین مرتب اور سورتین مکمل تھین، لیکن سورتون مین کوئی

ترتیب نہ تھی، اور نہ وہ کتابی شکل مین مدون تھین،

گذشتہ مباحث سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ آیتون کی ترتیب الہامی ہے، اور ان کو آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے مرتب فرما دیا تھا، جب سورتین مرتب ہون گی تو لامحالہ ہر سورہ مکمل ہوگی،

اس لیے عہد صدیقی مین جمع و تدوین کی پہلی شکل کسی طرح صحیح نہین ہوسکتی، صرف آخری دو شکلین

ہوسکتی ہین، اور ان مین سے کسی کے ماننے مین بھی مضائقہ نہین ہے، اس لیے عہد صدیقی مین یا سورتون

کی ترتیب اور ان کی کتابی تدوین کا کام انجام پایا یا صرف کتابی تدوین کا جس سے عہد رسالت میں کلام مجید کی تکمیل و ترتیب پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور صحف صحیفہ اور مصاحف کے الفاظ اس کا ثبوت ہیں کہ اس سے مراد کتابی تدوین ہے، البتہ ان روایتوں سے ایک شبہ ہوتا ہے جس کی تفصیل اور اس کا جواب بعد میں آئے گا،

اوپر کی روایت بہت مجمل ہے، اس سے طریقہ کار کی نوعیت پر کوئی روشنی نہیں پڑتی، دوسری روایتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کیلئے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ نے بڑا اہتمام فرمایا تھا، اور جس قدر احتیاطیں ممکن ہیں عمل میں لائی گئیں، اس کی تدوین ان بزرگوں نے زید بن ثابت کے سپرد فرمائی، جو عہد رسالت میں کاتب وحی اور حافظ و جامع قرآن تھے، پھر قرآن کا کوئی حصہ خواہ وہ تحریری شکل میں رہا ہو یا زبانی، دو ثقہ اور معتبر شہادتوں کے بغیر قبول نہیں کیا جاتا تھا، حافظ ابن حجر ابن ابی داؤد کے حوالہ سے لکھتے ہیں،

قام عمر فقال من کان تلقی من
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شیئاً
من القرآن فلیات بہ وکانوا یکتبون
ذلک فی الصحف والالواح والعسب
وکان لایقبل من احد شیئاً حتی
یشھد شاھدان وھذا یدل علی
ان زیداً کان لا یکتفی بمجرد
وجدانہ مکتوباً حتی یشھد بہ
من تلقاہ سماعاً مع کون زید کان
یحفظہ، وکان یفعل ذلک مبالغۃً
فی الاحتیاط (فتح الباری ج ۹ ص ۱۱)

یعنی تدوین قرآن کے وقت حضرت عمرؓ نے اعلان
کیا کہ جس شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے
قرآن مجید کا کوئی حصہ حاصل کیا ہو اس کو لاکر
پیش کرے، صحابہ اس کو اوراق، پتھر کی تختیوں
اور کھجور کی شاخوں پر لکھ لیا کرتے تھے، کسی سے قرآن
کا کوئی حصہ بغیر دو گواہوں کی شہادت کے قبول
نہیں کیا جاتا تھا، یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ زید کو
باوجودیکہ وہ آیت حفظ ہوتی تھی لیکن محض اس کا
لکھا ہونا کافی نہیں سمجھتے تھے، جب تک کہ اس کی
شہادت موجود نہ ہوتی کہ لکھنے والے نے رسول اللہ صلعم
کی زبان مبارک سے سنا ہے) اس کو سنا ہے، یہ ان کی انتہائی احتیاط تھی،

وعند ابن ابی داؤد ایضاً من
طریق هشام بن عروة عن ابیه
ان ابا بکر قال لعمر ولزید اقعدا
علی باب المسجد فمن جاءکما
بشاهدین علی شیء من کتاب الله
فاکتباه ورجاله ثقات مع انقطاعه
وکان المراد بالشاهدین الحفظ
والکتاب اوالمراد انهما یشهدان
علی ان ذالک من الوجوه التی
نزل بها القرآن وکان غرضهم
ان لا یکتب الا من عین ما کتب
بین یدی النبی صلی الله علیه وسلم
لا من مجرد الحفظ

ابن ابی داؤد نے ہشام بن عروہ سے انھوں نے اپنے والد
سے بھی روایت کی ہے کہ ابوبکر نے عمر اور زید سے
کہا کہ تم دونوں مسجد نبوی کے دروازے پر
بیٹھ جاؤ اور جو شخص دو شہادتوں کے ساتھ قرآن
کا کوئی حصہ پیش کرے تو اس کو لکھ لو، یہ روایت
گو منقطع ہے لیکن اس کے تمام راوی ثقہ ہیں،
دو شاہدوں سے مراد یہ ہے کہ وہ حصہ اس
شخص کو زبانی یاد بھی ہو اور اس کے پاس
لکھا ہوا بھی ہو یا یہ مراد ہو کہ اس کی دو شہادتیں
موجود ہوں کہ وہ اسی طریقہ سے نازل ہوا ہے،
اس سے ان لوگوں کی یہ غرض تھی کہ بعینہ وہی لکھا جائے
جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لکھا گیا تھا،
اور محض زبانی یاد کو کافی نہ سمجھا جائے،

دو شہادتیں اس کی ہوتی تھیں کہ مکتوبہ حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنکر یا آپ کے سامنے لکھا گیا ہے،

بخاری میں حضرت زید بن ثابتؓ سے مروی ہے کہ جب ہم نے کلام مجید کے متفرق اوراق کو کتابی شکل میں لکھنا شروع کیا تو سورہ احزاب کی ایک آیت جس کو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کرتا تھا، ابوخزیمہ کے علاوہ اور کسی کے پاس لکھی ہوئی نہیں ملی لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر ان کی شہادت دو شہادتوں کے برابر قرار دی تھی اس لئے قبول کر لی،[1]

---

[1] بخاری کتاب التفسیر تفسیر سورۂ احزاب ج ۲ ص ۷۰۵

اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیت زید بن ثابتؓ کو خود بھی یاد تھی لیکن انھوں نے تنہا اپنی یادداشت پر اعتماد نہیں کیا، اور جب تک کہ خزیمہ کے پاس لکھی ہوئی نہیں ملی، اس کو نہیں لکھا،

دوسری روایت میں ہے

عن عبد اللہ بن زبیرؓ عن ابیہ قال	حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ اپنے والد سے روایت
اتی الحارث بن خزیمہ بھا تین	کرتے ہیں کہ حارث بن خزیمہ سورہ براۃ کی آخیر کی
الآیتین من آخر سورۃ براۃ فقال	دو آیتیں لائے اور کہا میں شہادت دیتا ہوں
اشھد لقد سمعتھما من رسول اللہ	کہ میں نے ان دونوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
صلی اللہ علیہ وسلم ووعیتھما فقال عمرؓ	سے سنا اور یاد کیا حضرت عمرؓ نے انکی تصدیق کی کہ میں
انا اشھد لقد سمعتھما	شہادت دیتا ہوں کہ تم نے دونوں آیتیں سنی تھیں،

ان دونوں روایتوں سے شہادت کی نوعیت ظاہر ہوتی ہے، اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور زید بن ثابتؓ نے جمع قرآن میں کتنی احتیاط برتی تھی، اصول شہادت کی رو سے تو یہ محض دو ثقہ آدمیوں کی شہادت ہوتی تھی لیکن اگر اس کے دوسرے پہلوؤں پر غور کیا جائے، تو انکی قدر و قیمت دو شہادتوں سے کہیں زیادہ ہے۔ اولاً صحابۂ کرام کی صداقت کا درجہ خود عام ثقہ لوگوں سے بڑھ کر ہے، پھر قرآن کے بارے میں ان کی شہادت جس پر ان کے دین کا مدار تھا، اور جس میں ادنیٰ غلطی سے دین و دنیا دونوں کا خسارہ تھا کس درجہ کی ہوگی اور جب تک ان کو حق الیقین اور عین الیقین نہ ہوتا ہوگا وہ اس شہادت کو تصور میں بھی نہ لا سکتے تھے، اس لیے قرآن کے بارہ میں صحابہ کی شہادت کا دنیا کی کوئی شہادت مقابلہ نہیں کر سکتی اور اس کی صحت کی اس سے بڑھ کر شہادت دوسری نہیں ہو سکتی،

اوپر کی دو روایتوں کے بعض الفاظ سے بظاہر یہ شبہہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر عہد صدیقی میں کلام مجید کی صرف کتابی تدوین ہوئی تو پھر اس عام منادی کے کیا معنی کہ جس نے کلام مجید کا کوئی حصہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

سے سنا ہو تو وہ اس کو بیان کرے، اور بعض آیات بھی پوچھ کر لکھی جاتی تھیں، لیکن اس شبہ کا جواب خود ان روایات ہی میں مل جاتا ہے، درحقیقت یہ انتہائی احتیاط تھی تاکہ کلام مجید کی اس آخری تدوین میں جو ہمیشہ کے لیے ہو رہی تھی کوئی آیت چھوٹنے یا اس میں تغیر و تبدل نہ ہونے پائے، اور اگر کچھ بھول چوک ہوئی ہو تو آخری مرتبہ اس کی تصحیح ہو جائے،

اس کا ثبوت یہ ہے کہ حضرت ابی بن کعبؓ اور زید بن ثابتؓ دونوں حافظ اور جامع قرآن تھے، اور انھوں نے پہلے بھی قرآن مجید جمع کیا تھا، اور وہ محض اپنے حافظ اور تحریری یادداشت سے پورا قرآن مرتب کر سکتے تھے اس میں کسی کی مدد کی ضرورت ہی نہ تھی لیکن انھوں نے تنہا اپنی یادداشت پر اعتماد نہیں کیا، بلکہ پوری شہادت لینے کے بعد جس کی نوعیت اوپر کی روایات میں مذکور ہے کلام مجید کو قلمبند کیا حضرت ابیؓ اور زید بن ثابتؓ کے علاوہ حضرت علیؓ حضرت عثمانؓ اور بہت سے بزرگ حافظ قرآن تھے، ان میں چند نہایت آسانی کے ساتھ بغیر کسی کی مدد کے قرآن مرتب کر سکتے تھے لیکن ایسا نہیں کیا گیا، بلکہ پوری جماعت صحابہ کو اس لیے دعوت دی گئی تاکہ کلام الٰہی کی اس آخری تدوین میں کوئی فروگذاشت نہ رہنے پائے اور یہ نسخہ ہر حیثیت سے کامل ہو،

قرآن کی کتابی تدوین میں تاخیر کا سبب لیکن ان تمام حقائق کے باوجود دلوں میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ کہ جب عہد رسالت میں آیتوں کی ترتیب ہو چکی تھی اور سورتیں بھی مکمل ہو چکی تھیں تو پھر اس کی کتابی تدوین میں کیا امر مانع رہا اور عہد رسالت میں یہ کام کیوں نہ پورا ہو گیا،

درحقیقت اسلام سے پہلے عربوں میں کتابت و تحریر اور کتابی علم و تعلیم کا رواج نہ تھا، ان کا حافظہ اتنا قوی تھا کہ وہ عرب کی پرانی داستانیں، اس کی تاریخ، اشعار و انساب و اخبار عرب سب زبانی یاد رکھتے تھے، چنانچہ اسلام سے پہلے کی عرب کی ساری تاریخ زبانی روایات پر مشتمل تھی، شاعری کا سارا ذخیرہ سینوں میں تھا، بلکہ وہ کتابت اور کتابی علم کو ایک طرح کا ننگ سمجھتے تھے، ظہور اسلام کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

تحریر وکتابت کی جانب توجہ کی، اور اس کی تعلیم واشاعت کی مختلف تدبیرین اختیار فرمائین اور جس قدر کلام مجید نازل ہوتا جاتا تھا اس کو لکھواتے جاتے تھے، لیکن وہ مرتب کتابی شکل مین نہ تھا، بلکہ مختلف چیزون پر متفرق طور سے لکھا ہوا تھا اور چونکہ آپ کی وفات تک نزول وحی کا سلسلہ جاری رہا جس مین نسخ کا احتمال باقی تھا، اس لیے اس کی کتابی تدوین نہین فرمائی، بہت سے صحابہ بھی قرآن مجید لکھ لیتے تھے، لیکن بہتون نے پرانے طریقہ پر محض حفظ پر قناعت کیا، نظام الدین قمی نیشاپوری اپنی تفسیر مین لکھتے ہین۔

"پورا قرآن عہد رسالت مین جمع ہوچکا تھا، اس لیے کہ جو آیت بھی نازل ہوتی تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کاتب وحی کو حکم دیتے تھے کہ اس کو فلان سورہ کے فلان مقام پر لکھو، اور جب کوئی سورہ نازل ہوتی تھی تو کاتب کو حکم دیتے تھے کہ اس کو فلان سورہ کے پہلو مین لکھو، ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی سورہ نازل ہوتی تھی تو کاتب وحی کو حکم دیتے تھے کہ اس کو فلان مقام پر لکھو، انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مین انصار مین چار آدمیون نے قرآن جمع کیا تھا، ابی بن کعبؓ، معاذ بن جبلؓ، اور ابو زیدؓ (یہ روایت اوپر نقل کی جا چکی ہے)

اس زمانہ مین لوگون نے اس کو دو دفتیون کے درمیان (یعنی کتابی صورت مین) مدون نہین کیا تھا، اور نہ سورتون کی ترتیب کے ساتھ اس کی تلاوت کرتے تھے، اس لیے کہ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ جب کوئی سورہ نازل ہوتی تھی، تو وہ اس کو حفظ کر لیتے یا لکھ لیتے تھے، پھر کسی سریہ مین چلے جاتے تھے، اور ان کی عدم موجودگی مین جو کوئی سورہ نازل ہو جاتی تو واپسی کے بعد اس کو لکھتے یا یاد کرتے تھے، اس سے لکھنے مین تقدیم و تاخیر ہو جاتی تھی، کچھ لوگ عربون کے پرانے رواج کے مطابق حافظہ پر اعتماد کرکے لکھتے نہ تھے، بلکہ اشعار و انساب کی طرح زبانی یاد کر لیتے تھے، بعض لوگ حفاظت کے خیال سے کاغذ، اونٹ کی ہڈیون، پتھر کی تختیون وغیرہ پر لکھ لیا کرتے تھے، مگر ان کو کتاب مین دیکھ کر پڑھنے کی ضرورت نہ پڑتی تھی، اس لیے کتابی صورت مین مدون کرنے کی ضرورت محسوس نہین ہوئی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب

مہاجرین وانصار لڑائیون کے سلسلہ مین مختلف ملکون مین منتشر ہوگئے، اور بعض لڑائیون مین انکی بڑی تعداد شہید ہوئی اور قرآن کے ضائع ہونے کا خطرہ پیدا ہوا اس وقت انھون نے مصحف یعنی کتابی صورت مین اس کو مدون کیا،[1]

یہ بھی واضح رہے کہ عہد صدیقی مین بھی کلام مجید کی تدوین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے چند ہی مہینون کے بعد عمل مین آئی، ربیع الاول سنہ ۱۱ھ مین آپ کا وصال ہوا، اسی سال یمامہ کی جنگ ہوئی، اور جنگ کے فوراً ہی بعد قرآن کی تدوین ہوئی، جیسا کہ اوپر بخاری کی روایت مین گذر چکا ہے، تاریخون مین بھی اس کی تصریح ہے، ابن اثیر مین جنگ یمامہ کے سلسلہ مین ہے[2]:

فی ھذہ السنۃ (یعنی سنہ ۱۱ھ)	اسی سنہ مین (یعنی سنہ ۱۱ھ) واقعہ یمامہ کے
بعد وقعۃ الیمامۃ امر ابوبکر	بعد جب اس مین کثرت سے صحابہ شہید ہوئے
بجمع القرآن لما رای من کثرۃ	تو حضرت ابوبکر نے اس خوف سے
من قتل من الصحابہ لئلا	کہ قرآن ضائع نہ ہو جائے اس کے
یذھب القرآن	جمع کرنے کا حکم دیا،

اس لیے اگر بالفرض عہد صدیقی ہی مین آیتون اور سورتون کی تدوین ہوئی ہوتی تب بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے چند ہی مہینون کے بعد اس کی تدوین مین کسی تغیر کا احتمال نہین ہوسکتا تھا،

عہد نبوی مین قرآن مجید کا تعلیمی نظم | عہد نبوی مین قرآن مجید کی جمع و ترتیب کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ نزول قرآن کے ساتھ ہی اس کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا، اور آگے چل کر اس کا پورا انتظام قائم ہوگیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابۂ کرام کو اذمان مین جو لوگ قرآن کے عالم ہوجاتے وہ دوسرون کو اس کی تعلیم دیتے تھے،

---

[1] تفسیر نیشاپوری ج اول ص ۲۳ و ۲۴ برحاشیہ ابن جریر [2] ابن اثیر ج ۲ ص ۱۴۰،

یہ صحیح ہے کہ قرآن مجید کے نزول کا سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک قائم رہا، اس لیے عہد رسالت کے ابتدائی اور درمیانی دور میں محض قرآن کی تعلیم پورے قرآن کی تدوین کا ثبوت نہیں ہے، کہ قرآن اس وقت تک پورا نازل ہی نہیں ہوا تھا، لیکن واقعات سے ثابت ہے کہ جس قدر قرآن نازل ہوتا جاتا تھا، اس کی تعلیم بھی ہوتی جاتی تھی، اس لیے نزول قرآن کے آخری زمانہ میں پورے قرآن مجید کی تعلیم ہوتی تھی، اور متعدد صحابہ نے پورا کلام مجید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھا تھا، حضرت ابی بن کعبؓ نے پورے قرآن کی تعلیم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی تھی، عبد اللہ بن مسعودؓ نے ستر سے زیادہ سورتیں آپ سے سیکھی تھیں، سالمؓ اور معاذ بن جبلؓ بھی قرائے صحابہ میں تھے، اور ان بزرگوں کو قرآن مجید پر اتنا عبور حاصل تھا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے مسلمانوں کو ان سے قرآن کی تعلیم حاصل کرنے کی ہدایت فرمائی تھی، [1]

ان کے علاوہ جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے حضرت ابو درداءؓ انصاری حضرت عبادہ بن صامتؓ، ابن ام مکتومؓ، ابو زید انصاریؓ وغیرہ متعدد صحابہ کا شمار قراء صحابہ میں تھا،

قرآن کی تعلیم مکی زندگی ہی سے شروع ہو گئی تھی، اور بیرونی مسلمانوں کی تعلیم قرآن کے لیے مکہ سے قراء بھیجے جاتے تھے، چنانچہ بیعت عقبۂ اولیٰ کے بعد حضرت مصعب بن عمیرؓ اور ابن ام مکتومؓ اہل مدینہ کی تعلیم کے لیے بھیجے گئے تھے، [2]

ہجرت کے بعد تعلیم کا پورا نظام قائم ہو گیا تھا، اور صفہ کی درسگاہ میں عام دینی تعلیم کے ساتھ قرآن مجید کی تعلیم خاص طور سے ہوتی تھی، اور بڑے بڑے قراء صحابہ اس میں تعلیم دیتے تھے، حضرت عبادہ بن صامتؓ کا بیان ہے کہ میں نے صفہ کے چند لوگوں کو قرآن کی تعلیم دی تھی، انھوں نے مجھ کو ایک کمان ہدیہ کی تھی، [3]

---

[1] بخاری ج ۲ ص ۷۴۹، باب القراء من اصحاب النبی صلعم [2] بخاری کتاب التفسیر باب سبح اسم ربک الاعلی [3] ابو داؤد کتاب البیوع باب فی کسب المعلم،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی خود اس درسگاہ میں تشریف لاکر لوگوں کو تحصیل قرآن کی ترغیب دلاتے تھے، ابن عامرؓ کا بیان ہے کہ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، ہم لوگ صفہ میں تھے، آپ نے فرمایا تم میں سے کون پسند کرتا ہے کہ وہ ہر روز بطحان اور عقیق (یہاں چراگاہیں تھیں) جاکر بغیر گناہ اور قطع رحم کیے ہوئے وہاں دو اونٹنیاں حاصل کرے، ہم لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم سب چاہتے ہیں، فرمایا تم میں سے کوئی صبح کو مسجد اس غرض سے کیوں نہیں جاکر وہاں تعلیم حاصل کرے اور قرآن کی دو آیتیں پڑھے، جو اس کے لیے دو اونٹنیوں سے، اور تین آیتیں تین اونٹنیوں سے اور چار آیتیں چار اونٹنیوں سے، اور اس سے زیادہ آیتیں اس سے زیادہ اونٹنیوں سے بہتر ہیں،[۱]

ابو سعید خدریؓ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ میں (صفہ میں) غریب اور نادار مہاجرین کی جماعت میں بیٹھا تھا، اور ایک قاری قرأت کر رہا تھا کہ اتنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے قاری پاس ادب سے خاموش ہوگیا، اور سلام عرض کیا، آپ نے پوچھا تم لوگ کیا کر رہے تھے ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ایک قاری قرأت کر رہا تھا اور ہم لوگ کتاب اللہ سن رہے تھے، آپ نے (ان غرباء کی حالت سے متاثر ہوکر) فرمایا اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ایسے لوگوں کو میری امت میں پیدا کیا کہ ان کے ساتھ مجھے بھی اپنے نفس پر صبر سے کام لینے کا حکم دیا گیا ہے، یہ فرماکر آپ اس جماعت کے درمیان بیٹھ گئے،[۲]

حضرت عبد اللہ بن عمروؓ بن العاص کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حجرہ سے نکل کر مسجد (صفہ کی درسگاہ مسجد سے بالکل ملی ہوئی تھی) تشریف لائے، لوگ دو حلقوں میں بیٹھے ہوئے تھے، ایک گروہ تلاوت قرآن اور دعا میں مصروف تھا، اور دوسرا تعلیم و تعلم میں، آپ نے دیکھکر

---

[۱] مسلم [۲] ابو داؤد کتاب العلم باب فی القصص

فرمایا، یہ سب نیک کام کر رہے ہیں، اگر خدا چاہے گا تو ان کی دعا قبول کرے گا، نہ چاہے گا تو قبول کرے گا
میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں یہ کہہ کر تعلیمی حلقہ میں بیٹھ گئے[۱]

اس درسگاہ کے اکثر معلمین نادار مسلمان تھے، اور محنت مزدوری کے ذریعہ معاش حاصل کرتے تھے، جن کو دن کو موقع نہ ملتا تھا وہ رات کو تعلیم حاصل کرتے تھے، انھیں قرا، کہا جاتا تھا، اور جہاں دینی تعلیم کی ضرورت اور طلب ہوتی وہاں ان کو بھیجا جاتا تھا،

انس بن مالکؓ کا بیان ہے کہ کچھ لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ سے درخواست کی کہ قرآن و سنت کی تعلیم دینے کے لیے چند آدمیوں کو ان کے یہاں بھیجا جائے، آپ نے ستر انصاری جو قرا کہلاتے تھے بھیجدیے، یہ لوگ قرآن پڑھتے تھے اور درس و تعلیم میں مشغول رہتے تھے، دن کو پانی لاکر مسجد میں رکھتے اور لکڑیاں چن کر بیچتے اور اس سے جو ملتا اس سے اصحاب صفہ اور دوسرے غربا کے لیے کھانا خریدتے لیکن ان کو راستہ میں دھوکے سے شہید کر دیا گیا، صرف ایک آدمی زندہ بچا جس نے مدینہ آکر اطلاع دی،[۲]

دوسری روایتوں میں اس واقعہ کی تفصیل ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قبیلہ کلاب کے رئیس کی درخواست پر آپ نے قرا بھیجے تھے، اور رعل و ذکوان نے ان پر دفعۃً حملہ کر کے شہید کر دیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی شہادت کا اتنا غم ہوا کہ ایک مہینہ تک قاتلین کے لیے بددعا کرتے رہے،

صفہ کی درسگاہ کے علاوہ اور متفرق طریقوں سے بھی تعلیم ہوتی تھی، باہر سے جو لوگ حصول تعلیم کے لیے مدینہ آتے تھے، ان کو مختلف علماء کے سپرد کر دیا جاتا تھا، اکثر یہ خدمت انصار کرام کے سپرد ہوتی تھی جو تعلیم کے ساتھ میزبانی کا بھی فرض انجام دیتے تھے، چنانچہ قبیلہ عبد قیس کی تعلیم د

---

[۱] ابن ماجہ باب فضل العلماء والحث علی العلم [۲] مسلم کتاب الامارۃ باب ثبوت الجنۃ للشہید

میزبانی آپ نے انصار کے سپرد فرمائی تھی، انھوں نے دونوں خدمتوں کو حسن و خوبی سے انجام دیا، اور آنحضرت صلعم کے استفسار پر وفد کے ارکان نے جواب دیا کہ انصار بڑے اچھے بھائی ہیں، ہمارے لیے نرم بستر بچھائے، عمدہ کھانے کھلائے اور ہم کو ہمارے رب کی کتاب اور ہمارے نبی کی سنت کی تعلیم دی، آپ سن کر بہت مسرور ہوئے، اور فرداً فرداً سب کا حال پوچھا، ان لوگوں نے جسقدر تعلیم حاصل کی تھی اس کی تفصیل بیان کی،[۱]

بعض قبائل کی تعلیم کے لیے خود مدینہ سے معلمین بھیجے جاتے تھے جیسا کہ قرا، کے واقعہ سے ظاہر ہے، عرب کے مختلف حصوں میں جو حکام اور عہدہ دار بھیجے جاتے تھے یہ سب صحابی ہوتے تھے، اس لیے انتظامی امور کے ساتھ تعلیم کی خدمت بھی ان کے متعلق ہوتی تھی چنانچہ جب حضرت معاذ بن جبل یمن کے قاضی مقرر ہوئے تو اہل یمن کی تعلیم قرآن اور احکام شریعت کی تعلیم بھی ان کے متعلق ہوئی،[۲] انھوں نے لوگوں کو جمع کر کے ان کو اسلام پر استقامت کی تلقین کی، اور قرآن کے مطالب کو سمجھنے کی ترغیب دی، اور کہا جب قرآن سمجھ لوگے .... تو پھر میں تم کو جنتیوں اور دوزخیوں کی پہچان بتاؤں گا، چند دنوں بعد لوگوں نے آکر کہا کہ ہم نے قرآن سمجھکر پڑھ لیا ہے، اب آپ ہم کو جنتیوں اور دوزخیوں کی پہچان بتائیے، آپ نے فرمایا جس کا لوگ بھلائی سے تذکرہ کریں وہ جنتی ہے، اور جس کا برائی سے کریں وہ دوزخی ہے،[۳]

قرآن کی تعلیم اتنی ضروری تھی کہ بچوں اور عورتوں کو بھی اس کی تعلیم دیجاتی تھی ابودرداءؓ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، آپ نے آسمان کی طرف نظر اٹھا کر فرمایا کہ ایک زمانہ آئے گا جب لوگوں سے اس طرح علم چھن جائے گا کہ بالکل باقی نہ رہے گا، زیاد بن لبید انصاری نے عرض کیا کہ ہم سے علم کس طرح چھن سکتا ہے جب کہ ہم خود قرآن پڑھتے ہیں، اور اپنی عورتوں اور بچوں کو اس کی تعلیم دیتے ہیں، اس پر فرمایا نا یاد تم مدینہ

---

[۱] مسند احمد بن حنبل ج ۳ ص ۴۳۲ [۲] استیعاب تذکرہ معاذ بن جبل [۳] مسند دارمی باب الاقتداء بالعلماء

کے فقیہ ہو کر ایسی باتین کرتے ہو، کیا توراۃ و انجیل یہود و نصاریٰ کے پاس موجود نہین ہین، لیکن ان سے ان کو کیا فائدہ پہنچ رہا ہے[1] یعنی اصل چیز ان کی تعلیم پر عمل ہے،

حدیث کی کتابون مین بکثرت ایسی روایات ہین کہ اگر ان سب کو جمع کر دیا جائے تو ان سے اس دور کا پورا تعلیمی نظام معلوم ہو سکتا ہے، لیکن ہمارا مقصد ان سب کا استقصا نہین بلکہ صرف عہد نبوی مین قرآن کی تعلیم کا اجمالی ذکر کر کے دکھانا مقصود ہے کہ خود عہد نبوی مین جس کتاب کی تعلیم کا اتنا مکمل انتظام رہا ہو وہ یقیناً اس زمانہ میں ہر حیثیت سے مرتب و مکمل رہی ہو گی، اور اس کی کوئی آیت چھوٹنے نہ پائی ہو گی،

نوٹ: مدیر معارف نے ایک موقع پر لکھا ہے کہ ابن ندیم اور سیوطی دونوں نے حضرت عبد اللہ رضی ابن مسعود اور ابی بن کعب رضی کے مصحف کی سورتون کے نام اور انکی ترتیب نقل کی ہے، اور ابن ندیم نے ان کے آخر مین انکی مجموعی تعداد بھی بتا دی ہے، کہ ابن مسعود کے مصحف مین ۱۱۰، اور ابی کے مصحف مین ۱۱۶ سورتین ہین، لیکن ابن مسعود کے مصحف کی جتنی سورتین انھون نے نقل کی ہین وہ اس میزان سے مطابقت نہین کرتین، اسی طریقہ سے سیوطی کی نقل کردہ فہرست مین بھی سورتون کی تعداد کم و بیش ہے، مگر اتنا سب کو مسلم ہے کہ ابن مسعود کے مصحف مین ۱۱۰، اور ابی بن کعب کے مصحف مین ۱۱۶ سورتین تھین، آخرالذکر کے متعلق معلوم ہے کہ ان کے مصحف مین خلع اور حفد دو سورتین زیادہ ہین، اور عبد اللہ بن مسعود کے مصحف مین بھی تین سورتون کی کمی کا سبب ظاہر ہے کہ وہ سورہ فاتحہ اور معوذتین کو قرآن کی سورت نہیں سمجھتے تھے، لیکن چوتھی سورت کی کمی کا سبب راقم کی نظر سے نہین گذرا، اگر ان کے مصحف کی کوئی صحیح فہرست مل جاتی تو معلوم ہو جاتا، اگر کسی صاحب علم کی نظر سے اس کے متعلق کوئی روایت گذری ہو تو امید ہے کہ وہ مطلع فرمائیں گے۔

---

[1] ترمذی کتاب العلم باب فی ذہاب العلم۔

عہد اسلامی کا ہندوستان

مملوک سلاطین دھلی

از مولانا سید ریاست علی ندوی

(۲)

سلطان رکن الدین فیروز شاہ شعبان ۶۳۳ھ تا ۶۳۴ھ

التمش نے اپنی زندگی میں اپنی جانشینی کے مسئلہ کو کسی قدر پیچیدہ بنا دیا تھا، عام اصول کے مطابق اس نے اپنے بیٹے فیروز کو امور مملکت میں حصہ لینے کے لئے آگے بڑھایا۔ ۶۲۵ھ/۱۲۲۸ء میں اس کو بدایوں کے صوبہ کی گورنری دی، مگر اس کے طور طریقے ایسے تھے کہ وہ اس کی نظر میں اس کی جانشینی کے لائق قرار نہ پا سکا،

رضیہ کی جانشینی کا پس منظر

اس لئے اس نے ایک دوسرے موقع پر فیروز کی موجودگی میں گوالیار کی مہم پر جاتے ہوئے اپنی بیٹی رضیہ کو دہلی کی زمام حکومت سپرد کی، اور واپس آکر وزیر اعظم تاج الملک محمود سے کہا کہ وہ رضیہ کی ولیعہدی کا اعلان کر دے، اگرچہ ترکوں میں نامور حکمراں خواتین گذر چکی تھیں، مگر ہندوستان کی روایات کا لحاظ کرکے ترک افسروں نے دبی زبان سے اس تجویز سے اختلاف کیا، مگر التمش نے یہ کہکر انھیں خاموش کر دیا کہ اس کے بیٹے فیروز میں سلطنت کا بار گراں سنبھالنے کی صلاحیت نہیں، انھیں خود تجربہ ہوجائے گا کہ رضیہ اپنی دانشمندی اور تدبر سے اس منصب کی اہل ثابت ہوگی، چنانچہ ۶۲۹ھ میں اس کی ولیعہدی کا اعلان ہوگیا، اور اس کے نام کا سکہ بھی اس کی زندگی میں جاری کر دیا گیا، اور فیروز کو عین الملک محمود کی نگرانی میں جس نے رضیہ کی ولیعہدی کی مخالفت کی تھی، لاہور کی صوبہ داری پر بھیج دیا، اور اس طرح گویا اس کو دارالسلطنت سے دور کرکے پایہ تخت کو آیندہ پیش آنے والے خطرہ سے بچا یا گیا، مگر فیروز کی ماں ترکان خاتون بھی بڑی شوخ چشم

ملکہ تھی، وہ فیروز کے حق ولیعہدی سے دست بردار نہیں ہوئی، اور ترک افسروں کو اپنا ہم نوا بنا لیا،

رکن الدین کی تخت نشینی | چنانچہ جب التمش آخری مرتبہ لاہور سے واپس آیا، تو فیروز کو اپنے ساتھ لیتا آیا، اس طرح اگرچہ اس کی ولیعہدی کا اعلان نہ ہوسکا، مگر یہ مسئلہ گویا نئے سرے سے ارباب حکومت کی توجہ کا مرکز بن گیا، اور جب التمش نے وفات پائی، تو ملکہ ترکان خاتون اپنے بیٹے کو ترک افسروں کی مدد سے دہلی کے تخت پر بٹھانے میں کامیاب ہوگئی، اور اس کا لقب رکن الدین قرار پایا،

رکن الدین جیسا کہ التمش کو خطرہ تھا، تخت پر بیٹھتے ہی کاروبار سلطنت سے غافل ہوکر عیش و طرب میں مشغول ہوگیا، شاہی خزانہ کو بے دردی سے برباد کرنے لگا، ترکان خاتون نے سلطنت کی زمام گویا اپنے ہاتھ میں لے لی، سوکنوں کو ہلاک کرایا، ایک سوتیلے بیٹے کی آنکھوں میں سلائی پھروائی، اور ملک میں ابتری شروع ہوئی، سلطان رکن الدین کا چھوٹا بھائی غیاث الدین محمد اودھ کا حاکم تھا، اس نے اطاعت سے انحراف کیا، لکھنوتی سے آنے والے شاہی خزانہ کو اودھ میں روک لیا، اسی طرح بدایوں، لاہور، ملتان، اور قلعہ ہانسی کے صوبہ داروں کی باہمی مراسلت سے رکن الدین کی مخالفت کرنے کا فیصلہ کیا گیا، سلطان رکن الدین ان خودسروں کو سزا دینے کیلئے دہلی سے نکلا، ان گورنروں کی فوج مقابلہ کے لئے آئی، اس اثنا میں خود رکن الدین کی فوج کے چند افسروں نے اپنے ساتھیوں کو قتل کرکے دہلی لوٹ آئے، اب رضیہ نے اپنے لئے فضا سازگار دیکھی وہ شجاعت سے مظلوموں کا لباس پہن کر جامع مسجد میں آئی، التمش کی مہربانیاں یاد دلائیں، اور کہا کہ وہ بھائی کے قصاص کیلئے اٹھی ہے، ایک بھائی نے اس کے دوسرے بھائی کو مار ڈالا ہے، فضا رکن الدین کے خلاف ہوچکی تھی، التمش کا رضیہ کو ولیعہد بنانا لوگوں کو یاد آیا، اور افسروں نے یہ کہکر کہ اگر یہ بھائیوں سے بہتر ثابت ہوئی تو تاج و تخت کی یہ مالک رہے گی، اس کو تخت پیش کرکے تاجدار بنا دیا، ترکان خاتون کو گرفتار کرکے قید کر دیا گیا، رکن الدین نے یہ حالات سنکر دہلی کا رخ کیا تو سلطانہ رضیہ نے پیش قدمی کرکے اس کو شکست دی اور قید خانہ میں ڈال دیا، رکن الدین فیروز صرف ۶ مہینے آٹھ دن حکمراں رہا، اور

ہندوستان میں پہلی مسلمان خاتون صاحب تاج و تخت بنی[1]

سلطانہ رضیہ ۶۳۴ھ تا ۶۳۷ھ / ۱۲۳۶ء تا ۱۲۴۰ء

سلطانہ رضیہ نے مردانہ لباس پہنکر بے نقاب تخت سلطنت پر جلوس کیا، اور تدبر و ہوشمندی سے حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی، سلطان رکن الدین کو شکست صوبائی گورنروں کے ہاتھوں ہوئی تھی، وہ بڑھتے ہوئے دہلی تک چلے آئے، اب وہ سلطان کی نامزدگی کو اپنا حق تصور کر رہے تھے، مگر وہ امرائے دہلی کے امرا کی رائے سے اتفاق نہ کر سکے، اس طرح ارباب سیف کے دو مستقل گروہ قائم ہو گئے، صوبہ داروں کے گروہ میں سے اودھ کے حاکم نے رضیہ کی حمایت کرنی چاہی، مگر وہ گرفتار کرکے قتل کر دیا گیا، سلطانہ نے شہر سے نکل کر جمنا کے کنارے خیمہ لگایا، دوسری طرف ترک امرا بھی دو گروہوں میں بٹ گئے، مگر رضیہ کے حسن تدبیر سے مخالفین کو شکست ہوئی، ان گورنروں میں سے اکثر مارے گئے، اور کچھ روپوش ہو گئے، رضیہ نے پورا تسلط قائم کرکے حکومت کے نظم و نسق پر توجہ کی، مختلف صوبوں میں گورنر بھیجے، اور لکھنوتی سے دیول و سندھ تک کا علاقہ اس کا مطیع و منقاد ہو گیا،

رضیہ نے تین سال تک امن و امان کی حکمرانی کی، بعض قلعے جو پہلے سے قبضہ سے نکل گئے تھے، وہاں مہم بھیج کر ان پر قبضہ کیا، وہ امور جہانداری سے بخوبی واقف تھی، مردانہ لباس میں باہر نکلتی، ہاتھی پر سوار ہو کر میدان جنگ میں جاتی، گھوڑے پر سوار ہوتی، عدالت و انصاف کیلئے بیٹھتی تو عادلانہ فیصلے کرتی، لیکن اسلامی ملکوں میں عورتوں کی بادشاہی کا رواج نہ تھا، اس کے کئی بھائی بھی موجود تھے، اس کے خلاف شورش پیدا کرنے کیلئے محض کوئی بہانہ چاہیے تھا، دربار میں ترک افسروں میں سے اس کا ایک مخالف گروہ جو اگرچہ کمزور ہو چکا تھا، مگر پھر بھی موجود تھا، اس کے دربار میں رفتہ رفتہ ایک حبشی جمال الدین یاقوت کو اقتدار حاصل ہو گیا تھا، ترک ملک و امرا کو اس کا اقتدار ناگوار گذرا، وہ اگرچہ سلطنت کے سارے کام مردانہ شجاعت سے انجام دیتی تھی، مگر اس کی نسوانیت بہرحال اپر

---

[1] فرشتہ ج ۱ ص ۶۸، فتوح السلاطین عصامی ص ۱۲۶، ۱۲۷، طبقات ناصری ص ۱۸۰ تا ۱۸۵، ظفر الوالہ ج ۲ ص ۷۰۰ تا ۷۰۸، ابن بطوطہ ج ۲ ص ۱۲۵، فونڈیشن آف مسلم رول ان انڈیا ص ۱۰۶ تا ۱۱۰، تاریخ ہندوستان ذکاء اللہ ج ۱ ص ۲۰۲ تا ۲۰۵،

میں موجود تھی، اور اس کے مخالفین کے پاس اس کے خلاف بھڑکانے کیلئے یہ آسان حربہ موجود تھا، چنانچہ اندر اندر اس کے خلاف تحریک ہوئی، اور وہ ایک شورش بن کر اٹھی، یاقوت حبشی گرفتار کرکے قتل کیا گیا، اور رضیہ کو جبکہ وہ بھٹنڈہ پر فوج کشی میں مصروف تھی، خود اس کے ہمراہیوں نے سازش سے گرفتار کرکے بھٹنڈہ میں قید کردیا، اس نے بھٹنڈہ کے قلعہ دار سے شادی کرکے وہاں سے نکلنے اور گکھڑوں اور جاٹوں کی مدد سے دہلی پر حملہ آور ہونے کی کوشش کی، مگر کامیاب نہ ہوسکی، آخر دہلی کے اطراف میں ماہ ربیع الاول ۶۳۸ھ قتل کردی گئی، اس کو تین سال چھ مہینے حکمرانی کا موقع مل سکا[۵۹]

معزالدین بہرام شاہ ۶۳۷ھ - ۶۳۹ھ (۱۲۴۰ - ۱۲۴۲)

اس وقت دہلی اور اس کے نواح میں سلطنت کے خلاف سازباز کرنے میں سرگرمی کرنے والوں کے کئی گروہ قائم ہوگئے تھے، چنانچہ رضیہ کی گرفتاری کے بعد التمش کے بیٹے بہرام شاہ کی بادشاہی کا اعلان کیا گیا، اس نے معزالدین لقب رکھا، ترک امرا اور ملک اپنی فوجیں لیکر پایہ تخت میں سلطنت کی حلف لینے کیلئے آئے، اور معزالدین نے اقتدار اعلیٰ کی کمان ان کے ہاتھ میں دیدی، اور ان کے رحم وکرم پر دہلی کے تخت کا مالک بنا، وزارت کی باگ دو امیروں اختیارالدین اور مہذب الدین کے ہاتھوں میں آگئی، موخرالذکر نے بہرام شاہ کی بہن سے شادی کرلی، اور اختیارات کا زیادہ مالک بن گیا۔ بہرام شاہ نے اقتدار کو ہاتھ سے نکلتے ہوئے دیکھ کر ان دونوں پر خفیہ حملہ کرایا، اختیارالدین مارا گیا، مہذب الدین زخمی ہوکر بچ نکلا، ایک دوسرا ملک بدرالدین سنقر امیر حاجب مقرر ہوا، اس نے بھی اپنے حدود سے تجاوز کرکے حکومت کو اپنے ہاتھوں میں سمیٹ کر . . . لے لیا، اس کے بعد مختلف امرا سازشوں کا جال بچھانے میں مصروف رہے، اور یکے بعد دیگرے منصب وزارت پر آئے، یہاں تک کہ ۶۳۹ھ میں جب شاہی لشکر مغلوں کے مقابلہ میں

---

[۵۹] فتوح السلاطین ص ۱۳۷، طبقات ناصری ۱۸۴، ۱۸۵ تا ۱۹۰، ظفر الوالہ ج ۲ ص ۷۰۲ تا ۷۰۵، عصامی کی فتوح، فرشتہ ج ۱ ص ۶۸، ۶۹، فونڈیشن آف مسلم رول ان انڈیا ص ۱۰۰ تا ۱۰۲، تاریخ ہندوستان ذکاء اللہ ج ۱ ص ۳۷۴ تا ۳۷۵

جارہا تھا، منصوبہ باندھنے والوں نے اس کو بادشاہ کے خلاف کرلیا، وہ دلی لوٹ آیا، اور شاہی محل کا محاصرہ کرلیا، صلح کی کوششیں ناکام رہیں، اور بہرام شاہ ماہ شعبان میں گرفتار اور ذیقعدہ ۶۳۹ھ/۱۲۴۱ء میں قتل کردیا گیا، وزارت کے منصب پر نظام الملک مستوفی بدستور مامور رہا،

سلطان علاء الدین مسعود ۶۳۹ھ/۱۲۴۱ء – ۶۴۴ھ/۱۲۴۵ء بہرام شاہ کی تخت نشینی میں ملک عزالدین بلبن کشلوخان کو امتیاز حاصل تھا، اس نے اپنی بادشاہی کا اعلان کیا، مگر دوسرے ترک ملک اور امراء نے شاہی خاندان ہی کے کسی رکن کو تخت نشین کرنے کا فیصلہ کیا اور نظر انتخاب سلطان رکن الدین کے بیٹے مسعود پر پڑی، اسکو قیدخانہ سے نکال کر علاء الدین مسعود کے لقب سے تخت نشین کیا گیا، ملک کشلوخان نے بھی کثرت رائے کی اطاعت کی، اور اپنے دعویٰ سے دست بردار ہوگیا، اس طرح ترک امراء اور ملک کی جو مختلف پارٹیاں تھیں، ان کی مشترکہ حکومت قائم ہوئی، اصل اقتدار انہی کے ہاتھوں میں رہا، ملک کشلوخاں کا اعزاز سب سے زیادہ کیا گیا، اور اس کو ناگور کے اقطاع کی حکومت سپرد کی گئی، اسی طرح مختلف ممتاز ملک مختلف صوبوں کے حاکم بنائے گئے، اور حکومت کی اصل باگ وزارت کے ہاتھ میں رہی جس میں وزارت و نیابت کے عہدوں پر مختلف پارٹیوں کے نمایندے سرفراز تھے، اس طرح بیدار مغز مدبر امراء کے ہاتھوں حکومت کا نظم و نسق خوبی سے سنبھل کر قائم ہوگیا،

بلبن کا اقتدار کچھ دنوں کے بعد مرکزی حکومت کے وزراء میں رد و بدل ہوا، وزارت عظمیٰ کا قلمدان غیاث الدین بلبن کے ہاتھوں میں آیا، اس نے فوج کی نئی تنظیم کی، اور اب طاقت در ... اس کے ہاتھوں میں آگیا، اور مرکزی حکومت کی پوری صورت حال بدل گئی، اس نے اپنی پارٹی کے معتمد لوگوں کو مختلف منصبوں پر مامور کیا، اور مخالف طاقتوں کی سازشوں اور حزب بندی کے شاخسانوں کو ختم کرنے کیلئے راجپوتوں اور مغلوں کے خلاف اپنی فوجی مہمیں شروع کیں، اور حکومت کی ساری توجہ اسی طرف لگادی،

۱؎ طبقات ناصری ص ۱۹۰ تا ۱۹۱، ۲۵۳، ۲۵۵ ۲؎ ظفر الوالہ ج ۲ ص ۷۰۵ تا ۷۱۰، فونڈیشن آف مسلم رول ان انڈیا ص ۱۱۴ تا ۱۱۸

رفتہ رفتہ ترک امراء و ملک کی قوت ٹوٹ گئی، یہاں تک کہ بلبن منگولوں کے حملہ کو کامیابی کے ساتھ روک کر واپس آیا تو شاہی فوج سلطان علاء الدین مسعود کے خلاف ہوگئی اور ۶۴۴ھ/۱۲۴۵ء میں اس کو معزول کرکے اس کے چچا ناصر الدین محمود کو جو صوبہ بہرائچ کا گورنر تھا، بلاکر تخت پر بٹھا دیا گیا، سلطان علاء الدین کی معزولی کا سبب تلاش کرنے میں اس کی عقل و فراست و اخلاق کو داغدار کیا گیا ہے، مگر یہ بیان منہاج سراج صاحب طبقات ناصری کا ہے، جو بلبن کے عہد میں قاضی القضاۃ کے عہدہ پر مامور تھا، اور اس کے علحدہ ہونے کے بعد علحدہ کیا گیا، اور پھر اقتدار آنے کے بعد نئے سرے سے اس عہدہ پر سرفراز کیا گیا تھا، پھر یہ سمجھنا کہ سلطان چار سال تک سلامت روی سے حکمرانی کرتا رہا، اور پھر ایسے زمانہ میں کہ اس کے عہد میں مغلوں کو نمایاں شکست ہوئی ہو اس کی روش میں اچانک ایسی تبدیلی آگئی کہ اس کی معزولی ضروری قرار پائی، باور کرنا عقل سے بعید ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں امراء کی کشمکش جس طرح جاری تھی، اس میں ایسے حکمراں کا صاحب تاج و تخت رہنا جو دوسرے امراء کے زیر اثر فرمانروائی کر چکا ہو بلبن کے کامل اقتدار کیلئے موزوں نہیں سمجھا جا سکتا تھا، اس لئے بلبن نے ایک نئے نام چلا کی ضرورت محسوس کی اور وہ ناصر الدین محمود کے ذریعہ سے پوری ہوئی،

علاء الدین مسعود کا عہد حکومت

سلطان علاء الدین مسعود لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور اخلاق سے پیش آتا تھا، عدل و انصاف اور داد و دہش میں شہرت حاصل تھی، وزیر اعظم نظام الملک مستوفی ۶۴۰ھ میں قتل کیا گیا تو سلطان مسعود صدر الملک نجم الدین ابوبکر کو اس منصب پر مامور کیا، جو اس کے آخر دور حکومت تک اس خدمت پر مامور رہا،[1]

سلطان ناصر الدین محمود
۶۴۴ھ - ۶۶۴ھ
۱۲۴۵ء - ۱۲۶۵ء

ناصر الدین محمود نے بلبن کو حجابت عظمیٰ کے منصب پر برقرار رکھا، اور "الغ خاں" کے خطاب سے سرفراز کیا، اور حکومت کا اقتدار جوں کا توں بلبن کے ہاتھوں میں رہا، اس نے ۶۴۷ھ میں سلطان کی بہن سے شادی کرلی جس سے اس کے اعزاز میں مزید ترقی ہوئی اور

[1] طبقات ناصری ص ۱۹۷ تا ۲۰۱، ظفر الوالہ ج ۲ ص ۱۰، تا ۱۲۷،

اس نے نائب مملکت کے عہدہ پر اپنے بھائی کشلو خاں کو مامور کیا، اور اسی طرح مختلف عہدوں اور منصبوں پر اپنے آدمی مقرر کر دیئے، ترک امرا بلبن کی حکمت عملیوں سے غافل نہ تھے، وہ بھی اپنی ریشہ دوانیوں میں مصروف رہے، ان دنوں ایک نئی طاقت عماد الدین ریحانی کی سرکردگی میں ابھری، یہ ہندوستانی مسلمان تھا، ترکوں نے اس قدیم ہندی نومسلم افسر کے ذریعہ سے جو پہلے بلبن کے معتمدین میں سے تھا، اس کے خلاف مورچہ لگایا، اور سلطان ناصر الدین محمود نے ایک دن اچانک ۶۵۱ھ میں بلبن کے حجابت کے عہدہ سے معزول ہونے اور عماد الدین ریحانی کے مقرر کئے جانے کا فرمان نافذ کیا، اور بلبن کو اس کی جاگیر قلعہ ہانسی میں چلے جانے کا حکم صادر ہوگیا، ریحانی نے برسر اقتدار آتے ہی اہم منصبوں سے بلبن کے آدمیوں کو معزول کر کے اپنے آدمی مقرر کئے، اور اپنا اقتدار قائم کرنے میں مصروف ہوگیا،

لیکن بلبن نے پایہ تخت سے نکل کر اپنی حکمت عملی سے ان ترک افسروں کو اپنا ہم نوا بنا لیا، جو مختلف صوبوں کے حاکم تھے، اور ان کا متحدہ لشکر کوچ کر کے دلی آیا اور سلطان کو اپنی اطاعت کا یقین دلا کر عماد الدین ریحانی کو معزول کرنے کا مطالبہ پیش کیا، چنانچہ سلطان نے فوجی طاقت کے آگے سپر ڈالی، عماد الدین ریحانی کو معزول کر کے بلبن کو نئے سرے سے حاجب مقرر کیا، اور ریحانی کو پہلے بدایوں پھر بہرائچ بھیج دیا گیا، بلبن نے رمضان ۶۵۲ھ میں وزارت عظمیٰ کا قلمدان نئے سرے سے سنبھال لیا،

پھر آگے چل کر سلطان ناصر الدین محمود نے بلبن کو اپنا نائب مقرر کیا، اور کہا "میں تجھے اپنا نائب بناتا ہوں، اور امور سلطنت سونپتا ہوں، کوئی ایسا کام نہ کرنا کہ کل خدا کے حضور مجھے اور تجھے دونوں کو شرمندہ ہونا پڑے"،

بلبن نے اپنے پرانے آدمیوں کو دوبارہ مقرر کر دیا، چنانچہ صدر الملک نجم الدین پھر وزارت کے منصب پر آگئے، اور ۶۵۵ھ ۱۲۵۷ء تک اس عہدہ پر فائز رہے،

اب سلطان شاہی محل میں شاہانہ شان و شوکت سے بیٹھ چکا تھا، اور لوگوں کی نگاہوں سے اسی طرح

دوچند ہوگیا جیسے کہ اندلس میں خلیفہ ہشام اموی کو منصور عامری نے شاہی محل میں بٹھا دیا تھا، یہاں تک کہ دلی کے ایک تاجر نے سلطان کی خدمت میں باریاب ہونے کیلئے کثیر دولت نچھاور کرنا چاہی، مگر اس کو حضوری کا شرف نہ مل سکا، بلبن سلطنت کے سیاہ و سپید کا اندلس کے حاجب المنصور عامری کی طرح مالک تھا، اس لئے سلطان محمود کی حکمرانی کا زمانہ اگرچہ بیس سال تک رہا، مگر اس عہد کی سیاسیات کی پوری تاریخ گویا بلبن ہی کی حکمرانی کی تاریخ ہے،

لیکن امراء کی پارٹی بندی کا سلسلہ پھر بھی ختم نہیں ہو سکا، ۶۵۳ھ/۱۲۵۵ء سے ۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء تک کا زمانہ بغاوتوں کے فرو کرنے میں گذرا، عماد الدین ریحانی نے بھی بغاوت کی، وہ قتل کیا گیا، اسی طرح مرکز میں سیاسی ہل چل سے فائدہ اٹھا کر حاکم بنگال طغرل طغان خاں نے گویا اپنی خودمختاری قائم کرلی تھی، اس نے آگے بڑھ کر کڑا مانک پور اور اودھ کے بعض علاقوں پر قبضہ کرلیا، یہ گویا مرکزی حکومت کیلئے اس کی طرف سے ایک مستقل چیلنج تھا، بلبن نے اودھ کے گورنر تمر خاں کو اشارہ کیا، اور ایسے موقع سے کہ اڑیسہ کی غیر مسلم ریاست جاج نگر سے طغان خاں شکست کھا کر واپس جا رہا تھا، کہ تمر خاں ۶۴۲ھ/۱۲۴۴ء میں پایہ تخت لکھنوتی میں داخل ہوگیا، پھر ۶۴۴ھ/۱۲۴۶ء میں تمر خاں اور طغان خاں کی وفات کے بعد ازبک خاں نے خودمختاری کا اعلان کیا، یہاں تک کہ ۶۵۷ھ/۱۲۵۹ء میں ارسلان خاں حاکم کڑا نے اچانک حملہ آور ہوکر بنگال پر قبضہ کرلیا، اسی طرح اودھ، سندھ، پنجاب میں مقامی حالات پیش آتے گئے، بلبن نے دوبارہ قلمدان وزارت سنبھال کر ان سب صوبوں کی سیاسیات پر عبور حاصل کیا، اور یکے بعد دیگرے اپنا اقتدار قائم کیا،

اسی طرح ۶۳۳ھ/۱۲۳۵ء سے ۶۶۳ھ/۱۲۶۵ء تک کے زمانہ میں مختلف غیر مسلم طاقتوں نے جاج نگر، بہار وغیرہ میں اپنی سطوت قائم رکھی، اور اس کو ترقی دینے کی کوشش کی، بہار میں مسلمان حکمرانوں کے اثرات شاہ آباد، پٹنہ، مونگیر اور بھاگل پور وغیرہ میں قائم ہوئے تھے، لیکن جنوبی بہار میں بودھ گیا، رہتاس گڑھ وغیرہ کا وسیع علاقہ غیر مسلم حکمرانوں کے قبضہ میں تھا، اور موقع پاکر ان کی تاختیں مسلم علاقوں پر جاری تھیں، چنانچہ تلخ الدین

سنجر کربت خاں بہار میں مارا گیا، لیکن بلبن کے زمانہ تک ۶۶۳ھ/۱۲۶۵ء میں یہ دوبارہ مسلمانوں کے اقتدار میں آگیا تھا اور غیر مسلم طاقتیں کمزور پڑ گئی تھیں، اور گیا بھی مسلمانوں کے قبضہ میں آچکا تھا، چنانچہ ۶۶۶ھ/۱۲۶۸ء میں گیا کے ایک مصنف کی سنسکرت تصنیف میں بلبن کا نام حکمراں کی حیثیت سے آیا ہے، تیرہویں صدی میں گیا کو دوسرے مذہبی مقاموں کی طرح ترکوں کے اقتدار سے نکالنے کی کوشش کی گئی، مگر کامیابی نہ ہو سکی، ترکی حکومت کے اقتدار اعلیٰ کو یہاں کے وہ راجہ بھی قبول کرنے پر مجبور ہوئے جو خود مختاری سے حکومت کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے تھے، اسی طرح رہا، کالنجر وغیرہ میں راجپوتوں نے سر اٹھایا، مگر وہ بھی کوئی بڑی کامیابی حاصل نہ کر سکے، اگرچہ بندیل کھنڈ اور بعض جنوبی علاقوں پر ان کا قبضہ ۶۵۰ھ/۱۲۵۲ء سے ۶۷۹ھ/۱۲۸۰ء تک برقرار رہا، اسی طرح گوالیار، نروا، مالوہ، گجرات، مارواڑ وغیرہ کے بعض علاقوں، پھر اودھ میں قنوج و تارولی وغیرہ میں خود مختار حکومتیں ایک مختصر مدت کیلئے قائم ہوئیں، بلبن نے ان مسلم و غیر مسلم ابھرنے والی طاقتوں کو یا تو اپنی نیابت کے زمانہ میں یا آگے چل کر اپنی بادشاہی کے زمانہ میں زیر کر لیا، اس طرح بلبن اپنے دور کا ایک کامیاب حکمراں تھا،

سلطان ناصر الدین محمود نے ۱۲ جمادی الاولیٰ ۶۶۴ھ/۱۲۶۵ء میں وفات پائی، اس کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی کہ جانشینی کا دعوی کرتی، ترک امرا التمش کے زمانہ سے جس طرح جانشینی کا فیصلہ کرتے آئے تھے اسی اصول کے مطابق بلبن نے اپنے کو مستحق سمجھا، اختیارات تو اس کے ہاتھ میں تھے ہی، اس نے بادشاہ کی وفات کے بعد تاجپوشی کی رسم بھی انجام دے لی،

سلطان غیاث الدین بلبن ۶۶۴ھ/۱۲۶۵ء - ۶۸۵ھ/۱۲۸۷ء

بلبن، سلطان غیاث الدین کے لقب سے تخت پر متمکن ہوا، وہ اسی ترکی قبیلہ البری کا ایک فرد تھا جس سے سلطان التمش کا نسلی تعلق تھا، قسمت نے اس کو جمال الدین کے ہاتھوں ۶۳۰ھ میں التمش کے دربار میں پہنچا دیا تھا، ابتدائی خدمت کے بعد رضیہ کے عہد میں امیر شکار بنا، رفتہ رفتہ ترقی کر کے نائب سلطنت قرار پایا، وہ اگرچہ اس خاندان کا خانہ ساز غلام تھا، مگر ہم نسل ہونے

کی وجہ سے شمسی خاندان سے اس کی رشتہ داری آسانی سے قائم ہو گئی، وہ اپنی زندگی کے مختلف دوروں میں آگے بڑھتا ہوا تخت دہلی کا مالک بنا، التتمش نے دہلی سلطنت کی داغ بیل ڈالی تھی، اور یہ بلبن ہی کے حصہ میں تھا کہ وہ اس سلطنت کو اعلیٰ استحکام اور ترقی کے عروج پر پہنچا دے،

اس نے تخت نشینی کے بعد سلطنت کے وقار کو قائم کرنے کیلئے سب سے پہلے فوج کو نئے سرے سے منظم کیا، اعلیٰ عہدوں اور منصبوں میں اپنی پسند کے آدمیوں میں ردوبدل کیا، پایہ تخت کے قریب کے ان جنگلوں کو جہاں سرکش کمینگاہیں بناتے تھے، صاف کیا، پایہ تخت کے نظم سے فارغ ہو کر وہ دوآبہ اور اودھ میں آیا، اور سارے علاقہ کو کئی فوجی کمان میں تقسیم کیا، اسی طرح اس نے مختلف دوسرے مقاموں میں جنگلوں سے گذر کر سڑکیں نکالیں، اور پھر موقع موقع سے سرکشوں کو سزائیں بھی دیں اور حفظ ماتقدم کی تدابیر سے ملک میں امن وامان پیدا ہوا، اور لوگ زندگی کے مختلف کاموں کاشتکاری اور صنعت وحرفت وغیرہ میں امن و سکون سے لگ گئے،

اس کے ساتھ اس نے اپنی حکومت کی داخلی حکمت عملی میں بھی نمایاں تبدیلی کی، اس نے سوچا کہ جب تک مغل غزنی پر قابض ہیں، اور ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی طاقت ان میں موجود ہے، اس وقت تک ہندوستان کے چھوٹے بڑے جو بھی اس وقت تک خود مختار ہیں، انھیں زیر کرنا اور ان سے لڑائی مول لینا صحیح نہ ہوگا، اس لئے صرف اس علاقہ کو اپنے زیر حکومت رکھا جو پنجاب سے لکھنوتی تک اس کے قبضہ میں موجود تھا،

بنگال کی بغاوت سلطان علاء الدین کے زمانہ میں بنگال میں طغاخاں کے بعد ملک قرابیگ تیمور خاں ۶۵۵ھ ۱۲۵۷ء میں ملک جلال الدین ۶۵۶ھ ۱۲۵۸ء میں ارسلان خاں اور اس کی وفات کے بعد تاتار خان وہاں کے والی یکے بعد دیگرے ہوئے، بلبن نے اپنے دور حکومت کے آغاز میں جس کو برقرار رکھا ۶۶۵ھ ۱۲۶۶ء اور بعد ازاں دیگر ۶۶۶ھ ۱۲۶۵ء میں اس کو مرکز کی خدمات کیلئے بلالیا، اور دوسرے ایک غلام طغرل خاں کو وہاں کی گورنری سپرد کی، اس نے قوت بہم پہنچا کر جاج نگر پر فوج کشی کر کے بیشمار دولت حاصل کی، اس اثنا میں

ملتان پر مغلوں کے حملے شروع ہو گئے، پھر سلطان کی علالت کی خبر موت کی افواہ میں بدل کر مشہور ہو گئی، اد ھر مرکزی حکومت نے ہندوستان کے خود مختار حکمرانوں سے چھیڑ چھاڑ جاری نہ رکھنے کا بھی فیصلہ کیا تھا، ان اسباب سے طغرل خاں میں خود مختاری کا حوصلہ پیدا ہوا، اس نے سلطان مغیث الدین کے لقب سے اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا، سلطان غیاث الدین کیلئے یہ اطلاع غیر متوقع تھی اس نے اودھ کے گورنر محمد امین کو فوج کشی کا حکم دیا، اس نے شکست کھائی، تو ملک ترمینی کو مامور کیا، اس کو بھی ہزیمت ہوئی، اور کچھ لوگ طغرل سے مل گئے، تو سلطان اپنی پیرانہ سالی کا خیال نہ کرکے خود کمر ہمت چست کرکے اٹھ کھڑا ہوا، دو لاکھ فوج اس کے ہمرکاب ہوئی سخت سے سخت بارش میں بھی سفر جاری رکھا، لکھنوتی کے قریب پہنچا تو طغرل خاں فرار ہو گیا، سلطان نے کہا جب تک طغرل خاں کی گرفتاری عمل میں نہ آ جائے، وہ واپس نہ ہوگا، آس پاس کے غیر مسلم جاگیرداروں نے بھی اس کی تلاش میں مدد دی، اتفاق سے سلطانی فوج کے ایک ہراول دستہ نے اچانک طغرل کو دیکھ لیا، اور وہ فرار ہوا تو تیر کا نشانہ لگا کر گرایا، اور سر کاٹ کر سلطان کے پاس لے آیا، سلطان نے لکھنوتی کے بازار میں دو رویہ سولیاں نصب کیں، اور باغی سرداروں اور طغرل کا ساتھ دینے والوں کو منظر عام پر سولی پر لٹکایا، پھر لکھنوتی کی ولایت اپنے بیٹے بغرا خاں محمود کو سپرد کی، اور وصیت کی کہ وہ دہلی کے بادشاہ کا ہمیشہ تابع فرماں رہے، چاہے بادشاہ دہلی کوئی بیگانہ ہو یا اس کا رشتہ دار، کیونکہ لکھنوتی کا ملک کتنے ہی فاصلہ پر ہو وہ دہلی کے مضافات میں ہمیشہ داخل رہے گا، اس کے بعد دہلی واپس چلا گیا،

اسی زمانہ میں شاہزادہ محمد ملتان سے آیا تو اس کی ولیعہدی کا اعلان کیا، اور پھر اس کو مغلوں کی خبر رکھنے کیلئے سرحد پر واپس کر دیا، کیونکہ سرحد کی حفاظت اہم ترین مسائل میں سے تھی، اس لئے کہ مغل اس وقت ایشیا پر چھا گئے تھے، بڑی بڑی اسلامی سلطنتوں کو تباہ و برباد کر چکے تھے، ہندوستان کی سمت بھی وہ آئے، مگر ترکوں کی آبدار تلوار نے ان کا منہ موڑ دیا، ہندوستان کی سرزمین کو مغلوں کی پامالی سے بچانے میں بلبن کے اہم خدمات تھے،

منگولوں کا تعلق ہندوستان سے | جس زمانہ میں ہندوستان میں سلطان التمش کا ستارۂ اقبال عروج پر تھا، وسط ایشیا کے میدانوں کا خانہ بدوش قبیلہ منگول چنگیز خاں کی سالاری میں اٹھا، اور خوارزمی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، ۶۱۸ھ/۱۲۲۱ء میں خوارزم کا بادشاہ جلال الدین بھاگ کر پنجاب میں دریائے سندھ کے کنارے آیا، چنگیز خاں سے یہاں معرکہ ہوا، پھر وہ شکست کھا کر دہلی میں پناہ گزیں ہو گیا، پھر ملتان اور اچھ سے گذر کر ہندوستان سے نکل گیا، اس کے بعد مغلوں کی مستقل یورش کا سلسلہ جاری ہوا، ۶۳۹ھ/۱۲۴۱ء میں وہ لاہور تک آ گئے، اور اس کو تباہ کیا، اس طرح ان میں پنجاب کی ملکیت کا دعویٰ پیدا ہو گیا، وہ اپنے حملے کرتے رہے، چنانچہ ۶۵۵ھ/۱۲۵۷ء میں بلبن نے ملتان کو ان کے حملہ سے بچایا، اور باوجودیکہ یہ خونخوار قوم سارے ایشیا میں تہلکہ مچائے تھی، مگر ہندوستان کی سلطنت کو بلبن کے مضبوط ہاتھوں میں دیکھ کر ہلاکو خاں کو اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا پڑا، چنانچہ ۶۵۷ھ/۱۲۵۹ء میں اس کے سفیر ہندوستان میں آئے، بلبن نے ان کا ایسے تزک و احتشام سے استقبال کیا کہ منگولوں کی نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئیں، اگرچہ اس دوستانہ سفارت کا کوئی پائدار اثر نہیں نکلا، مگر انھیں اس کا حوصلہ نہ ہو سکا، کہ وہ دہلی کے تخت پر بھی نگاہ ڈال سکیں، باایں ہمہ وہ پنجاب کے دعویٰ سے دست بردار نہیں ہوئے، اور اس پر شدید حملے کرتے رہے، غیاث الدین بلبن نے شاہزادہ محمد کو مقابلہ کیلئے متعین کر دیا تھا، وہ ۶۸۳ھ/۱۲۸۵ء میں جبکہ سندھ و ملتان کا امیر تھا، مغلوں سے ایک لڑائی میں کام آ گیا، باایں ہمہ ہندوستانی لشکر نے مغلوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا، یہ فتنہ اگرچہ کچھ دنوں کیلئے دب گیا، مگر پنجاب میں اسکی چنگاری کسی نہ کسی طرح سلگتی رہی،

وفات اور جانشینی | سلطان غیاث الدین کے لئے اس نوجوان بیٹے کی جس کی ولیعہدی کا اعلان بھی کر چکا تھا، موت کا حادثہ ایسا سخت تھا کہ وہ برداشت نہ کر سکا، اور وہ اس کے لئے جان لیوا ثابت ہوا، چنانچہ کچھ دنوں کے بعد وہ مرض موت میں مبتلا ہوا، بغرا خاں باپ کی عیادت کیلئے آیا، سلطان نے بغرا خاں کو اپنا ذ[illegible] گیا [illegible] سلطنت [illegible] دہلی کے تخت کو ترجیح نہ دے سکا،

غیاث الدین کو اس کا افسوس ہوا، اور اس نے مقتول شہزادہ محمد کے بیٹے کیخسرو کی ولیعہدی کا اعلان کیا، مگر غیاث الدین کی وفات کے بعد وزرا کے اشارہ سے کیخسرو پایہ تخت سے ملتان چلا گیا، اور بغرا خاں کے بیٹے معز الدین کیقباد کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔[۵]

معز الدین کیقباد ۶۸۶ھ تا ۶۸۹ھ

کیقباد ۱۷ سال کی عمر میں تخت پر بٹھایا گیا، معز الدین اس کا لقب رکھا گیا، اس کی تخت نشینی بعض امرا کی سازشوں سے عمل میں آئی تھی، ان ہی نے کیخسرو کو فریب دے کر سندھ کی طرف بھگا دیا، اور اپنے اثر و اقتدار کیلئے اس نوعمر کو تخت نشین کیا، دوسرے مقتدر امرا بلبن کی وصیت کے پورے نہ ہونے کی وجہ سے اس کے مخالف رہے، مگر سلطنت کا کوئی دعویدار موجود نہ تھا، اس لئے سب نے جبر و اکراہ سے اطاعت کر لی۔

کیقباد جن امرا کے ہاتھوں تخت سلطنت پر بیٹھا، وہ قدرتی طور پر صاحب اقتدار ہو گئے، اور مختلف عہدوں میں ردوبدل ہوا، یوں تو وزارت و نیابت سب ہی عہدوں پر مختلف لوگ مامور کئے گئے، مگر اصل طاقت ملک الامرا فخر الدین کوتوال کے داماد ملک نظام الدین کے ہاتھوں میں آگئی، جو دادبگی کے عہدہ پر مامور تھا، اس نے سلطان کا اعتماد حاصل کر لیا، اور پوری طرح اس کو قابو میں کر لیا، اس کی بیوی بھی شاہی محل میں پہنچ گئی، اور سلطان کی منہ بولی ماں بن کر اندرون خانہ کے انتظام کو اپنے ہاتھ میں لے لیا، رفتہ رفتہ اس کو خود صاحب تخت و تاج ہو جانے کا خیال پیدا ہو گیا، ملک فخر الدین کوتوال نے اس کو اس ارادہ سے باز رکھنا چاہا، مگر وہ اسی دھن میں لگا رہا، سلطان کو عیش و عشرت کی راہ پر لگا دیا، ذرا ایسی صورتیں زبیا

---

[۵] طبقات ناصری ص ۲۰۱، ۲۲۸ و ۲۸۱ تا ۲۸۴، ۲۷۷، ۲۳۵، ۲۴۲ تا ۲۴۶، ۲۶۳، ۲۶۶، ۲۷۶، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۹، ۳۰۰، ظفر الوالہ حاجی دبیر ج ۲ ص ۱۳ تا ۲۷، دبیر اور دوسرے مورخین نے بلبن کا سال جلوس ۶۶۲ھ لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے، ۶۶۵ھ کا سکہ بنام محمود برآمد ہو چکا ہے، ابن بطوطہ ج ۲ ص ۲۶، ۲۹ فرشتہ ج ۱ ص ۷۴، ۷۵، ۷۷، تاریخ فیروز شاہی برنی ص ۲۳، ۲۴، ۲۵ تا ۱۲۵، قران السعدین خسرو ص ۸
(باقی حاشیہ صفحہ ۴۳۶ پر)

سکیں، کہ انقلاب سلطنت کا موقع ہاتھ آسکے،

اس سلسلہ میں اس کو کیخسرو کی طرف سے کھٹکا تھا، اس نے سلطان کو سمجھا کر اس کے قتل کرانے کا حکم جاری کردیا، چنانچہ کیخسرو کو دہلی آنے کی دعوت دی گئی، اور راہ میں اس کو فریب سے قتل کرادیا گیا،

معز خاں اور کیقباد کی ملاقات | بغرا خاں نے بنگال میں دار السلطنت کے حالات سن کر اپنے بیٹے کی بے راہ روی سے خاندان سے سلطنت کے نکلنے کا خطرہ محسوس کر کے بیٹے کو نصیحت آمیز خطوط بھیجے، مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا، تو ملاقات کا قصد کیا، لیکن چونکہ اس نے بنگال میں سلطان ناصر الدین کا لقب اختیار کر کے اپنے نام کا خطبہ وسکہ جاری کر دیا تھا اور ملک نظام الدین نے کیخسرو کو راہ سے ہٹانے کے بعد بغرا خاں کے قصہ کو بھی پاک کرنا چاہا، اس لئے کیقباد کو یہ سمجھا دینا آسان ہوا، کہ وہ اگرچہ باپ ہیں مگر سلطنت کی راہ میں باپ بیٹے کا رشتہ نہیں ہوتا، اس نے اپنے نام کا خطبہ وسکہ جاری کر کے ایک قسم کی بغاوت کی ہے، اور اب دلی کے تخت کی ہوس اس کے دل میں پیدا ہوئی ہے، کیقباد کے دل میں خطرات پیدا ہوگئے، اس لئے اس نے اثنائے راہ میں اودھ میں سرجو کے کنارے ملاقات کا مقام مقرر کیا، اور نظام الدین کے مشورہ سے لشکر بھی ساتھ لے گیا، بغرا خاں کو یہ حالات معلوم ہوئے تو وہ بھی فوجی طاقت کے ساتھ روانہ ہوا، اور سرجو کے دونوں کناروں پر باپ بیٹے کے فوجی پڑاؤ پڑ گئے، نظام الدین کوشش کرتا رہا کہ کسی طرح ان دونوں میں جنگ چھڑ جائے، اور ملاقات کیلئے پے درپے شرطیں عائد کرائیں، بغرا تدبر اور ہوشمندی سے کام لیکر سب شرطیں منظور کرتا گیا، آخر میں اس نے کہا میں سلطان بلبن کا پسر ہوں، اور دہلی کے تخت کا میں حقدار تھا، مگر وہ میرے بیٹے کے قدموں کے نیچے آگیا ہے، اور وہ میرے باپ کی جگہ بیٹھا ہے، دہلی کے تخت کی عزت سلاطین دیا رکرتے آئے ہیں، میں بھی اس کا احترام ملحوظ رکھوں گا، اور ویسی ہی حاضری دونگا جیسے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۳۵) ریاض السلاطین ص ۷۳، تا ۷۵، فونڈیشن آف مسلم رول ان انڈیا ص ۱۴۰ تا ۱۴۳ و ۱۵۱ تا ۱۵۴، ہسٹری آف اڑیسہ بنرجی ج ۱ ص ۲۶۳، گیا گزیٹیر ص ۲۰۸، نزہۃ الخواطر ۱۹، ۲۳۰، ۱۲۴،

شہنشاہ کے دربار میں پہنچا جاتا ہے، بغرا خاں کی اس تحریر کے بعد ملک نظام الدین کیلئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ
حیلہ جوئی سے کام لیکر ان دونوں کی ملاقات کو مزید معرض التوا میں ڈال سکتا، چنانچہ شہنشاہ کے دربار
میں بنگال کو اپنے "حاکم" کو جو اپنے نام کا سکہ و خطبہ جاری کرنے کی جرأت کر چکا تھا، حاضری کی اجازت عطا ہوئی
اور وہ دریائے سرجو کو عبور کر کے شاہی خیمہ میں حاضری دینے کیلئے آگیا، اور دربار میں پہنچ کر اپنی اسی
حیثیت کو ملحوظ رکھکر شاہی مراسم ادا کرتا اور حسب دستور زمین بوس ہوتا آہستہ خرامی سے سلطان کے روبرو
بڑھتا گیا، "دور نگاہ روبرو سلطان جہاں پناہ" کی صدا چوبدار نے لگائی، اور "لکھنوتی کے گنہگار کو امان" کی
آواز بھی بلند کی گئی، بغرا خاں تخت کے سامنے پہنچکر مؤدب کھڑا ہو گیا، اور کیقباد شاہانہ جاہ و تمکنت سے تخت
پر متمکن رہا، بغرا خاں اس نظارہ کی تاب زیادہ دیر تک نہ لاسکا، اور وہیں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، اب
بیٹے کے لئے بھی اپنے آپ کو سنبھالے رکھنا دشوار ہو گیا، تخت سے اترا اور لپک کر باپ کے قدموں پر
سر رکھ دیا، باپ نے اٹھا کر گلے سے لگایا، اور دونوں دل بھر کر روئے، اور اس منظر سے سارے درباریوں
پر رقت و گریہ طاری ہو گیا،

اس کے بعد مختلف نشستوں میں باپ نے بیٹے کو نصیحتیں کیں، امور سلطنت کے نشیب و فراز سمجھائے اور
اور اخلاق اور دینداری کے درس کی تلقین کی، اس کی نصیحتوں کو مورخین نے قلمبند کیا ہے، ملک نظام الدین
اور ملک قوام الدین کو بلا کر بھی سلطنت کے متعلق مختلف باتیں سمجھائیں، پھر علیحدہ طریقہ سے نظام الدین سے
ہوشیار رہنے کی تلقین کی، بغرا خاں کو بیٹے سے دلی تعلق تھا، وہ سلطنت کے شیرازہ کو بھی قائم رکھنے کا
خواہشمند تھا، مگر حالات و قرائن سے اس کو اندازہ ہو چکا تھا کہ دہلی کا تخت اس کے خاندان سے نکلتا ہے
اس نے واپسی کے بعد اپنے رفیقوں سے کہا "یہ میرے لخت جگر سے میری آخری ملاقات ہے" واپسی کے
رقت آمیز منظر کا نقشہ بھی مورخین نے کھینچا ہے کیقباد باپ کی نصیحتوں سے کسی قدر متاثر ہوا، سفر کی
واپسی میں چند منزلوں تک اس نے شراب نہیں پی، عیش و عشرت کی زندگی بھی ترک کر دی، مگر

ملک نظام الدین نے حسین عورتوں کے جھرمٹ کو پیش کرکے آخر پھر ..... اس کو اسی راہ پر لگا دیا،

ملک نظام الدین کا زوال لیکن نظام الدین کے متعلق بغرا خاں نے اس سے جو کچھ کہا تھا، وہ اس کے دلنشیں ہو چکا تھا، دہلی پہنچنے کے کچھ دنوں کے بعد اس کو باپ کی بات یاد آئی، اس نے نظام الدین کو کیخسرو کی جگہ ملتان کی گورنری پر جانے کو کہا، وہ اصل مقصد سمجھ گیا، اور حیلہ جوئی سے دہلی ہی میں ٹھہرا رہا، کیقباد نے زہر دلوا کر اس کا کام تمام کرا دیا، اس کے بعد ایک خلجی امیر ملک فیروز کو اس نے حجابت کے عہدہ پر مامور کیا، مگر خود اس کی عادتیں جو بگڑ چکی تھیں وہ درست نہیں ہوئیں، رفتہ رفتہ ملک فیروز خلجی کے اقتدار میں اضافہ ہوتا گیا، اس کے ساتھ کیقباد کی غیر محتاط زندگی سے اس کی صحت بھی بگڑ چکی تھی، وہ دفعۃً لقوہ اور فالج میں مبتلا ہوا اور نقل و حرکت سے بھی معذور ہو گیا،

نئے تاجدار کا سوال اب دربار کے امراء کے سامنے دہلی کے آئندہ تاجدار کا سوال تھا، وہ پھر دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے، ایک طرف ملک فیروز کی سیادت میں خلجی تھے، یہ بہادر پور میں چلے آئے، دوسرا گروہ ملک ایتمر سرخا کی سرکردگی میں ترکوں کا تھا، وہ کیقباد کے سہ سالہ بچے کیومرث کو شاہی محل سے نکال کر چبوترہ ناصری کے میدان میں چلے آئے اور ان دونوں گروہوں میں اقتدار اعلیٰ کو ہاتھ میں لینے کیلئے کشمکش شروع ہو گئی،

شمس الدین کیومرث ۶۸۸ھ - ۶۸۹ھ / ۱۲۸۹ء - ۱۲۹۰ء ملک ایتمر سرخا نے کیومرث کی تاجپوشی کی رسم انجام دی، اور شمس الدین لقب دیا، تین مہینے کے بعد خلجیوں نے ترکوں کا محاصرہ کرکے کیومرث کو چھین لیا، ملک ایتمر سرخا مارا گیا، سرکشوں نے کیقباد کو جو مردہ حال بستر پر پڑا اسسکیاں لے رہا تھا بے دردی سے پیٹا، پھر بستر سمیت اٹھا کر جمنا کی لہروں کے سپرد کر دیا،

اب دہلی میں بلبن کے خاندان کا کوئی وارث موجود نہیں تھا، طاقت خلجیوں کے ہاتھ میں آ چکی تھی، چنانچہ انھوں نے خلجی سردار ملک فیروز کو سلطان جلال الدین خلجی کے نام و لقب سے تخت نشین کیا، اور مملوک سلاطین دہلی کی سلطنت

کا خاتمہ ہو گیا،[1]

علم و فضل کی ترقی اور اکابر و اعیان

رکن الدین فیروز شاہ کے عہد آغاز ۶۳۳ھ/۱۲۳۵ء سے معز الدین کیقباد کے زمانہ کے خاتمہ ۶۸۹ھ/۱۲۸۹ء کی نصف صدی سے اوپر مدت میں بہت سے ممتاز علما و صوفیہ گذرے جن کے روشن کارنامے یہاں کے تمدن کے مختلف شعبوں کو ترقی دینے میں انجام پائے، ان میں سے بہت سے ایسے ممتاز اعیان ہیں، جن کے درخشاں خدمات کا سلسلہ خصوصاً سلطانہ رضیہ کے عہد سے بلبن کے زمانہ تک کسی نہ کسی حیثیت سے جاری رہا، یہ اساتذۂ فن اپنے اپنے مستقر پر بیٹھے تھے، اور اپنی جگہ خود ایک مستقل درسگاہ تھے، سلاطین کے دور میں مستقل مدرسے بھی جاری تھے، جن میں مختلف علوم و فنون کی تعلیم جاری تھی،

اس دور میں ملک کی علمی و تعلیمی ترقی کا خاص سبب یہ تھا کہ خود سلاطین کو علم و فضل سے دلی لگاؤ قائم تھا، چنانچہ سلطان التمش کے بعد جو سلاطین تخت دہلی پر آئے، ان میں بیشتر خود صاحب علم و فضل تھے، علماء و صلحاء کی قدر کرتے اور علوم و فنون کی ترقی میں حصہ لیتے رہے، نیز ان میں سے بیشتر سلاطین دیندار تھے، صلحاء و مشائخ کا احترام کرتے، اور ان کے ذریعہ رشد و ہدایت کی جو خدمت جاری تھی، اس میں معاون ہوتے، چنانچہ سلطان ناصر الدین محمود کے متعلق مورخین لکھتے ہیں، ہر سال قرآن مجید کے دو نسخے لکھا کرتا، عبادت و ریاضت میں وقت گذارتا تھا،[2] سلطان غیاث الدین اپنے دور کا بہترین حکمراں تھا، علماء و فضلاء اور صلحائے امت و مشائخ کا قدردان و ادب شناس تھا، شیخ برہان الدین بلخی، شیخ سراج الدین سجزی اور شیخ نجم الدین دمشقی وغیرہ کی مجلسوں اور حلقۂ درس میں جانے اور علمی فیوض سے بہرہ اندوز ہونے کا وقت بھی نکالتا تھا، اس کی اس علمی دلچسپی سے اس عہد میں علماء و فضلاء کی منزلت بڑھی، اور علوم کی اشاعت

---

[1] ظفر الوالہ حاجی دبیر ج ۲ ص ۸۳۰ تا ۸۵۲، تاریخ فیروز شاہی ص ۲۷ تا ۴۳، ۱۷۱، ۲۱۱، قران السعدین ص ۳۴، ۳۵، ابن بطوطہ ج ۲ ص ۲۶، فرشتہ ج ۱ ص ۸۰، فونڈیشن آف مسلم رول ان انڈیا ص ۱۷۵ تا ۱۸۸

[2] نزہۃ الخواطر ص ۲۲۹،

کے مواقع پیدا ہوئے۔ اس کے زمانہ کو "خیر الاعصار" کہا گیا ہے، اس دور میں بڑے بڑے اکابر صلحاء ہمت و مشائخ موجود تھے، اور ان کی خدمت میں حاضر ہونے کو وہ اپنی سعادت تصور کرتا تھا۔

نیز شاہی خانوادہ کے دوسرے ارکان بھی علم و فضل اور صلاح و تقویٰ کے قدر دان تھے، سلطان غیاث الدین نے اپنے بیٹے شاہزادہ محمد کو اعلیٰ تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا تھا، وہ علوم و فنون اور علماء و صلحاء کا قدر دان تھا، امیر خسرو اور امیر حسن اس کے دامن دولت سے وابستہ تھے، ان کے علمی کمالات اسی دور میں نمایاں ہو چکے تھے، اس نے شیخ سعدی شیرازی کو دو مرتبہ کثیر عطایا بھیج کر ملتان آنے کی دعوت دی کہ وہ ان کیلئے خانقاہ تعمیر کرائے گا، اور جاگیریں وقف کرے گا، مگر شیخ نے ہر مرتبہ اپنی پیرانہ سالی کی وجہ سے معذوری ظاہر کی، فن انشاء و شعر میں بھی اس کو کامل مہارت تھی، امیر خسرو نے اس کا پر درد مرثیہ لکھا ہے، جو اہل علم میں شہرت رکھتا ہے[۱]۔

سلطان غیاث الدین کا بھتیجا امیر علاء الدین محمد بن کشلی خاں دہلوی علم و فضل کی قدر دانی میں اپنے دور میں بے مثال سمجھا جاتا تھا، اس کی داد و دہش کی شہرت سن کر عراق، عرب، مصر، شام و تتار سے لوگ اس کے در دولت پر آتے اور کامران واپس جاتے تھے[۲]۔

سلطان غیاث الدین کا دوسرا بیٹا ناصر الدین محمود معروف بہ بغرا خاں بھی علم و فضل کی قدر دانی میں شہرت رکھتا تھا، ناصر الدین محمود اور معز الدین کیقباد کی تاریخی ملاقات جو دریا کے کنارے ہوئی تھی امیر خسرو کی قران السعدین اسی کی آئینہ دار ہے، بغرا خاں نے ۶۹۱ھ ۱۲۹۲ء میں وفات پائی، اس دور کے حسب ذیل ممتاز اعیان، قضاۃ، علماء، شعراء، مصنفین، اور ارباب خیر و صلاح خاص طور پر لائق ذکر ہیں:-

قضاۃ و صدر جہاں | صدر جہاں یا قاضی ممالک کے عہدہ پر ملک کے نامور اہل علم مامور کئے جاتے تھے، چنانچہ طبقات ناصری کے مشہور مصنف قاضی ابو عمر عثمان بن محمد جوزجانی معروف بہ منہاج سراج

---

[۱] نزہۃ الخواطر ج ۱ ص ۱۹۲، [۲] ایضاً ص ۲۲۰ [۳] ایضاً ص ۲۲۲

اس منصب پر ۶۵۳ھ/۱۲۵۵ء تک مختلف زمانوں میں سرفراز رہے، منہاج کا تعلق دہلی کی سلطنت سے التمش کے زمانہ میں پیدا ہوا، وہ ۵۸۹ھ/۱۱۹۳ء میں پیدا ہوئے تحصیل علوم کے بعد ۶۲۴ھ/۱۲۲۷ء میں اچھ میں آئے، ناصر الدین قباچہ نے مدرسہ فیروزیہ میں درس وتدریس اور اس کے لڑکے بہرام شاہ نے قضاء عسکر کے منصب پر مامور کیا، ۶۲۵ھ/۱۲۲۸ء میں سلطان التمش نے گوالیار کے امور شرعیہ کا حاکم، قاضی، خطیب اور امام مقرر کیا، ۶۳۵ھ/۱۲۳۸ء تک یہاں خدمت انجام دیتے رہے، سلطانہ رضیہ کے زمانہ میں وہ دلی میں آئے، تو سلطانہ نے مدرسہ ناصریہ دہلی کے اوقاف کا والی مقرر کیا، اور گوالیار کی قضاءت کا منصب بدستور قائم رہا، پھر بہرام شاہ نے دار السلطنت دہلی کا قاضی مقرر کیا، ۶۳۹ھ/۱۲۴۱ء تک وہ اس خدمت پر مامور رہے، مسعود شاہ کے زمانہ میں وہ دہلی سے لکھنوتی گئے، طغرل طغان خاں نے عزت واحترام سے جگہ دی، دو سال کے بعد پھر دہلی واپس آئے، اور ۶۴۳ھ/۱۲۴۵ء میں بلبن نائب سلطنت نے گوالیار کی قضاءت اور خطابت پر دوبارہ مامور کیا، پھر اسی سال مدرسہ ناصریہ دہلی کا سابق عہدہ بھی انھیں مل گیا، پھر ۶۵۲ھ/۱۲۵۴ء میں صدر جہاں کے منصب پر مامور کئے گئے،

ان کی تصنیفات کا سلسلہ ۶۴۵ھ/۱۲۴۷ء سے شروع ہوا سب سے پہلے التمش کا رزم نامہ ناصری نامہ کے نام سے لکھا، بلبن نے قدردانی سے ان کا حوصلہ بڑھایا، اور رفتہ رفتہ مختلف جاگیریں عطا ہوئیں، قاضی منہاج فقہ، اصول، سیر، تاریخ اور شعر میں دستگاہ رکھتے تھے، تصوف کا بھی مذاق تھا، حضرت نظام الدین اولیاء کے دربار میں حاضری دیتے تھے، التمش کی شان میں متعدد قصیدے لکھے ہیں، طبقات ناصری سو جلدوں میں لکھی، طبقات ناصری کے نام سے بنگال ایشیاٹک سوسائٹی نے ۱۸۶۴ء میں جو جلد شائع کی ہے وہ اصل کتاب کی انیسویں سے اکیسویں جلد تک پر مشتمل ہے۔[۵]

(۱۱) قاضی جلال الدین کاشانی قاضی ممالک (چیف جسٹس) کے عہدہ پر بہرام شاہ کے زمانہ تک مامور رہے، اس نے ۶۵۳ھ/۱۲۵۵ء میں ان کو معزول کیا، تو اودھ چلے گئے، اور عہدہ قضا کی خدمت انجام دی،

---

[۵] نزہۃ الخواطر ج اول حصہ اول ص ۱۴۷۔

علاء الدین مسعود نے انھیں دوبارہ طلب کیا، اور ۶۴۱ھ ۱۲۴۳ء میں سفارت کی خدمت سپرد کر کے لکھنوتی بھیجا، پھر دہلی کے صدر جہانی کے عہدہ پر سلطان ناصر الدین محمود نے ۶۴۷ھ ۱۲۴۹ء میں دوبارہ مقرر کیا، اسی منصب پر مامور رہ کر ۶۶۳ھ ۱۲۶۵ء میں وفات پائی،[۵]

(۳) قاضی شمس الدین مارہروی بہرام شاہ کے زمانہ میں مار... کے قاضی تھے ۶۳۹ھ ۱۲۴۱ء میں شیخ ایوب ترکمانی کے اشارہ سے بعض الزامات کی بنا پر ان کو ہاتھی کے پاؤں کے نیچے ڈالکر بے رحمی سے مار ڈالا،[۲]

(۴) شیخ عماد الدین محمد شقورقانی سلطان مسعود کے زمانہ میں ۶۳۹ھ ۱۲۴۱ء میں دہلی کے قاضی مقرر ہوئے، ۶۴۲ھ میں معزول کر کے بدایوں بھیجے گئے، پھر عماد الدین ریحانی نے اسی سال ماہ ذی الحجہ میں انھیں قتل کرایا۔[۳]

(۵) قاضی شمس الدین بہرائچی کو سلطان ناصر الدین محمود نے اپنی ولایت بہرائچ کے زمانہ میں یہاں کا قاضی مقرر کیا تھا، جب وہ سریر سلطنت پر بیٹھا تو ۶۵۰ھ ۱۲۵۲ء میں دہلی بلاکر یہاں کی قضارت کی خدمت سپرد کی، اور ۶۵۳ھ ۱۲۵۵ء میں معزول کیا، جب امرائے اس کے خلاف ۶۵۵ھ ۱۲۵۷ء میں بغاوت کی تو اس کا اتہام ان پر بھی رکھا گیا، اور اسی سال وہ دہلی سے جلاوطن کر دیئے گئے، اور بہرائچ میں سکونت اختیار کر لی،[۴]

(۶) قاضی جمال الدین محمد بسطامی کو سلطان ناصر الدین نے ۶۵۳ھ ۱۲۵۵ء میں شیخ الاسلام کے منصب سے سرفراز کیا، ۶۵۷ھ ۱۲۵۹ء میں انھوں نے وفات پائی،[۵]

(۷) قاضی جلال الدین کاشانی سلطان معز الدین کیقباد کے عہد میں دہلی میں عہدۂ قضا پر مامور تھے، سلطان جلال الدین فیروز شاہ خلجی نے انھیں دہلی سے علیحدہ کر کے بدایوں کی قضارت پر مامور کر دیا، اور یہی مملوک سلاطین کے دور کے آخری قاضی تھے،[۶] (باقی)

---

[۱] نزہۃ الخواطر ص ۱۴۷ [۲] ایضاً ص ۱۶۰ [۳] ایضاً ص ۲۲۶ [۴] ایضاً ص ۱۶۰ [۵] ایضاً ص ۲۲۷ [۶] ایضاً ج ۲ ص ۲۳،

مصنف سلاطین اسلام

ابو العباس احمد الملقب بہ قادر باللہ عباسی

از مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی رفیق دار المصنفین

(سلسلہ معارف اپریل)

خلفاء عباسیہ میں قادر باللہ چوتھا خلیفہ ہے جو تدبیر و سیاست کے علاوہ علم و فضل کے اعتبار سے بھی بلند حیثیت کا مالک تھا، اور اس نے اپنی تحریری یادگار بھی چھوڑی ہے،

نام و نسب احمد نام، ابو العباس کنیت، قادر باللہ لقب، مقتدر باللہ کا لڑکا تھا، ۳۳۶ھ میں یمنی یا دمنہ نام کی ایک لونڈی کے بطن سے پیدا ہوا[1]،

خلافت اور کارنامے ۳۸۱ھ میں طائع کے بعد وہ خلیفہ منتخب ہوا، اس وقت اس کی عمر چوالیس سال کی تھی[2]،

قادر بڑا مدبر اور بڑے جاہ و جلال کا خلیفہ تھا، اس کے پیشرو خلفاء کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہ گئی تھی، خلافت کا سارا نظام اور اقتدار دیالمہ کے ہاتھ میں تھا، وہ جو چاہتے تھے کرتے تھے، خلفاء کو دم مارنے کی مجال نہیں تھی، وہ صرف تبرک کے طور پر تخت خلافت پر بٹھا دیئے جاتے تھے، قادر نے اپنی سیاست اور تدبیر سے خلافت کا کھویا ہوا وقار دوبارہ قائم کیا،

اس کے زمانہ میں بڑے بڑے انقلابات اور واقعات مثلاً دیالمہ کی لڑائی، شیعوں کی شورش، غزنویوں کا عروج وغیرہ پیش آئے، لیکن قادر نے اپنی بیدار مغزی سے سب پر قابو پالیا، اسی کے زمانہ میں غزنویوں کا تعلق خلافت بغداد سے ہوا، غزنوی خاندان کے مشہور حکمران سلطان محمود غزنوی کو

[1] طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۵ و تاریخ بغداد ج ۴ [2] طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۴۳،

اس نے لواے حکومت عطا کیا، اور اس کو کہف الدولہ کے لقب سے سرفراز کیا[۱]

وفات | ۴۲۱ھ میں وہ بیمار پڑا اور ایک سال تک مسلسل بیمار رہا، ذی الحجہ ۴۲۲ھ میں انتقال کیا، اس وقت اس کی عمر ۸۶ سال کی تھی، مدت خلافت ۴۱ سال، حکومت کا اتنا طویل زمانہ اس کے پیشرو میں کسی کو نہ ملا تھا[۲]

حلیہ | خطیب نے لکھا ہے کہ میں نے اس کو کئی بار دیکھا تھا، وہ نہایت خوش رو اور خوش اندام تھا، ڈاڑھی بہت گھنی تھی، اور اس پر خضاب لگاتا تھا[۳]

اخلاق وعادات | قادر اخلاق کے اعتبار سے نہایت حلیم، فیاض اور نیک نفس خلیفہ تھا، خطیب کا بیان ہے کہ اس کی سیاست، دینداری، تہجد گذاری، نیکیاں اور صدقات وخیرات کی کثرت اتنی مشہور باتیں ہیں کہ اُن سے ہر شخص واقف ہے،

صدقات وخیرات کا وہ اسقدر اہتمام کرتا تھا کہ اپنے افطار تک کے تین حصے کرتا تھا، ایک حصہ اپنے لئے رکھتا تھا اور دو حصے جامع رصافہ اور جامع بغداد کے مسکینوں کیلئے بھیجتا تھا[۴]

علم وفضل | علمی اعتبار سے اس کا شمار اس وقت کے علما میں تھا، اپنے زمانہ کے مشہور عالم ابوالبشر ہروی شافعی سے اس نے فقہ کی تعلیم حاصل کی تھی، سبکی نے "طبقات الشافعیہ" میں شافعی علمار کے زمرہ میں اس کے حالات لکھے ہیں، حافظ ابن کثیر البدایہ و النہایہ میں اس کے علم وفضل کے متعلق لکھتے ہیں

وکان الخلیفۃ قادر باللہ من	خلیفہ قادر باللہ بہترین خلفاء اور
خیار الخلفاء وسادات العلماء	اور ممتاز علماء میں تھا، (ج ۱۱ صفحہ ۳۱۹)

۱؎ تاریخ اسلام شاہ معین الدین احمد صاحب جلد ۴ ص ۶۴ ۲؎ تاریخ بغداد جلد ۴ ص ۳۸

۳؎ ایضاً ۴؎ ایضاً

سیوطی لکھتے ہیں،

وراس الخلفاء القادر باللہ	قادر باللہ سرخیل خلفاء تھا، کیونکہ ان میں
فانہ من علمھم تفقہ وصنف	سب سے بڑا عالم تھا، اس نے فقہ حاصل
وناھیک بان الشیخ تقی الدین	کی تھی، ایک تصنیف بھی کی ہے، اس کے
عدہ من الفقہاء الشافعیۃ	علم و فضل کیلئے یہ شہادت کافی ہے کہ تقی الدین
(تاریخ الخلفاء ص ۴۲۷)	سبکی نے اسکو فقہائے شافعیہ میں شمار کیا ہے،

تصحیح عقائد مختلف مذاہب اور اقوام کے اثر سے بغداد ہر قسم کے عقائد و خیالات کا مرکز بن گیا تھا جن سے مسلمان بھی متاثر ہو گئے تھے، قادر نے ان کے عقائد کی تصحیح کی سعی بلیغ کی، ۴۰۸ھ میں اس نے محمود غزنوی کو احیائے سنت کا حکم دیا، محمود میں خود مذہبی جوش تھا، اس لئے اس نے نہایت سختی سے اس حکم کی تعمیل کی،[۱]

تصنیف قادر نے تصحیح عقائد کیلئے "اصول اسلام" میں خود ایک کتاب لکھی جس میں محدثین کے مسلک کے مطابق صحابہ کرام کے فضائل، ترتیب کے ساتھ تھے، اس میں اس نے حضرت عمر بن عبد العزیز کو شامل کر لیا تھا، اور معتزلہ اور خلق قرآن کا عقیدہ رکھنے والوں کی تکفیر اور تفسیق کی تھی، یہ کتاب ہر جمعہ کو جامع رصافہ اور جامع بغداد میں محدثین کے حلقہ میں پڑھی جاتی تھی، لوگ جوق درجوق اس کی سماع کے لئے آتے تھے،[۲]

خطیب اور سبکی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب نثر میں لکھی گئی تھی، دونوں حضرات لکھتے ہیں،

وصنف ۔ [illegible] ۔ اس نے اصول میں ایک کتاب تصنیف کی تھی،

[۱] ابن اثیر ج ۹ ص ۱۳۲ [۲] تاریخ بغداد ج ۴ ص ۳۸، طبقات الشافعیہ ج ۳ ایضاً

لیکن حافظ ابن کثیر کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتاب نظم میں تھی، وہ لکھتے ہیں،

وصنف قصیدۃ فیہا فضائل الصحابۃ	اس نے ایک قصیدہ لکھا تھا جس میں صحابہؓ
وغیرھا وکانت تقرأ فی حلق	کے فضائل تھے جو جامع مہدی میں ہر جمعہ کو
اصحاب الحدیث کل جمعۃ	محدثین کے مجمع میں پڑھا جاتا تھا،
فی جامع المھدی (البدایہ ۱۱ ص ۲۹۹)	

ہو سکتا ہے کہ کتاب نثر میں لکھی گئی ہو بعد میں آسانی کیلئے نظم بھی کر دیا ہو حافظ ذہبی (متوفی ۷۴۸ھ) اسکی اس تصنیف کے متعلق لکھتے ہیں،

لہ مصنف فی السنۃ وذم	اس کی ایک تصنیف سنت کی توجیہ اور معتزلہ
المعتزلۃ والروافض	اور روافض کی مذمت کے بارے میں
(دول الاسلام ج ۱ ص ۱۹۵)	ہے،

ملک شاہ

سلجوقی خاندان کا دوسرا فرمانروا ملک شاہ اپنے اوصاف وخصوصیات اور ملک گیری اور ملک داری میں نہ صرف سلجوقی سلاطین بلکہ دنیا کے ممتاز حکمرانوں میں تھا،[1] ابن خلکان کا بیان ہے کہ وہ اپنی سیرت کے لحاظ سے دنیا کے بہترین سلاطین میں تھا، اور "سلطان عادل" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا، اس کی سلطنت کا رقبہ طول میں چین سے بیت المقدس اور عرض میں قسطنطنیہ سے بلاد خزر تک تھا،[2]

عماد الدین اصفہانی لکھتا ہے کہ ملک شاہ عادل، شجاع، حوصلہ مند اور صائب الرائے باذو

---

[1] تاریخ اسلام ج ۴ ص ۱۰۱، [2] ایضاً ص ۱۳۲،

فرماں روا تھا، وہ شام اور انطاکیہ سے قسطنطنیہ کی سرحد تک پہنچ گیا، اور رومی ملکوں سے ایک ہزار دینار سرخ وصول کئے، اور یہاں پچاس اسلامی منبر نصب کئے،[۱]

سلطنت کی توسیع کے ساتھ اس کو علمی و تمدنی حیثیت سے بھی ذروۂ کمال تک پہنچا دیا، راوندی کا بیان ہے کہ ملک شاہ کے اسلاف نے جہانگیری کی اور اس نے جہانداری،

رعایا کی آسایش اور سہولت کے لئے بہت سے کام انجام دیئے، اپنے حدود سلطنت میں ہر قسم کے تجارتی ٹیکس موقوف کر دیئے، سارے ممالک محروسہ میں سڑکیں نکلوائیں، گذرگاہوں پر سرائیں اور دریاؤں پر پل تعمیر کرائے، ۴۸۵ھ میں بغداد کے اندر ایک عالیشان جامع مسجد تعمیر کرائی،[۲] مکہ معظمہ کے راستہ میں جابجا پانی کے ذخیرہ کے لئے حوض و تالاب بنوائے،[۳] حاجیوں سے جو ٹیکس لیا جاتا تھا اس نے اسکے معاوضہ میں جاگیر وقف کر کے ٹیکس بند کر دیا،[۴]

علمی ترقی اس کے عہد میں علم و فن کو بھی بڑی ترقی ہوئی، بلخ، نیشاپور، ہرات، اصفہان، بصرہ، مرو، موصل اور عراق کے تمام شہروں میں مدرسے قائم ہوئے، اسی کے عہد میں نظام الملک کے اہتمام سے بغداد میں مدرسۂ نظامیہ کی بنیاد پڑی جس میں اس دور کے تمام ممتاز علماء درس کے لئے منتخب کئے گئے، امام ابو اسحاق شیرازی، ابونصر صباغ، ابن الخطیب شارح حماسہ، ابوالحسن فصیحی، قطب الدین شافعی اور امام غزالی جیسے یگانۂ روزگار علماء مختلف اوقات میں اس مدرسہ کی تعلیم و تدریس کی مسند پر بیٹھے، اس نے امام ابوحنیفہؒ کے نام سے بھی ایک مدرسہ قائم کیا،[۵]

اس کے دور کی علمی خدمات کے سلسلہ میں سب سے اہم سیاست نامہ اور زیج ملک شاہی ہے، سیاست نامہ نظام الملک طوسی کی تصنیف ہے، جو نہ صرف اس زمانہ کی بہترین سیاسی کتابوں میں

---

[۱] ابن خلکان جلد دوم ص ۱۲۳، دولت آل سلجوق ص ۲۲ [۲] ابن خلکان جلد دوم ص ۱۲۳ [۳] ابن اثیر ۱۰ ص ۷۴ [۴] البدایہ ص ۱۴۲ ج ۱۲

ہے، بلکہ آج بھی اس سے ملکی انتظام میں فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، اس کا ترجمہ یورپ کی بہت سی زبانوں میں ہو چکا ہے[۵]

زیچ ملک شاہی کو مشہور شاعر و حکیم عمر خیام نے اس کے نام پر ترتیب دیا تھا، یہ زیچ چھپ چکی ہے[۶]

تصنیف | ملک شاہ خود بھی صاحب علم اور اس سے زیادہ علم و فن اور اہل علم اور ارباب کمال کا قدرداں تھا، اس نے سلجوقی حکومت کے جغرافیہ پر فارسی میں خود ایک رسالہ لکھا تھا، کشف الظنون میں ہے،

رسالہ ملکشاہیہ فارسی للسلطان ملک شاہ السلجوقی فی وصف بلادہ و مملکتہ (ص ۹۳۳ ج ۲)

رسالہ ملکشاہیہ فارسی زبان میں ملک شاہ کی تصنیف ہے جس میں اس نے اپنے شہر اور سلطنت کے حالات و اوصاف لکھے ہیں،

۶ر شوال ۴۸۵ھ کو اس نے وفات پائی،

محمود غزنوی

محمود غزنوی خاندان کا گو ہر شب چراغ تھا، وہ جس حیثیت کا فاتح اور کشور کشا تھا اسی حیثیت کا علم دوست اور علم پرور بھی تھا، وہ خود عالم، شاعر، اور مصنف تھا اور اس کے دربار میں علماء، فضلا کا مجمع رہتا تھا، لیکن اس کی زندگی کا یہ پہلو اس کی ملک گیری اور کشورستانی کی داستانوں کے سامنے اس قدر دھندلا ہو گیا ہے کہ عام طور سے اس کی جانب نگاہ نہیں جاتی،

باپ کا انتقال اور تقسیم سلطنت | غزنوی حکومت کی بنیاد امیر سبکتگین نے ڈالی، امیر سبکتگین کے انتقال کے بعد سلطنت کا کچھ حصہ محمود کے قبضہ میں آیا اور باقی پر اس کے بھائی اسمٰعیل[۱]

---

۵ تاریخ اسلام شاہ معین الدین احمد ج ۴ ص ۱۳۵ ۶ ایضاً

نے قبضہ کر لیا، محمود نے ایک سال تک کوشش کی کہ تقسیم سلطنت کا معاملہ صلح سے طے ہو جائے، لیکن جب اس میں اسے ناکامیابی ہوئی تو اس نے ۳۸۹ھ میں اسماعیل کو شکست دیکر پوری سلطنت پر قبضہ کر لیا،

خلافت بغداد سے تعلقات اسمٰعیل کو شکست دینے کے بعد محمود نے خلیفہ قادر باللہ عباسی سے سند حکومت کی درخواست کی، قادر نے اس کو سند حکومت، لوا، خلعت اور یمین الدولہ کہف الاسلام کا لقب عطا کیا، بعد میں دونوں میں کچھ اختلاف ہو گیا تھا، لیکن پھر تعلقات قائم ہو گئے جو آخر وقت تک قائم رہے، چنانچہ ۴۰۸ھ میں قادر نے محمود کو اعتزال اور باطنیت کے فتنوں کے انسداد اور احیائے سنت کا حکم دیا اور اس نے نہایت ہی سختی سے ان فتنوں کو فرو کیا[۱]،

محمود کی وفات ربیع الثانی ۴۲۱ھ میں محمود نے وفات پائی، اس وقت اس کی عمر ۶۳ سال تھی اور مدت سلطنت ۳۵ سال، کئی لڑکے محمود، مسعود وغیرہ یادگار چھوڑے،

اخلاق وعادات محمود نہایت دیندار اور پاک طینت تھا، اس کے حدود سلطنت میں علانیہ کوئی برائی یا شراب نوشی نہیں ہو سکتی تھی، لہو ولعب سے نہ اسے خود دلچسپی تھی، اور نہ وہ دوسروں کیلئے اسے پسند کرتا تھا[۲]،

علم وفضل جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے محمود علمی حیثیت سے بھی ممتاز فرمانروا تھا، فارسی تو اس کی مادری زبان تھی، اس کی تحریری یادگاروں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ عربی بھی جانتا تھا، اور فقہ وحدیث اور عجم وعرب کی تاریخ میں پوری دستگاہ رکھتا تھا، اس کی حدیث دانی کے متعلق ابن خلکان کا بیان ہے کہ

وکان مولعاً بعلم الحدیث وھو یسمع ویستفسر الاحادیث[۳] — علم حدیث کا بڑا دلدادہ تھا، اس کا سماع کرتا تھا اور اسکے متعلق علماء سے سوالات کیا کرتا تھا

---

[۱] دول الاسلام ج ۱ ص ۱۸۹ [۲] البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۳۰ [۳] ابن خلکان ج ۲ ص ۸۶

فقہ سے اس کی واقفیت کا اندازہ اس کی کتاب سے جس کا تذکرہ آگے آئیگا ہو جائے گا، اہل فارس اور مسلمانوں کی تاریخ پڑھی اس کی نگاہ تھی، چنانچہ جب مجد الدولہ دیلمی والی رے[1] قید کرکے اس کے سامنے لایا گیا تو اس نے دریافت کیا کہ تم نے شاہنامہ جو اہل فارس کی تاریخ ہے، اور تاریخ طبری جو مسلمانوں کے عہد کی تاریخ ہے، پڑھی ہے؟ اس نے کہا ہاں پڑھی ہے، محمود نے کہا کہ لیکن تمھارا حال ان کتابوں کے پڑھنے والوں جیسا نہیں ہے، یہ اس کا ثبوت ہے کہ محمود کی نگاہ سے یہ دونوں کتابیں گذر چکی تھیں، اس کے علم و فضل کے متعلق ابن اثیر کا بیان ہے کہ

وہ علماء اور اصحاب کمال کا قدر دان تھا، ان کا اعزاز واکرام اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرتا تھا، دور دور سے علما آکر اس کے دربار میں جمع ہو گئے تھے، جنھوں نے اس کے لئے کتابیں بھی لکھیں[2]، شیخ محی الدین عبد القادر جواہر مضیہ میں لکھتے ہیں،

"محمود ممتاز فقہا میں تھا، فصاحت و بلاغت میں یگانہ تھا،" (ص ۱۵۷ ج ۲)

ابن عماد حنبلی لکھتے ہیں کہ

"محمود بڑا ذکی، دور رس اور صائب الرائے تھا، اس کی مجلس علماء و فضلا کا مرجع تھی" (شذرات الذہب، ص ۲۲۰ ج ۳)

اس کی علم دوستی کا اندازہ اس بیان سے ہو سکتا ہے،

اصحاب کمال کی تلاش اور ان کی قدر دانی جہاں جہاں اصحاب کمال کا پتہ چلتا تھا محمود ان کو غزنین بلا بھیجتا تھا، اسکے بہنوئی ابو العباس مامون فرمانروائے خوارزم کے دربار میں مختلف علوم و فنون کے ارباب کمال جمع تھے، اطباء میں ابن سینا اور ابو الحسن الخمار علمائے ریاضی میں البیرونی اور

---

[1] مجد الدولہ بنی بویہ کے خاندان کا فرمانروا تھا، مجد الدولہ میں انتظامی صلاحیت بالکل نہیں تھی، جب تک اس کی ماں زندہ رہی امور سلطنت دیکھتی بھالتی رہی، اس کے انتقال کے بعد نظام سلطنت بالکل مختل ہو گیا اور بدامنی پھیل گئی، اس نے محمود سے مدد طلب کی، محمود نے رے پر خود قبضہ کر لیا، اور مجد الدولہ کو معزول کر دیا (ابن اثیر ج ۹ ص ۲۶۲)

ابو نصر عراق فلاسفہ میں ابو سہل مسیحی دربار خوارزم کی زینت تھے، محمود نے مامون کو لکھ بھیجا کہ تمہارے دربار میں جو فلاں فلاں علما، ہیں استفادہ کے لئے ان کو اپنے یہاں بلانا چاہتا ہوں انھیں بھیج دو، مامون اپنے ارباب کمال کو جدا کرنا نہیں چاہتا تھا، لیکن محمود کی خواہش کو روکنا بھی اس کے بس میں نہ تھا، اس لئے اس نے ان علما، کو محمود کا خط سنا کر اپنی مجبوری ظاہر کی، خماسن کر البیرونی ابو الحسن انحار اور ابو نصر عراق غزنین چلے گئے، لیکن ابن سینا، اور ابو سہل مسیحی نے جانا پسند نہ کیا، اور محمود کے خوف سے خوارزم چھوڑ دیا۔

اس کی علم نوازی اتنی مسلم واقعہ ہے کہ یورپین مورخین جنھیں محمود کو بدنام کرنے میں خاص لطف آتا ہے، اس کی علم دوستی کے معترف ہیں۔ لفنسٹن صاحب کہتے ہیں،

محمود کے فخر و اعزاز کا واقعی سبب یہ تھا کہ وہ سپہ گری اور جہاندارانہ زندگی کے باوجود علوم فنون کے ترقی دینے میں بڑا سرگرم تھا، اور یہ اس کے دور کی عجیب وغریب خوبی تھی، اور آج تک کوئی بادشاہ علوم پروری میں اس سے سبقت نہ لے جاسکا، باوجودیکہ محمود نہایت کفایت شعار تھا، مگر علوم وفنون کے باب میں بڑا فیاض واقع ہوا تھا، اس نے خاص غزنین میں ایک بہت بڑا مدرسہ تعمیر کرایا، اور مختلف زبانوں کی عجیب وغریب کتابیں جمع کیں، اس مدرسہ کے اخراجات کیلئے اس نے بہت سا روپیہ مقرر کیا، اور طلبہ اور ارباب کمال کے وظائف کے لئے ایک مستقل فنڈ قائم کیا، ایک لاکھ سالانہ محض علمار کے وظائف مقرر کئے، علما، ومشاہیر کے ساتھ اس احترام سے پیش آتا تھا کہ اس کے دار السلطنت میں اتنے ارباب کمال جمع ہوگئے تھے کہ ایشیا کے کسی بادشاہ کو یہ فخر نہ حاصل تھا۔[۳]

کتبخانہ جس مدرسہ وکتبخانہ کی طرف الفنسٹن صاحب نے اشارہ کیا ہے بحر الفوائد اور فرشتہ

[۱] ابن اثیر ج ۹ ص ۱۲۵ و تاریخ اسلام بحوالہ تاریخ ادبیات ایران ج ۲ ص ۹۶ [۲] تاریخ الفنسٹن ترجمہ اردو ص ۵۵۲ ماخوذ تاریخ اسلام جلد ۴ شاہ معین الدین احمد،

میں اس کی تفصیل موجود ہے، مجمع الفوائد میں ہے،

سلطان غازی محمود سبکتگین گفت ہمہ مرادہائے جہاں در جہاں یافتم، اگر یک آرزو، دفترہا خواندن و خبرہائے گزشتگاں دانستن پس فرمود تا در شہر غزنین کتب خانہ بساختند چوں شب در آمدے علما را جمع کردے تا بخواندندے

(تنقید شعر العجم)

تاریخ فرشتہ میں ہے،

در جوار آں مسجد مدرسہ بنا نہاد و بنفائس کتب و غرائب نسخ موشح گردانید و دہات بسیار بر مسجد و مدرسہ وقف فرمود[۱]

علمی مجلس اور مباحثے اپنے دربار کے علما سے فقہ و حدیث اور کلام وغیرہ کے مسائل پوچھتا رہتا تھا، جب اسے کسی فن کے کسی مسئلہ میں کچھ تامل ہوتا تو وہ اس فن کے علما کو جمع کرکے اپنے سامنے ان سے علمی مباحثہ کراتا اور اسے جو مسلک پسند آتا تھا اسے اختیار کر لیتا تھا، چنانچہ استوا علی العرش کے مسئلہ پر مشہور متکلم محمد بن الہیضم اور مشہور محدث و فقیہ القفال مروزی سے مباحثہ کرایا، محمد بن الہیضم کا مسلک اسے پسند آیا، اور اسے اختیار کر لیا،[۲]

فقہ میں ابتداءً حنفی مسلک رکھتا تھا، لیکن بعد میں شافعی ہو گیا، امام الحرمین نے اس کی تفصیل یہ لکھی ہے کہ اسے حدیث سے بجد ذوق تھا، وہ اکثر مشائخ حدیث سے سماع اور احادیث کے بارے میں سوالات کیا کرتا تھا، اس تلاش و تحقیق سے اس کو اکثر احادیث امام شافعی کے مسلک کے مطابق معلوم ہوئیں، اس لئے دونوں مسلکوں کے علماء کو مرو میں جمع کرکے ان سے اپنے اپنے مسلک کی ترجیح کے دلائل دریافت کیے، دونوں نے دلائل پیش کیے لیکن کوئی بات طے

---

[۱] ص ۳۰ مطبوعہ نولکشور [۲] البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۳۰

نہیں پاسکی، آخر میں یہ قرار پایا کہ دونوں مسلک کا ایک ایک آدمی دو دو رکعت نماز پڑھائے، ان کی نماز کے مشاہدہ کے بعد محمود کو امام شافعیؒ کا مسلک حدیث کے زیادہ موافق معلوم ہوا اور اس روز سے وہ شافعی مسلک کا پابند ہو گیا[1]۔

شعر و شاعری | محمود خود بلند پایہ شاعر تھا اور شعر و سخن کا بڑا پاکیزہ مذاق رکھتا تھا یہی وجہ تھی کہ فارسی شاعری کو اس عہد میں بڑی ترقی ہوئی، مشہور ہے کہ اس نے شاعری کا ایک محکمہ قائم کیا تھا اور عنصری کو ملک الشعراء کا خطاب دے کر اس کا افسر مقرر کیا،

بعض تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ چار سو شعراء اس کے دربار سے وابستہ تھے جن میں عنصری، عسجدی، ابو الحسن علی بن قلوغ فرخی، حسن بن اسحاق فردوسی، منوچہری، دامغانی کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں،

حمد اللہ مستوفی کا بیان ہے کہ محمود علماء و شعراء کا قدردان تھا، اور ان پر چار لاکھ دینار سالانہ صرف کیا کرتا تھا، (تاریخ گزیدہ ص ۳۹۵)

ہر نئے شاعر کو دربار میں عزت کے ساتھ جگہ دیتا تھا، اور جب شاعروں کو دیکھتا تو مسرور ہوتا تھا، فرخی کہتا ہے،

تو از دیدار مدح خوانان شادان شوی شاہا — کہ ہر گز نیم ازاں وامق نگشت از دیدن عذرا
طواف شاعران بینم بگرد قصر تو دائم — ہمانا قصر تو کعبہ است و گرد قصر تو بطحا

شعراء کو بات بات پر انعام دیتا تھا، ایک مرتبہ عنصری کو ایک ہزار انعام دیا، باتوں باتوں میں غزالی پر کوئی لطیفہ ہو گیا، محمود نے اس لطیفہ پر غزل کی فرمائش کی، عنصری نے فی البدیہہ ایک غزل کہہ کر پیش کی، محمود نے انعام میں ایک ہزار کا اور اضافہ کر دیا، چنانچہ عنصری کہتا ہے

ہزار بود ہزار دگر ملک بفزود — بیک غزل کہ زمن خواست بر لطیفہ غزال

---

[1] ابن خلکان ج ۲ ص ۸۶ و البدایہ والنہایہ ص ۳۰ ج ۱۱ سنہ ...

فرشتہ کا بیان ہے کہ غضائری کو اس قصیدے کے صلہ میں جس کا مطلع ہے،

اگر مرا و بجاہ اندرست وجاہ بمال   مرا ببین کہ ببینی جمال را بکمال

محمود نے چودہ ہزار درہم عطا کئے تھے،

سلطان نے ایک مرتبہ کسی نووارد شاعر کو تین ہزار موتی عطا کئے، عنصری اس واقعہ کو ذکر کرکے کہتا ہے کہ اس فیاضی اور شعراء کی اس قدردانی کیوجہ سے محمود کے دربار میں شعراء کا مجمع لگا رہتا ہے اسکے اشعار یہ ہیں،

بیک عطا سہ ہزار گہر بشاعر داد   کہ زآں خزینہ گہے زرد چہرہ گہہ لاغر

نہ شاعری کہ قدیمش ز رنج خدمت بود   نہ از بہیج بدرگاہ او گرفتہ گزر

ازیں سبب درعالیش مجمع شعر است   اگر بود بسفر شاہ یا بود بحضر

شعراء نوازی کے ساتھ خود بھی نکتہ سنج شاعر تھا، شیخ محی الدین عبدالقادر نے لکھا ہے

ولہ شعر جید .....   اس کے اشعار اچھے ہوتے تھے،

محمد عوفی نے شاہی شعراء میں دوسرے نمبر پر اس کا ذکر کیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ "گلستان نامی ایک کنیز سے اس کو دلی محبت تھی، جب اس کا انتقال ہوا تو محمود نے ذیل کا مرثیہ لکھا،

تا تو اے ماہ زیر خاک شدی   خاک را بر سپہر فضل آمد

دل جزع کرد گفتم اے دل صبر   ایں قضا از خدائے عدل آمد

آدم از خاک بود خاکی شد   ہر کہ زو زاد باز اصل آمد

محمود نے جس بیماری میں وفات پائی اس کا سلسلہ طویل ہوگیا تھا، تقریباً ایک سال تک بیمار رہا، اس حالت میں جب اسے اپنی گذشتہ شان و شوکت، جاہ و جلال اور موجودہ بیچارگی و درماندگی کا خیال آتا

لہ تنقید شعر العجم بحوالہ دیوان عنصری ص ۷۶

تو اس کے دل پر بڑا اثر ہوتا، اور اکثر اوقات وہ رو پڑتا تھا، ذیل کے اشعار میں اس نے اس کیفیت کا نقشہ کھینچا ہے،

زبیم تیغ جہانگیر و گرز قلعہ کشائے　　جہاں مسخر من شد چو تن مسخر رائے
گہے بعز و بدولت ہمی نشستم شاد　　گہے ز حرص ہمی رفتمی زجائے بجائے
بسے تفاخر کردم کہ من کسے ہستم　　کنوں برابر بینم ہمی امیر و گدائے
اگر دو کلۂ بوسیدہ برکشی زدو گور　　ہرا میر کہ داند ز کلۂ گدائے
ہزار قلعہ کشادم بیک اشارت دست　　بسے مصاف شکستم بیک فشردن پائے
چو مرگ تاختن آورد ہیچ سود نکرد　　بقا بقائے خدا ئیست و ملک ملک خدائے[1]

تصنیف : محمود نے اپنی متعدد علمی یادگاریں چھوڑی ہیں، شیخ محی الدین عبدالقادر نے امام مسعود کے حوالہ سے لکھا ہے کہ

ولہ التصانیف فی الفقہ و　　فقہ، حدیث، خطبات اور رسائل میں
الحدیث والخطب والرسائل　　محمود کی تصانیف ہیں، اور اس کے اشعار
ولہ شعر جید　　بھی اچھے ہوتے تھے،

اس کے اشعار کے جو نمونے مل سکے ہیں وہ نقل کئے جا چکے ہیں، مگر حدیث و خطبات اور رسائل میں اس کی علمی یادگاروں کا کچھ پتہ نہیں چل سکا، البتہ فقہ حنفی میں اس نے ایک عمدہ کتاب "التفرید" کے نام سے تصنیف کی تھی، جس کے متعلق شیخ عبدالقادر کا بیان ہے کہ "وہ نہایت عمدہ کتاب ہے، اس میں فقہ حنفی کے ساٹھ ہزار مسائل ہیں، غزنی کے اطراف وجوانب میں یہ کتاب بہت مشہور ہے"[2]

اس وقت تو اس کتاب کے موجود ہونیکا کوئی علم نہیں ہے، البتہ فتاویٰ تاتار خانیہ میں جو آٹھویں صدی کی تصنیف ہے کثرت سے اس کتاب کے حوالے آتے ہیں، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ آٹھویں صدی تک یہ کتاب موجود تھی،

---

[1] لباب الالباب ج ۱ ص ۲۴، ۲۵ [2] جواہر مضیئہ ج ۲ ص ۱۵۷

جماعت اخوان الصفا

از جناب صغیر حسن صاحب ایم اے استاد شعبہ عربی و اسلامیات ڈھاکہ یونیورسٹی

عربی انشاء پردازی کے جو نمونے خلافت عباسیہ کے زریں کارناموں پر مشتمل ہیں، ان میں رسائل اخوان الصفا کو ہر دور میں مقبولیت و خصوصیت حاصل رہی ہے، اور عام طور سے ممالک عربیہ میں ان کی خاص وقعت و نمایاں حیثیت سمجھی جاتی ہے، چنانچہ عصر حاضر کے عربی کے بڑے بڑے ادیبوں، ڈاکٹر طہٰ حسین، احمد زکی پاشا، سید ادیب عباسی وغیرہم نے رسائل اخوان الصفا کو اپنا موضوع بنایا ہے مگر افسوس یہ ہے کہ انھوں نے اس اعتناء و توجہ سے کام نہیں لیا ہے جس کے رسائل اخوان الصفا بجا طور سے مستحق تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کے معلومات مستشرقین یورپ مثلاً سلفسترو وساسی،[1] ڈیٹریصی ڈی بوئر، نوفرک[2] اور گولڈتسیر وغیرہم کے نوشتوں سے آگے نہیں بڑھتے، ان میں ڈیٹریصی نے رسائل اخوان الصفا کے ساتھ خاص اہتمام برتا،[3] اور اس کا مطالعہ اس بارے میں سب سے زیادہ گہرا ہے، مگر اس کی بحثیں بھی ناقص و ناتمام ہیں،

رسائل اخوان الصفا کے مطالعہ کرنے والوں میں ڈاکٹر عمر فروخ پروفیسر فلسفہ اسلام مقاصد کالج بیروت نے حال میں اپنے تحلیلی مطالعہ کے نتائج کو بعنوان "اخوان الصفا" شایع کیا ہے،

---

[1] انھوں نے فرنچ زبان میں رسائل اخوان الصفا کا خلاصہ لکھا ہے [2] نوفرک نے برلن سے ۱۸۳۶ء میں ان رسائل کا خلاصہ شائع کیا، اور اخوان الصفا اور ان کی کتابوں سے بحث کی [3] پروفیسر ڈیٹریصی نے اصل رسائل کی اشاعت کے بعد پورے مجموعہ کا خلاصہ 'Makrokosmos' اور 'Mikrokosmos' کے نام سے دو جلدوں میں ۱۸۷۶ء و ۱۸۷۹ء میں شائع کیا،

جس میں انھوں نے جابجا رسائل پر نقد و تبصرہ سے بھی کام لیا ہے، یہ کتاب اخوان الصفا کے فلسفہ کو سمجھنے اور ان کے عقائد و آراء سے واقفیت پیدا کرنے کے لئے بڑی کار آمد ہے،

فروری سال رواں کے معارف میں مولانا عبد السلام صاحب ندوی مدظلہ کا بیش بہا مضمون اخوان الصفا شائع ہوا ہے جو زبان اردو میں غالباً پہلی مثال ہے کہ ان رسائل کے متعلق معلومات بہم پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے، یوں تو رسائل کا ایک حصہ جو مجموعۂ رسائل کی قسم دوم کا آٹھواں رسالہ ہے، کانپور میں بار ہا چھپا، اور عرصہ سے جابجا داخل نصاب ہے[۱]. لیکن غالباً سب سے پہلے ۱۸۱۲ء میں پورا مجموعہ تحفہ اخوان الصفا کے نام سے شیخ احمد بن محمد شروانی الیمنی کے زیر نظر کلکتہ میں طبع ہوا، اور پھر بمبئی سے ۱۳۰۶ھ میں شائع ہوا، مگر کسی ہندوستانی نے غالباً رسائل اخوان الصفا کے لکھنے والوں اور اس کتاب کے مضامین کو اپنا موضوع سخن اس سے پہلے قرار نہیں دیا تھا،

اس مقالہ سے ظاہر ہو چکا ہے کہ ان رسائل کے لکھنے والے مختلف اشخاص تھے، اور یہ کارنامہ ایک فرد کا نہیں بلکہ ایک جماعت کا کارنامہ ہے، سطور ذیل میں اسی جماعت اخوان الصفا کے حالات، عقائد اور مذہب پر خود ان کے رسائل سے مختصر طور پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے،

جماعت اخوان الصفا کا قیام جماعت اخوان الصفا کا دعویٰ ہے کہ یہ جماعت عہد نبویؐ سے موجود تھی،

---

[۱] اس رسالہ کو ایڈٹ کرنے والے احمد بن محمد شروانی الیمنی ہیں، جنھوں نے اس ایڈیشن کے شروع میں صفحہ ۱ تک مقدمہ لکھا ہے، پھر اصل کتاب 'قال رضی اللہ عنہ' کے بعد سے شروع ہوتی ہے، یہ رسالہ بمبئی ایڈیشن کی القسم الثانی میں "الرسالۃ الثامنۃ فی کیفیۃ تکوین الحیوانات واصنافہا" میں موجود ہے جو مجموعہ میں اکیسواں رسالہ ہے، (ملاحظہ ہو ص ۱۳۵ بمبئی ایڈیشن) مقدمہ میں ایڈیٹر نے رسائل اخوان الصفا کو مجہول الحال ابن الجلدی کی تصنیف قرار دیا ہے، اور لکھا ہے کہ ان رسائل کی تعریف میں قاضی اسحٰق العبدی نے بہت مبالغہ کیا ہے تحقیق سے اب تک ابن الجلدی نیز قاضی اسحٰق العبدی کا حال کچھ معلوم نہ ہو سکا،

اور خود وصی یہ و اہل بیت کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس جماعت سے تعلق رکھتے تھے، بلکہ تمام انبیاؑ
از منۂ ماضیہ کے صلحاء اتقیاء کا طریق کار وہی تھا جو اس جماعت کا رہا ہے[۱]

پھر بعد میں یہ جماعت روپوش ہوگئی، اور اپنی روپوشی اور خفیہ تبلیغ و اشاعت کا سبب
یہ بیان کرتی ہے[۲]

اور اس سے پہلے حقانیت والوں کو وہ مصائب پیش نہیں آئے جو ان کے بعد اس
گروہ کے متقدمین کو پیش آئے، پھر صاحب شریعت کی غیبت کے بعد آپ کے جلیل القدر
اصحاب، جو اقامت شریعت میں ان کے دست و بازو رہے تھے، جیسے حضرت صدیق
(اکبرؓ) فاروق (اعظمؓ) ذو النورینؓ وغیرہم قتل ہوئے، اور ان کے خویش و
اقارب پر جو مصائب و مظالم توڑے گئے وہ مشہور و متواتر ہیں، یہ وجہ تھی اخوان الصفا
کے پوشیدہ ہو جانے کی، اور دوستان و فاکیش کی دولت کے ختم ہو جانے کی، تا آنکہ اللہ
تعالیٰ اس جماعت کے اول، ثانی، اور ثالث کے قیام کی ان اوقات میں جن میں ان کا قیام
سزاوار ہو اجازت دے"

غرض جماعت اخوان الصفا اپنے زعم میں اولین مسلمانوں کی نسل سے تعلق رکھتی ہے،
اور اس کا ظہور ارادی یا غیر ارادی طور پر چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی مسیحی) میں ہوا،
جہاں تک تاریخی قرائن سے پتہ چلتا ہے، اس جماعت کی نشو و نما عراق اور بصرہ میں ہوئی، زمانہ
و مدت کی تعیین البتہ مشکل ہے، ان کا ظہور جیسا کہ ابھی مذکور ہوا چوتھی صدی ہجری کے وسط میں ہوا
بعض لوگ ابن الرومی (المتوفی ۲۸۳ھ ۸۹۶ء) اور ابو الفتح البستی (المتوفی قریباً ۴۰۰ھ ۱۰۱۰ء) کے
اشعار سے جو ان رسائل میں موجود ہیں ان کے عہد کی تعیین کرتے ہیں[۳] مگر یہ اس لئے قرین قیاس

---

[۱] دیکھو رسائل ج ۴ ص ۱۲۵ طبع مصر [۲] رسائل ج ۴ ص ۱۴۹، ۱۵۰ طبع مصر [۳] ڈاکٹر عمر فروخ: اخوان الصفا ص ۸،

نہیں کہ ان اشعار سے صرف رسائل کے عہد تالیف پر روشنی پڑتی ہے نہ کہ جماعت کی تاسیس کے زمانہ پر، پھر یہ بھی واضح رہے کہ یہ رسائل ایک فرد کا کارنامہ نہیں بلکہ ان کے لکھنے والے مختلف افراد ہیں، اس لئے کسی تاریخی شہادت کی موجودگی کے بغیر اس جماعت کے قیام و نشو و نما کو کسی خاص زمانہ کیساتھ مختص کرنا ادعائے محض اور خلاف عقل ہے،

اگرچہ اخوان الصفا کی ترکیب اضافی کا استعمال جاہلی اشعار میں نایاب نہیں، مگر بظاہر اس جماعت نے اپنے نام کا اشتقاق آیت پاک "فاصبحتم بنعمته اخوانا" سے کیا ہے، البتہ خود ان کا بیان ہے کہ ان کا نام صفوۃ الاخوان سے ماخوذ ہے[1]، جو درحقیقت لغوی توجیہ ہے،

اخوان الصفا کے مقاصد اس جماعت کی غرض و غایت ممکن ہے کچھ اور رہی ہو مگر رسائل صاف طور پر بیان کرتے ہیں کہ ان کا مقصد اخلاق کی درستگی، حق کی حمایت، علوم و فنون کی پرداخت، صفائے طینت، خلوص و مودت اور دینی اخوت کی اشاعت، بالفاظ دیگر ان صفات عالیہ کی نشر و اشاعت ہے جو صحابۂ کرامؓ اور خود ذات نبویؐ کا نصب العین تھا، اس کا ثبوت اس عبارت سے ملتا ہے[2]،

> "یہ معلوم ہونا چاہئے کہ یہ امر جس کی طرف ہم اپنے بھائیوں کو بلاتے اور اپنے دوستوں کو ترغیب دلاتے ہیں، کوئی نئی رائے اور نیا مذہب نہیں ہے، بلکہ ایک پرانی رائے ہے جسکی جانب بہت سے حکما، فلاسفہ اور فضلا نے سبقت کی ہے، یہ وہی طریقہ ہے جس پر انبیا علیہم السلام چلے ہیں اور وہی مذہب ہے جس پر انبیاء کے خلفاء اور ائمہ مہدیین عمل پیرا ہوئے تھے، اور یہی حکم ان نبیوں کا تھا جنھوں نے ہدایت پانے والوں اور ان علماء کو جو کتاب اللہ کے معانی کی نگہداشت کرتے تھے مسلمان بنایا، ہمارے باپ ابراہیم علیہ السلام کا یہی طریقہ تھا جس کی وجہ سے ہمارا نام انھوں نے پہلے ہی مسلمان رکھا،

---

[1] رسائل ج ۴ ص ۹، ۱۸۰، ۲۱۹ طبع مصر [2] ایضاً ج ۴ ص ۱۸۰

قرآن میں یہ ہے کہ لوگ ایک رائے پر مجتمع ہوں اختلاف کو ترک کریں، نفوس میں موافقت پیدا کریں، دلوں کو ایک دوسرے سے مانوس بنائیں، سچی باتوں کے ساتھ خطاب کریں، دلوں میں تصدیق کو جاگزیں بنائیں، ایک دوسرے کی تکذیب نہ کرے، دھوکا نہ دے نصیحت کرے خیانت نہ کرے، اعتماد سے کام لے، کسی کو بھی متہم نہ کرے، دوستی کرے حسد نہ کرے، ایک دوسرے کا دوست بنے، کسی سے بغض نہ رکھے، موافقت کرے مخالفت نہ کرے، اتفاق سے کام لے اختلاف نہ کرے ایک دوسرے کو تقویت پہنچائیں ذلیل نہ کریں باہم مدد کریں تساہل نہ برتیں، صلاح دیں پر ایک دوسرے کی مدد کریں، اور سب متحد ہو کر ایک فرد اور نفس واحد کی طرح ہو جائیں، اور اسی طرح شریعت کے طریقہ پر چلیں جس طرح کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے،

"ایمان والے ایک فرد ایک نفس ہیں ان کا خون اور انکا مال ایک دوسرے کیلئے مکافات ہے، اور اپنے علاوہ دوسروں کے مقابلہ میں بمنزلہ ایک ہاتھ کے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی نصیحت اور اس کا فرمان ہے کہ

تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان ۵	نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی معاونت کرو اور گناہ و ظلم پر معاونت نہ کرو

نیز ارشاد ہے،

ولا تنازعوا فتفشلوا وتذهب ریحکم	آپس میں نہ جھگڑو کہ کمزور پڑ جاؤگے اور تمھاری ہوا (طاقت) چلی جائے گی،

نیز فرماتا ہے،

فاصبحتم بنعمته اخوانا	تو تم اسکی نعمت سے بھائی بھائی ہو گئے،

اس جماعت کی خواہش تھی کہ لوگوں میں معرفت خیر و شر[1]، صلاح دین و دنیا عام ہو[2]، اس غرض کے حصول کیلئے اس جماعت نے مجلسوں[3] خصوصاً غیر شیوخ[4] کی اقتدا میں بھی تامل نہیں کیا، اس کو کسی مذہب سے بیر نہیں، بلکہ وہ سارے علوم طبیعیہ، ریاضیہ، الٰہیہ[5] اور سارے مذاہب پر نظر رکھنے کی متمنی تھی، اور اس کی خواہش تھی کہ ان کے اخوان تمام علوم سے بہرہ ور ہوں کہ اسی میں ان کے نزدیک نجات و فلاح ابدی ہے[6]؛

البتہ ہر ہر رسالہ میں اور ہر مناسب مقام پر تنبیہ کرتے جاتے ہیں کہ جو کچھ بیان ہوا محض رموز و اشارات ہیں، اور اصل مقصد کا ظاہر کرنا مشکل ہے، چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں[8]؛

"اس کلام پر غور و خوض کرو، یہ اسرار عجیبہ اور رموز دقیقہ سے ہے، اور اس میں ایک غرض غامض ہے،.... تمھارے لئے سر اور یہ ہے کہ اپنے بھولنے والے اور سوئے ہوئے نفس کی طرف توجہ کرو، اور غفلت سے جاگو، اور جو کچھ ہم نے کہا اس پر غور کرو، اور جو کچھ اشارات و رموزات بیان ہوئے ان کے سمجھنے کی کوشش کرو، ہم پر سوء ظن کو راہ نہ دو کیونکہ ستر ربوبیت کا افشا کرنا کفر ہے"،

غالباً ایسی ہی عبارتوں سے محققین کو یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ یہ جماعت سیاست سے تعلق رکھتی تھی، اور اپنے وقت کی حکومت کا تختہ الٹنا چاہتی تھی، چونکہ ان کے چیدہ چیدہ خیالات، اور تبلیغ و اشاعت کی نوعیت باطنیہ کے بعض خیالات و تبلیغی کاموں سے کچھ کچھ ملتی جلتی ہے، اس لئے مستشرقین کو موقع ملا کہ اس جماعت کو بدنام کریں، چنانچہ کبھی تو ان کا رشتہ قرامطہ سے جوڑتے ہیں،

---

[1] رسائل ج ۳ ص ۲۱۹ [2] رسائل ج ۴ ص ۲۱۸ و ص ۲۱۹ [3] ایضاً ج ۳ ص ۲۳۸، ص ۳۳۹، [4] ایضاً ج ۳ ص ۲۰۰، ص ۳۰۱ [5] ایضاً ج ۴ ص ۲۱۳، ص ۲۱۸، ص ۲۱۹، ص ۲۳۳ [6] ایضاً ج ۴ ص ۲۱۶ [7] ایضاً ج ۴ ص ۳۵۶ [8] ایضاً ج ۴ ص ۱۳۳ طبع مصر،

اور کبھی باطنیہ سے[1]، حالانکہ اس جماعت کی اگر کوئی سیاسی غرض ہوتی تو ضرور کسی موقع پر اپنا زور دکھاتی، اور اپنی طاقت کا مظاہرہ کم از کم اپنی قوت کا جائزہ لینے کی خاطر ہی سہی ضرور کرتی جیسا کہ بعض شیعی فرقوں، قرامطہ اور باطنیہ سے ایسے واقعات وقتاً فوقتاً ظہور میں آتے رہے، لیکن جب ایسا کوئی تاریخی پس منظر ہمارے سامنے نہیں تو یہ حسن ظن ہی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یہ جماعت بھی دیگر علمی و اجتماعی جماعتوں، معتزلہ و اشاعرہ وغیرہ کی طرح عوام کے اخلاق سنوارنے اور آپس کے اختلاف کو دور کرنے کیلئے محض سوشیل ورکس (Social works) کی خاطر معرض وجود میں آئی تھی، اور چونکہ اس دور میں علوم ریاضیہ، حساب نجوم، عزائم و طلسم کا چرچا اہل علم میں عام تھا اسلئے انھوں نے اپنے مکتوبات کو فلسفہ، ریاضیات و طلسمات کا مرجع بنایا، گو ان رسائل دقیق علمی بحثوں پر روشنی نہیں پڑتی، مگر اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا، کہ یہ رسائل اپنے عہد کے عربوں کے علمی مذاق اور سوشیل کارناموں کا زندہ نمونہ ہیں، اور اس خیال سے ان کی قیمت اور دوبالا ہوجاتی ہے، کہ چوتھی اور پانچویں صدی کے عربوں میں علوم ریاضیہ و فلسفہ جس قدر متداول تھے ان کے صحیح خاکے ان ہی کے ذریعہ ہمارے نظر نواز ہوئے ہیں،

اخوان الصفا کا مذہب اور عقیدہ | اخوان الصفا بظاہر مسلمان تھے، ان کی نشاءت اسلامی تھی، ان کا فلسفہ اسلامی (؟)... اس پر قائم ہے اور ان کا اعتقاد تھا کہ اسلام سب دینوں میں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سب رسولوں میں افضل و بہتر ہیں اور اسلامیت 'عمدۃ العقیدہ' ہے،

البتہ تفصیل میں ان کے عقائد اور اسلامی تعلیمات میں بعض بنیادی اختلافات ہیں مثلاً انکا عقیدہ ہے کہ

شریعت محمدیہ باوجودیکہ 'عمدۃ العقیدہ' ہے، ناقص ہے، نیز جس کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہے وہ رسولوں کا محتاج نہیں، (رسائل ج ۴ ص ۱۲۱)

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھیے لٹریری ہسٹری آف دی عربس نکلسن ص ۳۷۱ و عربی تھاٹ اولیری ص ۵ ۱۶۷ تاریخ فلسفہ ڈی بوئیر ص ۸۹ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ج ۲ ص ۴۵۹،

حقیقی عبادت کے لئے ضروری ہے کہ صرف تسبیح و تقدیس ہو، فرائض نہ ہوں،

شریعتوں کی تعیین انسانی گڑھنت ہے، اللہ کی وحی کے ذریعہ ان کا قیام نہیں ہوا

وغیرہ وغیرہ (دیکھو فصل الہیات)

درحقیقت اس جماعت کا کوئی خاص دین و مذہب نہ تھا، اس کے یہاں دین، مذہب حتیٰ کہ محمدؐ، علیؑ، قرآن، اہل بیت نبیا، وغیرہ کے معانی کچھ اور ہیں، اور ان معانی سے بالکل مختلف ہیں، جو مسلمانوں میں خواہ وہ اہل السنت و الجماعت ہوں یا شیعہ، رائج ہیں، ان کا مذہب فلسفہ، اخلاق، اور روحانیت ہے، ان کے مذہب کو صوفیت سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں، ہر مذہب اور ہر علم کی خوبیوں کو اپنانا ان کا دین ہے، اور صفائے طینت و مودت و اخوت ان کا ایمان[1]

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جملہ علوم میں غور و فکر کرنا[2] علم و مال میں اشتراک[3] ان کا مذہب ہے، ان کے نزدیک حیات، روحانیت صداقت و نصیحت اور حسن معاملہ سے وابستہ ہے[4] ان کے نزدیک اللہ کی عبادت نماز روزہ نہیں بلکہ دین و دنیا کی تعمیر عبادت ہے[5]، اور عبادات شرعیہ یعنی صوم و صلوٰۃ اور حج بذاتہا مقصود نہیں ہیں، یہ سب اصلی مقصد کے حصول کیلئے اشارے اور کنائے ہیں[6]، آخرت میں حقیقی نجات پانے والا وہ ہوگا جو ساری امتوں اور ادیان کے فضائل کا جامع ہوگا[7]، نجات صرف عبادات اور اخلاق سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے علوم و معارف پر حاوی ہونا بھی ضروری ہے[8]

محققین کو ان کے مذہب کے بارے میں سخت دھوکا ہوا ہے، عام خیال یہ ہے کہ اخوان الصفا شیعہ تھے، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ شیعہ بھی نہیں تھے، نہ امامیہ فرقہ سے ان کا تعلق تھا نہ اسماعیلیہ

۱؎ رسائل ج ۴ ص ۲۱۳، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۳۰ ۲؎ ایضاً ج ۴ ص ۱۱۶، ۱۱۷ ۳؎ ایضاً ج ۴ ص ۱۹، ۲۲۸، ۲۲۴ ۱۹۴۶

۴؎ ایضاً ج ۴ ص ۱۷۰ ۵؎ ایضاً ج ۴ ص ۱۹۹ ۶؎ ایضاً ج ۴ ص ۱۶۳ ۷؎ ایضاً ج ۴ ص ۱۵۷، ۱۵۰ ۸؎ معارف فروری ص ۹۰، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، ڈی بوئر، نکولسن، اولیری (دیکھو نوٹ ۱ صفحہ ۶ مضمون ہذا)

اور باطنیہ سے، مذہب شیعہ کے بنیادی رکن عقیدۂ امامت پر وہ اس طرح طنز کرتے ہیں:[1]

"... یہی اس کا حکم ہے جو یہ رائے و اعتقاد رکھتا ہے کہ امام فاضل و ہادی پوشیدہ ہیں، اور اپنے مخالفین کے خوف سے ظاہر نہیں ہوتے، یہ عقیدہ رکھنے والا عمر بھر اپنے امام کے خروج کا منتظر رہتا ہے، کہ جلد از جلد امام نکلیں اور ظاہر ہوں، مگر اس کی عمر ختم ہو جاتی ہے اور وہ اسی حسرت و غصہ میں مر جاتا ہے کہ اپنے امام کو نہیں دیکھ سکا ... پھر معلوم ہو کہ ایسی فاسد رائیں بہت ہیں"

گو اخوان الصفا خود اہل باطن ہونے کا دعویٰ کرتے تھے لیکن اس مذہب کے پیروؤں کے سخت دشمن تھے، (ملاحظہ ہو رسائل ج ۴ ص ۵۸، ۵۹)

جماعت اخوان الصفا کے نظام و آئین: اس جماعت کی مجلسیں اوقات معینہ میں خفیہ طور پر منعقد ہوا کرتی تھیں،[2] اس کے خاص قوانین تھے، اس کے ممبر بچے، جاہل، کمزور، بوڑھے اور عورتیں نہیں ہو سکتی تھیں، اس جماعت کے نزدیک عورتوں کا شمار عوام بچوں اور جاہلوں میں تھا،[3]

ذیل کے اقتباس سے مجلس اخوان الصفا کے نظام پر روشنی پڑتی ہے:[4]

"ہمارے بھائیوں کو، اللہ ان کی مدد کرے، سزاوار ہے کہ جس شہر میں بھی ہوں ان کی خاص مجلس ہونی چاہئے، جس میں معلوم وقتوں میں سب کا اجتماع ہوا کرے، اس میں وہ غیروں کو داخل نہ ہونے دیں، اور علوم و اسرار خصوصاً علم النفس حس و محسوس، عقل و معقول اور کتب الٰہیہ، تنزیلات نبویہ اور موضوعات شرعیہ

۱؎ رسائل ج ۴ ص ۵۸ ۔ ۲؎ ایضاً ج ۴ ص ۲۰۲ ۳؎ ایضاً ج ۴ ص ۷۰، ج ۴ ص ۲۰۲، ۲۲۷، ۲۲۸، ج ۳ ص ۲۵۱، ۱۲۰، ج ۴ ص ۲۲۳، ج ۴ ص ۲۶، ۲۷، ۴۷، ۵۰، ۶۲، ۷۵، ۲۳۹

۴؎ ایضاً ج ۴ ص ۲۰۲،

کے اسرار پر بحث و مذاکرہ ہوا کرے، اور علوم ریاضیات اربعہ یعنی عدد، ہندسہ، تنجیم اور تالیف کا تذکرہ بھی ہونا چاہئے لیکن زیادہ توجہ علوم الٰہیہ کی جانب جو اصل مقصود ہیں ہونی چاہئے؟

اس نظام میں تعلیم و تربیت کے لحاظ سے مدارج و مراتب مقرر تھے، ہر ایک درجہ کا ایک نام تھا، چونکہ علوم و معارف کے قبول کرنے کی صلاحیت اور تہذیب نفس کی استعداد طبائع میں مختلف ہوتی ہے، اور قوی عقلیہ میں بلحاظ سن و سال کے بتدریج پختگی پیدا ہوتی ہے، اسلئے اخوان الصفا کے چار طبقے مقرر کئے گئے تھے۔

طبقہ اولی :۔ اخوان ابرار رحماء، اس میں وہ لوگ ہوتے جو عمر کے پندرہ سال طے کر چکے ہوتے اور جن میں قوت عاقلہ ممیزہ ابھر چکی ہوتی یہ طبقہ دوسرے طبقوں سے اس لحاظ سے ممتاز ہوتا کہ ان میں جوہر نفس کی صفائی، علوم و فنون کے قبول کرنے کی اہلیت اور سرعت تصور جیسی صفتیں موجود ہوتی ہیں،

طبقہ ثانیہ :۔ اخوان اخیار فضلاء، ان میں وہ لوگ ہوتے جن کی عمر تیس سال کی ہوتی، اور جن میں قوت حکیمہ ابھر چکی ہوتی، ان کے امتیازی اوصاف یہ تھے، اخوان کی رعایت سخاوت نفس اعطاء فیض و شفقت و رحمت، نیز شفقت علی الاخوان

طبقہ ثالثہ :۔ اخوان فضلاء کرام، وہ لوگ جو عمر کی پختگی یعنی چالیس سال کو پہنچ چکے ہوتے، اور ان میں قوت ناموسیہ ابھر چکی ہوتی ہے،

طبقہ رابعہ :۔ اس طبقہ کا نام نہیں بتایا گیا، اس کے اوصاف یہ لکھے گئے ہیں، جن کی عمر پچاس برس کی ہو چکی ہوتی اور ان میں قوت ملکیہ پیدا ہو چکی ہوتی، اس درجہ میں نفس ان مدارج

ا؎ رسائل ج ۴ ص ۱۱۹، ۱۲۰،

کو جن کے ذریعہ حق کو عیاناً دیکھ سکتا ہے، طے کر چکتا ہے، اور عالم ملکوت سے مل جاتا ہے، اور قیامت، بعثت، حساب اور مجاورت رحمٰن کے حقائق کا ادراک کرنے لگتا ہے،

اخوان الصفا کی تصنیفات رسائل اخوان الصفا کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس جماعت کی تصنیفات میں رسائل کے علاوہ چار کتابیں اور مراسلات، ردّ اور سوالات کے جوابات بھی ہیں، چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں[۱]،

> "جماعت اخوان الصفا کے مختلف رسائل ہیں، اور ایسی ہی ان کی چار کتابیں اور مشہور ہیں جن کو لوگ پڑھتے ہیں، مگر سمجھتے نہیں، اس لئے وہ لوگوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ ان کی مجلسوں میں آکر ان کتابوں کو پڑھیں اور سمجھیں،"

رسائل اخوان الصفا کی تالیف ان رسائل کے لکھنے کا سبب جیسا کہ خود ان کا بیان ہے یہ تھا کہ جماعت کے بہت سے اخوان (ممبران جمع) مرکز دعوت سے دوری کی بنا پر مجالس الاخوان میں حاضر نہیں ہو سکتے تھے . ان کے لئے یہ رسائل لکھے گئے تاکہ مجالس کی کارروائی سے سب اخوان باخبر ہوتے رہیں، اور ان کو معلومات حاصل ہوتے رہیں[۲]،

چونکہ اخوان الصفا نے بڑی احتیاط کے ساتھ اپنے ناموں کو چھپایا تھا، اس لئے یہ بحث پیدا ہوگئی ہے کہ کن لوگوں نے ان رسائل کو تالیف کیا؟ اور ان رسائل کے لکھنے والوں میں کون کون لوگ شریک تھے؟ قفطی نے چند نام گنائے ہیں[۳]، اور انھوں نے اپنا نام ابوحیان التوحیدی کی مقابسات کو قرار دیا ہے، جس میں زید بن رفاعہ کے متعلق جو اخوان الصفا کا سرگروہ سمجھا جاتا ہے[۴]، یہ مذکور ہے کہ زید جماعت اخوان الصفا کے لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا اور ان کی صحبت میں رہا تھا، جو اس

---

۱ رسائل ج ۴ ص ۱۶۷، ۱۷۱ ۲ ایضاً ج ۴ ص ۱۲۲ ۳ اخبار الحکما ص ۵۹ مصری ۴ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ج ۲ ص ۴۵۹ و امیر علی اسپرٹ آف اسلام ص ۴۳۵ و اولیری عربک تھوٹ Arabic Thought ص ۱۷۵

بات کی دلیل ہے کہ زید بھی کم از کم ایک ممبر ضرور تھا، ورنہ اس محتاط جماعت کے ممبر زید کے ساتھ کھل کر نہ ملتے، اور اس قدر خلا ملا نہ رکھتے، مقابسات کی عبارت کا یہ فقرہ[۱] "صحبھم وخدمھم" بتاتا ہے کہ زید اخوان الصفا کی آراء اور رمز اکرات سے پوری طرح واقفیت رکھتا تھا، اور اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ اخوان الصفا اپنی مجلسوں میں غیروں کو شامل نہیں ہونے دیتے تھے[۲] اور زید اخوان الصفا کا صحبت یافتہ تھا، اور اس نے ان کی خدمت بھی کی تھی، اور لفظ خدمت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے مراد تبلیغ و اشاعت یا نشر و تالیف ہے، کیونکہ اس کے علاوہ اور اس جماعت کی کوئی خدمت نہیں ہو سکتی،

رسائل کی زبان بتاتی ہے کہ یہ رسائل یک وقت نہیں لکھے گئے بلکہ مختلف اوقات میں مختلف ممبروں کیلئے الگ الگ تحریر میں لائے گئے،

جماعت اخوان الصفا نے اپنی نشو و نما کے لئے رسائل کی تحریر کی ضرورت کو بہت بعد میں محسوس کیا، اور جیسا کہ ابوحیان التوحیدی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے[۳]، ان رسائل کے کچھ حصے ۳۷۳ھ سے قبل بھی مشہور تھے، نیز ان کی تالیف کا سلسلہ ۴۴۰ھ کے بعد تک جاری رہا ہے[۴] پھر جب اس پر غور کیا جائے کہ ان رسائل میں اشاعرہ اور مشبہہ پر بھی کثرت سے حملے کئے گئے ہیں، تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ پانچویں صدی کے اختتام تک اس کا سلسلہ جاری رہا ہوگا، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ حصے اور بھی بعد میں بڑھائے گئے ہیں،

البتہ ان تمام رسائل کی بنیاد ایک ہی عقیدہ اور ایک ہی خیال کے ماتحت ان کی تحریر عمل میں آئی ہے،

---

[۱] ابوحیان، مقابسات ص ۴۷ طبع مصر، [۲] مضمون ہذا ص ۹ [۳] مقابسات ص ۴۶، ۴۷ [۴] ابوالفتح البستی (المتوفی تقریباً سنہ ۴۴۰ھ) کے اشعار کا وجود اس کی صاف دلیل ہے،

رسائل کی تعداد | رسائل اخوان الصفا کے جزء اول سے پتہ چلتا ہے کہ ان رسائل کی تعداد باون[1] ہے لیکن باقی تینوں اجزاء میں ان کی تعداد اکیاون[1] بتائی گئی ہے[2]،

ان اکیاون رسالوں کے علاوہ فہرست اخوان الصفا بھی ہے، جس میں رسائل کی تعداد اور مضامین کی طرف اختصار کے ساتھ اشارہ کیا گیا ہے، بظاہر یہ فہرست رسائل کی کتابت سے قبل لکھی گئی ہے[3]،

ان رسائل کے اخیر میں "الرسالۃ الجامعۃ" یا "الفصل الجامع" کے عنوان سے ایک اور رسالہ بھی ہے جس میں سارے حقائق کا استقصار کیا گیا ہے[4]، اس کو سارے رسائل اخوان الصفا کا نچوڑ سمجھنا چاہئے، اس کے متعلق خود رسائل میں حسب ذیل رائے ظاہر کی گئی ہے[5]،

"در اصل یہی اصل مقصود اور اسی پر دین و دنیا کی کامیابی موقوف ہے"

اس لئے ان رسائل کی تعداد باون[5] ہوتی ہے،

---

[1] رسائل ج ۱ ص ۱، ۱۹، ۴۸ [2] ایضاً ج ۲ ص ۱۳، ج ۳ ص ۲۸، ج ۴ ص ۱۲۷، ۱۹۱، ۳۲۰، ۳۲۱ [3] ایضاً ج ۴ ص ۳۲۰ [4] ایضاً ج ۱ ص ۱۹ [5] ایضاً ج ۱ ص ۲۲،

(سلسلہ تاریخ اسلام)

تاریخ صقلیہ جلد اول

اس میں صقلیہ کے جغرافی حالات سسلی، اٹلی و جزائر سسلی پر اسلامی حملوں کی ابتدا اسلامی حکومت کا قیام، عہد بعہد کے دوروں کا عروج اور مسلمانوں کے مصائب اور جلا وطنی کا مرقع دکھایا گیا ہے، قیمت للعہ، ۵۴۶ صفحے،

"منیجر"

مخطوطہ فتح المنان فی تائید مذہب النعمان

از جناب مولوی ابو یحییٰ امام خاں صاحب نوشہروی

معارف (ج ۶۴ ص ۴۵۰) میں [illegible] حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی نے کتاب مذکورۃ الصدر پر تبصرہ فرمایا تھا، ذیل کی سطور اسی کا تکملہ ہیں،

اور ممدوح نے اپنے مضمون میں فتح المنان کے جس نسخہ کا تذکرہ فرمایا ہے وہ مولانا محمد طاہر مرحوم (م ۱۲۹۶ھ / ۱۸۷۸ء) کے کتب خانہ میں ہے جو شاہ محمد اسحاق دہلوی (م ۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۸ء) کے شاگرد تھے،

اس کا دوسرا مخطوطہ دار الحدیث رحمانیہ دہلی[1] میں تھا، جو دہلی کے گذشتہ فساد میں تباہ ہو گیا، افسوس اس بزم تحدیث کی ۲۷ سالہ (از ۱۳۳۹ھ تا ۱۳۶۶ھ) علمی بہاریوں لٹ گئی۔

---

[1] اہل حدیث کی یہ تعلیم گاہ باڑہ ہندو راؤ دہلی میں تھی اس کے بانی شیخ عبد الرحمان مرحوم ہیں، جن کی رحلت کے بعد آپ کے حاتم صفت بھائی میاں عطاء الرحمٰن متولی مقرر ہوئے اور ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے حاجی عبد الوہاب صاحب ان کے جانشین قرار پائے، تعلیم گاہ کا کلیہ مصارف متولی کے ذمہ تھے، آخری زمانہ میں مدرسہ میں ۹ اساتذہ اور ۶۰، ۷۰ تک طلبہ تھے، طالب علموں کی ذہنی تربیت اور مشق کیلئے ایک ماہانہ رسالہ "محدث" نکلتا تھا، مدرسہ کا وائٹ ورکس تک اپنا ذاتی تھا، اور آج تک اس مدرسہ کے تقریباً ایک سو فارغ التحصیل حضرات ملک کے مختلف اطراف میں مصروف تدریس و تبلیغ ہیں، مقدمہ تحفۃ الاحوذی شرح جامع ترمذی جسکی جناب مولانا عبد الرحمٰن مبارکپوری نے رکھی تھی اس کی تکمیل اسی دار الحدیث کے باخبر فارغ اور شیخ الحدیث مولانا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۷۰ پر)

اصل کتاب کا تذکرہ فتح المنان کے اس دہلوی مخطوطہ کے ۵۲۲ صفحات ہیں، ہر صفحہ میں ۱۴ سطریں ہیں، کاتب کا نام محمد انوار الحق دہلوی ہے، جو مولف فتح المنان شاہ عبد الحق صاحب محدث دہلوی (م ۱۰۵۲ھ / ۱۶۴۲ء) کو اپنا جد لکھتے ہیں، خاتمہ کتاب پر کاتب کی عبارت یہ ہے،

"تم ھذا الکتاب المستطاب المسمی بفتح المنان فی تائید مذھب النعمان للشیخ الاجل الحبر النبیل ومصداق علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل سندی وجدی ابی المجد الشیخ عبد الحق محدث الدھلوی روح اللہ روحہ واصل الینا فتوحہ فی عشیۃ یوم السبت تاریخ الثامنۃ والعشرین مضت من ذی الحجۃ المنسلکۃ فی مشھور سنۃ تسع و تسعین والمائتین بعد الالف (سنہ ۱۲۹۹ھ / ۱۸۸۱ء) من الھجرۃ بتوفیقہ تعالیٰ علی ید اقل عبیدہ الراجی محمد انوار الحق الدھلوی تاب اللہ علیہ والحمد للہ رب العالمین" (ص ۵۶۶)

کتاب کا آغاز " الحمد للہ الذی ارسل محمداً وجعلہ سید المرسلین" سے ہے،

(بقیہ حاشیہ ص ۴۶۹) عبید اللہ صاحب مبارکپوری نے کی، ان دنوں آپ شرح مشکوٰۃ المصابیح پر متوجہ (۲) ہیں، مدرسہ رحمانیہ کی عمارت جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کو ہبہ کر دی گئی ہے، کتب خانہ اوکھلا جامعہ نگر میں منتقل ہو گیا، مخطوطہ فتح المنان فی تائید مذہب النعمان بھی جامعہ ہی میں ہے، اسی کتب خانہ میں امام شوکانی کی سیل الجرار کا مخطوطہ بھی راقم السطور نے دیکھا ہے، اور شیخ عبد الوہاب اپنی بہت بڑی غیر منقولہ املاک کوڑیوں کے مول فروخت کر کے کراچی ہجرت کر گئے اور یہ پورا المیہ راقم کے سامنے (ستمبر ۱۹۴۷ء) میں وقوع پذیر ہوا،

مولف نے امام ابن ہمام کے فیض کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے،

وجزی اللہ عنا الشیخ الاجل الاکرم الاعظم کمال الدین ابن الہمام رحمہ اللہ العلیم العلام حیث حقق ھذا الامر واثبت المذھب بالاحادیث الصحیحۃ والحسنۃ الصالحۃ للاحتجاج واثبت احادیث المتن وایضاً اجاب عن دلائل الشافعیۃ عند الاحتیاج (ص۴)

حضرت شاہ عبدالحق شافعی مسلک اختیار کرنے پر مائل ہو چکے تھے جس کا ثبوت حسب ذیل عبارت سے ملتا ہے،

ولما کنت انا العبد المسکین عبدالحق بن سیف الدین دھلوی وطناً والبخاری اصلاً والترکی نسلاً والحنفی مذھباً والصوفی مشرباً والقادری طریقۃ بالحرمین الشریفین زادھما اللہ تشریفاً وتعظیماً وکنت اقرء کتاب المشکوۃ وقعت فی ھذا الخیال وھممت ان ادخل فی مذھب الشافعی فی الحال ... (ص۶۵)	میں مسکین عبدالحق بن سیف الدین جو وطن کے لحاظ سے دہلوی خاندان کے لحاظ سے بخاری نسل کے لحاظ سے ترکی، مذہب کے لحاظ سے حنفی مشرب کے لحاظ سے صوفی اور طریقہ کے لحاظ سے قادری ہوں جب حرمین شریفین میں کتاب مشکوۃ پڑھی تو میرے خیال میں یہ بات آئی کہ فوراً شافعی مذہب میں داخل ہو جاؤں، ... .

لیکن پھر شیخ عبدالوہاب المتقی کی رہنمائی سے اس ارادہ سے باز رہے،

... فعرضت ذلك على سيد الشيخ
العالم العامل المقتدى طوداً علياً
وعلم الهدى ونور التقى وصاحب
الاستقامة التي هي فوق الكرامة
والكرامة التي تحصل بعد الاستقامة
أبي المواهب صفي الدين عبد الوهاب
المتقي القادري الشاذلي"
قال من أين وقعتم في هذه
الخيال لعله حصل لكم عليه قرءة
المشكوة بالاستعجال وقال
ما هو إلا أنهم تتبعوا الأحاديث
الواضحة موافقة لمذهبهم
فأوردوها في كتبهم مكررة و
ههنا أحاديث أخرى راجحة
عليها يثبت مذهبنا مكررة
كما مر"
ثم ذكر الشيخ مناقب الإمام
أبي حنيفة وقال كان هذا الإمام
الرفيع الشان تقدم في الزمان

میں نے اس خیال کو شیخ صفی الدین
عبدالوہاب کے سامنے پیش کیا
جو بلندی اور ہدایت کے پہاڑ، تقویٰ
کے نور اور ایسے صاحب استقامت
تھے جو کرامت سے بڑھ کر تھی ایسی
کرامت جو استقامت کے بعد حاصل
ہوتی ہے، انھوں نے فرمایا کہ تمھارے
دل میں یہ خیال کیونکر پیدا ہوا؟
غالباً عجلت کے ساتھ مشکوٰۃ کے پڑھنے
سے پیدا ہوا ہوگا، اس کی وجہ یہ ہے
کہ وہ اپنے مذہب کے موافق حدیثیں
تلاش کرکے ان کو اپنی کتابوں میں
بار بار لائے لیکن دوسری حدیثیں
بھی ہیں، جو ان پر ترجیح رکھتی ہیں
اور ہمارا مذہب ان سے بار بار ثابت
ہوتا ہے جیسا کہ گذرا
پھر انھوں نے امام ابو حنیفہ کے مناقب
بیان فرمائے کہ ان کو تقدم زمانی
حاصل تھا، اور ان کے اصحاب

عربی	اردو
وكان له اصحاب من التابعين	تابعین اور تبع تابعین میں جو متقی،
واتباعهم من العلماء المتقنين	پرہیزگار، فقیہہ اور محقق تھے اور
المتورعين الفقهاء المتقنين المحققين	مجتہدین سے زیادہ تھے، اس کے
اكثرها لغيره من المجتهدين	علاوہ اس کے ثبوت کے لئے
الى آخر ما قال من المقدمات	اور بھی بہت سے مقدمات بیان کئے
فی تقرير هذا الكلام ما اصل	جن سے اصل مقصد کی تحقیق ہوتی
الی تحقیق المرام" (ص۷)	تھی،

اس گفتگو سے شاہ صاحب اتنے متاثر ہوئے کہ حنفیت پر قائم رہے،

عربی	اردو
فذهب منی ذالك الخيال و	اب میرا یہ خیال زائل ہو گیا اور
انقلبت الحال ثم لما اراد	حالت بدل گئی، پھر جب انھوں نے
الشيخ رحلة [illegible] عنی	مجھے وطن جانے کیلئے رخصت کرنا
الى الوطن التمست منه ان	چاہا تو میں نے ان سے درخواست
يمكنني فی [illegible] مدته [illegible]	کی کہ مجھ کو چند دنوں اور اپنی خدمت
من الزمن حتى ابحث واتحقق	میں رہنے کی اجازت مرحمت ہو،
مذاهب الائمة الاربعة	تاکہ میں ائمہ اربعہ بالخصوص
خصوصاً هذين المذهبين	امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کی
اعنی مذهب الحنفية و	مذہب کی تحقیق کر لوں، کیونکہ
الشافعية لكونهما وقعين	ان دونوں میں بڑا اختلاف
فی البين حتى يتحقق الامر ويظهر الحق	ہے، تاکہ حق ظاہر ہو جائے، انھوں نے

فی ذالك"	فرمایا اگر خدا نے چاہا تو تم کو
"قال یحصل لکم ان شاء الله	وطن ہی میں یہ بات حاصل ہو جائے
تعالیٰ هذه الامر هنا لك	گی، اور خود شرح مشکوٰۃ کے ذریعہ
وتحصل ببرکة نفسه الشریف	یہ باتیں ان کی ذات کی برکت
فی شرح المشکوة من ذالك	سے معلوم ہو جائیں گی،
الاشیاء" (ص۲)	

اور پھر حنفی مذہب سے وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ اس کی تائید میں فتح المنان فی تائید مذہب ابی حنیفۃ النعمان لکھی، اس کے طرز تالیف کے متعلق لکھتے ہیں،

"ثم انه قد اتفق تالیف هذا	یہ کتاب دو طریقوں پر مرتب
الکتاب علی طریقین	کی گئی ہے، ایک تو ابواب اور
احدهما انها اقتضیت	فصول میں میں نے صاحب مشکوٰۃ
اثر صاحب المشکوة فی سرد	کی پیروی کی لیکن مشکوٰۃ کے علاوہ
الابواب والفصول اوردت	اور کتابوں سے بھی حدیثیں لی ہیں
من غیرها الاحادیث من	اور ہر اصل میں مقام اختلافات
ماثر الاصول ونبهت فی	پر تنبیہ کر دی ہے اور جیسا کہ شرط کی
کل اصل علی مواضع الاختلافات	تھی، اس کے دلائل و براہین
علی ما شرطت من ذکرا	بھی بیان کئے ہیں اور اسی طرز پر
لاستدلالات والمتمسك ختم علی	کتاب الصلوٰۃ کے آخر کتاب الجنائز
هذه النمط الی کتاب الجنائز	تک پوری کتاب لکھی ہے،

آخر کتاب الصلوٰۃ"

ومن ھنا الیٰ کتاب البیوع	اس کے بعد کتاب البیوع تک میں نے اختلافی
اخذت المسائل الاختلافیۃ	مسائل ائمہ کی فقہی کتابوں سے لئے ہیں اور
من الکتب الفقہیۃ للائمۃ	ان میں جو دلائل و مباحث مذکور تھے
ونقلت دلائلہا ومباحثہا	ان کو نقل کیا ہے اس لئے کتاب کا پہلا
المذکورۃ ثمۃ"	حصہ حدیث کی کتابوں کے طریقہ پر مرتب
فتم القسم الاول علی	ہے اور دوسرا فقہی کتابوں کے طریقہ پر
نمط کتب الحدیث والثانی	اس کتاب سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ اس
مثل کتب الفقہ ومقصودنا	سے مذہب حنفیہ کی تائید ہو جو دونوں
من ھذہ الکتاب ھو تائید	طریقوں سے حاصل ہے'
مذھب الحنفیۃ حاصل	. . . .
فی الوجہین ...."	. . . .

حنفی کے لئے شافعی امام کے اقتدار کے بارہ میں شاہ صاحب کا مسلک یہ ہے

احدھما حدیث ابی ھریرۃ	حضرت ابوہریرہؓ کی ایک مشہور
رواہ مسلم اذا اقیمت الصلوٰۃ	حدیث ہے جس کی روایت مسلم نے
فلا صلوٰۃ الا المکتوبۃ و	کی ہے کہ جب نماز کھڑی ہو جائے
قد لزم ھذا علی الحنفیۃ	تو پھر صرف فرض نماز پڑھنی چاہئے' اس
فی الحرمین الشریفین زادھما اللہ	حدیث کی بنا پر حرمین شریفین میں
تشریفاً وتعظیماً یقیم الشافعیۃ	جب شافعیہ نماز فرض ادا کرتے ہیں

الصلوٰة والحنفية يشغلون
بالسنن والنوافل ولهم كلام
في ذلك الكلام في الاقتداء
بالشافعية منعاً وجوازاً فبعضهم
يقتدون بهم خروجاً من
هذه الورطة وبعضهم
لا يقتدون خوفاً من الورطات
الأخر في اختلاف فهم في باب
الطهارة وانتقاض الوضوء
وأمثال ذلك فحيث يعلم
رعايتهم مواضع الخلاف
يجوز وحيث لا يعلم لم يجز
"فهذه من المواضع التي ابتلي
أهل الحرمين فيها من تجويز
تكرار الجماعة المذاهب
الأئمة الأربعة خصوصاً
الشافعية والحنفية وقد
استوفى في ذلك بعض الفقهاء
المحدثين من أهل المدينة بما فيه كتاباً

اور حنفیہ سنن و نوافل کی نماز پڑھتے ہوتے
ہیں تو منع و جواز کے رو سے اس مشکل
سے بچنے کے لئے بعض حنفیہ تو ان کی
اقتدار کرتے ہیں اور بعض اقتدار
نہیں کرتے تاکہ طہارت اور وضو
کے ٹوٹنے وغیرہ کے بارے میں ان دونوں
مذہبوں میں جو اختلافات ہیں ان سے
بچیں ہر نئے اختلافی مسائل میں جہاں
اختلاف کی رعایت مناسب معلوم
ہو وہاں ان کی اقتدار جائز ہے
اور جہاں مناسب نہ معلوم ہو وہاں
جائز نہیں ہے، انہی حالات و اسباب
کی بنا پر اہل حرمین نے مجبوراً مذاہب
اربعہ بالخصوص شافعیہ اور حنفیہ
کی تکرار جماعت کو جائز رکھا ہے اور
مدینہ کے بعض فقہاء محدثین نے ان
مسائل پر مفصل کتاب لکھی ہے۔

وقد عرضت هذه الواقعة على سيد الشيخ عبد الوهاب المتقي رحمة الله عليه قلت ما المخرج عنها؟ قال اثبتوا انتم على حنفيتكم ولا تتذبذبوا

میں نے اس واقعہ کو سیدی شیخ عبد الوہاب المتقی رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے بیان کرکے اس کا حل دریافت کیا تو فرمایا کہ اپنے حنفی مسلک پر قائم رہو، اور اس میں تذبذب کو راہ نہ دو،

(ایضاً فی کتاب الصلوٰۃ)

. . . .

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ المتقی بھی اقتدائے شافعی میں محتاط ہیں،

مسلک حنفیہ کی تائید میں تقریباً اسی قسم کی چار اور تالیفات کا تذکرہ ملتا ہے،

(۱) المعزۃ المنیفۃ فی ترجیح مذہب ابی حنیفۃ یہ اس موضوع پر سب سے پہلی تالیف ہے، اس کے مولف سراج الہند عمر بن اسحاق الغزنوی الہندی م ۷۷۳ھ / ۱۳۷۲ء ہیں، مولانا عبد الحی لکھنوی نے سراج الہند کے لقب کے ساتھ ان کا تذکرہ فرمایا ہے،

وہ ہندوستان کے اساتذہ اور شیوخ میں ہیں، امام وجیہ الدین دہلوی، ملک العلماء سراج الدین ثقفی دہلوی، رکن الدین بدایونی سے ان کو شرف تلمذ حاصل تھا

(۲) دوسری عقود الجواہر المنیفۃ فی ادلۃ امام ابی حنیفۃ ہے، اس کے مولف علامہ سید محمد مرتضیٰ بلگرامی الزبیدی م ۱۲۰۵ھ / ۱۷۹۰ء ہیں، یہ مصر میں چھپ کر شائع ہو چکی ہے،

(۳) تیسری تالیف مولینا محمد بن علی المعروف بہ ظہیر احسن شوق نیموی بہاری کی آثار السنن ہے اس کتاب میں مباحث کے بجائے بلوغ المرام من ادلۃ الاحکام کے طریقہ پر مسلک حنفیہ کی تائید میں احادیث و آثار جمع کی گئی ہیں،

(۴) چوتھی کتاب صحیح البہاری مرتبہ مولانا ظفر الدین صاحب مدرس مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ ہے یہ بھی آثار السنن کے طریق پر ہے[1]،

[1] معارف: پانچویں مولانا اشرف علی تھانوی کی اعلاء السنن ۲۰ جلدوں . .

وفیات

سید حسین کی موت

میں

بعض غلطیوں کی تصحیح

جناب بشیر الحق صاحب بیدل

میرے ایک ہموطن عزیز بشیر الحق صاحب بیدل جو ان حالات سے مجھ سے زیادہ واقف ہیں مضمون مذکور کی غلطیوں کی تصحیح کرکے بھیجی ہے جو نذر ناظرین ہے،

اپریل کے معارف میں "سید حسین کی موت" کے عنوان سے جو نوٹ آپنے دیا ہے، میرے خیال میں اس میں دو تین جگہ آپ سے تسامح ہوگیا ہے،

(۱) میرے علم میں نواب سید محمد آزاد کے مضامین اپنچ بانکی پور پٹنہ میں کبھی نہیں نکلے، ان کے مضامین مشیر قیصر لکھنو اور اودھ پنچ میں نکلتے تھے،

(۲) آپنے لکھا ہے کہ سید حسین اس وقت ۶۲ برس کے تھے، اور ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے تھے اس حساب سے انکی عمر صرف ۵۳ سال ہوتی ہے معلوم ہوتا ہے کاتب کی غلطی سے ۱۸۶۶ء کی جگہ ۱۸۹۶ء چھپ گیا ہے، اس حساب سے بھی ان کی عمر ۶۳ سال ہوتی ہے،

(۳) سید حسین صاحب کے ایک ہی بھتیجے کی شادی وِسینہ میں ہوئی ہے گذشتہ سال کے شروع میں جس لڑکے کی شادی وِسینہ میں ہوئی وہ سید حسین کے بڑے سوتیلے بھائی ڈپٹی اشرف صاحب مرحوم کا نواسہ ہے

مطبوعاتِ جدید

مسلم دیش بھگت اور آج کے شہید از جناب رتن لال صاحب بنسل فیروز آبادی تقطیع چھوٹی ضخامت علی الترتیب ۲۰۷ و ۱۱۶ صفحے کاغذ معمولی کتابت و طباعت بہتر،

قیمت ۲ روپے و ۱ روپے پتہ دفتر نیا ہند ۲۸۵ بائی کا باغ الہ آباد،

انگریزوں نے ہندوستان کی حکومت مسلمانوں کے ہاتھ سے لی تھی، اور وہ مذہبی حیثیت سے بھی نصاریٰ کی حکومت کو گوارا نہیں کر سکتے تھے، اس لئے سب سے پہلے انہی نے اس زمانہ میں انگریزی حکومت کی مخالفت اور ہندوستان کو ان سے آزاد کرانے کی کوشش کی جب ہندوستانیوں میں سیاسی شعور بھی پیدا نہ ہوا تھا اور اس راہ میں انھوں نے بڑی بڑی مصیبتیں جھیلیں جس کا سلسلہ ہندوستان کی آزادی ملنے تک برابر قائم رہا لیکن اس آخری زمانہ میں بعض ایسے واقعات پیش آگئے کہ ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد سے مسلمانوں کا نام ہی اڑا دیا گیا اور آج وہ اس کے فوائد کے حقدار بھی نہیں سمجھے جاتے لائق مصنف نے جو سچے کانگریسی، اور ہندو مسلم اتحاد و اتفاق کے حقیقی حامی ہیں، مذکورۂ بالا خیال کی تردید کے لئے یہ کتاب لکھی ہے اور اس میں حضرت شاہ ولی اللہؒ دہلوی سے لیکر شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ تک اس سلسلہ کے مجاہد بزرگوں اور جدید دور کے بعض محبان وطن کے حالات اور ہندوستان کی آزادی میں ان کی خدمات اور قربانیوں کا ذکر کیا ہے یہ حالات بیشتر مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کی کتابوں سے ماخوذ ہیں اس میں شبہہ نہیں کہ حضرت شاہ صاحب کی بعض کتابوں میں سیاسی و اقتصادی مسائل بھی ملتے ہیں لیکن مولانا عبید اللہ نے ان کی جو تعبیریں کی ہیں یا اس سلسلہ کے بزرگوں کے مجاہدات سے جو نتائج اخذ کئے ہیں اس میں اختلاف رائے کی گنجائش ہے لیکن انگریزی حکومت کے ساتھ ان بزرگوں کی مخالفت اور

ان کے خلاف عملی جدوجہد مسلم ہے جس کو افسوس ہے کہ جدید ہندوستان نے بالکل فراموش کردیا ہے، اس لئے تاریخ کے ان صفحات کو سامنے لانے کی ضرورت تھی، لیکن مسلم دیش بھگت میں مظہر الحق صاحب مرحوم کا تذکرہ ہے جو زیادہ یا پھر ان کے ساتھ حکیم اجمل خان مرحوم ڈاکٹر انصاری مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی وغیرہ کا بھی ذکر ہونا چاہئے تھا، آج کے شہیدوں میں موجودہ زمانہ کے ان محبان وطن کا تذکرہ ہے جنھوں نے گذشتہ ہندو مسلم فسادکو روکنے میں اپنی جان دی، مولانا برکت اللہ بھوپالی کے حال میں مصنف کے یہ فقرے سبق آموز اور موجودہ ذہنیت پر نہایت صحیح تبصرہ ہے کہ "اگر آج مولانا برکت اللہ ہوتے تو پاکستان کے کسی جیل میں ہوتے کیونکہ وہ ہندو مسلم ایکتا کے حامی تھے اور یہ بربادی اور آپس کی نفرت برداشت نہیں کرسکتے تھے اور اگر ہندوستان میں ہوتے تو اسی ملک کے بچے کے ہندوستان میں رہنے پر اعتراض کرنے اور ان کی وفاداری پر کوئی ایسے صاحب شک کرتے نظر آتے جن کی پوری عمر برٹش حکومت کے تلوے سہلانے میں بیتی" دونوں کتابوں کی زبان مستقبل کی متحدہ عام فہم ہندستانی ہے جہاں کوئی عربی فارسی یا ہندی کا مشکل لفظ آگیا ہے تو بریکٹ میں اس کی تشریح کردی گئی ہے، آج کل زبان سے تو متحدہ قومیت کا دعویٰ کیا جاتا ہے، لیکن عمل اور متحدہ قومیت کی تعمیر کے طریقے اس کے بالکل خلاف ہیں۔ لائق مصنف نے اس کا صحیح طریقہ اختیار کیا ہے ان کی یہ کوشش قومی نقطۂ نظر سے بڑی قابل قدر ہے، کاش ہمارے سیاسی رہنماؤں اور ارباب حکومت کو بھی اس کی توفیق ہوتی،

خطبوں کا مجموعہ اور دیہات میں جمعہ کا جواز	از مولانا ابو بکر محمد شیث مرحوم تقطیع بڑی ضخامت ۹۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت ستھری قیمت آٹھ آنے، پتہ دائرہ مطبوعات طیبہ جونپور، دارالمصنفین اعظم گڈھ

مصنف مرحوم کی ذات اور علمی و دینی شہرت محتاج بیان سے مستغنی ہے، انھوں نے خطبوں کا ایک مجموعہ بھی تالیف و مرتب کیا تھا، اس میں ہر مہینہ میں پڑھنے کے خود مصنف کے بارہ خطبے مع ترجمہ اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی، مولانا اسمٰعیل شہید اور فقیہ ابو اللیث کے مشہور خطبات اور نکاح، استسقاء، چاند گرہن اور سورج گرہن کی نمازوں کے خطبے بھی شامل کردئے گئے ہیں آخر میں دیہات میں نماز جواز پر ایک مختصر رسالہ بھی ہے

تاریخ سندھ

مؤلفہ مولنا سید ابوظفر صاحب ندوی دیسنوی سابق رفیق دارالمصنفین اعظم گڈھ

ہندوستان مین مسلمانون کا پہلا قافلہ سندھ مین اترا تھا، اور اُن کی پہلی حکومت یہین قائم ہوئی تھی، اور وہ ایک ہزار سال سے اوپر یہان حکمران رہے، آج بھی سندھ کے درودیوار سے اُن کے آثار نمایان ہین، لیکن اس کے باوجود اُردو مین اسلامی سندھ کی کوئی مفصّل و محققانہ تاریخ موجود نہین تھی، دارالمصنفین نے تاریخ ہندوستان کے سلسلہ مین یہ جامع و محققانہ تاریخ مرتب کرائی ہے، اس مین سندھ کا جغرافیہ، مسلمانون کے حملہ سے پیشتر کے مختصر اور اسلامی فتوحات کے مفصل حالات، خلافتِ راشدہ کے زمانہ سے لے کر آٹھوین صدی ہجری تک سندھ جن جن حکومتون کے ماتحت رہا، اُن کی پوری تاریخ اور ان تمام دورون کے نظامِ حکومت، علمی و تمدنی حالات، اور رفاہ عام کے جو جو کام انجام پائے، ان سب کی پوری تفصیل ہے، مسلمان اس قدیم اسلامی خطہ کی تاریخ فراموش کرچکے تھے، اب پھر اس کو یاد کرنے کی ضرورت ہے، یہ کتاب ایسے وقت مین شائع ہو رہی ہے، جب کہ سندھ کی تاریخ کا ایک نیا باب کھل رہا ہے، اور وہان ایک نئی حکومت کی بنیادین استوار ہو رہی ہین،

ضخامت: ۴۰۰ صفحے   قیمت: چھ روپیے،

"منیجر"

دارالمصنفین کی دینی علمی و ادبی کتابیں

اقبالِ کامل

ڈاکٹر اقبال کے فلسفہ و شاعری پر اگرچہ بکثرت مضامین، رسالے اور کتابیں لکھی گئیں لیکن ان سے اُن کی بلند پایہ شخصیت واضح اور مکمل طور پر نمایاں نہ ہو سکی، یہ کتاب اس کمی کو پورا کرنے کے لئے لکھی گئی ہے، اس میں اُن کے مفصل سوانح حیات کے علاوہ اُن کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کے اہم پہلوؤں کی تفصیل کی گئی ہے، اور سوانح حیات کے بعد پہلے اُن کی اردو شاعری پھر فارسی شاعری پر ان کے بہترین اشعار کے انتخاب کے ساتھ مفصل تبصرہ کیا گیا ہے، اور اُن کے کلام کی تمام ادبی خوبیاں دکھلائی گئی ہیں، پھر اُن کی شاعری کے اہم موضوعوں یعنی فلسفۂ خودی، تعمیر خودی، نظریۂ ملیت، تعلیم، سیاست، صنعت لطیفہ [illegible] فنونِ لطیفہ اور نظامِ اخلاق وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے، مرتبہ مولانا عبدالسلام ندوی، ضخامت ۰۰ہم صفحے، قیمت: [illegible]

"منیجر"

بزمِ تیموریہ

بابر ایک بے مثل اہل قلم تھا، ہمایوں نے شعر و شاعری کے علاوہ ہیئت و نجوم کی بھی انجمن آرائی کی، اکبر کا عہد علوم و فنون کی روشنی سے جگمگا اُٹھا، جہانگیر نے ادب و انشاء کو چمکایا، شاہجہان نے شعراء اور فضلاء کو سیم و زر میں تلوایا، عالمگیر نے معارف پروری اور انشاپردازی کے اعلیٰ نمونے پیش کئے، تیموری دور کے آخری بادشاہوں نے بھی اپنے اسلاف کی روایات کو قائم رکھنے کی کوشش کی، بہادر شاہ ظفر نے عروسِ سخن کے گیسو سنوارے، تیموری شہزادوں اور شہزادیوں نے بھی علم و ادب کی محفلیں سجائیں، دربار کے امراء، شعراء اور فضلاء نے شاہانہ سرپرستی میں گوناگوں کمالات دکھائے، ان سب کی تفصیل مذکورۂ بالا کتاب میں ملاحظہ فرمائیے، مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم اے۔ قیمت: معہ [illegible]

"منیجر"

(پرنٹر و پبلشر صدیق احمد)

دائرۃ المعارف
یعنی
معارف اعظم گڈھ
کی

دائرۃ المصنفین

یعنی

معارف اعظم گڈھ

کی

۶۳ ویں جلد

از جنوری ۱۹۴۹ء تا جون ۱۹۴۹ء

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

و

شاہ معین الدین احمد ندوی

مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ

فہرست مضمون نگاران معارف

(جلد ۶۳)

جنوری ۱۹۴۹ء تا جون ۱۹۴۹ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست مضامین

(جلد ۶۳)

جنوری ۱۹۴۹ء تا جون ۱۹۴۹ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست مضمون نگاران معارف

(جلد ۶۳)

جنوری ۱۹۴۹ء تا جون ۱۹۴۹ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

شمار	اسمائے گرامی	صفحہ	شمار	اسمائے گرامی	صفحہ
۱	مولانا ابوالجلال صاحب ندوی رفیق دارالمصنفین	۵	۷	جناب بشیر الحق صاحب بیدل دسنوی	۴۷۸
۲	مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی	۱۰۵-۱۰۷، ۲۲۳-۲۲۵، ۳۹۳	۸	مولانا سید ریاست علی صاحب ندوی	۳۴۴-۴۲۳
			۹	سید سلیمان ندوی	۳۱۵
۳	جناب ابومحفوظ الکریم صاحب معصومی ریسرچ اسکالر ڈھاکہ یونیورسٹی	۲۷۰	۱۰	جناب صغیر حسن صاحب معصومی ایم اے استاذ شعبہ عربی اسلامیات ڈھاکہ یونیورسٹی	۴۵۶
۴	جناب مولوی ابویحییٰ امام خاں صاحب نوشہروی	۳۶۹	۱۱	جناب مولوی عبدالسلام خاں صاحب رام پور	۲۷
					۲۷
۵	جناب مرزا احسان احمد صاحب بی اے ال ال بی ٹمکیگ	۱۲۱-۲۰۳، ۲۷۵-۲۸۱	۱۲	مولانا عبدالسلام ندوی	۸۵
۶	جناب مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی	۱۶۵-۱۸۷، ۳۶۱	۱۳	جناب مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی رفیق دارالمصنفین	۵۴-۲۱۸، [illegible]
			۱۴	جناب مولوی سید محمد عبدالرؤف صاحب	[illegible]

فہرست مضمون نگاران معارف

(جلد ۶۳)

جنوری ۱۹۴۹ء تا جون ۱۹۴۹ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

شمار	اسمائے گرامی	صفحہ	شمار	اسمائے گرامی	صفحہ
۱	مولانا ابوالجلال صاحب ندوی رفیق دار المصنفین	۵	۷	جناب بشیر الحق صاحب بیدل دسنوی	۴۷۸
۲	مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی	۱۰۵-۱۰۷، ۲۲۴-۲۲۵، ۳۹۳	۸	مولانا سید ریاست علی صاحب ندوی	۳۴۳-۳۴۴، ۴۲۳
			۹	سید سلیمان ندوی	۳۱۵
			۱۰	جناب صغیر حسن صاحب معصومی ایم اے استاذ شعبہ عربی اسلامیات ڈھاکہ یونیورسٹی	۴۵۶
۳	جناب ابومحفوظ الکریم صاحب معصومی ریسرچ اسکالر ڈھاکہ یونیورسٹی	۲۶۰	۱۱	جناب مولوی عبدالسلام خاں صاحب رام پور	۲۷، ۲۷
۴	جناب مولوی ابو یحییٰ امام خاں صاحب نوشہروی	۴۶۹	۱۲	مولانا عبدالسلام ندوی	۸۵
۵	جناب مرزا احسان احمد صاحب بی اے ایل ایل بی علیگ	۱۲۱-۲۰۳، ۲۷۵-۲۸۱	۱۳	جناب مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی رفیق دار المصنفین	۵۴-۸۰، ۲۹۲-۳۰۳
۶	جناب مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی	۱۶۵-۱۷۷، ۳۷۱	۱۴	جناب مولوی سید محمد عبدالرؤف صاحب اورنگ آبادی	۱۳۷